دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

اگست 2013

نگرانِ اعلیٰ

معراج رسول

جشنِ آزادی مبارک

مدیراعلیٰ
عذرا رسول

جاسوسی ڈائجسٹ

MEMBER APNS — CPNE

جلد43 • شمارہ 08 • اگست 2013 • زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021)35895313 فیکس (021)35802551 email:jdpgroup@hotmail.com
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

چینی کے چینی

عزیزانِ من۔۔۔السلام علیکم!

تمام پڑھنے والوں کو جشنِ آزادی مبارک ہو۔۔۔ایسی نویدیں روز ہمارا مقدر ٹھہریں۔۔۔آج تم، کل ہماری باری ہے۔۔۔پاکستان میں یہ سوچ عاقبت کے حوالے سے کبھی پروان نہیں چڑھی۔ یہ ہمارا سیاسی فلسفہ بن گیا ہے۔ جمہوری تعاون کے نام پر جماعتیں ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوط کرتی رہتی ہیں۔ حزبِ اختلاف زیادہ کس بل دکھائے تو اس کی باری آنے پر دوسری طرف سے بھی یہی کچھ ہوگا بہتر یہی ہے کہ دکھاوے کا تھوڑا بہت شور کر کے پُرامن بقائے باہمی کے اصول پر عمل کیا جائے۔ جانے والوں نے جو کچھ کیا، وہی اب بھی ہو رہا ہے۔ ان کے آدمی ہٹا کر اپنے لگائے جا رہے ہیں کیونکہ اب باری اپنی ہے۔ رہے عوام تو ان کو بجلی، پانی اور گیس جیسی بنیادی ضروریات کی وہ بے رحمانہ مار ماری جا رہی ہے کہ اب یہ آوازیں آنے لگی ہیں کہ جو دام چاہو، لے لو مگر خدا کے لیے ہمیں بجلی، پانی اور گیس دے دو۔۔۔یوں ان تینوں لوازم کے طویل تعطل کے نتیجے میں عوام بہت جلد آئی ایم ایف کی زبان بولنے لگیں گے۔ دام بڑھیں گے، بحران ختم تو کیا کم ضرور ہوگا۔۔۔حکومت کا کام آسان ہو جائے گا۔ آئی ایم ایف کی شرائط پوری ہوں گی۔ بے دم، بے حال اور مضمحل عوام خوش ہوں گے کہ مہنگی سہی، مگر بنیادی سہولیات مل تو رہی ہیں۔ اس کھیل میں حزبِ اختلاف خاموش تماشائی ہے کیونکہ کل کو ان کی بھی باری آنے والی ہے اور انہیں بھی بحران بحران کھیل کر عوام کو بے وقوف بنانا ہے۔ نئی حکومت کو آئے دو ماہ ہونے والے ہیں اور پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آنے لگے ہیں۔ عوام کی بہبود کا کوئی ایک کام بھی ہوا ہے نہ ہوتا نظر آ رہا ہے۔ سارا زور ان نکات پر ہے جن سے ہماری معزز۔۔۔محترم اور مقتدر اشرافیہ کے مفادات وابستہ ہیں۔ آیئے مل کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہماری اشرافیہ کو اس انجام سے محفوظ رکھے جو ایران اور بعض دوسرے ملکوں میں ایسے طبقات کا مقدر بنا ہے۔ عید کی پُربہار ساعتوں میں اپنے لیے۔۔۔اپنے ملک کے لیے ضرور دعا کیجیے گا۔۔۔

اس درخواست کے ساتھ اپنی محفل کا رخ کرتے ہیں۔۔۔جہاں ہر قاری کے سوال در جوابوں میں دعاؤں اور دوا کا ذخیرہ ہے۔۔۔

مری سے کبیر عباس عرف شہزادہ کہسار کی گریڈنگ ”ٹائٹل پر حسبِ معمول کُڑی ایک تے بندے دو۔ البتہ کلر اسکیم تھوڑی دکھری تھی اس لیے ٹائٹل تھوڑا اچینج اور اچھا لگا۔ انکل جی! یہ ہمیشہ ہمارے ہمراہ ہمایوں سعید ہی کیوں ہوتے ہیں حالانکہ ہمارے ساتھ کترینہ کیف بڑا جچتی ہے۔ اب دیکھیں نا سائڈ ہیروئن کے طور پر ٹائٹل گرل اور ہیرو، ہیروئن کے طور پر ہم اور کترینہ کیف اگر ٹائٹل پر جلوہ گر ہوں تو خود اندازہ لگا لیں کہ ٹائٹل کو کتنے چاند لگ جائیں گے۔ (اوہ، ہم گرنے والے ہیں۔۔۔تھام لو ذرا) خیر ہمارا کام تھا مشورہ دینا، آگے آپ کی مرضی۔ سعدیہ بخاری! ہم ادھر بہت پیار محبت اور امن و امان سے رہتے ہیں، آپ کو ادھر ویلکم کرتے ہیں۔ ثمینہ حبیب، قہقہے ضرور لگاؤ مگر پلیز پیسٹ کرنے کے بعد ہاہاہا۔ ماہا ایمان! ہم جانتے ہیں آپ ہمارے نقشِ پا پر نہیں چل رہیں کیونکہ ہمارے نقشِ پا تو صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتے ہیں۔ قیصر اقبال، ماہا اکہتر کی پیداوار نہیں۔ اکہتر میں تو ان کا شناختی کارڈ بنا تھا۔ محسن علی میم! کئی دفعہ ہمیں بھی مری کے خوب صورت مناظر اور موسم کی منظر نگاری کا خیال آیا مگر گرمی اور لوڈشیڈنگ سے بلکتے لوگوں کے جذبات کا خیال کر کے خاموش رہے مگر آپ نے ان کے دل جلانے والی حرکت کر ہی ڈالی۔ کاظمی صاحب! آپ کو عظیم ہم مان تو لیں مگر ہمارا معدہ اتنا توانا نہیں اور ابھی تک ہاضمے کی کوئی ایسی دوا بھی ایجاد نہیں ہوئی جو اتنی بڑی بڑ ہضم کرنے کے قابل بنائے۔ باقی تمام لوگوں کو ویلکم اور پرانوں سے دست بستہ اپیل کہ اپنے درشن کرا جاؤ۔ گرداب میں خلافِ توقع چودھری کی ملاقات شہریار سے نہ ہو سکی۔ خیر قسط پسند آئی۔ ہم نے اپنی گریڈ بک کھولی اور اس قسط کے لیے گریڈ ”اے“ کا انتخاب کیا۔ احمد اقبال کی جواری کی ابتدا اچھی تھی۔ قاتل دلہن اور فرید کے ٹکراؤ کو بہت زبردست انداز میں بیان کیا گیا مگر نورین کی کہانی احمد اقبال اپنی بے شمار تحریروں میں بیان کر چکے ہیں سو بورنگ لگی۔ البتہ اینڈ پھر دلچسپی بڑھا گیا۔ اس قسط کے لیے ہم نے اپنی گریڈ بک میں سے گریڈ ”بی“ منتخب کیا۔ احمد اقبال ہی کے قلم کا اعجاز سرورق کا پہلا رنگ گریڈ اے لینے میں کامیاب رہا۔ اس تحریر کا بھی آغاز بہت اچھا تھا۔ دوسرے سین میں پروفیسر اور لڑکوں کے مکالمے بہت جان دار تھے۔ تیسرا سین بھی پسند آیا مگر پھر مائرہ کی کہانی بھی نورین کی کہانی کی طرح احمد اقبال اپنی بے شمار تحریروں کی زینت بنا چکے ہیں۔ تاہم ابتدائی دلچسپی اس کے باوجود آخر تک برقرار رہی۔ کاشف زبیر کی خوف کے تاجر بین الاقوامی سیاست پر مشتمل دل کے تاروں کو چھیڑ کے بلکہ درہم برہم کر کے اے پلس گریڈ ہم سے چھیننے میں کامیاب رہی۔ آصف ملک کی کفارہ پاکستانی معاشرے کی تلخیوں سے لبریز حلق کڑوا کرنے کا سبب بنی۔ قفل پر ابتدا ہی میں شک ہو گیا تھا۔ یہ ناقابلِ فراموش تحریر اے پلس گریڈ کی حق دار ٹھہری۔ سمیرا یعقوب کی کھیل اور کھلاڑی میں مزاح کے علاوہ ہر وہ چیز تھی جو کسی تحریر میں دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ یہ تحریر اے پلس گریڈ میں پاس ہوئی۔ مریم کے خان کی چھوٹا چور چند ہلکے پھلکے جملوں اور تجسس سے بھرپور ہونے کی وجہ سے گریڈ اے پلس لینے میں کامیاب ہو گئی۔ مجموعی طور پر کافی عرصے کے بعد اس ماہ کا شمارہ ہمیں صحیح معنوں میں متاثر کرنے میں کامیاب رہا۔ امید ہے آئندہ بھی مزید بہتری دیکھنے کو ملے گی۔ یہ تھا ہمارا مکمل اور اپنی طرف سے جامع تبصرہ۔ اگر اس میں کسی قسم کی زیادتی ہو گئی ہو تو نشاندہی کر دیجیے گا۔ آئندہ ہم اس زیادتی سے پرہیز کرنے کی کوشش کریں گے۔“

اسلام آباد سے سید شکیل کاظمی کی وضاحتیں ”سات جولائی کو جاسوسی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ سرورق کے پھیکے رنگ بھی دلکش ہی محسوس

ہوئے۔ اپنی بزم کا رخ کیا تو اٹک سے سعدیہ بخاری صدارت کے لیے موزوں امیدوار قرار پائیں۔ گو کہ ان کا ایک چوتھائی تبصرہ مجھ پر ہی تھا۔ سعدیہ بخاری سے معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ میری پڑوسن کون ہے اور کون ہوگی، اس کے جملہ حقوق اور تمام تر اختیارات میرے پاس محفوظ ہیں۔ عبدالوہاب صاحب! شیکسپیئر کا اپنا برا حال ہو گیا ہے، بجلی کی غیر حاضری سے، وہ حل کیا بتائے بے چارہ۔ ثمینہ حبیب! آپ اچھا لکھتی ہو۔ کبیر عباسی! آخر آپ پہنچ ہی گئے محفل میں۔ آپ کے توسط سے مجھے اپنی ایک اور خوبی کا پتا لگ گیا کہ میں بے ضرر سا انسان ہوں، گواہی دینے کا شکریہ۔ ایم اے ہاشمی صاحب! میں ہرگز بے رحم نہیں ہوں، اس کا اندازہ آپ کو جولائی کے چند تبصروں سے ہو جانا چاہیے۔ کم ظرفی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صبا گل! آپ نے میری پڑوسن کو اوٹ پٹانگ کہا؟ محتاط رہیے گا، اب کہیں اگلے ماہ وہ آپ پر تبصرہ نہ لکھ دے۔ ماہا ایمان! آپ نے بھی ملاحظہ کر لیا ہوگا کہ مجھے پڑوسیں دریافت کرنے کا اتنا شوق نہیں جتنا ان کو خود دریافت ہونے کا شوق ہے۔ باقی میں ادارے کی دور اندیشی کا دل سے معترف ہوں۔ وہ میرے تبصرے میں آپ کا ذکر اکثر حذف کر دیتے ہیں۔ (اب خوش ہیں؟) سوچ بچار کے بعد جواری سے آغاز کیا۔ شیکسپیئر کے نام سے کہانی شروع ہوئی، اس لیے کافی دلچسپی بڑھ گئی۔ کہانی کا آغاز تو کافی بہتر ہوا ہے مگر مزید اقساط پڑھنے کے بعد ٹھیک سے پتا لگے گا۔ ڈاکٹر سلیم عادل کی کفن بردوش جاسوسی کے اولین صفحات کی زینت بنی۔ یہ کہانی پڑھ کے مجھے تمام کاؤبوائے طرز کی موویز یاد آ گئیں۔ جوزف بھی تقدیر کا دھنی نکلا۔ یہ ایک بہترین اور مکمل کہانی تھی، ذرا بھی اکتاہٹ نہیں ہوئی۔ سرورق کے رنگوں میں کاشف زبیر ہمیشہ کی طرح ایک خوب صورت کہانی کے ساتھ حاضر ہوئے۔ کاشف زبیر کی کوئی بھی کہانی قاری کو کسی بھی مقام پر خود سے الگ نہیں ہونے دیتی۔ مگر سرورق کا پہلا رنگ اپنا گہرا تاثر چھوڑ گیا۔ احمد اقبال نے معاشرے کے تلخ و شیریں حقائق کو بہت عمدہ طریقے سے قلمبند کیا۔ مختصر کہانیوں میں مریم کے خان کی چھوٹا چور سب سے زیادہ پسند آئی۔ باقی کچھ کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔''

جھنگ سے ڈاکٹر عمران فاروق کی آمد ''جاسوسی 5 جولائی کو موصول ہوا۔ ہمیشہ کی طرح سرورق پر نظر پڑی۔ یہ کیا، نامکمل چہرہ۔ غموں سے چور حسینہ اپنی آنکھوں میں گلیسرین لگا کر میری طرف دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے تو نیچے بنوں والے بھائی اپنا نام بلیک لسٹ میں آنے کی وجہ سے بھاگتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ دوستوں کی محفل میں پہنچا۔ جی ہاں، ایک اور ظلم اور ناانصافی صنفِ نازک کا پہلا خط اور کرسیٔ صدارت۔ بڑے اچنبھے کی بات ہے، خیر مبارک باد قبول ہو۔ بڑی خوشی ہوئی عبدالوہاب کو دوسرے نمبر پر دیکھ کر اور ہمیں ویلکم کرنے پر شکریہ دوست۔ تیسرے نمبر پر آنے والے خط کو پڑھا۔ پڑھتے پڑھتے پہنچے سید شکیل کاظمی کی طرف، 26 ویں بہار دیکھنے پر مبارک باد، ہماری دعا ہے کہ آپ ایسی بہت ساری بہاریں دیکھیں آمین۔ محمد فیضان غنی کو جاسوسی میں ویلکم۔ 21 ویں نمبر پر براجمان ہیں بڑی آپا ماہا ایمان جی جن کے پورے خط میں جلی کٹی باتوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ماہا جی! میں مایوس نہیں ہوں۔ مجھے قوی یقین ہے کہ آپ کی اس جلن میں مزید اضافہ افطاری میں پکوڑے سموسے کھانے سے ضرور ہوا ہوگا۔ تمام دوستوں کے تبصرہ جات بھی اچھے تھے۔ جواری پڑھنا شروع کی پہلے صفحے سے ہی لگا کہ احمد اقبال کی یہ کہانی بہت ہی دم دار ہوگی۔ موصوف جیل سے بھاگے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آج کل ہماری جیلوں سے مجرموں کے بھاگنے کا رجحان زور پکڑ چکا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ چیف جسٹس صاحب دوسروں کی طرح موصوف کے جیل سے بھاگنے کا ازخود نوٹس ضرور لیں گے ہاہاہا۔''

بھکر سے ثمر خان کی پسند ''اس بار کا شمارہ بھی اچھا رہا۔ پہلا رنگ ہشت پا محبت بے شک ایک اچھی تحریر تھی۔ مختصر کہانیوں میں انکشاف بھی اچھی تھی۔ اگر قاتل خود انکشاف نہ کرتا تو یہ باتیں کبھی کسی کو سمجھ نہ آتیں۔ بظاہر عام اور کمزور سا نظر آنے والا آدمی بھی حالات کی وجہ سے قاتل بن گیا۔ حق داروں میں حق داروں کو حق دلانے کی کوشش بھی بھلی تھی۔ سلسلے وار میں گرداب اصل میں گرداب ہی ہے۔ ہر کردار کسی نہ کسی طرح دوسرے کردار سے ملا ہوا ہے۔ اسلم پر مصیبت کا ایک اور دور۔ میرے خیال سے اب وہ موسا دسے ٹکرا جائے گا۔ سلو اور شہریار عادل بھی برے پھنسے۔ بھائی جی نے صرف مطلب کے لیے ہی انہیں بلایا تھا۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ عبدل انہیں کسی موڑ پر دوبارہ ملے گا۔''

فہد علی جنجوعہ، کوٹلی آزاد کشمیر سے لکھتے ہیں ''اس سال کا ماہ جولائی ہمارے لیے دہری خوشیاں لایا۔ ایک خوشی تو 2 جولائی کو ہماری چھبیسویں سالگرہ تھی اور دوسری خوشی آٹھ جولائی کو ہمارے پیپرز مکمل ہونے کی تھی۔ حسبِ معمول ٹائٹل پر نظر دوڑائی۔ بہرحال ٹائٹل کی ہمیں کچھ خاص سمجھ نہ آئی اور وہ ہمارے سر سے یوں گزر گیا جیسے کالج کے دور میں پروفیسر حضرات کا دیا گیا لیکچر ہمارے سر سے گزر جاتا تھا۔ دیدہ زیب فہرست پر نظر دوڑاتے ہوئے پہنچے اپنی موسٹ فیورٹ محفل چینی، نکتہ چینی میں۔ اٹک سے سعدیہ بخاری اپنی پہلی انٹری کے ساتھ ہی صدارت تک پہنچ گئیں جس میں موصوفہ کا کوئی خاص کمال نہیں بلکہ یہ ان کی خوش قسمتی تھی جو انہیں صدارت تک لے گئی۔ بہرحال مبارک باد قبول کیجیے۔ تمام دوستوں کے خطوط پڑھے۔ میں بھی محفل کے تمام دوستوں کی طرح للکار کی آخری قسط کے سحر سے ابھی تک نہیں نکل سکا۔ کاشف علی میراں، آپ کے بیٹے کی وفات کا پڑھ کر دکھ ہوا۔ ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور صالح اولادِ نرینہ عطا فرمائے۔ شکیل حسین کاظمی صاحب! آپ کو آپ کا جنم دن مبارک ہو۔ اس مرتبہ ابتدا جواری سے کی۔ جو کہ ابتدائی قسط میں کچھ خاص متاثر نہ کر پائی۔ گرداب میں ماہ بانو ایک مرتبہ پھر منظر سے غائب ہے۔ میرا خیال ہے کہ کہانی کو بلاوجہ طول دیا جا رہا ہے۔ بات ہو جائے اس ماہ کے رنگوں کی۔ سب سے پہلے احمد اقبال کی ہشت پا محبت پڑھی۔ موضوع وہی پرانا اور گھسا پٹا تھا لیکن اندازِ تحریر دلچسپ تھا۔ مائرہ نے وہ سب حاصل کر لیا جس کی وہ آرزومند تھی لیکن اس کا طریقہ کار غلط تھا۔ دوسرا رنگ خوف کے تاجر کاشف زبیر کی ایک خوب صورت تحریر تھی۔ کہانی کا موضوع بین الاقوامی سیاست تھا۔ عرصہ دراز سے مشرق و مغرب کے درمیان مذہب اور نسلی تعصب کی دیواریں کھڑی کی جا چکی ہیں۔ کاشف زبیر صاحب اس موضوع کو خوب صورت انداز میں احاطۂ تحریر میں لائے۔ بات اگر ہو مختصر کہانیوں کی تو مریم کے خان کی چھوٹا چور بازی لے گئی۔ ابتدائی صفحات پر کفن بردوش یقیناً کسی انگریزی ناول کا ترجمہ تھا جو ہمیں کچھ خاص متاثر نہ کر سکا۔''

لاہور سے سائرہ علی خان کی مختصر نویسی ''جاسوسی اس ماہ بہت ترستے کے بعد کافی تاخیر سے ملا۔ ٹائٹل کا پوسٹ مارٹم باقی ساتھیوں کے حوالے کر دیتی ہوں، وہ یہ کام بخوبی انجام دے لیں گے۔ چینی نکتہ چینی میں اس مرتبہ زویا اعجاز، عبدالمنان، احتشام احسان اور ہمایوں سعید کی کمی کافی محسوس ہوئی۔ للکار کی عدم موجودگی کے باعث کہانیوں کا آغاز کفن بردوش سے کیا۔ امریکی حالات سے خوب آگاہی ہوئی۔ جواری سے کافی توقعات وابستہ ہیں۔ ابتدا تو ٹھیک ٹھاک کی ہی تو قع ہے کہ آگے چل کر مزید نکھار آئے گا۔ گرداب کی یہ قسط مجھے تو بہت پسند آئی۔ حالات نئی کروٹ لینے والے ہیں۔ ہشت پا محبت اتنی خاص نہیں تھی۔ خوف کے تاجر پسندیدگی کے معیار پر پوری اتری۔ مختصر کہانیوں میں یارانِ رفتگاں ٹاپ پر رہی۔''

لاہور سے زویا اعجاز کی مبارک باد ''ماہ جولائی کے جاسوسی نے بے انتہا صبر اور ایک طویل انتظار کے بعد سات جولائی کو شرفِ دیدار بخشا۔ ٹائٹل بس ایوریج تھا۔ چینی نکتہ چینی میں قدم رنجہ ہوئے تو سعدیہ بخاری کو مسندِ محفل پر براجمان دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ویلڈن سعدیہ جی۔ پہلی ہی بال پر سکسر۔ دیگر ممبران للکار کے اختتام پر ملول اور عمران وانش کی ناقابلِ فراموش موت پر پرسہ دیتے نظر آئے۔ ماہا ایمان اور کاظمی صاحب کا تبصرہ بے حد شاندار تھا۔ کاشف صاحب اولاد کی آزمائش بہت جان لیوا ہوتی ہے۔ پروردگار آپ کو صبر عطا فرمائے۔ کہانیوں کا آغاز خلافِ معمول گرداب سے کیا۔ تمام قارئین کے اندازوں کے برعکس ماہ بانو اس بار حقیقی مشکل سے دوچار ہو چکی ہے۔ شہریار کے لیے نئے ہنگامے منتظر ہیں۔ آثار بتاتے ہیں کہ اشوک کے ساتھ چودھری کے جہنم واصل ہونے کا وقت قریب تر ہے۔ اسلم کا جنون آئرلینڈ میں کافی ہلچل مچانے والا ہے۔ بہت سنسنی خیز قسط رہی۔ سرورق کا پہلا رنگ بالکل پھیکا لگا۔ محبت کا رشتہ کاروباری بنیادوں پر قائم کرنے والی ایک تو خیز حسینہ اور گوڈے گوڈے اس کے عشق میں غرق ایک امیر کبیر وڈیرا۔ یہ پلاٹ بہت فرسودہ ہو چلا ہے۔ اختتام بھی کافی عجلت میں کیا گیا۔ کاشف زبیر نے دوسرا رنگ زبردست لکھا۔ مغربی سیاست اور بین الاقوامی ریشہ دوانیوں کو آشکار کرتی یہ تحریر کافی عرصہ یاد رہے گی۔ جواری کے متعلق ابھی رائے محفوظ ہے۔ چند اقساط کا مزید مطالعہ کرنے سے ہی اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جاسکے گی۔ کفن بردوش بھی پسند آئی۔ مجموعی طور پر جولائی کا شمارہ عمدہ رہا۔ آخر میں سب ہم وطنوں کو ایڈوانس عید مبارک۔''

کلول، بھکر سے قیصر اقبال کچہ کے جوابات ''جولائی کا جاسوسی 8 تاریخ کو خریدا۔ سرورق پر اظہارِ خیال کبیر عباسی کے ذمے لگاتے ہوئے ہم سیدھا داخل ہوئے اپنی محفل میں۔ ایس بی صاحب! مجھے آپ کے کرسیٔ صدارت پر براجمان ہونے کی اتنی خوشی نہیں ہوئی، جتنا صدارت چھن جانے کا دکھ ہوا۔ کیونکہ جس وقت آپ کی نظریں ان لائنوں کا طواف کر رہی ہوں گی، کرسیٔ صدارت پر کوئی اور بیٹھا ہوگا۔ کبیر عباسی بھیا! آپ نے سید بادشاہ کو بے ضرر کہہ کر ماہی کو دانہ تو ڈال دیا ہے۔ دعا ہے کہ وہ دانہ چگ بھی لے۔ اپنے سید بادشاہ! آپ کی پڑوسن یہ تو ضرور کہتی ہوگی۔

دل کے معاملات سے انجان تو نہ تھا

اس گھر کا فرد تھا کوئی مہمان تو نہ تھا

کاشف بھیا! مایوسی گناہ ہے۔ وہ مالکِ کائنات اس سے بہترنعم البدل سے نوازے گا۔ اشرفی صاحب! لگتا ہے سالہا سال کی عرق ریزی کے بعد حسن کے بارے میں آپ کے زریں خیالات منظرِ عام پر آئے ہیں۔ صبا گل صاحبہ! ماہا نے آپ سے کچھ کہا تھا، آپ نے اس کا جواب نہیں دیا۔ کہیں پارٹی میں ردوبدل تو نہیں ہو گیا ہے؟ سوہنی خان! شاید تازہ ترین خبریں پہنچانے کی ذمے داری آپ کے نازک کندھوں پر ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی، جہاں ایک طرف شہریار عادل اور سلو انڈیا میں اپنی دھاک بٹھا رہے ہیں تو دوسری طرف ماہ بانو اور اسلم ہنوز مشکلات کا شکار ہیں۔ احمد اقبال کی جواری کی پہلی قسط میں ابھی کردار و واقعات کا تانا بانا بُنا جا رہا ہے۔ امید ہے کہانی آگے چل کر اپنا رنگ دکھائے گی۔ ابتدائی صفحات سلیم عادل کی کفن بردوش جاسوسی کے شایانِ شان تو نہیں تھی (کیوں جناب؟) پھر بھی گزارہ کر گئی۔ احمد اقبال کا پہلا رنگ ہشت پا محبت میں موجودہ معاشرتی ناہمواریوں کی عکاسی کی گئی اور مائرہ نے جو کچھ بھی کیا پھر بھی اپنے بہن بھائیوں اور خاندان سے محبت نبھاتی رہی۔ کاشف زبیر کا دوسرا رنگ خوف کے تاجر مغربی طاقتوں کا مسلمانوں کے ساتھ ازلی دشمنی کا منہ بولتا ثبوت۔ جہاں عمر حسن نے کہانی میں جان ڈالی، وہیں بارنی نے بھی خوب کفارہ ادا کیا۔ مریم کے خان کے چھوٹے چور نے لمبا ہاتھ مارا، پھر بھی ہر خطرے سے محفوظ رہا۔ سیراطارق کی کھیل اور کھلاڑی میں بہت سے شکار کرنے والا کھلاڑی اپنے آخری شکار کو شکار کرتے ہوئے جہنم واصل ہوا۔''

فوجی علی ڈنو جعفری دریا خان مری ولی محمد مری سے لکھتے ہیں ''کھاریاں کینٹ کے بک اسٹال پر 10 چکر لگائے، جاسوسی نہ ملا پھر کھاریاں بازار سے لے کر آیا 7 جولائی کو اور پڑھنا شروع کیا۔ شروعات اسما قادری کی گرداب سے کی۔ اس بار گرداب ماہ بانو کے گرد گھومتی رہی اور لگتا ہے ماہ بانو ایک بار پھر گرداب میں آگئی ہے عادل اور سلو کی بھائی سے ملاقات کیا رنگ لاتی ہے۔۔۔ احمد اقبال صاحب کی جواری پہلی قسط پھرتی رہی بھوت بنگلے میں۔ اس سے پہلے سندھ کی کہانی تھی کونجاں والی اب یہ ہے دیکھتے ہیں فرید کتنے پانی میں ہے۔ نادر شاہ کی فرید سے دشمنی واضح نہیں ہوئی۔ کفن بردوش میں جوزف کو دو دو بیویاں مل گئیں، واہ قسمت ہو تو ایسی۔ عامل گزیدہ استاد کی استادی تو ہم جانتے ہیں۔ سرورق کی پہلی کہانی ہشت پا محبت مائرہ کو بنگلا اور کار مل گئی، بہت ہے۔ خوف کے تاجر میں عمر کا کردار بہت ہی اچھا رہا۔ کاشف زبیر صاحب (کسی چھا گئے) چھوٹی کہانیوں میں آصف ملک صاحب کی کفارہ نے میدان مار لیا۔ حق دار، یارانِ رفتگاں، زر زبر برز بردست بھائی کیا بات ہے۔''

لاہور سے محمد اشفاق قریشی کے اعتراض ''جولائی کا جاسوسی نظر نواز ہوا۔ ہر شمارے کا ٹائٹل دیکھ کر لگتا ہے کہ ذاکر صاحب غالب کے اس مصرع سے بہت متاثر ہیں... سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں... چنانچہ وہ تخیل کے چمن سے ایک پھول لاتے ہیں اور جاسوسی کے ماتھے پر سجا دیتے ہیں۔ اس بار قیصر اقبال کچہ کا تبصرہ بھرپور تھا، پڑھ کر لطف آیا۔ شکیل کاظمی ذرا خیال رہے۔ شیشۂ دل اتنا نہ اچھالو۔ چھبیس سالہ ہونے کی بات کسے بتانا چاہتے ہو؟ ماہا ایمان! تم نے جو میزبانی کی بات کی تھی، اس سے دل شاد ہوا تھا۔ جب پیا گھر سدھاروگی تو یاد کرنا۔ دعا دوں گا اور تحفہ بھی۔ ایک بات کہتا ہوں، اس محفل میں بھائیوں کی بہت چٹکیاں لے لیں۔ مقبولیت کی حدوں کو چھو لیا۔ اب اس سطح سے اوپر اٹھو۔ تم میں ارادے کی پختگی بھی ہے اور امنگ بھی۔

لازم ہے کہ تحقیق کے میدان میں قدم رکھو۔ ہمایوں سعید! دیکھو روٹھا نہ کرو۔ بات ہنس کے کیا کرو۔ تم میں خود اعتمادی تو بہت ہے۔ انداز بیاں بھی نرالا ہے۔ محفل میں اپنی حیثیت منوا چکے ہو۔ اپنے تخیل کی پرواز کو مزید بلند کرو اور کہانی نویسی میں طبع آزمائی کرو۔ محی الدین اشفاق ہر انسان کو ایسا المناک دن دیکھنا پڑتا ہے اور یہ دکھ سہنا پڑتا ہے۔ اس حقیقت سے مفر نہیں۔ اللہ تمہارے لیے آسانیاں پیدا کرے۔ کیو ایم اے کے امتحان کیسے رہے۔ ہر کہانی کا انجام ہوتا ہے۔ للکار کا بھی ہوا۔ اپنے مزاج کے لحاظ سے یہ ایک طرفہ کہانی تھی۔ اس میں مغل صاحب نے بے شمار جہتیں دکھائیں۔ نئی سلسلے وار کہانی جواری نئی طرز کی لگتی ہے۔ اقبال صاحب تخیل کی تکرار بہت کرتے ہیں۔ ترجمہ شدہ کہانیوں میں کفن بردوش اور چھوٹا چور خوب تر رہیں۔ البتہ شریک جرم میں دلچسپی کا کوئی پہلو نہ تھا۔ کتر نیں اوسط درجے کی رہیں اور تجلی پلاننگ والی کترن تو شامل کرنے کے قابل نہ تھی۔'' (ہم کوشش کرتے ہیں کہ زیادہ تر کوشش قارئین کی ارسال کردہ لگائیں... نہیں لگاتے تو بھی آپ کو شکایت ہوتی ہے)

نامعلوم مقام سے بے نام دوشیزہ کا پہلا خط'' جاسوسی میں خط لکھنے کی جسارت پہلی دفعہ اس امید کے ساتھ کر رہی ہوں کہ خوش آمدید کہا جائے گا۔ (خوش آمدید) جاسوسی کے درشن اس دفعہ 7 تاریخ کو ہوئے۔ سرورق کی حسینہ سوئی جاگی کیفیت میں نظر آئی۔ شاید لوڈشیڈنگ کی وجہ سے بے چاری کی نیند پوری نہ ہوسکی یا پھر عمران کے غم میں نڈھال تھی۔ نیچے موجود ہمایوں سعید دم دبا کر بھاگتے نظر آئے۔ صنفِ نازک سے پنگا لینے کا یہی انجام ہوتا ہے، پیچھے موجود انکل برادر یقیناً عمیر شہزاد ڈنکش تھے جو بلیک لسٹ میں موجود ہونے پر ٹینشن میں تھے۔ اس کے بعد انٹری دی محفلِ یاراں میں جہاں سعدیہ بخاری ٹاپ پر نظر آئیں۔ مبارک باد۔ کاشف علی میراں! اللہ تعالیٰ آپ کو صبر عطا فرمائے اور صحت مند و صالح اولاد سے نوازے۔ محسن علی موم خاصا تجربہ معلوم ہوتا ہے آپ کو سر پر ہاتھ رکھ کے رونے کا شاید آنسوؤں کے پگھلنے سے آپ موم ہو گئے۔ موم تو ٹھیک ہے لیکن اب موم بتی نہ بن جانا۔ شکیل کاظمی! آپ کی عظمت کے تو جاسوسی قارئین گواہ ہیں۔ تفسیر عباس کا نام بلیک لسٹ میں دیکھ کر افسوس ہوا مگر ہمایوں سعید کا نام دیکھ کر تھوڑی تسلی ہوئی۔ رمضان کی آمد سے پہلے ہی شیاطین قید کر دیے گئے ہیں۔ کہانیوں میں چھوٹا چور، انکشاف اور کفارہ پسند آئیں۔ امید ہے محفل میں ضرور جگہ دی جائے گی۔'' (اب آپ کا خط کس نام سے چھاپیں... نام و پتا لکھنا بھول گئی ہیں کیا)

اعجاز احمد راحیل کی ساہیوال سے عنایت ''عذابِ انتظار کے مشکل مرحلوں کے بعد ماہ جولائی کا شاہکار کافی لیٹ ملا۔ یارو! جاسوسی کیا ملا کوئی تشنگی باقی نہ رہی۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں دلِ ناداں میں اک بے نام سی کسک باقی ہے۔ اشتہارات کو مختصر سا وقت دیتے ہوئے آپ کے اداریے سے مستفید ہو کر اپنی محفل میں ان ہوئے۔ نہایت ہی ادب و احترام سے ہم سعدیہ بخاری صاحبہ کو کرسی صدارت کی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ سعدیہ جی! کیا آپ نے یہ تبصرہ خود لکھا ہے یا کسی سے لکھوایا ہے؟ ہمایوں صاحب! پہلے ستاروں پر کمند تو ڈال لیجیے اس سے آگے جہاں کی بعد میں سوچیے... کوئٹہ سے ثمینہ حبیب کی باتیں بے مزہ کر گئیں۔ میانوالی سے احسان سحر اللہ آپ کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے آمین۔ محترم بھائی کبیر عباسی کا سر ہلا دینے والا تبصرہ مزہ دے گیا۔ کبیر بھیا! آپ ماہا جی کو ان کے حال پر ہی چھوڑ دیں تو اچھا رہے گا۔ بہت ہی قابلِ احترام سید شکیل کاظمی صاحب ہم آپ جیسی عظیم ہستی اور آپ کی پڑوسن کو سلام کہتے ہیں۔ ایبٹ آباد سے محمد فیضان غنی دل اتنا او کھانہ کرو یار، امید ہے عنقریب مغل صاحب کو ہم انہی صفحات پر دوبارہ بھی دیکھیں گے۔ صبا گل کا تبصرہ بہت ہی اچھا لگا۔ پلیز آپ ٹینشن نہ لیا کریں۔ ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ حافظ آباد سے ماہا ایمان صاحبہ! دریا کو کوزے میں بند کرنا اہلِ عقل لوگوں کا کام ہے اور آپ تو...؟ ابتدائی صفحات پر موجود دولت کے پجاریوں، محبت و نفرت کے درمیان گردش کرتی اسٹوری کفن بردوش اپنے منفرد اور دلکش موضوع محبت کی وجہ سے دل کے تاروں کو چھونے میں کامیاب رہی۔ جوزف کا کردار عمدہ لگا۔ گرداب بھی اس دفعہ کافی تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب رہی۔ احمد اقبال کی نیو اسٹوری جواری اچھی لگی۔ ہمارے جدید معاشرے کی بہترین عکاسی کرتی احمد اقبال کی اسٹوری ہشت پا محبت اپنا تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ ہمارے معاشرے کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم عزت و ناموس کی پروا نہ کرتے ہوئے بلندی کی طرف گامزن ہونے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں... جو کہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے اور ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ انسان اور انسانیت کے پہلوؤں کو اجاگر کرتی خوف کے تاجر منفرد اسٹوری ثابت ہوئی۔ بلاشبہ جیت ہمیشہ خیر کی ہوتی ہے۔ دلچسپ واقعات پر مبنی سنسنی خیز داستان چھوٹا چور زبردست لگی۔ اپنے آپ کو عقل کل اور کھلاڑی نمبرون سمجھنے والے کھلاڑی کی کھیل اور کھلاڑی پل پل رنگ بدلتی تحریر بے مثل ثابت ہوئی۔ یقیناً کھیل کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ قارئین جاسوسی اور ادارہ جاسوسی والوں کو میرے دوستوں ماسٹر یٰسین، ماسٹر محمد عباس، سید تقی شاہ، اداس زلفی کی طرف سے سلام۔'' (اب تو آپ خوش ہیں؟)

اوکاڑہ سے تفسیر عباس کے دل کے تار'' نظر سے دل کا غبار اترا تو ہم نے دیکھا کہ ماہ جولائی کا ماہِ تاباں نہایت شاہانہ کروفر سے بک اسٹال میں ایک رسی پر الٹا لٹک رہا ہے۔ زمانے کی اس بے ثباتی و کج روی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے دیدہ زیب و دلکش سرورق کا بغور معائنہ کیا۔ اشتہارات کی سرحد عبور کرنے کے بعد چینی نکتہ چینی میں پہنچے... اب کی بار گھمسان کا رن ہے۔ شاملِ اشاعت نہ ہونے والوں کی مایوس و افسردہ قطار میں خود کو بھی دیکھا۔ ایک پل میں جذبات، احساسات، نظریات اور افکار و خیالات کے قیمتی اثاثے منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ (دل پر مت لیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کبھی کبھی۔ ہر حادثے کا سواد ہی الگ ہے) مسندِ صدارت پر اٹک سے سعدیہ بخاری کی پہلی کوشش اور کاوش کامیاب ہونے پر تہِ دل سے مبارک باد لیکن سموسہ اور فلسفۂ حیات دو مختلف چیزیں ہیں۔ کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور... کوئٹہ سے ثمینہ حبیب کا مفصل و مربوط اور جاندار تبصرہ بصد شوق ملاحظہ کیا۔ میانوالی سے احسان سحر کی چٹنی چٹپٹی باتیں... اور محتاط رہنا چاہیے کچھ پڑوسی گوبھی کے پھول بھی ہوتے ہیں۔ مری سے کبیر عباسی! آپ نے تبصرہ یقیناً بیوٹی پارلر میں بیٹھ کر لکھا۔ اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی! ہم تو اس خیال سے فکرمند ہوئے بیٹھے ہیں کہ آپ کی شادی خانہ آبادی کے بعد آپ کی پڑوسن کا اور آپ کا کیا ہوگا۔ ہماری مانیں تو پڑوسن سے ہی... بالاکوٹ کے محسن علی موم! جمیل سیف الملوک اور جاسوسی جیسا طرح دار محبوب آپ کو تو خدا بھی مل رہا ہے اور وصالِ صنم بھی۔ حافظ آباد سے ماہا ایمان کی لیپاپوتی اور اداسی... عمر کے اس نازک حساس اور آخری مرحلے میں اداسی اور مایوسی کا غلبہ ہونا فطری بات

ہے۔ کنول بھگر سے قیصر اقبال کا قوم یاجوج ماجوج پر پہلا زبردست حملہ... بھئی چڑیلوں کے خوفناک محلے میں... ذرا احتیاط سے رہیں۔ دو ماہ کے عرصۂ مختصر میں ہمارے والدین کی یکے بعد دیگرے المناک اموات کے بعد جب تیسرے ماہ ہمارا اپنا بھی چل بسا تو وہ وقت کتنا صبر آزما اور دل خراش تھا، آپ اندازہ کر سکتے ہیں لیکن وقت سے بڑا مسیحا اور مرہم کوئی نہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پر تبصرہ جو کہ اپنے بہترین و پُراثر انجام سے دوچار ہو کر اذہان و قلوب پر گہرے اثرات مرتب کر گئی۔ احمد اقبال کی جواری یقیناً للکار کے خلا کو پُر کر سکتی ہے۔ پہلی قسط مضبوط گرفت سحر انگیز منظر نگاری اور بہترین و پُراثر عنوان۔ ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر سلیم عادل کی پُراثر سنسنی خیز و ہیجان انگیز تحریر و تخلیق... آغاز تا اختتام سسپنس جاسوسی اور تجسس سے بھرپور سرگزشت... سرورق کا پہلا رنگ ایک دفعہ پھر محبوب مصنف سے شرفِ ملاقات۔ گویا ایک ٹکٹ دو نظارے۔ ہشت پا محبت، محبت کی آڑ میں خواہشات و مقاصد کی مکروہ تجارت اغراض و مفادات کے بازار میں ناموس و اخلاقی اقدار کی پامالی و نیلامی... مائرہ نے شارٹ کٹ راستہ اختیار کیا اور ٹوٹی کہاں کمند لیکن بقول شاعرِ مشرق کہ اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی... جس سے رشتوں محبتوں اور عقیدتوں کی تذلیل ہو۔ دوسرا رنگ اسلام دشمن عناصر کی سازشوں، منافقتوں اور ریاکاریوں کا ماجرائے عبرت۔ کاشی بھیا کی پُراثر و شاندار اور جاندار تحریر۔ پسندیدہ مصنفہ مریم کے خان کی نہایت دلچسپ تحریر چھوٹا چور۔ چور کو پڑ گئے مور کی عملی تصویر۔ میر ایعقوب کی نہایت اثر انگیز تحریر۔ کھیل اور کھلاڑی ایک پُراثر و پُرتجسس موضوع۔ لاش کا پیغام دلچسپ مگر مختصر ترین اور بہترین۔''

راجن پور سے ماہتاب عمیر رانا کی کٹھنائیاں'' چند ماہ کی غیر حاضری کے بعد پھر حاضرِ خدمت ہوں۔ میری غیر حاضری کی وجہ یہ ہے کہ جہاں میری شادی ہوئی ہے وہ ایک چھوٹا سا دیہات ہے، کوٹلہ شیر محمد۔ یہاں بنیادی سہولیاتِ زندگی بھی میسر نہیں۔ یہاں اسکول مڈل تک ہے۔ لڑکوں کا بھی اور لڑکیوں کا بھی ہے۔ یہاں اسپتال نہیں ہے اور تو اور یہاں کوئی کوالیفائڈ ڈاکٹر بھی نہیں ہے۔ یہاں سب سے بڑا مسئلہ میرے لیے یہ کہ یہاں پوسٹ آفس بھی نہیں ہے اور کوئی بک شاپ بھی نہیں۔ یہاں ڈائجسٹ وغیرہ بھی نہیں ملتے۔ اب آپ خود سوچیں کہ خط لکھ کر ابتدائی تاریخوں میں پوسٹ کرانا کہ وقت پر پہنچ کر شاملِ اشاعت ہو جائے کتنا مشکل ہے۔ اول تو ڈائجسٹ منگوانا سب سے بڑا مسئلہ پھر اوپر سے یہ کہ آگہی نہ ہونے کے باعث یہاں ڈائجسٹ پڑھنا گناہِ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔ اوپر سے پھر میرے ''وہ'' چھٹیوں میں گھر آتے ہیں۔ وہ ہوں تو ڈائجسٹ لانے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اگر وہ نہ ہوں تو پھر مسئلہ ہوتا ہے۔ انکل جی! اس مرتبہ بھی میں بغیر ڈائجسٹ پڑھے خط لکھ رہی ہوں کیونکہ میں نے یہ پوچھنا ہے کہ اگر کوئی بک شاپ وغیرہ نہ ہو تو کیا پھر ڈائجسٹ لگوایا جا سکتا ہے کہ گھر بیٹھے مل جائے؟ (اس سلسلے میں ادارے کے اشتہارات آپ کو پرچے میں ملیں گے جن سے آپ مستفید ہو سکتی ہیں) اگر ہاں تو اس کا کیا طریقہ کار ہے؟ پلیز انکل جی! میرا خط لازمی شاملِ اشاعت کیجیے گا۔ اگرچہ میں نے ڈائجسٹ پڑھے بغیر لکھا ہے پھر بھی۔ اور ہاں، للکار میں ہیرو بھائی کی موت کا بہت افسوس ہوا تھا۔ خیر طاہر انکل نے اینڈ بہت اچھا کیا، بہت زبردست۔ انکل جی! اب سلسلے وار کہانی کاشف زبیر صاحب سے لکھوائیں پلیز۔''

پشاور سے ساحل امان کا تعارفی خط'' جب سے للکار شروع ہوئی، میں جاسوسی تب سے پڑھ رہا ہوں۔ آج پہلی دفعہ خط لکھ رہا ہوں۔ میرا نام ساحل امان خٹک ہے۔ میں پشاور کے ایک گاؤں شاہ کوٹ بالا میں رہتا ہوں۔ مجھے جاسوسی نے دیوانہ بنایا ہے۔ جب جاسوسی لیٹ ہوتا ہے تو بے چین ہو جاتا ہوں جیسے میری کوئی چیز گم ہو گئی ہے۔ اسما قادری کی گرداب بھی بہت زبردست ہے۔ للکار کا اختتام بہت برا ہوا ہے۔ طاہر جاوید مغل بہت اچھا لکھتے ہیں۔ آخر میں پاک آرمی کو سلام۔''

منشی رانا حماد فرہاد قیدی سزائے موت سینٹرل جیل ساہیوال سے دوستوں سے مخاطب ہیں'' شمارہ جون کی 3 تاریخ کو رات 9 بجے موصول ہوا۔ عین اس وقت جبکہ بجلی کو گئے دو گھنٹے بیت چکے تھے اور شدید گرمی کی وجہ سے جان بے چاری نکلتے نکلتے لبوں تک پہنچ آئی تھی۔ ٹائٹل پر نگاہ پڑی تو ایک نیم حسین لڑکی کو مدہوش پڑے پایا۔ ذہن پر زور دیا، معلوم کرنے کی کوشش کی۔ آخر کون سی وجہ ہے جو یہ لڑکی ادھ موئی ہو چکی ہے۔ شاید ہماری طرح گرمی کی وجہ سے مگر یہ بات صادق محسوس نہ ہوئی پھر... شاید اس گولی کے خوف سے جو اسے چھوئے بغیر گزر کر کسی دیوار کو چوم رہی تھی۔ ٹائٹل میں ایک بات تحقیق طلب محسوس ہوئی۔ وہ یہ کہ حسینہ شاید مرنے کے قریب تھی مگر ہونٹ پھر بھی سرخی سے مالا مال تھے۔ (ہاں تو مرنا بھی شاہانہ انداز میں چاہیے) لاہور سے زویا اعجاز! کیا آپ نے نفسیات میں ڈگری لے رکھی ہے جو آپ کو سازشوں کی خوشبو آنے لگی؟ شکیل کاظمی صاحب! ابھی تو اپریل ایک سال بھی نہیں ہوا کرسی سے محروم ہوئے، آپ نے پھر سے لیک جھپک شروع کر دی؟ بھائی میرے، خدا کا شکر کرو اپنی پڑوسن کے مشوروں پر عمل نہیں کر رہے ورنہ اب تک آپ یہ خط کسی جیل سے لکھ رہے ہوتے۔ خدا کا خوف کریں بھائی۔ ادریس صاحب! زبردست۔ سوئی خان! میری بہن دوسروں نے کون سا باقاعدہ ڈاکٹری کی ڈگری لی ہوئی ہے یا اس رسالے میں صرف سرجن ہی خط لکھتے ہیں؟ ماہا ایمان باجی! یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم آپ کے فین ہیں مگر کیا آپ کچھ کچھ مغروریت نہیں محسوس کر رہیں؟ محی الدین اشفاق صاحب! آپ کے والد صاحب کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ دے۔ حافظ شاہد عمران محبت دینے کا شکریہ، اللہ آپ کو بھی اور سب قیدیوں کو جیل جیسی دوزخ سے رہائی نصیب فرمائے۔ واہ جی واہ، اب کی بار تو بلیک لسٹ بھی بڑے بڑے ناموں سے جگمگا رہی تھی۔ اعجاز راحیل آپ ساہیوال میں کس جگہ سے ہیں۔ دلنشین صاحبہ پتا نہیں کہاں کی سیر پر گئی ہوئی ہیں۔ کہانیوں پر تبصرہ کرنے کو بالکل بھی دل نہیں کر رہا، دل کچھ بوجھل بوجھل سا ہے۔ میری موسٹ فیورٹ کہانی کی آپ نے سانس ہی کھینچ لی!!''

چکوال سے محمد عزیر کی مشتاق'' ٹائٹل اچھا تھا۔ سعدیہ بخاری، صدارت مبارک ہو۔ سوائے فہد کے باقی دوستوں کے تبصرے پسند آئے۔ میرا صدیق کو لازماً چانس ملنا چاہیے۔ نئے دوستوں کو خوش آمدید۔ ماہا ایمان، زبیدہ آپا بنی ہوئی تھیں جو خود آزمودہ ٹوٹکے دوستوں کو پیش کر رہی تھیں۔ احسان سحر جی باقی مستقلین تو واپس آ سکتے ہیں مگر مرحوم اقبال کاظمی کی واپسی؟ جواری، احمد اقبال کی تحریر، قسط آخر میں کافی دلچسپ ہو گئی تھی، اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر صاحب کا خوف کے تاجر پسند آیا۔ گرداب کے بارے میں یہ کہوں گا کہ اسما قادری ایک اچھی رائٹر ہیں۔ اور ہاں انکل جی، بھی

گئی تصویر کے بارے میں آپ کے کمنٹس کا انتظار رہے گا۔'' (آپ کی ڈرائنگ اچھی ہے، کوشش کریں تو اس فیلڈ میں جاسکتے ہیں)

شاہدرہ لاہور سے عبدالوہاب کی پسندیدگی ''جولائی کا شمارہ چار چکر لگانے کے بعد بالآخر 6 تاریخ کو مل گیا۔ سرورق میں ایک حسینہ اور دو اس کے رقیب روسیاہ ہمیشہ کی طرح ایک دوسرے کی جان کے درپے تھے۔ سرورق اس مرتبہ مختلف انداز میں تھا، پسند آیا۔ دوستوں کی محفل میں سعدیہ بخاری پہلی فلائٹ سے آئیں اور چھاگئیں مبارک ہو۔ تبصرہ اچھا تھا، پسند آیا۔ سید شکیل حسین! آپ نے کون سا کارنامہ انجام دیا ہے جو عظیم انسان ٹھہرے، سالگرہ مبارک۔ کاشف علی میراں! آپ کے بیٹے کا افسوس ہوا، رب کریم آپ کو اور آپ کے لواحقین کو صبر عطا فرمائے، آپ کے بیٹے کو آپ کے لیے ذریعہ مغفرت بنائے آمین۔ آپ نے بیٹے کی وفات کی وضاحت نہیں کی؟ صبا گل صاحبہ! آپ کا تبصرہ پڑھا، آپ کے سر درد کے لیے دعا کی ہے۔ خالق کریم آپ کو شفا عطا فرمائے۔ سمیرا صدیق صاحبہ نے درخواست کی ہے، میری رائے ہے کہ انہیں ایک موقع دیا جائے۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ابتدا جواری سے کی۔ جان کی بازی لگا کر جوا کھیلنے والے جواری کی مشکلات میں اضافہ ہوگیا، اچھی کہانی ہے۔ کفن بردوش، جرم اور محبت سے گندھی ڈاکٹر سلیم عادل کی پُراثر کاوش تھی، مزہ آگیا۔ کھیل اور کھلاڑی انسانی جان وخون سے کھیلنے والے جنونی کی چالبازیاں لیکن آخرکار ناکام ہوئی اور وہ اپنے انجام کو پہنچا۔ گرداب اس مرتبہ فل ایکشن میں تھی۔ ماہ بانو کا غیاب ابھی برقرار ہے۔ چھوٹا چور میں چھوٹا چور بڑے چوروں کے جال میں پھنس گیا۔ دلچسپ تحریر تھی۔ رنگوں میں پہلا رنگ معاشرے کی بگڑتی صورت حال کی عکاسی کرتی عبرت ناک کہانی تھی۔ دوسرا رنگ خوف کے تاجر جنگ اور دہشت گردی کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کرتی پُراثر تحریر تھی۔''

مہر اختر عباس تھراج کی کبیر والا سے رائے ''اس دفعہ خلاف توقع رسالہ بہت لیٹ ملا۔ یعنی سات جولائی کو۔ ملک کے اس جلتے کڑے حالات اور بڑے نازک دور میں جاسوسی دل کی تسکین ثابت ہوا۔ حالانکہ تفریح کے اور بھی بہت ذرائع ہیں مگر جاسوسی کی شان ہی کچھ اور ہے۔ فوراً محفل میں چھلانگ لگائی لیکن اس سے پہلے ٹائٹل کی تعریف نہ کرنا ذاکر انکل سے زیادتی ہوگی۔ صنفِ نازک کو اتنا پیارا دیکھ کر گویا دل ٹھہر سا گیا۔ اس کے ساتھ صنفِ وجاہت دوڑتا ہوا نظر آیا کیونکہ اس کے بیک پر ایک صنفِ کرخت گولی کا نشانہ لے رہا تھا۔ وجہ صرف صنفِ نازک ہوگی۔ محفل میں اس دفعہ بہت سارے جگمگاتے ستارے ایسے نظر آئے جو کہ پہلی دفعہ خط لکھ رہے تھے۔ صدارت کی کرسی اس دفعہ سعدیہ بخاری نے حاصل کی۔ سعدیہ جی پہلی دفعہ جاسوسی میں آئیں اور چھاگئیں شاہ کر کے۔ عبدالوہاب مایا کو محفل میں بندہ بندہ جانتا ہے آپ کو میں بتادیتا ہوں۔ وہ کئی ناموں سے محفل کی شان بڑھا چکی ہیں مگر انہوں نے ماننا نہیں ہے۔ (آپ بھی اسی فہرست سے تعلق رکھتے ہیں؟) احسان سحر! لگتا ہے آپ بھی ہماری طرح کرکٹ کے مریض لگتے ہیں۔ ہم سے میچ کھیلنا ہے کیا؟ اسلام آباد سے انور یوسف زئی گرمی اور لوڈشیڈنگ سے کس کا دل نہیں کڑھتا مگر...... کبیر عباسی! عشق کا مرض تمہیں نہیں لگا صد شکر ادا کرو۔ اسی شہر سے ہمارے پیارے شاہ جی سید شکیل کاظمی صاحب! آپ کی پڑوسن کو بہت زیادہ پذیرائی مل رہی ہے، وہ مایا تو نہیں ہیں؟ فیضان بچے خوش آمدید۔ جگر سے ثمر خان خان مبارک باد کے حق دار ہیں۔ کاشف بھائی! آپ کا بہت زیادہ دکھ ہوا ہے۔ اللہ پاک آپ کو آپ کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ بالاکوٹ سے محسن علی ہم نے وہ نظارہ تصور کرلیا ہے، بہت مزہ آیا ہے آپ کا تبصرہ پڑھ کے۔ حافظ آباد سے ماہا ایمان زیادہ رومان پرور کہانی بہت نقصان دیتی ہے۔ لہٰذا گرداب کی موجودہ سچویشن پر قناعت کریں۔ مزید وضاحت کی ضرورت ہو تو بتایئے گا۔ قیصر بھائی اولڈ از گولڈ ہوتا ہے مان لو۔ صبا گل! یہ پیر بابا کہاں کا علاقہ ہے؟ اب بات ہوجائے کچھ کہانیوں پر۔ سب سے پہلے جواری کو پڑھا، پسند نہیں آئی۔ گرداب کی بات کریں تو اسٹوری پہلے کی نسبت بہتر ہے۔ امید ہے اسما قادری ان کردار کو واپس لائیں گی جن سے کہانی کی ابتدا ہوئی تھی۔ (سلسلے وار کہانی ایک کردار تک محدود نہیں رہتی۔ وقت کے ساتھ کردار تبدیل ہوتے رہتے ہیں) کاشف زبیر نے بہت زیادہ سنجیدہ کہانی خوف کے تاجر لکھی اور ہمیں بہت زیادہ معلومات ملیں کہانی کو پڑھ کے۔ آخر میں، میں محی الدین نواب سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ دہشت گردی جیسے ٹاپک کے حوالے سے کوئی کہانی لکھیں۔ کیونکہ جو قلم نواب صاحب کا اس بارے میں جانتا ہے، وہ کوئی اور نہیں جان سکتا۔ ہمارے تمام اہلِ علاقہ کی پُرزور فرمائش ہے نواب صاحب اور مدیر اعلیٰ صاحب دونوں سے۔''

میانوالی سے احسان سحر کی سحر انگیز باتیں ''ٹھنڈے موسم میں دگنی ٹھنڈ دل و دماغ کو پہنچانے کے لیے دیدار جاسوسی کیا اور محفل خوشبو میں خوشبو محسوس کرنے کے لیے اسٹائل سے تشریف لائے تاکہ کوئی متاثر ہوجائے۔ پہلی خوشبو کا لقب سعدیہ بخاری کے حصے میں آیا اور بے چاری کو پہلی مرتبہ شرکت پر ترس کھا کر انکل نے نواز دیا، خیر مبارک ہو جی۔ قیصر بھائی ہم تو ڈنکے کی چوٹ پر رہیں گے اور آپ بس دور سے دیکھ کر غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے رہو گے۔ جاسوسی کے خزانے کی طرف پیش قدمی کی۔ پہلے نمبر پر ابتدائی صفحات پر کفن بردوش، امریکا کی زمین پر وحشت ناک، دہشت سے بھرپور اور ایڈونچر پسند ناول پڑھنے کو ملا۔ سونے کے حصول کی خاطر وحشت ناک طریقے سے کھیلا گیا خونی کھیل کافی مزہ دے گیا اور انجوائے بھی کیا۔ چھوٹا چور، دلچسپی کا سامان رہی۔ چھوٹا چور خود چھوٹی چوری کرنے گیا اور پھنس گیا بڑی مصیبت میں۔ اور آخر میں واقعی چھوٹے چور نے ایمان داری، شرافت، قانون پسندی کا ساتھ دے کر مسز انگرام کی بھی جان بچائی، اچھا شاہکار تھا۔ کھیل اور کھلاڑی، سنسنی خیز واقعات سے بھرپور تیز ترین اسٹوری ثابت ہوئی۔ لاش کا پیغام بھی ایک اناڑی قاتل کا منہ بولتا ثبوت تھی اور جو ایک چھوٹی سی چیز کو فراموش کر بیٹھا اور بے نقاب ہوگیا۔ تعبیر، سب سے زیادہ عمدہ اور دلچسپی کا پیکر رہی جس نے اینڈ تک سحر میں جکڑے رکھا۔ وکی کی سراغ رسی نے کافی محظوظ کیا۔ نیا سلسلہ، نیا ولولہ جواری ابتدا ہی سے کافی دلچسپی کا سامان تھی۔ جیل سے فرار ہو کر ایک بھوت حویلی میں قیام، دلہن کی آپ بیتی تو سامنے آگئی۔ عامل گزیدہ کافی عرصے بعد استاد ایک اور کارنامے کے ساتھ براجمان تھے۔ گرداب اس ماہ ماہ بانو پر گھومتی رہی۔ ایک دفعہ پھر کافی دلچسپ موڑ آگیا ہے۔ حق دار اور انکشاف مختصر مگر اچھی اسٹوریز رہیں۔ خاص کر انکشاف مجوبہ کی کھوپڑی سے قتل کرڈالا واہ جی کیا نرالا اور انوکھا انتقام لیا۔ رنگوں کی بات ہوجائے۔ رنگ برنگے رنگوں کی تو پہلے نمبر پر احمد اقبال وحشت یا محبت لے کر آئے۔ بہت ہی الگ انداز کا موضوع لے کر اقبال صاحب آئے ہر کوئی محبت، عشق سے مجبور ہو کر اچھے برے کام کرتا ہے۔ مائرہ نے خاندان کی محبت کی خاطر اتنا بڑا قدم اٹھایا۔ ویلڈن احمد اقبال۔

دوسرا رنگ خوف کے تاجر بیرونی ممالک میں مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور دھوکا دہی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔''

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی معتبر برائے ''اس بار جاسوسی کافی تاخیر سے اور بک اسٹال کے متعدد پھیرے لگانے کے بعد 7 تاریخ کو ملا۔ سرورق کی حسینہ کی نیم وا آنکھوں سے لگتا ہے کہ ملک کے شمالی علاقوں سے تعلق ہے اور سرد حضرات حسب معمول تھری پیس سوٹ میں ملبوس۔ خطوط کی محفل میں اٹک کی سعدیہ بخاری کو اول آنے پر مبارک باد۔ حافظ آباد کی بی بی ماہا ایمان کی خدمت میں عرض ہے کہ میرا مقصد طویل تبصرہ نگاروں کو شرمندہ کرنا نہیں تھا بصرف نصیحت کرنا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ خطوط شامل اشاعت ہوں۔ (بالکل صحیح کہا آپ نے) باقی انہیں رفتہ رفتہ دریا تو کیا سمندر کو بھی کوزے میں بند کرنا آجائے گا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے احمد اقبال کی جواری پڑھی۔ آغاز تو نہایت شاندار ہے، اب دیکھیں فرید اور نورین پولیس سے پیچھا کیسے چھڑاتے ہیں۔ گرداب اس بار بھی بڑی سست رو رہی۔ ماہ بانو کو کن لوگوں نے اغوا کیا یہ تو اب آئندہ اقساط میں ہی پتا لگے گا۔ سرورق کی پہلی کہانی احمد اقبال کی وحشت یا محبت بے حد دلچسپ رہی۔ دوسری کہانی کاشف زبیر کی خوف کے تاجر برطانیہ کے پس منظر میں ایک روایتی کہانی تھی۔ اس شمارے کی اولین، کہانی کفن بردوش کسی مغربی کہانی کا ترجمہ تھی اور جاسوسی میں شامل اشاعت ہونے کی صحیح معنوں میں حق دار۔ دیسی کہانیوں میں سمیرا یعقوب کی کھیل اور کھلاڑی بہترین تھی۔ کافی عرصے بعد منظر امام کی عامل گزیدہ لطف دے گئی جس میں استاد کے عجیب و غریب مکالمے اس کہانی کی جان ہیں۔ بدیسی کہانیوں میں یاران رفتگان سب سے اچھی رہی۔''

رحیم یار خان سے اے کیو حسین کی شمولیت ''جاسوسی کی خوب صورت اور دلنشین محفل میں یہ میرا دوسرا خط ہے۔ پہلا خط للکار پڑھ کر لکھ ڈالا لیکن زیادہ انٹریز کی وجہ سے شائع نہ ہوسکا۔ جاسوسی نے اپنا رخ دلنشین 6 تاریخ کو دکھایا۔ جولائی کا شمارہ ایک نئے انداز میں تجریدی آرٹ لیے ذاکر انکل کی مہربانی سے دیکھنے کو ملا۔ بھاگتے ہوئے بھگو اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی حسینہ بھی خوب جچ رہی تھی۔ پہلے چٹپٹی نکتہ چینی میں پہنچے اور تمام کے تبصرے زیر غور فرمائے۔ سعدیہ بخاری کو ایک ماہ کی صدارت کی کرسی کی مبارک باد پنجابی کے محاورے کے مطابق آتے ہی چھاگئیں موصوفہ۔ تمام کہانیاں دلچسپ تھیں۔ خاص کر چھوٹا چور میں جوئی اسٹیل کی بہادری اور کھیل اور کھلاڑی میں کھلاڑی کی عیاری نے لہو میں گردش اور تیز کردی۔ اسما قادری کی گرداب اپنی ہی ڈگر پر چلتی جارہی ہے۔ احمد اقبال نے اچھا طرزِ عمل اپنایا۔ وحشت پانے تو خوب پنجے گاڑ دیے لیکن جواری کا جوا ابھی باقی ہے کیونکہ نہ جواری کا نام پتا، نہ بیک گراؤنڈ سو میرے خیال سے آگے مزہ آنے والا ہے لیکن یہاں ہم یہ بتاتے چلیں کہ للکار للکار رہی تھی۔ اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ اس دفعہ کے دونوں رنگ بے مثال تھے۔''

پشاور سے طاہرہ گلزار کی ناراضگی ''آج 8 تاریخ کو جاسوسی ملا، مسلسل 3 تاریخ سے چکر لگا کے آخر کار اپنا سویٹ سویٹ جاسوسی ملا۔ احسان سحر آپ کا آپریشن ہوا، اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ واہ انکل دل خوش کردیا کبیر عباسی کو جواب دے کے کہ دوسرا ہمایوں سعید ہے۔ اف سید شکیل حسین کاظمی کی خود پسندی تو ملاحظہ کیجیے۔ شکیل صاحب! عظیم وہ ہوتے ہیں جو عظیم کام کرتے ہیں۔ آپ نے کیا کمال کردیا ہے؟ ویسے سالگرہ مبارک ہو۔ کیک اکیلے کھالیا۔ شکیل صاحب آپ اپنی پڑوسن کے ذکر کو ہر خاص و عام کے سامنے کیوں کرتے ہو۔ محسن علی موم! آپ نے جھیل سیف الملوک کا ذکر کر کے دل دکھی کر۔ صبا گل سر درد کے لیے فجر کی نماز کے بعد اول و آخر 11، 11 بار درود شریف اور 101 بار یاقوی پڑھ لیا کرو اور وہ اپنے سر اور ماتھے پر دم کیا کرو۔ چند دن میں ان شاء اللہ سر کا درد غائب ہوجائے گا۔ ماہا ایمان جی! آپ لکھا کریں، ہمیں آپ کی تحریر، تفسیر بھائی کی تحریر کی طرح پسند ہے۔ قیصر اقبال کچھ صاحب! دیکھو۔ جناب احمد اقبال تو کمال کا لکھتے ہیں۔ پہلی ہی قسط نے کافی حد تک للکار کے دکھ کا مداوا کیا۔ اسما قادری کی یہ قسط بھی زبردست تھی۔ سرورق کی پہلی کہانی احمد اقبال کی تحریر وحشت یا محبت زبردست تحریر جس میں تعلیمی، سیاسی، جاگیرداری اور محبت کے رنگ نظر آئے۔ یہ دنیا ہے اس میں شر اور خیر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔''

بنوں سے محمد ہمایوں سعید کی حاضری ''رم جھم برستی بارشوں کے رومینٹک سہانے موسم میں جب جاسوسی کا دیدار ہوا، سعدیہ جی ٹھیک فرمایا آپ نے! کاظمی صاحب کو اسلام آباد کے سینے پر فخر ہے ہوکے چھینکیے، کھانسے اور ٹیکسلا کو تمسخرانہ نظروں سے دیکھنے کا بڑا شوق ہے مگر ان کے محدود علم میں یہ بات نہیں آئی ہے کہ ٹیکسلا کی آن بان اور شان تب سے ہے جب ان کے عظیم الشان شہر میں صرف الو اور بندر بولتے تھے، ثمینہ حبیب، اپنی ہی کہی بے تکی باتوں پہ بے تحاشا قہقہے لگانے والے لوگوں کو احمقوں کی رینکنگ میں اعزازی طور پر پہلے درجے میں رکھا جاتا ہے مبارک ہو۔ کاظمی برادر! آپ کی پیدائش کی صورت میں پاکستان کو اتنے عظیم الشان اعزاز سے نوازا گیا مگر آج تک ہم بدقسمت پاکستانیوں کو اس کی کانوں کان خبر نہیں ہوئی، حتیٰ کہ خود اعزاز کو چیخ چیخ کر اپنے ہونے کا واویلا کرنا پڑا، ہم اسے عظیم الشان اعزاز کی بے وقعتی سمجھیں یا کچھ اور؟ محسن برادر! جس صنف کو آپ چڑیلیں کہہ رہے ہیں وہی صنف آپ کی زندگی کے ہر حصے سے جڑی ہے چاہے ماں ہو، بہن، بیوی یا بیٹی، کب سمجھو گے بھائی میرے۔ نئے نئے رخ اختیار کرتی گرداب پہلے سے زیادہ پسند آئی، ویسے ہمیں بالکل امید نہیں تھی کہ اسما جی کہانی کو اتنا آگے لے جائیں گی اور پھر اتنے کرداروں کو ساتھ لے کر چلنا۔ واقعی خراج تحسین کی مستحق ہیں اسما صاحبہ۔ ..... للکار کے متبادل کے طور پر پیش کی گئی کہانی جواری احمد اقبال کے مخصوص انداز اور خوب صورت جملوں کی وجہ سے دل میں گھر کرنے میں کامیاب رہی۔ دل دہلا دینے والی کہانی کھیل اور کھلاڑی کو انگلش مووی کی طرح انجوائے کیا۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہوسکے۔

ثمینہ حبیب، کوئٹہ...... انجم فاروق ساحلی، لاہور۔ محمد قدرت اللہ نیازی، خانیوال۔ ملک سعید، چکوال۔ ادیس احمد خان، کراچی۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی، لاہور۔ تابی اور یالو، شیخوپورہ۔ سعدیہ بخاری، اٹک۔ افتخار حسین اعوان، آزاد کشمیر۔

جولائی کے شمارے میں کھیل اور کھلاڑی کی مصنفہ سمیرا یعقوب کا نام غلطی سے سمیرا طارق چلا گیا..... اس سہو کے لیے ہم ان سے معذرت خواہ ہیں۔

مٹھی میں ریت

مریم کے خان

دیارِ غیر کی بستیوں اور ریگزاروں میں طویل اور صبر آزما رفاقتوں کے باوجود اپنے وطن اور اپنی مٹی سے محبت کا رشتہ کبھی ختم نہیں ہوتا... غریب الوطنی کا کرب... معاشرتی اقدار اور دو مختلف سماجی رویوں کا فرق انسان کو کسی نہ کسی سمت میں ڈھلنے پر مجبور کر دیتا ہے... بدیسیوں کی سرزمین پر اپنے لیے عزت و احترام کی تکریم کے خواہش مند کی داستانِ ہمت... وہ جینا چاہتا تھا... اس کے لیے زندہ رہنا اہم نہیں تھا... مگر عزت سے زندہ رہنا ہی اصل زندگی تھی... وہ صرف اپنی قوم کا ہی نہیں بلکہ پوری نسلِ انسانی کا بہی خواہ تھا... اس کے ذہن نے جو سوچا... آنکھوں نے جو خواب دیکھے... ان کی تعبیر ہی اس کا اصل سرمایۂ حیات تھا...

اپنے ہم وطنوں کو جینے کا ہنر عطا کرنے والے سراب در سراب بھٹکتے سوداگر کا سنسنی خیز کارنامہ

امریکا، لینگلے، سی آئی اے ہیڈ کوارٹر...

کمرے میں تین افراد موجود تھے۔ سی آئی اے چیف گارمین شیلڈ، ڈائریکٹر آپریشن آئزک کوہان اور تیسرا فرد افریقا کا انچارج ڈیوڈ کارٹر تھا۔ چیف نے ڈیوڈ کارٹر کی طرف دیکھا۔ ”گرین شیڈ کا طریقہ ناکام رہا ہے۔ وہ ہماری بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔“

”اس لیے ریڈ شیڈ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔“ آئزک کوہان نے سرد لہجے میں کہا۔ ”آپریشن تمہاری ذمے داری ہوگی۔“

”تمہیں بہرصورت صفائی کرنی ہے اور اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ چینیوں تک کچھ پہنچنے نہ پائے۔“

ڈیوڈ کارٹر بریفنگ لے چکا تھا، اس نے پہلا سوال کیا۔ ”کیا یہ یقین ہے کہ چینیوں تک کچھ نہیں پہنچا ہے؟“

”سو فیصد... چینی سیکرٹ سروس میں ہمارے آدمی پوری طرح فعال ہیں اور ان کی رپورٹ ہے کہ بات چیت

ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے۔"
"لیکن ہمارے پاس تین دن سے زیادہ وقت نہیں ہے۔" آئزک کوہان نے کہا اور پھر مشورہ دیا۔ "بہتر ہے اسے بہتّر گھنٹوں میں تقسیم کرلو اور ابھی سے کاؤنٹ ڈاؤن شروع کردو۔"

ایک گھنٹے بعد ڈیوڈ کارٹر سی آئی اے کے ایک جیٹ طیارے میں جنوبی افریقا کی طرف محوِ پرواز تھا۔ اس کا لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا اور وہ اس آپریشن کے بارے میں ہر امکانی پہلو پر غور کررہا تھا۔ اسے بتادیا گیا تھا کہ اس بار ناکامی پر اسے واپس بلالیا جائے گا۔ انگولا اور زمبابوے میں سی آئی اے کی ناکام حکمتِ عملی پر اسے قصوروار ٹھہرایا گیا تھا اور یہ اس کے لیے آخری موقع تھا۔ پانچ گھنٹے بعد وہ کیپ ٹاؤن میں اتر رہا تھا۔ ائرپورٹ پر اس کا نائب جیمس بیکر اسے ریسیو کرنے آیا تھا۔ ڈیوڈ نے اترتے ہی اسے حکم دیا۔ "مجھے نصف گھنٹے میں تمام ایجنٹس میٹنگ روم میں چاہئیں۔"

نصف گھنٹے بعد وہ جنوبی افریقا میں تعینات سی آئی اے کے ایک درجن اہم ترین ایجنٹس سے بات کررہا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر اس سات سالہ بچی کا معائنہ کررہا تھا۔ بچی بڑی پیاری سی تھی اور فراک سوٹ میں بالکل گڑیا لگ رہی تھی۔ اس نے ایک چھوٹی سی گڑیا اپنے سینے سے لگا رکھی تھی۔ دو گھنٹے سے جاری سیشن میں اس نے کئی ٹیسٹ لیے تھے اور بچی سے بے شمار سوالات کیے تھے۔ سیشن کے خاتمے پر وہ بچی کو لے کر باہر ویٹنگ روم میں اس کے ماں باپ کے پاس آیا۔ باپ نے ڈاکٹر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے گہری سانس لے کر بچی سے کہا۔ "بے بی! آپ اپنی مما کے ساتھ جاؤ، میں آپ کے پاپا سے کچھ بات کروں گا۔"

ماں بچی کو باہر لے گئی۔ باپ نے بے تابی سے پوچھا۔ "اِزشی آل رائٹ؟"

"ہاں۔۔۔ وہ ست دماغ کی مالک ہے اور یہ مسئلہ دائمی سمجھیں۔"

باپ کے چہرے پر مایوسی چھاگئی۔ "میری بیٹی ساری عمر ایب نارمل رہے گی۔"

"آئی ایم سوری لیکن یہ حقیقت ہے۔ البتہ تھراپی سے بہتری آئے گی۔ اس کے باوجود اس کے لیے نارمل زندگی گزارنا ممکن نہیں ہوگا۔ مگر ایک حیرت انگیز بات سامنے آئی ہے۔ یہ فوٹوگرافک میموری رکھتی ہے۔ میں نے اس کا ٹیسٹ لیا ہے اور اس نے سو میں سے سو نمبر لیے ہیں۔"

باپ نے اس خبر کا کوئی اثر نہیں لیا، وہ دکھی تھا کہ اب اس کی بیٹی ساری عمر ایب نارمل رہے گی۔ وہ نارمل بچوں کی زندگی گزار سکے گی اور نہ نارمل لڑکیوں والی خوشیاں اسے ملیں گی۔ اسے ساری عمر دیکھ بھال کی ضرورت ہوگی۔ ابھی تو وہ اسے دیکھ رہے ہیں لیکن جب وہ نہیں ہوں گے تب اس کا کیا ہوگا؟

☆☆☆

جنوبی افریقا، بلوبرگ۔۔۔

بحرِ اوقیانوس کے ساتھ جزری کھاڑی کے ایک حصے میں یہ دو منزلہ مکان خاموش اور تاریک تھا۔ صرف ایک کھڑکی سے روشنی جھلک رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے سمندر کی طرف سے ایک بے آواز سیاہ کشتی ساحل سے آلگی اور اس میں سے نصف درجن سرتاپا سیاہ پوش اتر کر مکان کی طرف بڑھے۔ انہوں نے چاروں طرف سے مکان کو گھیر لیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں خودکار رائفلیں تھیں اور آنکھوں پر نائٹ ویژن چشمے تھے۔ ان میں سے دو سامنے والے حصے کی طرف تھے۔ انہی میں سے ایک نے نائٹ ویژن آلہ آنکھ سے لگایا۔ یہ اتنا حساس تھا کہ دیوار کے پار بھی دکھاتا تھا۔ فوراً ہی اسے دو افراد نچلے فلور پر دکھائی دیے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "اندر دو افراد ہیں۔"

"دو نہیں، تین افراد ہونے چاہئیں۔" اس کے کان میں لگے ائرفون سے آواز آئی۔ اس نے ایک بار اسی آلے کی مدد سے پورے مکان کا جائزہ لیا لیکن وہاں کوئی تیسرا فرد نہیں تھا۔

"دو ہی افراد ہیں۔" اس نے پھر کہا۔ "اب کیا کرنا ہے؟"

"لعنت ہو۔" بولنے والا غرّایا۔ "یہ کام آج ہی ہونا چاہیے۔"

سیاہ پوش کسی ایسے فرد سے رابطے میں تھا جو یہاں سے دور رہ کر اس سارے آپریشن کی نگرانی کررہا تھا۔ اس نے اجازت دے دی۔ "ٹھیک ہے لیکن تیسرے فرد کی لوکیشن لازمی معلوم ہونی چاہیے۔"

سیاہ پوش نے سر ہلایا اور دھیمی آواز میں اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینے لگا۔ وہ سب اسی طرح کے ریڈیو کی مدد سے آپس میں رابطے میں تھے۔ ہدایت دے کر وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ دبے قدموں مکان کی طرف بڑھا اور برآمدے میں آکر اس نے ایک بار پھر آلے کی مدد سے اندر کا جائزہ لیا۔ اس بار بھی اسے دو ہی افراد دکھائی دیے تھے۔ البتہ

مکان کے تہ خانے میں اسے حرارت دکھائی دی تھی لیکن حرارت کس چیز سے خارج ہورہی تھی، یہ واضح نہیں تھا۔ اس نے سر سے اشارہ کیا تو اس کے ساتھی نے دروازے پر لات ماری۔ وہ کھل گیا اور وہ دونوں اندر داخل ہوگئے۔ ان کا رخ اس حصے کی طرف تھا جہاں انہیں دو افراد دکھائی دیے تھے۔ ابھی وہ لاؤنج میں تھے کہ کچن کی طرف سے ایک عورت نمودار ہوئی، وہ شور سن کر آئی تھی۔ اس نے ہاتھ میں کچھ اٹھا رکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ آلے والا سیاہ پوش اپنے ساتھی کو روکتا، اس نے فائر کھول دیا اور عورت الٹ کر کچن میں جا گری۔ اس کے ساتھ ہی پورے گھر کی روشنیاں جل اٹھیں۔

"لعنت ہو۔" سیاہ پوش غرّایا۔ "یہ کیا کیا؟"

روشنی ہوتے ہی انہوں نے نائٹ ویژن اتار دیے۔ ان کی آنکھوں کو روشنی سے ہم آہنگ ہونے میں چند لمحے لگے اور دوسرا فرد اسی دوران میں غائب ہوگیا۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ عورت نے بیلن اٹھایا ہوا تھا اور اب وہ اس کی لاش کے پاس پڑا تھا۔ اس دوران میں باقی بھی اندر آگئے تھے۔ دو عقب سے کھڑکی توڑ کر آئے تھے اور دو بائیں طرف کے دروازے سے داخل ہوئے تھے۔ سیاہ پوش نے اشارے سے ان کو اوپر اور نیچے پورے گھر کی تلاشی کے لیے کہا اور آہستہ سے بولا۔ "آدمی کو زندہ پکڑنا ہے۔"

ایک منٹ سے بھی پہلے انہوں نے دونوں منزلیں چھان لیں۔ وہاں وہ آدمی نہیں تھا۔ اب ایک ہی جگہ بچتی تھی۔ پہلے آنے والے دونوں سیاہ پوش تہ خانے کی سیڑھیوں تک آئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور یہ لات مارنے سے کھل جانے والا دروازہ نہیں تھا اس لیے لاک توڑنے کے لیے برسٹ مارنا پڑا۔ رائفلیں بے آواز تھیں اس لیے دونوں بار فائرنگ کا شور نہ ہونے کے برابر تھا۔ سیڑھیاں نیچے جارہی تھیں۔ سیاہ پوش آگے پیچھے نیچے اترے۔ وہ فائر کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ نیچے آتے ہی انہوں نے دیکھ لیا کہ ایشیائی خدوخال والا ادھیڑ عمر شخص ایک گیس سلنڈر کے پاس کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں موجود شاٹ گن کا رخ سلنڈر کی طرف تھا۔ ان کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم لوگ آؤگے۔"

سیاہ پوش بولا۔ "جب تمہیں معلوم تھا کہ ہم آئیں گے تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہم کیوں آئے ہیں؟"

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے بھرّائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سارہ کو مار کر تم نے اپنے عزائم واضح کردیے ہیں۔"

"وہ میرے ساتھی کی غلطی تھی۔" سیاہ پوش نے کہا۔

"ہم تم سے بات کرنے آئے ہیں۔ اگر تم اپنا ارادہ ترک کر دو تو۔۔۔"

"جھوٹ مت بولو، تم سب تباہ کرنے آئے ہو۔ اب تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں سلنڈر اڑادوں گا۔ اس میں دس کلوگرام ہائیڈروجن بھری ہے جو اس مکان کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہے۔"

"تمہاری بیٹی کہاں ہے؟"

آدمی مسکرایا۔ "وہ تمہاری پہنچ سے بہت دور ہے۔"

"ہم جلد یا بدیر۔۔۔ اسے تلاش کرلیں گے۔"

"وہ ایک ایب نارمل لڑکی ہے۔ اگر تم اسے تلاش کرلو یا مار بھی دو تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تمہیں کوئی فائدہ ہوسکتا تھا تو مجھ سے ہوسکتا تھا لیکن اب تمہیں صرف موت ملے گی میرے ساتھ۔"

اگرچہ انہیں حکم تھا کہ آدمی کو زندہ پکڑیں لیکن اب ان کی جان پر بن آئی تھی۔ سیاہ پوش نے پہلے ہی رائفل تان رکھی تھی۔ آدمی کی بات سنتے ہی اس نے برسٹ مارا اور یقیناً آدمی کا دل چھلنی کردیا تھا لیکن وہ اسے شاٹ گن چلانے سے نہیں روک سکا۔ فائر ہوتے ہی ایک خوفناک دھماکا ہوا اور پورا مکان ماچس کی تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔ اس میں موجود افراد کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ساحل سے تقریباً ایک کلومیٹر دور۔۔۔۔ اس کشتی میں موجود افراد نے دھماکے کی آواز سنی تھی اور آپریشن کی نگرانی کرنے والا ڈیوڈ کارٹر بار بار ریڈیو پر انہیں پکار رہا تھا مگر دوسری طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ اس نے ہیڈفون پٹخ دیا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا گول چہرے اور گنجے سر والا سفید فام تھا۔ اس کے ساتھ کشتی میں چھ افراد اور تھے۔ ساتواں اس کا نائب تھا، اس نے جیمس کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے اس نے سب تباہ کردیا ہے۔"

ان کے چہرے بجھ گئے۔ ایک نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔"

"سب کچھ اسی مکان میں تھا اور سب تباہ ہوگیا۔" ڈیوڈ نے گہری سانس لی۔ "اب ہمیں لڑکی کو تلاش کرنا ہے۔"

☆☆☆

جنوبی افریقا، کیپ ٹاؤن۔۔۔

شہر کے تجارتی علاقے کی اس پندرہ منزلہ عمارت کے آخری فلور پر ایلکا کارپوریشن کا دفتر تھا۔ بظاہر یہ فرم امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتی تھی لیکن درحقیقت یہ جنوبی افریقا اور خطے کی نگرانی و آپریشنز کے لیے سی آئی اے کا سینٹر

تھا۔ ڈیوڈ کارٹر اور جیمس کنٹرول روم میں موجود تھے۔ ڈیوڈ کمپیوٹر پر آنے والی پولیس رپورٹ دیکھ رہا تھا۔ پولیس رپورٹ کے مطابق بلوبرگ کے اس مکان میں پاکستانی نژاد جنوبی افریقی ماہرِ طبیعیات وسیم احمد انصاری اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ مقیم تھا۔ وہ کیپ ٹاؤن یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر تھا۔ وسیم احمد کی بیوی سارہ چینی نژاد تھی اور وسیم احمد کی اس سے ملاقات دورانِ تعلیم آکسفورڈ میں ہوئی تھی۔ انہوں نے محبت کی شادی کی اور کم نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کا نام سارہ رکھا گیا تھا۔ ان کی اکلوتی بیٹی انیس سالہ عمارہ ذہنی لحاظ سے پسماندہ تھی۔ مکان میں ہونے والے دھماکے میں وسیم احمد اپنی بیوی سارہ سمیت ہلاک ہوگیا لیکن عمارہ وہاں نہیں تھی۔ پولیس کو اس کے بارے میں علم نہیں تھا اور اس کی تلاش جاری تھی۔ پولیس کے مطابق دھماکا تہ خانے میں موجود ہائیڈروجن کا سیلنڈر پھٹنے سے ہوا تھا۔ رپورٹ میں دیگر چھ افراد کی ہلاکت کا کوئی ذکر نہیں تھا اور نہ ہی سارہ کی موت کی اصل وجہ بیان کی گئی تھی۔ ڈیوڈ نے مطمئن انداز میں سرہلایا۔ گویا رپورٹ اس کی مرضی کے مطابق تھی۔ اس نے ایک کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے نوجوان سے کہا۔

”ملر! عمارہ کے بارے میں ہمارے ڈیٹا میں کیا ہے؟“

ملر نے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں اور چند لمحے بعد ایک نوجوان اور دلکش لڑکی کا چہرہ اسکرین پر آگیا۔ اس کے نقوش میں بیک وقت پاکستانی اور چینی خصوصیات موجود تھیں۔ وہ ایب نارمل تھی یعنی اس کا ذہن عمر سے پیچھے تھا مگر چہرے سے اس کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ آنکھوں میں چمک اور تاثر تھا جبکہ ایب نارمل افراد کی آنکھیں بجھی ہوئی بے تاثر ہوتی ہیں۔ تصویر کے ساتھ معلومات بھی تھیں۔ اس کی عمر، بائیو ڈیٹا اور دوسری خصوصیات لکھی تھیں۔ ڈیوڈ چونک گیا۔ وہ جس خاص بچوں کے اسکول میں تعلیم حاصل کرتی رہی تھی، اس کی رپورٹ بھی اس میں شامل تھی۔ ڈیوڈ نے غور سے رپورٹ دیکھی۔ اس کے بچ جانے والے چھ فیلڈ ایجنٹ عمارہ کو تلاش کررہے تھے۔ مکان سے کچھ نہیں ملا تھا، سوائے لاشوں اور راکھ کے۔ مگر یہ خدشہ تھا کہ وسیم احمد نے عمارہ کو کچھ دیا نہ ہو۔ یہ جاننے کے لیے لڑکی کی تلاش لازمی تھی۔ اس نے اپنے فیلڈ ایجنٹس کے سربراہ جان کو کال کی۔ ”کیا پروگریس ہے؟“

”ہم وسیم احمد کے جاننے والوں کو کھنگال رہے ہیں لیکن ابھی تک کہیں کامیابی نہیں ملی ہے۔“

مقامی پولیس ان سے تعاون کررہی تھی۔ ”یہ کافی نہیں ہے۔“ ڈیوڈ نے غرا کر کہا۔ ”مجھے ہر صورت لڑکی چاہیے۔“

☆☆☆

سوڈان، خرطوم...

عمارت جدید انداز کی لیکن مختصر تھی۔ اوپر تلے اس کی تین منزلیں تھیں اور سامنے والے حصے پر شنگھائی کارپوریشن کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ ایک فرم تھی جو چینی مصنوعات کی سوڈان اور اس کے آس پاس کے افریقی ممالک میں ڈسٹری بیوشن کرتی تھی مگر یہ آڑ تھی۔ عمارت چین کی خفیہ سروس کا مرکز تھا اور یہاں سے افریقا اور مڈل ایسٹ میں چین کے مفادات اور اس کے خلاف ہونے والی سازشوں پر نظر رکھی جاتی تھی۔ عمارت کے تہ خانے میں قائم جدید ترین کنٹرول اور مواصلاتی سینٹر میں نصف درجن افراد موجود تھے۔ جی چن زی اس مرکز کا سربراہ تھا اور اس کا شمار اپنے شعبے کے بہترین افراد میں ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا نائب ڈین پی لیو تھا۔ ان کے سامنے چار فیلڈ ایجنٹس تھے۔ زیان ٹن ایجنسی کا افریقا میں فیلڈ آپریشن کا سربراہ تھا اور جیانگ جوشی اس کا نائب تھا۔ چن زی مضطرب تھا، اس نے کہا۔

”افسوس کہ اوپر والوں نے ہمیں دیر سے خبردار کیا ورنہ سی آئی اے ناکام رہتی۔“

”وسیم احمد کا پروسیس بہت اہمیت کا حامل تھا۔“ ڈین نے کہا۔

”وہ اب بھی اہم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وسیم احمد نے اسے کہیں اور بھی چھپایا ہوگا۔“ چن زی نے کہا۔ ”وہ ایسا آدمی نہیں ہے جو اپنے ساتھ سب تباہ کردے۔“

”وسیم احمد کی بیٹی عمارہ غائب ہے۔“

”مجھے یقین ہے، وہ اس بارے میں کچھ نہ کچھ جانتی ہے۔“

”لیکن وہ امریکیوں کے پاس نہ ہو؟“ ڈین نے خدشہ ظاہر کیا۔

”نہیں، ہمارے آدمی مسلسل کام کررہے ہیں۔ اگر وہ امریکیوں کے ہاتھ لگی ہوتی تو ہمیں فوراً پتا چل جاتا۔ وہ غائب ہے اور امریکی بھی اسے تلاش کررہے ہیں۔“

”لیکن اس سے پہلے امریکی اس تک پہنچیں، ہمیں لڑکی تک پہنچنا ہوگا۔“ ڈین نے زیان کی طرف دیکھا۔ ”اور یہ تمہاری ذمے داری ہے۔“

زیان نے سرہلایا۔ وہ تقریباً پینتیس برس کا خوش شکل اور مضبوط جسامت کا شخص تھا۔ اس کا شمار خفیہ سروس کے چند بہترین فیلڈ ایجنٹس میں ہوتا تھا اور اس نے افریقا میں اپنے

ملک کے لیے کئی کارنامے سرانجام دیے تھے۔ اس سے پہلے وہ ہمیشہ آزمائش میں پورا اترا تھا اور یہ اس کے لیے ایک اور آزمائش تھی۔ چن زی نے ایک چھوٹی سی فائل زیان کی طرف بڑھائی۔ ”اس میں وسیم احمد اور عمارہ کے بارے میں ساری معلومات موجود ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ عمارہ کی ماں سارہ چینی تھی۔“

ڈین نے کہا۔ ”ایک اہم اطلاع ہے۔ وسیم احمد کا بھتیجا محمود احمد جنوبی افریقا آگیا ہے اور وہی سب دیکھ رہا ہے۔ امکان ہے وہ عمارہ کی تلاش میں ہوگا۔“

”تب ہم اسی سے آغاز کرتے ہیں۔“ زیان نے کہا اور اپنے ساتھیوں سمیت کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک چھوٹے پرائیویٹ جیٹ طیارے میں جنوبی افریقا کی طرف محوِ پرواز تھا۔ امریکیوں کی طرح چینی بھی سوچ رہے تھے کہ عمارہ کہاں ہے؟

☆☆☆

عمارہ کیپ ٹاؤن سے تقریباً تیس میل دور ایک چھوٹے شہر ولنگٹن کے ایک اپارٹمنٹ میں موجود تھی۔ رونے سے اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرے پر غم آلود تاثرات تھے۔ دو دن پہلے وسیم احمد نے اس سے کہا کہ اسے جانا ہوگا۔ وہ حیران اور بے قرار ہوئی تھی۔

”کہاں پاپا؟“

”ابراہیم چچا کے پاس... تم نے ان کا گھر دیکھا ہے؟“

”مگر کیوں پاپا؟“

”یاد ہے میں نے تمہیں ایک بار کچھ بتایا تھا اور کہا تھا کہ اگر موقع آئے تو تم ابراہیم چچا کے پاس جاؤ گی اور جیسا میں نے کہا ہے ویسا کرو گی؟“

عمارہ کو یاد تھا۔ اس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ اگرچہ سوچنے کے معاملے میں اس کا ذہن سست تھا اور وہ معمولی سے مسئلے کا حل بھی خاصی دیر میں جاکر نکالتا تھا مگر وہ جو بات ایک بار سنتی یا کوئی چیز دیکھتی تو وہ اسے ہمیشہ کے لیے یاد ہوجاتی تھی۔ عمارہ نے سرہلایا۔ ”جی پاپا! یاد ہے۔“

”شاباش۔“ وسیم احمد نے اس کا سر سہلایا۔ ”عمارہ! اب وقت آگیا ہے۔ تم ابراہیم چچا کے پاس جاؤ گی۔“

عمارہ ڈر گئی۔ ”اکیلے پاپا؟“

”ہاں میری بچی اکیلے... اگر میں یا تمہاری ماما میں سے کوئی ساتھ گیا تو دشمن پھر پیچھے آئیں گے اس لیے ہم نہیں جاسکتے۔“

عمارہ نہیں جانتی تھی کہ دشمن کون تھے... کیونکہ وسیم احمد نے کبھی وضاحت نہیں کی تھی لیکن ایک بات اس کے ذہن میں بٹھادی تھی کہ دشمن بہت خوفناک ہے اور وہ انہیں مارنے کے لیے آتا ہے۔ اس لیے جب اس نے دشمن کا لفظ کہا تو عمارہ سہم گئی۔ اس نے بے بسی سے باپ کی طرف دیکھا۔ ”پاپا! وہ کیوں آئیں گے؟“

”میں نہیں جانتا لیکن میں اور تمہاری ماما تمہیں بچانا چاہتے ہیں۔“

عمارہ نے پوچھا۔ ”مجھے کب جانا ہے؟“

”کل صبح۔“ وسیم احمد نے جواب دیا۔ ”کل صبح میں تمہیں پہلی بس میں بٹھادوں گا۔“

ان کے پاس صبح تک چند گھنٹے تھے اور دونوں میاں بیوی ان چند گھنٹوں کا ایک ایک لمحہ عمارہ کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے۔ ان کی اکلوتی بیٹی ہی ان کا سب کچھ تھی۔ وہ اسے ہر قیمت پر بچانا چاہتے تھے۔ جب یہ معاملہ شروع ہوا اور انہیں دھمکی ملی تھی تب ہی سارہ اور وسیم اس کے لیے... پریشان ہوگئے تھے۔ وہ دن رات سر جوڑے بیٹھے رہتے اور کوئی ایسی ترکیب سوچتے تھے کہ ان کی نہ سہی عمارہ کی زندگی بچ جائے۔ مگر وہ جانتے تھے کہ ان کے دشمن جنگل کے درندوں سے زیادہ سفاک ہیں۔ ان کی سفاکی کی داستانیں اس کرۂ ارض کے چپے چپے پر لکھی ہوئی تھیں۔ ان تین افراد کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وسیم احمد جانتا تھا کہ اس کے کیے کی سزا صرف اسے ہی نہیں بلکہ اس کی بیوی اور بچی کو بھی ملے گی۔ اسے اپنی پروا نہیں تھی لیکن وہ سارہ اور عمارہ کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ پھر اس نے ایک طریقہ سوچ لیا اور سارہ سے بات کی۔ سارہ نے اس سے اتفاق کیا لیکن ساتھ ہی اس نے وسیم کو چھوڑ کر جانے سے انکار کردیا۔

”تمہیں جانا ہوگا... عمارہ کی خاطر۔“ وسیم نے اصرار کیا۔

”نہیں، میرا ساتھ عمارہ کے لیے خطرہ بن جائے گا۔ وہ یہ سوچ کر پیچھے آئیں گے کہ میں کچھ جانتی ہوں یا میرے پاس کچھ ہے۔ عمارہ اکیلی ہوگی تو ان کے ذہن میں یہ خیال نہیں آئے گا۔“

”ہم ایک جوا کھیل رہے ہیں۔ ممکن ہے وہ پھر بھی سوچ لیں۔“ وسیم نے ٹھنڈی سانس لی۔ اس کے اصرار کے باوجود سارہ نے عمارہ کے ساتھ جانے سے انکار کردیا تھا۔ وسیم جانتا تھا کہ وہ عمارہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی وجہ سے جانے سے انکار کررہی تھی۔ سارہ نے اس کی خاطر اپنا مذہب

ہی نہیں، اپنا ملک اور اپنا خاندان سب چھوڑ دیا تھا۔ اس پر اس کے خاندان والے اس سے خفا تھے۔ انہوں نے آج تک اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ تقریباً یہی حال وسیم احمد کے خاندان کا تھا۔ وہ پاکستان کے ایک قدامت پرست روایتی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ابھی وہ پندرہ سال کا تھا کہ اس کی منگنی اس کی چچازاد سے کردی گئی۔ وہ صرف پانچ جماعت تک پڑھی ہوئی تھی اور پھر اسے گھر بٹھا لیا گیا تھا۔ جب وسیم پڑھنے کے لیے انگلینڈ آیا اور اس کی ملاقات کم سے ہوئی تو اس نے منگنی توڑنے کا کہہ دیا۔ اس پر اس کے گھر والوں نے وسیم احمد سے تعلق توڑ لیا اور اس کی سابق منگیتر کی شادی اس کے بھائی سے کردی۔ اس کے بعد وسیم احمد صرف ایک بار پاکستان گیا۔ اسے گھر میں داخل ہونے نہیں دیا گیا۔ وہ ناکام واپس آ گیا۔

تعلیم مکمل کر کے وہ کچھ عرصہ انگلینڈ میں ہی ایک کالج میں پڑھاتا رہا پھر کم سے شادی کے بعد وہ جنوبی افریقا منتقل ہو گیا اور یہاں کی شہریت حاصل کرلی۔ عمارہ یہیں پیدا ہوئی تھی۔ ابھی وہ دو سال کی تھی مگر اس نے بولنا یا کسی بات پر ردِعمل دینا شروع نہیں کیا تھا۔ پریشان ہو کر وسیم اور سارہ نے اسے ڈاکٹرز کو دکھایا۔ تب معلوم ہوا کہ وہ ذہنی لحاظ سے پسماندہ ہے۔ پانچ برس کی عمر میں اسے خصوصی بچوں کے اسکول میں داخل کرایا گیا جہاں اس نے بولنا اور ٹھیک طرح سے چلنا پھرنا سیکھا۔ چار سال تک وہ مشکل سے کھڑی ہو کر چند قدم اٹھاتی تھی۔ اسکول جانے کے بعد اس میں بہتری آنے لگی۔ فزیکل اور مینٹل تھراپی سے اسے اتنا فائدہ ہوا کہ وہ اب انیس برس کی عمر میں تقریباً نارمل دکھائی دیتی تھی۔ وہ درست انداز میں بولتی اور چلتی پھرتی تھی۔ فٹ بال کی بہت اچھی کھلاڑی تھی۔ ہاں جب اس سے باقاعدہ بات کی جاتی تب اس کی ذہنی کمزوری سامنے آتی تھی۔

اس رات ماں باپ اسے سمیٹ کر بیٹھے رہے اور اس کے ساتھ ماضی کی یادیں دہراتے رہے۔ وہ بار بار اسے پیار کرتے تھے اور عمارہ سہم جاتی تھی۔ ایسا لگتا جیسے اسے ماں باپ کا یہ پیار آخری بار مل رہا ہے۔ صبح سارہ نے اس کا سامان تیار کیا۔ بیگ میں اس کے کپڑے اور کتابیں تھیں۔ بیگ کی اسٹرپ کے ساتھ ڈبل تہ والی جگہ وسیم احمد نے ایک چھوٹی سی میموری چپ رکھی۔ میموری چپ ایک چھوٹے سے پلاسٹک شاپر میں پیک تھی تاکہ نمی اور چوٹ سے محفوظ رہے۔ وسیم نے عمارہ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اگر ان کے ساتھ کوئی سانحہ پیش آجائے تو اسے کیا کرنا ہے مگر چپ رکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر عمارہ کو سب سمجھایا۔ وہ غور سے سن رہی تھی پھر اس نے وسیم کو بتایا کہ وہ کیا کرے گی۔ وسیم نے خوش ہو کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ ''شاباش میری بیٹی۔''

''پاپا! مجھے سب آتا ہے نا؟'' اس نے فخر سے پوچھا۔

''ہاں! میری بیٹی کو سب آتا ہے۔'' وسیم کی آواز بھرا گئی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ دنیا عمارہ جیسے لوگوں کے لیے نہیں لیکن وہ کیا کرسکتا تھا۔ سارہ نے اس کے لیے ناشتا بنایا مگر عمارہ سے کھایا نہیں جارہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور وہ مشکل سے خود پر قابو پائے ہوئے تھی۔ سورج نکلنے کے بعد وہ دونوں اسے لے کر ہائی وے تک آئے جہاں سے بس گزرتی تھی۔ وسیم احمد اسے بار بار بتا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ حالانکہ اسے صرف ایک بار کچھ کہنا پڑتا تھا اور وہ اسے ہمیشہ کے لیے یاد ہو جاتا تھا۔ مگر ہیجان اور اضطرابی کیفیت میں وسیم یہ بات بھول گیا تھا۔ اس نے عمارہ کو ابراہیم علی کے لیے ایک لفافہ بھی دیا تھا۔ سارہ نے مستقل اسے لپٹا کر رکھا ہوا تھا۔ پھر بس آئی تو انہوں نے بڑی مشکل سے خود پر جبر کر کے اسے بس میں سوار کرایا۔ جب بس چلی تو عمارہ پیچھے والے شیشے سے چہرہ لگائے اس وقت تک انہیں دیکھتی رہی جب تک وہ نظر آتے رہے۔

پون گھنٹے بعد بس نے اسے ونگٹن میں اتار دیا۔ وہ اس شہر میں ایک بار پہلے بھی آچکی تھی۔ تب وسیم اسے بس سے لے کر آیا تھا اور اس نے خاص طور سے اسے ابراہیم چچا کے اپارٹمنٹ تک کا راستہ یاد کرایا تھا۔ عمارہ بس سے اتر کر اس راستے پر چل پڑی۔ دس منٹ بعد وہ ابراہیم چچا کے اپارٹمنٹ کے سامنے تھی۔ ابراہیم علی کا تعلق جوہانس برگ سے تھا۔ وہ شادی شدہ اور بیوی بچوں والا شخص تھا۔ اس کا خاندان کئی نسلوں سے جنوبی افریقا میں آباد تھا۔ پھر نسلی فسادات کے زمانے میں اس کا خاندان مارا گیا۔ بلوائیوں نے حملہ کیا تو اس علاقے میں آباد ابراہیم علی کا گھر بھی ان کی لگائی آگ کی لپیٹ میں آگیا اور جب تک فائر بریگیڈ کا عملہ آتا پورا گھر مع مکینوں کے جل کر راکھ ہو گیا۔ صرف ابراہیم علی بچا تھا کیونکہ وہ اس وقت گھر سے باہر تھا۔ اس کا جوہانس برگ میں اچھا کاروبار تھا لیکن اس واقعے سے دل برداشتہ ہو کر اس نے اپنا سب کچھ بیچ دیا اور ونگٹن چلا آیا۔ یہاں اس نے چھوٹا سا اپارٹمنٹ لے لیا اور زندگی کے باقی دن خاموشی سے گزارنے لگا۔ اس کے پاس اتنا پیسا تھا کہ وہ باقی زندگی آرام سے گزار سکتا تھا۔ اس علاقے میں پاکستانی نژاد افراد کم تھے اس لیے جو تھے وہ آپس میں رابطہ رکھتے تھے۔ اکثر

تقاریب ہوتی تھیں جن میں پاکستانی نژاد جنوبی افریقی ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ایسی ہی ایک تقریب میں وسیم احمد کی ملاقات ابراہیم سے ہوئی اور عمروں کے فرق کے باوجود جلد وہ آپس میں گھل مل گئے۔ ان میں دوستی تھی لیکن وسیم احمد اسے چچا کہتا تھا۔ تقریباً ہر مہینے ان کی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ ابراہیم کے پاس آتے یا ابراہیم ان سے ملنے بلوبرگ آتا تھا۔ عمارہ کو ابراہیم... اچھا لگتا تھا۔ وہ اس سے بہت پیار سے پیش آتا اور اس کی باتوں میں پوری دلچسپی لیتا تھا۔ عمارہ کو ایسے لوگ بہت اچھے لگتے تھے جو اس کی باتوں میں دلچسپی لیں۔

عمارہ نے کال بیل بجائی تو ایک منٹ بعد ابراہیم علی نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر چونکا۔ ''عمارہ! وسیم اور سارہ بھی آئے ہیں؟''

''نہیں، میں اکیلی آئی ہوں۔'' وہ بولی۔

ابراہیم علی فکر مند ہو گیا۔ وہ اسے اندر لے آیا۔ ''تم اکیلی کیسے آئیں؟''

''پاپا نے مجھے راستہ دکھا دیا تھا۔'' اس نے سادگی سے کہا اور اپنی جیکٹ سے ایک چھوٹا سا لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ''پاپا نے آپ کے لیے دیا تھا۔''

ابراہیم نے لفافہ لے کر کھولا اور اس میں سے نکلنے والا رقعہ پڑھا تو اس کے جھریوں زدہ چہرے پر جھریوں کا مزید اضافہ اور ہو گیا۔ اس نے عمارہ کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں پتا ہے اس لفافے میں کیا ہے؟''

''نہیں۔''

''وسیم احمد نے کچھ اور بھی کہا تھا تم سے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ابراہیم نے سب سے پہلے اپنے اپارٹمنٹ کی تمام کھڑکیوں پر پردے برابر کردیے۔ پھر وہ عمارہ کے پاس آیا اور آہستہ سے بولا۔ ''تمہارے پاپا نے کہا ہے کہ میں تمہارا خیال رکھوں اور تم وہی کرو گی جو میں کہوں گا، ٹھیک ہے؟''

''جی چچا جان۔'' عمارہ نے معصومیت سے سر ہلایا۔

''تمہیں یہاں خاموشی سے رہنا ہے۔ کوئی آواز نہیں نکالنی یا ایسی حرکت نہیں کرنی جس سے پتا چلے کہ یہاں میرے علاوہ بھی کوئی رہ رہا ہے۔ سمجھ گئیں؟''

''جی چچا جان۔'' وہ بولی۔

''میں کچھ دیر کے لیے جارہا ہوں اور دروازہ باہر سے بند کردوں گا۔ اگر مجھے دیر ہو جائے تو پریشان مت ہونا۔''

ابراہیم اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ وسیم نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ کوئی رابطہ نہیں کرے گی۔ یعنی اسے کال نہیں کرے گی اور نہ ہی انٹرنیٹ سے رابطہ کرے گی۔ عمارہ کے پاس موبائل تھا لیکن وسیم نے اسے ساتھ لانے نہیں دیا تھا۔ اس کے ذہن میں سوالات آرہے تھے مگر ذہن اتنا تیز نہیں تھا کہ صورتِ حال کا تجزیہ کرسکتا۔ زیادہ سوچیں انسان کو پریشان کرتی ہیں۔ وہ زیادہ نہیں سوچتی تھی اس لیے اب پُرسکون تھی۔ اس نے وقت گزاری کے لیے اپنی کامک بک نکالی اور اسے دیکھنے لگی۔ اسے کامک کا شوق تھا۔ وسیم ہر مہینے اس کی پسند کی کامک بکس لا کر دیتا تھا۔ ابراہیم ایک گھنٹے بعد آیا۔ اب وہ مطمئن لگ رہا تھا۔ وہ کچھ سامان بھی لایا تھا۔ اس نے دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع کردی۔ اس دوران میں وہ عمارہ سے سوالات کرتا رہا۔ عمارہ جواب دیتی رہی مگر وہ اسی سوال کا جواب دیتی تھی جس کے بارے میں اسے علم ہوتا تھا کہ اسے کیا جواب دینا ہے۔ باقی سوالات پر وہ صرف شانے اچکانے پر اکتفا کرتی تھی۔ یہ بات ابراہیم بھی جانتا تھا اس لیے وہ کوئی سوال دوبارہ نہیں کرتا تھا۔

اگلی صبح وہ لیونگ روم میں صوفے پر بیدار ہوئی تو اسے بیڈروم سے ٹی وی کی آواز آرہی تھی۔ بلوبرگ کا نام آیا تو وہ اٹھ کر دروازے تک آئی اور اندر جھانکا۔ ابراہیم ٹی وی کے سامنے ساکت کھڑا تھا۔ اسکرین پر شعلے دکھائے جارہے تھے جو ایک تباہ شدہ مکان سے اٹھ رہے تھے۔ عمارہ چند لمحے دیکھتی رہی پھر اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ اس نے مکان کے آس پاس کی جگہ پہچان لی تھی۔ یہ اس کا اور اس کے ماں باپ کا گھر تھا۔ اب وہاں صرف ایک گڑھا رہ گیا تھا جس سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ پولیس اور فائر فائٹرز وہاں موجود تھے۔ چیخ سن کر ابراہیم چونکا پھر وہ تیزی سے اس کے پاس آیا۔ اس نے عمارہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ پہلی چیخ کے بعد وہ خاموشی سے رو رہی تھی اور ابراہیم اس کا سر تھپکتے ہوئے دلاسا دے رہا تھا۔

''بس میری بچی... صبر کرو... اللہ کی مرضی یہی تھی۔''

''پاپا... ماما؟'' عمارہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

اس سوال کا جواب ابراہیم کے چہرے پر لکھا تھا۔ عمارہ پھر رونے لگی اور اپنی آواز روکنے میں اسے خود پر اتنا جبر کرنا پڑا کہ اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ابراہیم نے اسے نیند کی گولی دے دی اور کچھ دیر بعد وہ روتے روتے سو گئی۔ شام کو اٹھی تو اس کی طبیعت بہتر تھی۔ ابراہیم نے اسے مجبور کر کے کھلایا کیونکہ اس نے گزشتہ رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ وہ بار بار ابراہیم سے

ماں باپ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ ابراہیم نے معلوم کیا تھا، پولیس نے وسیم احمد کے بھتیجے محمود احمد کی درخواست پر دونوں لاشیں پاکستان بھیجنے کا انتظام کر دیا تھا۔ لاشیں ناقابلِ شناخت اور دیکھنے کے قابل نہیں تھیں اس لیے انہیں مخصوص تابوت میں بند کر کے روانہ کیا جاتا۔ دوسرے ضروری فرائض یہیں انجام دے لیے جاتے۔ جیسے غسل اور کفنانا وغیرہ۔

محمود احمد آسٹریلیا میں زیرِ تعلیم تھا اور وہ اس سانحے کی اطلاع ملتے ہی جنوبی افریقا پہنچ گیا تھا۔ امکان یہ تھا کہ لاشیں آج رات یا کل صبح روانہ کی جاتیں۔ یہ ساری معلومات ابراہیم نے اس دوران میں حاصل کی تھیں جب عمارہ سو رہی تھی۔ عمارہ محمود احمد کے بارے میں سن کر حیران رہ گئی تھی کہ وہ یہاں کیسے پہنچ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا محمود احمد نامی کزن بھی تھا۔ وسیم اور سارہ نے اسے اپنے خاندانوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ابراہیم رات تک اس کے ساتھ رہا اور اسے تسلی دیتا رہا۔ عمارہ کے آنے سے وہ کچھ پریشان ہوا تھا لیکن جب اس نے محمود احمد کے بارے میں سنا تو وہ اب اتنا فکرمند نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر عمارہ کو نیند کی دوا دے کر سلا دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ محمود سے کس طرح رابطہ کرے۔ ویسے اسے حیرت تھی کہ محمود ہزاروں میل دور سے اتنی جلدی کیسے جنوبی افریقا آ گیا تھا۔

☆☆☆

محمود احمد پرتھ یونیورسٹی میں اپلائیڈ کیمسٹری میں ماسٹر کر چکا تھا اور اب ایم فل کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ وسیم احمد کے بڑے بھائی نعیم احمد کا بیٹا تھا۔ محمود تقریباً چوبیس سال کا خوش شکل نوجوان تھا۔ بینائی کمزور ہونے کی وجہ سے وہ عینک لگاتا تھا مگر جدید فیشن کی موٹے فریم والی عینک بھی اس پر اچھی لگتی تھی۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ اس کے ایک چچا وسیم احمد جنوبی افریقا میں رہتے ہیں لیکن ملاقات آسٹریلیا میں ایک سائنسی کانفرنس میں ہوئی تھی۔ تب سے وہ وسیم احمد سے رابطے میں تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ وہ چھٹی سے فائدہ اٹھا کر اس سے ملنے جنوبی افریقا آیا تھا اور جب وہ ائرپورٹ پر اترا تو اسے اس سانحے کا پتا چلا۔ اس نے پولیس سے رابطہ کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ پھر اس نے گھر والوں سے رابطہ کر کے انہیں بتایا۔ وہاں رونا پیٹنا مچ گیا تھا۔ محمود کے دادا یعنی وسیم کے باپ علیم احمد نے بیٹے اور بہو کی لاشیں پاکستان لانے کو کہا۔ محمود نے پولیس سے بات کی اور وہ ضروری کارروائی کے بعد لاشیں اس کی مرضی کے مطابق پاکستان بھیجنے پر راضی ہو گئی کیونکہ محمود ہی اب وارث تھا اور عمارہ کی ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ وارث سمجھی جاتی۔ دوسرے وہ خود غائب تھی۔ محمود کو جب پتا چلا کہ مکان سے صرف وسیم اور سارہ کی لاشیں ملی تھیں اور عمارہ کا کچھ پتا نہیں تھا، تب سے وہ عمارہ کی تلاش میں تھا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ یہاں وسیم احمد کی جان پہچان کن لوگوں سے تھی۔ اس نے پولیس سے درخواست کی کہ وسیم احمد کے جان پہچان کے لوگ جب رابطہ کریں تو اسے بھی مطلع کیا جائے۔ شام تک کئی افراد نے اس سے رابطہ کر کے وسیم اور سارہ کی تعزیت کی تھی۔ یہ سب لوگ کیپ ٹاؤن یا آس پاس رہتے تھے اور ان میں سے اکثر وسیم کے کولیگ تھے۔ مگر ان میں سے کسی کو عمارہ کا علم نہیں تھا۔ کیپ ٹاؤن یونیورسٹی میں عنایت اللہ نامی شخص سے وسیم احمد کی دوستی تھی کیونکہ دونوں پاکستانی نژاد تھے۔ اس کا نمبر پولیس نے محمود کو دیا تھا۔ عنایت اللہ ایڈمنسٹریشن میں ایک اچھے عہدے پر تھا۔ محمود نے اس سے ملاقات کی درخواست کی تو وہ بولا۔ ”میں خود آ جاتا ہوں۔ تم کہاں رکے ہوئے ہو؟“

محمود نے ہوٹل کا بتایا جہاں وہ مقیم تھا۔ عنایت اللہ ایک گھنٹے میں پہنچ گیا۔ وہ تقریباً پچاس سال کا سنجیدہ سا شخص تھا۔ اس نے پہلے تعزیت کی اور پھر افسردگی سے بولا۔ ”وسیم پہلے ہی اس بات کا خدشہ ظاہر کر چکا تھا۔“

محمود چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”اسے خطرہ تھا کہ کچھ لوگ اس کے درپے ہیں۔ خاص طور سے جب سے اس نے پانی سے ہائیڈروجن حاصل کرنے کا سستا طریقہ ایجاد کرنے کا دعویٰ کیا تھا۔“

”سنا تو میں نے بھی تھا۔“ محمود احمد نے سر ہلایا۔ ”لیکن اگر چچا جان نے ایسا کوئی کام کیا تھا تو اس سے کسی کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا اور وہ کیوں ان کے درپے ہو جاتا؟“

”میں بھی اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن ایک بار وسیم نے بتایا تھا کہ دنیا کے ٹھیکے دار کسی ایسے سستے ایندھن کے خلاف ہیں جو ہر ملک آسانی سے حاصل کر سکے۔ اس سے دنیا پر ان کی اجارہ داری خطرے میں پڑ جائے گی۔“

محمود احمد نے سر ہلایا۔ ”یہ تو ہے... پانی ہر ملک میں ہے اور اس سے ہائیڈروجن حاصل کرنے کا کوئی سستا طریقہ دریافت ہو جائے تو توانائی کے بہت سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔“

”وسیم نے یہ طریقہ ایجاد کر لیا تھا اور اسی وجہ سے اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔“

”لیکن پولیس تو اسے حادثہ قرار دے رہی ہے۔“

محمود بے چین ہو گیا۔ اب تک اس کے گمان میں بھی نہیں آیا تھا کہ اس کے چچا چچی کو اصل میں قتل کیا گیا تھا۔

عنایت اللہ نے سر ہلایا۔ ”اگر یہ انہی لوگوں کا کام ہے جو وسیم کے ایجاد کردہ پروسیس کے مخالف تھے تو پولیس ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہو گی۔ وہ حکومتوں کو اپنی مرضی پر چلا سکتے ہیں۔ تم میرا اشارہ سمجھ رہے ہو نا؟“

محمود نے سر ہلایا۔ ”اگر یہ ان کا کام ہے تو اس صورت میں کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ چچا جان کا ایجاد کردہ پروسیس کہاں ہے... انہوں نے اسے کہیں محفوظ تو کیا ہو گا؟“

”میرا خیال ہے کہ وہ مکان کے ساتھ ہی تباہ ہو گیا ہے۔“ عنایت اللہ نے کہا۔

”اس سے بھی اہم سوال ہے کہ میرے چچا کی بیٹی عمارہ کہاں ہے؟“

”میں نے تمام جان پہچان والوں سے معلوم کیا ہے لیکن کسی کو بھی عمارہ کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔“

”چچا جان کی کسی سے زیادہ دوستی تھی؟“

”یونیورسٹی کی حد تک تو مجھ سے ہی تھی۔ اس سے باہر کے لوگوں کو میں کم جانتا ہوں۔“ عنایت اللہ بولتے بولتے رکا پھر اس نے کہا۔ ”ہاں، ایک نام ذہن میں آ رہا ہے۔ ابراہیم علی نامی شخص ہے۔ عمر میں وسیم سے خاصا بڑا ہے لیکن سنا تھا کہ اس کی وسیم سے گہری واقفیت تھی۔ دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی تھا۔“

اب تک محمود سے جتنے لوگوں نے رابطہ کیا تھا، ان میں کوئی ابراہیم علی شامل نہیں تھا جبکہ عنایت اللہ بتا رہا تھا کہ اس کے ابراہیم علی سے گھریلو تعلقات تھے۔ اس صورت میں اسے لازمی رابطہ کرنا چاہیے تھا۔ محمود نے پوچھا۔ ”آپ کو علم ہے کہ ابراہیم علی کہاں رہتا ہے؟“

”پتا معلوم نہیں ہے۔ بس اتنا پتا ہے کہ وہ ولنگٹن میں کہیں رہتا ہے۔ یہ شہر کیپ ٹاؤن سے کوئی تیس میل دور شمال مشرق میں ہے۔“

”میں آپ کا شکر گزار ہوں۔“ محمود نے اسے اپنا موبائل نمبر دیا۔ ”اگر کوئی بات معلوم ہو تو پلیز مجھے کال کر لیجیے گا۔“

”کیوں نہیں۔“ عنایت اللہ نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”میتوں کی روانگی کب ہے؟“

”کل صبح چھ بجے کی ایک فلائٹ میں۔“ محمود بولا۔

”کیا تم بھی جا رہے ہو؟“

”نہیں، میں عمارہ کے ملنے تک یہیں رکوں گا۔ اب وہ میری ذمے داری ہے۔“

”میں ائرپورٹ آؤں گا۔“ عنایت اللہ نے کہا اور رخصت ہو گیا۔

رات کے دس بج رہے تھے اور محمود گزشتہ چوبیس گھنٹے سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا تھا۔ اس کا تھکن سے برا حال تھا مگر ابھی میتوں کی روانگی کا حتمی پلان طے کرنا تھا۔ پھر اسے رہ رہ کر عمارہ کا خیال آ رہا تھا۔ وہ اس کے چچا کی بیٹی تھی اور اب ان کے بعد اس کی ذمے داری تھی۔ مگر وہ کہاں تھی؟ محمود بارہ بجے تک مصروف رہا۔ بالآخر فلائٹ میں میتوں کی روانگی کنفرم ہوئی۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ خود بھی اسی فلائٹ سے پاکستان چلا جائے لیکن اب وہ عمارہ کو تلاش کیے بغیر یہاں سے نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے پاکستان کال کر کے صورتِ حال بتائی تو علیم احمد نے بھی اسے رک کر عمارہ کو تلاش کر کے لانے کا کہا۔ اجازت ملنے کے بعد وہ پُرسکون ہو گیا۔ اب تک اسے پولیس پر اعتماد تھا لیکن عنایت اللہ نے یہ کہہ کر کہ وسیم اور سارہ کی اموات قتل بھی ہو سکتی ہیں اس کا اعتماد متزلزل کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے پولیس افسران کو ابراہیم علی کے بارے میں نہیں بتایا۔ ہوٹل میں آ کر وہ صبح پانچ بجے کا الارم لگا کر سو گیا۔ فلائٹ روانگی کے موقع پر اس کا ائرپورٹ پر موجود ہونا ضروری تھا۔

☆☆☆

عنایت اللہ کیپ ٹاؤن کے نواحی علاقے میں رہتا تھا۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے دو جوان بیٹے تھے۔ ایک جوہانسبرگ یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا اور دوسرا ڈربن کے ایک میڈیکل کالج میں پہلے سال کا طالبِ علم تھا۔ گھر میں بس وہی دو میاں بیوی تھے۔ عنایت اللہ کی بیوی جودینا ملاٹو نسل سے تھی۔ اس کا دادا ایک سفید فام تھا۔ وہ ایک اسکول میں ٹیچر تھی۔ دونوں میاں بیوی مل کر اپنے بیٹوں کی تعلیم کا خرچ برداشت کر رہے تھے۔ عنایت اللہ محمود سے مل کر آیا تو اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن اس نے جودینا سے کہا۔ ”مجھے صبح پانچ بجے اٹھا دینا۔ وسیم اور اس کی بیوی کی میتیں کل صبح پاکستان روانہ ہوں گی۔ میں ائرپورٹ جاؤں گا۔“

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”دوا لے رہا ہوں، صبح تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

عنایت اللہ فلو کا اثر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے دوا لی اور پھر سو گیا۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ دم گھٹنے کا سبب وہ ہاتھ تھا جو اس کی گردن پر جما ہوا تھا۔ سامنے

ایک سیاہ پوش تھا جس کے چہرے کے نقاب سے جھانکتی سرخ آنکھیں درندگی سے بھرپور تاثر لیے ہوئے تھیں۔ عنایت اللہ خوف زدہ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ شخص کون ہے اور اس کے بیڈ روم میں کہاں سے آیا۔ تب اس کی نظر ایک طرف کرسی پر بیٹھی جووینا پر گئی، اس کے سر پر غلاف چڑھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے سر پر بھی ایک سیاہ پوش موجود تھا۔ دیو قامت سیاہ پوش نے عنایت اللہ کو کسی کھلونے کی طرح اٹھا کر ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور پھر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تو اس نے لباس سے ایک لمبا چھرا نکالا اور جووینا کا سر اوپر کیا کہ اس کی گردن نمایاں ہو جائے۔ پھر اس نے چھرا یوں بلند کیا جیسے ایک ہی وار میں جووینا کا سر دھڑ سے الگ کر دے گا۔ عنایت اللہ بے ساختہ چلایا۔

"نہیں...."

سیاہ پوش کا ہاتھ رک گیا۔ عنایت اللہ کو جکڑے سیاہ پوش نے غرا کر کہا۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری بیوی کا سر اپنے جسم کے ساتھ لگا رہے تو میرے کچھ سوالوں کے جواب سو فیصد سچائی کے ساتھ دینا۔"

"پوچھو۔" عنایت اللہ نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

"تم محمود سے ملنے کیوں گئے تھے؟"

"وسیم سے میرے تعلقات تھے اور وہ اس کا بھتیجا ہے۔ میں اس کے پاس تعزیت کے لیے گیا تھا۔"

"تمہاری اس سے کیا بات ہوئی... خاص طور سے عمارہ کے بارے میں؟"

عنایت اللہ کو جھٹکا لگا اور اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے ہکلا کر کہا۔ "اس کے بارے میں...."

سیاہ پوش نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تو اس نے چھرا جووینا کی گردن پر رکھ دیا۔ اس کے بعد عنایت اللہ کے لیے زبان بند رکھنا ممکن نہیں رہا۔ وہ بولتا چلا گیا اور اس نے محمود سے ہونے والی تمام گفتگو سنا دی۔ سیاہ پوش غور سے سنتا رہا پھر اس نے کہا۔ "اگر اس میں ایک لفظ غلط ہوا تو ہم دوبارہ آئیں گے اور تمہاری بیوی کی گردن کاٹ دیں گے۔ ہمارے جانے کے بعد پانچ منٹ سے پہلے اس کمرے سے باہر مت نکلنا۔ پولیس کو اطلاع دینا چاہو تو تمہاری مرضی ہوگی۔"

سیاہ پوش کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی عنایت اللہ بیوی کی طرف لپکا۔ اس نے سر سے غلاف اتارتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔ "تم ٹھیک ہو نا؟"

جووینا گہری سانسیں لے رہی تھی اور بے حد خوف زدہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس لمحے عنایت اللہ نے فیصلہ کیا کہ وہ پولیس سے رابطہ نہیں کرے گا اور نہ ہی اس معاملے میں مزید پڑے گا۔ اس کے لیے اپنی بیوی اور بیٹوں کی سلامتی اولیت رکھتی تھی۔ اس وقت صبح کے سات بج رہے تھے اور باہر روشنی پھیل رہی تھی۔ جووینا نے اس کی ہدایت کے برعکس اسے نہیں اٹھایا تھا اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ وہ اس وقت اکیلی ہوتی اور نہ جانے یہ سیاہ پوش اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے؟

☆☆☆

عنایت اللہ کے گھر سے نکلنے والے جان نے ڈیوڈ کارٹر سے رابطہ کر کے اسے حاصل شدہ معلومات کے بارے میں بتایا۔ اس نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "ابراہیم علی... اس کا پتا معلوم کرو۔"

"یہ مشکل نہیں ہے، طر معلوم کر سکتا ہے۔" جان نے کہا تو ڈیوڈ نے طر کو حکم دیا اور اس نے سچ مچ پانچ منٹ میں بجلی کمپنی کے ریکارڈ سے ابراہیم علی کا پتا نکال لیا۔ ڈیوڈ کارٹر نے پتا جان کو بتایا اور ہدایت کی۔

"کام ایسے کرنا کہ کوئی نشان نہ رہے، لڑکی بہر صورت ملنی چاہیے۔ اگر وہ زندہ نہیں ملتی تب بھی اس کی لاش اور اس کے پاس موجود سامان ہمارے قبضے میں آنا چاہیے۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟"

"یس سر۔" جان نے کہا اور اپنے ساتھی مارک کو گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ ان کا رخ ونگٹن کی طرف تھا۔ بیک وقت چھ ایجنٹوں کی موت ان کے لیے بڑا سانحہ تھی۔ افریقا میں آج تک سی آئی اے کو اتنا بڑا نقصان نہیں ہوا تھا اور ایجنٹس کی کمی سے انہیں عمارہ کی تلاش میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ جان نے محمود کی نگرانی کی تجویز پیش کی تھی اور یہی کام آئی۔ عنایت اللہ محمود سے ملنے آیا تو ان کی نظر میں آ گیا۔ جان کو شبہ ہوا تھا کہ عنایت اللہ کسی خاص وجہ سے محمود سے ملنے گیا تھا۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ درجہ بدرجہ کامیابی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ابھی تک چینیوں کی طرف سے کوئی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

محمود نے نم آنکھوں سے وسیم اور سارہ کے تابوت طیارے پر سوار ہوتے دیکھے۔ تقریباً بیس گھنٹے کی پرواز کے بعد یہ لاہور پہنچتے۔ تابوتوں کی روانگی کے وقت وسیم اور سارہ کے کچھ واقف کار اور یونیورسٹی کے کچھ افراد موجود تھے۔ محمود

کو عنایت اللہ کا خیال آیا کیونکہ اس نے آنے کو کہا تھا مگر وہ نہیں آیا۔ جب تابوت طیارے میں منتقل ہو گئے تو وہ لاؤنج میں آیا۔ اس نے عنایت اللہ کا نمبر ملایا۔ خاصی دیر تک بیل جاتی رہی اور جب وہ مایوس ہو کر کال ختم کرنے والا تھا، کال ریسیو کر لی گئی۔ عنایت اللہ نے اجنبی سی آواز میں پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

محمود کو اس کے انداز پر تعجب ہوا کیونکہ عنایت اللہ کے پاس اس کا موبائل نمبر تھا اور وہ اسے پہچان گیا تھا۔ "آپ نے کہا تھا کہ آپ ائرپورٹ آئیں گے۔"

"میرا اب اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" عنایت اللہ نے پہلے والے انداز میں کہا اور کال کاٹ دی۔ محمود پریشان ہو گیا۔ یہ عنایت اللہ رات والے شخص سے بالکل مختلف لگ رہا تھا۔ اسے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اس نے دوبارہ کال کی۔

"کیوں کال کر رہے ہو بار بار؟" عنایت اللہ پھٹ پڑنے والے انداز میں بولا۔ "جب میں کہہ چکا ہوں کہ اس معاملے سے اب میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"مجھے بتائیں آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے، کوئی مسئلہ ہے؟"

"سنو۔" عنایت اللہ نے سرگوشی میں کہا۔ "بات دور تک چلی گئی ہے۔ تم بھی جتنی جلدی یہاں سے چلے جاؤ، تمہارے لیے بہتر ہے۔"

"لیکن عمارہ...."

"اس کو بھول جاؤ اور مجھے بھی۔" عنایت اللہ نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اس بار اس نے موبائل بھی بند کر دیا تھا۔ محمود نے پھر کال ملانے کی کوشش کی تو آگے سے موبائل بند ہونے کی اطلاع سنائی دی۔ وہ فکرمند ہو گیا کہ عنایت اللہ نے عمارہ کے بارے میں ایسا کیوں کہا۔ اچانک اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا اور وہ جلدی سے باہر آیا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو ایک ٹیکسی اس کے پاس آ کر رکی۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھا اور اس نے ونگٹن چلنے کو کہا۔ ڈرائیور نے پوچھا۔ "ونگٹن میں کہاں سر؟"

"تم مجھے شہر کے مرکز میں اتار دینا۔" محمود نے کہا۔ اس کے پاس ابراہیم علی کا پتا نہیں تھا۔ اس کے کہنے پر ٹیکسی والے نے تیز ڈرائیو کی اور وہ ساڑھے سات بجے ونگٹن میں تھا۔ ایک چوک پر ٹیکسی والے نے اسے اتار دیا۔ یہ تقریباً قصبہ نما شہر تھا مگر یہاں اچھی خاصی آبادی تھی اور تاحدِ نگاہ مکانات یا عمارتیں تھیں۔ ایسے میں کسی ایک فرد کو جس کا صرف نام معلوم ہو، تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ اسے خیال آیا کہ فون ہیلپ لائن سے مدد لے۔ اتفاق سے بوتھ یہاں موجود تھا۔ اس نے ہیلپ لائن کا نمبر ملایا اور اس سے ونگٹن میں ابراہیم علی کا فون نمبر یا گھر کا پتا مانگا۔ آپریٹر نے چیک کر کے بتایا۔ "سوری... ونگٹن میں ہمارے پاس کوئی ابراہیم علی نہیں ہے۔"

"ایک منٹ۔" محمود نے جلدی سے کہا۔ "دیکھیں، میں بیرونِ ملک سے آیا ہوں اور مجھ سے پتا کھو گیا ہے۔ میں یہاں صرف ان صاحب کو جانتا ہوں۔ اس لیے پلیز میری مدد کریں اور مجھے ان کا پتا یا موبائل نمبر ہو تو مہیا کر دیں۔"

آپریٹر کو اس پر ترس آگیا۔ اس نے محمود کو چند منٹ کے لیے ہولڈ کرایا اور پھر اسے ابراہیم علی کا موبائل نمبر بتایا۔ پتا نہیں اس نے کہاں سے حاصل کیا تھا مگر محمود کا کام بن گیا۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے آپریٹر کا شکریہ ادا کیا اور کال کاٹ کر موبائل نمبر ملایا۔ دوسری گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی۔

"ابراہیم علی؟"

"بات کر رہا ہوں۔"

محمود نے اپنا تعارف کرایا۔ "میں وسیم احمد کا بھتیجا محمود احمد بات کر رہا ہوں۔"

"محمود احمد۔" اس بار ابراہیم علی کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ "میں خود تم سے ملنا چاہتا تھا۔ کہاں ہو تم؟"

"آپ کے شہر میں۔" اس نے جواب دیا اور پھر اصل بات کی۔ "آپ عمارہ کے بارے میں جانتے ہیں؟"

"تم جگہ بتاؤ میں لینے آرہا ہوں۔" ابراہیم علی نے اس کا سوال نظر انداز کر کے کہا تو محمود نے دوبارہ سوال کیے بغیر اسے لوکیشن سمجھائی۔

"میں سمجھ گیا... بس پانچ منٹ انتظار کرو۔"

پانچ منٹ بعد ایک پرانی فاکس ویگن محمود کے سامنے رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک معمر پاکستانی نژاد شخص موجود تھا۔ اس نے باہر سر نکالا۔ "محمود احمد؟"

"جی... آپ ابراہیم علی ہیں؟"

"ہاں اندر آجاؤ۔" اس نے دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔ محمود کے بیٹھتے ہی اس نے کار آگے بڑھا دی۔

"عمارہ آپ کے پاس ہے؟"

"ہاں لیکن میں نے فون پر بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔" ابراہیم علی نے سر ہلایا۔ "وسیم نے دو دن پہلے اسے میرے پاس بھیج دیا تھا۔ شاید اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔"

محمود چونکا۔ "آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ ان کے ساتھ کچھ ہوا ہے؟"

"اس نے مجھے خط بھی بھیجا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں عمارہ کی حفاظت کروں۔ ویسے اور کس کا یہ خیال ہے؟"

محمود نے عنایت اللہ کے بارے میں بتایا اور پھر اس کے عجیب رویے کا ذکر بھی کیا۔ "مجھے لگ رہا ہے کہ اسے کوئی دھمکی ملی ہے۔"

"میں اسے جانتا ہوں۔ اچھا آدمی ہے اور وسیم کا بہت اچھا دوست تھا۔" ابراہیم علی فکر مند ہو گیا۔ "اگر کوئی اس کے پاس آیا تھا اور اس کے خوف سے وہ اس قدر بدل گیا ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ اس نے اسے میرے بارے میں بتا دیا ہو۔"

"مجھے بھی یہی خیال آیا تھا اسی لیے میں ائرپورٹ سے سیدھا یہیں چلا آیا۔" محمود نے کہا۔ "یہ بتائیے کہ چچا جان نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجائے تو اس صورت میں عمارہ کا کیا کرنا ہے؟"

"مجھے حیرت ہے، اس نے اس بارے میں کوئی ہدایت نہیں کی۔ حالانکہ عمارہ کے ماں باپ کے دونوں طرف کے رشتے دار موجود ہیں۔ ایک منٹ، تم خود خط پڑھ کر دیکھ لو۔" ابراہیم علی نے خط نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا جو عمارہ نے لفافے میں بند اس کے حوالے کیا تھا۔ محمود نے خط دیکھا، وسیم نے لکھا تھا۔

"چچا جان! میں اس وقت بہت مشکل میں ہوں۔ کچھ ایسے لوگ میرے درپے ہو گئے ہیں جن سے اس زمین پر مجھے مشکل سے ہی کہیں پناہ مل سکتی ہے اور اب وقت نہیں رہا ہے۔ مجھے اپنی اور سارہ کی اتنی فکر نہیں ہے جتنی عمارہ کی ہے۔ میں اس امید کے ساتھ اسے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں کہ آپ اس کی حفاظت کریں گے۔ اگر میں جیتا رہا تو اپنی امانت لے جاؤں گا۔

فقط وسیم احمد۔"

محمود نے خط واپس اس کی طرف بڑھا دیا۔ "ہاں، اس میں واقعی انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔"

"اس لیے میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس بچی کا کیا کروں۔ ابھی تو وہ صدمے کی کیفیت میں ہے مگر آنے والے دنوں میں اسے کسی نہ کسی کے حوالے تو کرنا تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ تم آگئے۔ اگر تم نہ آتے تو میں خود تم سے رابطہ کرتا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ عمارہ کو بھی ان لوگوں سے خطرہ ہے جو اس کے ماں باپ کے قاتل ہو سکتے ہیں۔"

ابراہیم علی نے بلڈنگ کے سامنے گاڑی روکی جس میں اس کا اپارٹمنٹ تھا۔ وہ اتر کر اندر کی طرف بڑھے تھے کہ محمود نے سڑک کے پار ایک بڑی سیاہ وین رکتے دیکھی۔ اس نے توجہ نہیں دی تھی۔ اس میں جان اور مارک تھے۔ کیپ ٹاؤن سے نکلنے کے بعد وہ غلط سڑک پر مڑ گئے تھے۔ اس وجہ سے انہیں یہاں تک پہنچنے میں دیر لگی تھی۔ انہوں نے ابراہیم اور محمود کو اندر جاتے دیکھا۔ جان نے ڈیوڈ کارٹر کو اطلاع دی۔ "وسیم احمد کا بھتیجا محمود احمد بھی یہاں آگیا ہے۔ وہ ابراہیم علی کے ساتھ ابھی اندر گیا ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" ڈیوڈ نے حکم

دیا۔ "طے شدہ احکامات پر عمل کرو۔ لڑکی زندہ یا مردہ ہر صورت میں ہمارے قبضے میں آنی چاہیے۔"

جان نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اپنے پستول نکال کر ان پر سائلنسر چڑھائے اور وین سے نیچے اتر آئے۔ اس وقت انہوں نے توجہ نہیں دی تھی کہ گلی کے کونے پر ایک زرد کار ابراہیم علی کی فاکسی کا تعاقب کرتی آئی تھی اور اس میں تین چینی نژاد افراد موجود تھے۔

☆☆☆

عمارہ اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔ اس نے چوتھی منزل سے دیکھا کہ محمود ابراہیم کے ساتھ آیا ہے۔ جب محمود کی کال آئی اور ابراہیم علی نے اس کا نام لیا تو عمارہ چونک گئی۔ کال سن کر ابراہیم علی نے اسے بتایا کہ وہ اس کے کزن کو لینے جا رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ عمارہ بے تابی سے منتظر تھی اور کھڑکی سے لگی کھڑی تھی۔ تب اس نے سیاہ وین دیکھی اور بلندی کی وجہ سے اسے اس طرف بیٹھے فرد کی حرکات صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے پستول نکال کر اس پر کوئی سیاہ لمبی سی چیز لگائی تو عمارہ نے دیکھ لیا تھا۔ اگرچہ وہ سمجھ نہیں سکی تھی مگر پستول دیکھ کر اسے خطرے کا احساس ہوا۔ جیسے ہی کال بیل بجی، وہ دروازے کی طرف بھاگی۔ اسے یاد تھا کہ ابراہیم علی کی آواز سن کر دروازہ کھولنا ہے۔ اس نے پہلے پوچھا اور جب ابراہیم نے جواب دیا تو اس نے دروازہ کھول دیا اور پھر محمود کو دیکھ کر ذرا جھجکی لیکن پھر اسے پستول والا یاد آیا تو اس نے جوش سے کہا۔ "چچا جان! نیچے سیاہ وین میں ایک آدمی ہے۔ اس کے پاس پستول ہے۔ اس نے اس پر کوئی لمبی سی سیاہ چیز لگائی تھی۔"

ابراہیم چونکا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر کھڑکی سے جھانکا اور محمود نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ وہ عمارہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عمارہ نے جھجک کر پوچھا۔ "تم محمود ہو؟"

"ہاں، تمہارے پاپا میرے چچا تھے۔"

باپ کے ذکر پر عمارہ کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ ابراہیم علی کھڑکی کا پردہ برابر کر کے ان کی طرف آیا۔ "میرا خیال ہے کوئی گڑبڑ ہے۔ دو افراد اتر کر عمارت میں آئے ہیں اور وہ اپنے انداز سے خطرناک لگ رہے ہیں۔ محمود! ایسا کرو تم عمارہ کو لے کر ہنگامی حالات والی سیڑھی سے اتر جاؤ اور یہاں سے کچھ دور مون لائٹ نامی ریستوران ہے، وہاں جا کر میرا انتظار کرو۔ اسی گلی سے نکلو گے تو بڑی سڑک پر شمال کی جانب سے دائیں طرف ہے۔"

محمود نے سر ہلایا اور عمارہ سے کہا۔ "تمہارا کوئی سامان ہے تو لے لو؟"

عمارہ نے اپنا بیگ اٹھا کر پشت پر پہن لیا۔ ابراہیم انہیں کچن کے ساتھ کھلنے والے ہنگامی سیڑھیوں کے دروازے تک لایا۔ اسی لمحے باہر والے دروازے پر دستک ہوئی۔ ابراہیم نے عجلت میں کہا۔ "جاؤ جلدی، یہ وہی ہوئے تو میں انہیں روکنے کی کوشش کروں گا۔"

محمود، عمارہ کے ساتھ باہر آیا۔ ابراہیم نے عقب میں دروازہ بند کر لیا۔ یہ لوہے اور لکڑی سے بنی سیڑھیاں تھیں۔ محمود آگے تھا، عمارہ اس کے پیچھے اترنے لگی۔ اچانک اوپر سے چیخ سنائی دی۔ وہ دونوں رک گئے۔ عمارہ نے لرزتے لہجے میں کہا۔ "ابراہیم چچا کی آواز تھی نا؟"

"جلدی کرو۔" محمود نے اس کا ہاتھ تھام کر تیزی سے اترنا شروع کر دیا مگر کچھ دیر بعد اسے مشکل ہونے لگی۔ عمارہ کا جسم چھریرا اور لچک دار تھا جبکہ اس کا جسم سخت اور غیر لچک دار تھا۔ عمارہ آگے نکلی اور اب تیرتی ہوئی نیچے جا رہی تھی جبکہ محمود کو سنبھل کر اترنا پڑ رہا تھا۔ وہ ابھی آدھی منزل اوپر تھا کہ عمارہ نیچے پہنچ گئی۔ یہ چھوٹی سی گلی تھی جو ایک طرف سے بند تھی اور دوسری طرف یہ سڑک کی طرف نکل رہی تھی۔ اسی لمحے اوپر سے جان نمودار ہوا اور اس نے محمود کو دیکھتے ہی بے آواز پستول سے فائر کیا۔ گولی اس کے پاس سیڑھی پر لگی، وہ بال بال بچا تھا۔ عمارہ نے چیخ ماری۔ "محمود... کیا ہوا؟"

اب وقت نہیں تھا۔ محمود نے ریلنگ سے چھلانگ لگائی اور براہ راست نیچے پہنچ گیا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "میں ٹھیک ہوں، بھاگو۔"

بند سمت جانے سے وہ پھنس جاتے اس لیے وہ سڑک کی طرف بھاگے۔ اگرچہ محمود کے ذہن میں خدشہ تھا کہ سڑک پر بھی ان کا کوئی ساتھی نہ ہو مگر ان کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ محمود کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ ادھر وہ سڑک پر نکلے اور ادھر بلڈنگ سے دوسرا آدمی نکل آیا۔ وہ

لاجواب

ڈاکو سردار صاحب کے گھر گھس گیا اور بولا۔ "جلدی بتاؤ سونا کہاں ہے؟"

سردار: "پاگل کا بچہ اتنا بڑا گھر ہے کہیں بھی سو جاؤ۔ ہمیں اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔"

مارک تھا، اس نے انہیں دیکھتے ہی پستول نکال لیا تھا۔ عمارہ اور محمود مخالف سمت میں دوڑے۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ اور سر جھکائے بھاگ رہے تھے۔ اگر مارک نے فائرنگ کی تھی تو ان کو پتا نہیں چلا کیونکہ اس کے پستول پر بھی سائلنسر تھا۔ محمود نے عمارہ کو اپنی اوٹ میں رکھا تھا۔ اچانک سامنے سے فٹ پاتھ پر ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی نال والی گن دیکھ کر محمود ٹھٹکا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دشمنوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ محمود نے عمارہ کو روکا اور پھر دیوار سے لگا دیا۔ مگر آنے والے نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور اس نے مارک کا نشانہ لیا۔ اس کے پستول پر بھی سائلنسر تھا اس لیے وہ لمبا لگ رہا تھا۔ وہ مسلسل فائرنگ کرتے ہوئے مارک کی طرف جا رہا تھا۔ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے بھی وہ فائرنگ کرتا رہا۔ اچانک وہ جھٹکا کھا کر پیچھے ہوا۔ محمود نے دیکھا، اس کے دائیں پہلو سے کوٹ سرخ ہو رہا تھا لیکن دوسری طرف مارک یقیناً مارا گیا تھا کیونکہ وہ فٹ پاتھ پر چت پڑا تھا اور اس کے سر سے خون بہہ کر فٹ پاتھ کو سرخ کر رہا تھا۔ زخمی پلٹ کر آیا، تب محمود نے پہلی بار دیکھا۔ وہ نقوش سے چینی لگ رہا تھا۔ اس نے آف وائٹ رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ زیان تھا۔ سڑک کی طرف سے جیانگ بھاگتا ہوا آیا اور اس نے زیان کو سہارا دیا۔ گولی کا زخم یقیناً تکلیف دہ تھا لیکن اس کے چہرے سے تکلیف کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ زیان نے ان کی طرف دیکھا اور رواں انگریزی میں بولا۔

"چلو یہاں سے۔ ایک اور بھی ہے۔ وہ آ گیا تو ہم اتنی آسانی سے نہیں نکل سکیں گے۔"

ابھی زیان کے الفاظ منہ میں تھے کہ گلی سے جان نمودار ہوا۔ مارک کی لاش دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ اسے دیکھتے ہی زیان اور جیانگ نے فائرنگ کی مگر وہ بچ کر واپس گلی میں گھس گیا اور ان کی طرف فائرنگ کی مگر گولیوں نے انہیں نقصان نہیں پہنچایا۔ پھر سڑک پار زرد کار سے زیان کے دوسرے ساتھی نے جان کا نشانہ لیا اور اس کا بازو زخمی ہو گیا۔ محمود اور عمارہ نے آج تک اس قسم کی مار دھاڑ نہیں دیکھی تھی۔ دونوں دیوار سے لگے تھے۔ محمود نے خود کو سنبھال رکھا تھا اور کانپتی عمارہ کو اپنی اوٹ میں لیا ہوا تھا۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ کون ہو؟"

"دوست۔" زیان نے مختصر جواب دیا۔ "تمہیں بچانے آئے ہیں۔ اب یہاں سے چلو۔" محمود کو متذبذب دیکھ کر وہ پھر بولا۔ "دیر مت کرو، ممکن ہے ان کے اور ساتھی بھی ہوں۔ ہمیں پولیس سے بھی بچنا ہے۔"

محمود ہچکچا رہا تھا لیکن عمارہ نے اس سے کہا۔ "یہ ٹھیک کہہ رہا ہے، اس کے ساتھ چلو۔"

محمود نے دیکھا تھا کہ وہ چینی انہیں بچاتے ہوئے زخمی ہو گیا تھا اور ان پر گولیاں برسانے والے کو شوٹ کر دیا تھا۔ مجبوراً اس نے سر ہلایا..... ان کی زرد کار سڑک پار کھڑی تھی۔ اب یہ انتخاب تھا یا اتفاق کہ کار کا رنگ بھی زرد تھا۔ محمود عمارہ کو اپنی آڑ میں لیتے ہوئے بھاگ کر سڑک پار پہنچا اور کار کے پچھلے حصے میں گھس گیا۔ تیسرا چینی ان کو کور دے رہا تھا۔ جیانگ زیان کو سہارا دے کر کار تک لایا۔ اس دوران میں وہ وقفے وقفے سے گلی کی طرف فائرنگ کر رہے تھے اور جان بھی زخمی ہونے کے باوجود ان پر گولیاں برسا رہا تھا مگر کسی کی گولی کارگر ثابت نہیں ہوئی تھی۔ زیان فرنٹ سیٹ پر آ گیا اور جیانگ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ان کا تیسرا ساتھی عمارہ اور محمود کے ساتھ پیچھے آ گیا۔ جیانگ نے کار اسٹارٹ کی اور اسے تنگ موڑ دیتے ہوئے مخالف سمت میں نکلا۔ عقب سے جان گولیاں برساتا ہوا نمودار ہوا مگر زرد کار لمحوں میں اس کی زد سے دور نکل گئی تھی۔ اس نے اپنا زخمی بازو دیکھا۔ گولی گوشت پھاڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ مارک مر چکا تھا اور اسے لڑکی کی فکر تھی۔ وہ بھاگتا ہوا وین تک آیا اور پھر یہ دیکھ کر اس کے منہ سے ڈھیر ساری ناگفتنی نکل گئی کہ وین کے اگلے دونوں ٹائر پنکچر تھے۔ یہ ان کی عدم موجودگی میں ہوا تھا۔ وہ دونوں اوپر چلے گئے تھے مگر ڈیوڈ اس کی بات کہاں سنتا۔ اس لیے اس نے پہلے دونوں پنکچر ٹائروں پر گولیاں ماریں اور پھر ریڈیو پر ڈیوڈ سے رابطہ کیا اور کراہتی آواز میں رپورٹ دینے لگا۔ ڈیوڈ نے مارک کی موت کی خبر سکون سے سنی لیکن لڑکی کے ہاتھ سے نکلنے کا سن کر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔

"تم سب نااہل ہو۔" اس نے دہاڑ کر کہا۔

"وہ تعداد میں زیادہ تھے پھر فائرنگ کر کے وین کے ٹائر بھی ناکارہ کر دیے۔ میں اوپر گیا تھا اور میری عدم موجودگی میں مارک مارا گیا۔"

"تم نے اس آدمی ابراہیم کے ساتھ کیا کیا؟"

"اس نے مزاحمت کی تھی مجبوراً شوٹ کرنا پڑا۔"

"گڈ... اب ہمارے آنے تک وہیں رکو۔" خلافِ توقع ڈیوڈ نے اسے اس کارنامے کی داد دی۔

☆☆☆

کار دور نکل گئی تھی پھر بھی انہوں نے احتیاطاً سر نیچے کر

لیے۔ دور نکلنے کے بعد محمود نے پلٹ کر دیکھا تو زیان نے کہا۔ "فکر مت کرو، وہ پیچھے نہیں آئے گا۔ میرے ساتھی نے وین ناکارہ کر دی ہے۔"

"یہ اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔" جیانگ نے کہا۔ "زخمی ہونے والا افریقا میں سی آئی اے کی فیلڈ ٹیم کا انچارج جان ایڈگر تھا۔"

زیان نے جواب نہیں دیا، وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ امریکی جس طرح فائرنگ کر رہے تھے ایسا لگ رہا تھا کہ انہوں نے لڑکی کو مارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ لڑکی کی موت سے ان کا کوئی مفاد وابستہ تھا۔ اگر لڑکی کی موت سے امریکیوں کا مفاد تھا تو یقیناً لڑکی کی زندگی سے چینیوں کا مفاد وابستہ تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے چینی زبان میں کہا۔ "لڑکی کو ہر قیمت پر بچانا ہے۔ چاہے اس کے لیے ہمیں اپنی جان کیوں نہ دینی پڑے۔"

محمود ابتدائی سنسنی اور افراتفری سے سنبھل گیا تھا۔ اس نے زیان سے پوچھا۔ "تم لوگ کون ہو اور تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہمیں خطرہ ہے؟"

"ہم دوست ہیں۔ وسیم احمد کا ہم سے رابطہ تھا اور ہم اسے بچانے آئے تھے لیکن افسوس ہمیں دیر ہو گئی۔ اس کے دشمن اس سے پہلے کام کر گئے۔ اب ہم اس کی بیٹی کو بچائیں گے۔"

"دشمن کون ہے؟"

زیان اپنا کوٹ اور شرٹ ہٹا کر اپنے زخم کا معائنہ کر رہا تھا۔ "تم اس معاملے میں مت پڑو۔ زیادہ جاننا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"

اس کے ساتھی نے جھک کر زخم دیکھا اور تشویش سے شاید چینی زبان میں کچھ کہا۔ عمارہ نے محمود سے آہستہ سے کہا۔ "یہ کہہ رہا ہے کہ زخم خطرناک ہے۔ اس سے پہلے زخمی ہونے والا اپنے ساتھیوں سے ہر قیمت پر مجھے بچانے کو کہہ رہا تھا۔"

زیان چونکا۔ اس نے عمارہ سے چینی زبان میں کچھ کہا اور اس نے اسی میں جواب دیا۔ محمود حیران ہوا۔ "تمہیں چینی آتی ہے؟"

"ہاں، ماما نے سکھائی تھی۔ مجھے اردو بھی آتی ہے اور انگلش بھی۔"

زیان اور جیانگ نے آپس میں کچھ بات کی۔ اس دوران میں ان کی کار ولنگٹن سے باہر نکل چکی تھی اور ایک سنسان سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ یہ ہائی وے نہیں تھی۔ شاید ان لوگوں نے جان بوجھ کر ہائی کی طرف جانے سے گریز کیا تھا۔ اس کا امکان تھا کہ مقامی پولیس اب انہیں تلاش کر رہی ہو۔

محمود نے اندازہ لگایا کہ وہ مشرق کی طرف جارہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ ان سے پوچھتا کہ وہ کہاں جارہے تھے؟ ڈرائیور نے کار کچے میں اتار دی۔ یہاں باقاعدہ راستہ نہیں تھا اور ہموار زمین کے باوجود جھٹکے لگ رہے تھے۔ تقریباً دوسو گز دور کار جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان رک گئی۔ یہاں سڑک سے نظر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ سب نیچے اتر آئے۔ تیسرے چینی نے کار کی ڈکی کھولی اور اس میں سے ربر میٹریس نکال کر زمین پر بچھایا۔

زیان میٹریس پر لیٹ گیا۔ اس کے ساتھی نے پہلے اس کا کوٹ اور پھر شرٹ اتاری۔ نیچے بنیان خون میں تر تھی محمود اور عمارہ ایک طرف کھڑے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ زخم کا معائنہ کر کے تیسرے چینی نے ڈکی سے میڈیکل کٹ نکالی۔ اس میں صفائی اور ڈریسنگ کا تمام سامان تھا۔ ایک پاؤچ میں سرجری کے اوزار بھی تھے۔ اسپرٹ لیمپ پر پانی گرم کر کے تیسرے چینی نے پہلے اوزار ابالے۔ پھر اس نے روئی اور جراثیم کش دوا کی مدد سے زخم صاف کیا۔ آخر میں اس نے سخت ربر کا ایک ٹکڑا زیان کو دیا جو اس نے دانتوں میں دبا لیا۔ گولی دائیں پہلو میں پسلیوں سے ذرا نیچے لگی تھی اور گوشت میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے کسی اہم عضو کو نقصان نہیں کیا تھا اسی لیے زیان ہوش میں تھا۔ جیانگ سڑک کی طرف چلا گیا تھا۔ شاید وہ اس طرف کار کی آمد کے نشان مٹانے گیا تھا۔

''میں مدد کروں؟'' محمود نے پوچھا۔

''ہاں، تم مجھے چیزیں پکڑاتے جانا۔'' تیسرے چینی نے باریک ربر کے دستانے پہنتے ہوئے کہا۔ اس نے چمٹی اور ایک دھار والا آلہ سنبھالا۔ پہلے زخم چوڑا کیا تو زیان تڑپ گیا۔ دانتوں میں ربر کا ٹکڑا دبا ہوا تھا مگر اس کی ناک سے اذیت بھری آواز نکلی تھی۔ حالانکہ گولی لگنے کے بعد انہوں نے ایک بار بھی اس کے کراہنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ عمارہ اس کے پاس آبیٹھی اور اس نے زیان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا جیسے اسے حوصلہ دے رہی ہو۔ تکلیف سے وہ پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ تیسرا چینی انہماک سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس نے زخم کریدتے ہوئے بالآخر گولی تلاش کر لی اور اسے چمٹی سے پکڑ کر باہر نکال لیا۔ خون پھر بہنے لگا لیکن گولی نکلتے ہی زیان سکون میں آگیا تھا۔ چینی نے خون جذب کرنے والی پٹی رکھی۔ چند منٹ بعد اس نے پٹی ہٹا کر زخم پر ایک پاؤڈر جیسی چیز چھڑکی اور دوسری پٹی رکھی۔ کچھ دیر بعد اس نے پٹی ہٹائی تو خون رک گیا تھا۔

دوسرے مرحلے میں اس نے ٹانکے لگا کر چکنی پٹی رکھ دی اور اوپر سے میڈیکو ٹیپ لگا دیا۔ آخر میں دو انجکشن یکے بعد دیگرے زیان کو لگائے۔ یہ شاید اینٹی سپٹک اور پین کلر انجکشن تھے۔ زیان انرجی ڈرنک پی رہا تھا اور کچھ دیر میں اس کی حالت خاصی بہتر نظر آنے لگی تھی۔ تیسرے چینی نے میڈیکل کٹ واپس ڈکی میں رکھی اور ایک بیگ سے گرم جرسی نکال کر زیان کو دی۔ پھر اس کا خون آلود کوٹ، شرٹ اور بنیان ایک طرف زمین کھود کر دفن کر دی۔ محمود یہ سب دیکھ رہا تھا، وہ مکمل پروفیشنل لگ رہے تھے۔ وہ دونوں کار کے بونٹ پر بیٹھے تھے۔ جیانگ واپس آگیا اور اس نے ایک بڑا شاپر نکالا۔ اس میں کھانے پینے کا خاصا سامان تھا۔ اپنے لیے ایک برگر نکال کر اس نے شاپر محمود کی طرف بڑھا دیا۔

''میرا خیال ہے کہ تم لوگوں کو بھوک یا پیاس لگ رہی ہوگی۔''

محمود نے عمارہ کی طرف دیکھا، اس نے نفی میں سر ہلایا تو محمود نے بھی شکریے کے ساتھ منع کر دیا اور بولا۔ ''سنو دوستو! مجھے تمہارے خلوص پر یقین ہے لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ سب کیا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں جنہوں نے میرے چچا اور ان کی بیوی کو قتل کیا۔ اب وہ عمارہ کے پیچھے پڑے ہیں۔''

جیانگ سوچ میں پڑ گیا۔ زیان بے ہوش تھا یا سو رہا تھا اور اس وقت وہی باس تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر ہلایا۔ ''میرا نام جیانگ ہے۔ یہ میرا باس زیان ہے۔ ہمارا تعلق ایک خفیہ ادارے سے ہے جو چین کی سلامتی کے لیے کام کرتا ہے۔''

''سی آئی اے یا کے جی بی جیسا کوئی ادارہ؟''

''ایسا ہی سمجھ لو۔''

''ٹھیک ہے، اب ہمارے پیچھے کون ہے؟''

''سی آئی اے۔'' جیانگ نے کہا تو محمود دنگ رہ گیا۔

''سی آئی اے... لیکن اسے چچا یا ان کی بیٹی سے کیا پرخاش ہو سکتی ہے؟''

''معاملہ مفاد کا ہے۔ تم شاید جانتے ہو کہ وسیم احمد نے پانی سے ہائیڈروجن گیس الگ کرنے کا ایک آسان اور سستا طریقہ ایجاد کیا تھا۔''

''میں جانتا ہوں لیکن اس کا سی آئی اے یا چینی سیکرٹ سروس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟'' محمود مضطرب ہو رہا تھا... عمارہ ان کی باتیں سن رہی تھی۔ جیانگ نے سکون سے کہا۔

''تم میری پوری بات سنو۔ ہر شخص جانتا ہے دنیا پر اس وقت ملٹی نیشنل کمپنیوں کی حکومت ہے۔ یہ کمپنیاں اس دنیا کی اصل حکمران ہیں۔ دنیا کی ہر اہم صنعت اور شعبہ ان کے

قبضے میں ہے۔ اس میں سب سے اہم انرجی سیکٹر ہے۔ اس شعبے میں ان کمپنیوں نے دو ٹریلین ڈالرز کی سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ پیٹرولیم اور گیس کے ذخائر تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ متبادل ذرائع اب تک اس سطح پر نہیں آسکے ہیں جہاں یہ پیٹرولیم اور گیس کی جگہ لے سکیں۔ بائیو فیول کے اپنے مسائل ہیں۔ ایٹمی ٹیکنالوجی اور کوئلہ مہنگا اور ماحول کے لیے خطرناک ہے۔ ماہرین بہت عرصے سے ہائیڈروجن کو مستقبل کا ایندھن قرار دے رہے ہیں کیونکہ یہ صاف ستھرا ماحول دوست ایندھن ہے۔ مگر اسے بڑے پیمانے پر حاصل کرنا دشوار اور مہنگا پڑتا ہے۔ ہائیڈروجن کا سب سے بڑا ذریعہ پانی ہے جس میں دسواں حصہ ہائیڈروجن ہوتی ہے لیکن اسے پانی سے الگ کرنا بہت مہنگا پڑتا ہے۔ اس میں جتنی توانائی لگتی ہے، حاصل ہونے والی توانائی کم ہوتی ہے۔''

عمارہ غور سے جیانگ کی بات سن رہی تھی۔ محمود کا شعبہ مختلف تھا مگر وہ سائنس کا طالب علم تھا اس لیے وہ بھی جیانگ کی بات سمجھ رہا تھا۔ عمارہ نے سر ہلایا۔ ''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پاپا بھی ایسا ہی کہتے تھے۔''

جیانگ مسکرایا۔ ''تمہارے پاپا ایک عظیم سائنس داں اور بہت اچھے انسان تھے۔ وہ چاہتے تو ان لوگوں کی بات مان کر اپنی جان بچا سکتے تھے لیکن انہوں نے انسانوں کی بہتری کے لیے اپنی بات پر ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ صرف تمہارے پاپا ہی نہیں بلکہ اس شعبے میں ایجادات کرنے والے دو درجن سے زیادہ افراد کو اسی طرح قتل کیا جا چکا ہے۔''

محمود نے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے، اس چکر کے پیچھے ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں... تو پھر یہ سی آئی اے کہاں سے آگئی؟''

''مغرب کے مفادات کے لیے کام کرنے والے اصل میں ایک ہی ہیں۔ ان میں ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی ہیں اور حکومتیں بھی۔ دنیا کو اپنا ماتحت رکھنے کے لیے یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔''

جواباً محمود نے اس کی بات پر اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔

''میں جانتا ہوں ہائیڈروجن مستقبل کا ایندھن ہے لیکن ابھی اس کے استعمال کی مشکلات پر قابو نہیں پایا جا سکا ہے۔ اس لیے اگر چچا جان نے ایسا کوئی پروسیس ایجاد کیا بھی ہے تو اس سے فوری فائدہ اٹھانا تو ممکن نہیں ہوگا؟''

''سائنسی ایجادات کے سلسلے میں دیکھا گیا ہے کہ ایجاد ہونے کے بعد بہت تیزی سے ان کا مصرف سامنے آجاتا ہے۔ آج سے ڈیڑھ صدی پہلے جب پیٹرولیم کی صنعت کا آغاز تھا تو یہ ظاہر اس کا بھی کوئی استعمال نہیں تھا لیکن جب پیٹرولیم آسانی سے ملنے لگا تو اس کا استعمال بھی بہت تیزی سے سامنے آیا۔ اسی طرح جب ہائیڈروجن آسانی سے ملنے لگے گی تو اس کا استعمال بھی جلد سامنے آئے گا۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ وسیم احمد کی چینی حکومت سے پہلے ہی بات چل رہی تھی۔ وسیم احمد نے پیشکش کی تھی کہ چین میں تھرمل پاور سے چلنے والے تمام بجلی گھروں کو ہائیڈروجن سے چلایا جا سکتا ہے۔ یہ بجلی گھر دنیا کی دس فیصد آلودگی پیدا کرتے ہیں اس لیے جب یہ ہائیڈروجن سے چلتے تو دنیا میں آلودگی کی شرح یک دم ہی دس فیصد کم ہو جاتی اور پھر دوسرے ممالک بھی یہی طریقہ استعمال کرتے تو آلودگی میں نصف کی ہو سکتی ہے مگر یہ سب ان کمپنیوں اور مغرب کے مفادات کے خلاف ہے۔''

''وہ کیسے... اس سے تو وہ بھی فائدہ اٹھائیں گے۔''

جیانگ کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ صرف سیکرٹ ایجنٹ ہی نہیں تھا بلکہ اسے ان تمام چیزوں کی سمجھ تھی جو وہ بیان کر رہا تھا اور شاید اسی لیے اس مشن پر اسے بھیجا گیا تھا۔

''اسے یوں سمجھو کہ ٹیکنالوجی گیپ تو اہم ہے لیکن ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں اصل فرق توانائی کے استعمال کا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کیونکہ استعداد رکھتے ہیں اس لیے وہ فی کس زیادہ توانائی استعمال کرتے ہیں اور اپنی ترقی کو برقرار رکھتے ہیں لیکن ترقی پذیر ممالک استعداد نہیں رکھتے اور وہ توانائی کے کفایت شعارانہ استعمال پر مجبور ہوتے ہیں، یہ چیز ان کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس وقت توانائی کے بڑے ذرائع میں پیٹرولیم، گیس، ایٹمی ٹیکنالوجی اور ہائیڈرو پاور ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ تمام ہی ذرائع بہت مہنگے ہیں۔ ایٹم اور پانی سے پیدا ہونے والی بجلی سستی پڑتی ہے لیکن ایٹمی پاور پلانٹ اور ڈیم بنانے کی لاگت بہت زیادہ ہے۔ ہر ملک میں یہ لگ بھی نہیں سکتے۔ تھرمل بجلی کے ذرائع مہنگے ہیں اور یہ آلودگی بھی بہت زیادہ پیدا کرتے ہیں۔ ایسے میں اگر ہائیڈروجن کی مدد سے ابتدائی طور پر صرف سستی اور آلودگی سے پاک بجلی پیدا ہو جائے تو اس سے ترقی پذیر ممالک کو پوری توانائی ملنے لگے گی۔ ان کی صنعت اور زراعت کو مسلسل بجلی ملے گی تو چند دہائیوں میں وہ ترقی یافتہ ممالک کے برابر آسکتے ہیں۔''

محمود قائل نظر آنے لگا۔ ''چچا جان نے جو پروسیس ایجاد کیا ہے، کیا اس سے سستی بجلی ملے گی؟''

''میں اس بارے میں بہت نہیں جانتا لیکن مجھے یہ

معلوم ہے کہ پاور پلانٹ کے لیے صرف پانی چاہیے ہوگا اور پانی دنیا کے خشک ترین ملک میں بھی اتنا ضرور ہوتا ہے کہ اس سے ہائیڈروجن حاصل کر کے وہ ملک اپنی ساری ضروریات پوری کر سکتا ہے۔ سوائے چند۔۔۔ ممالک کو چھوڑ کر سب ملکوں کے ساتھ سمندر لگتا ہے جہاں سے بے حساب پانی لیا جا سکتا ہے۔ وسیم احمد کا پروسیس صرف پیٹرولیم میں لگے ملٹی نیشنل کے سرمائے کو نقصان نہیں کرے گا۔ ان کا اصل نقصان یہ ہوگا کہ توانائی کے لیے ان کے محتاج ترقی پذیر ممالک ان کی گرفت سے نکل جائیں گے۔ اب تم سمجھ گئے ہو کہ یہ ان کے لیے زندگی و موت کا مسئلہ ہے اور یہ ہر صورت وسیم احمد کے پروسیس کو روکنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ بدقسمتی سے ہمیں تاخیر سے علم ہوا اس لیے جب تک ہم کچھ کرتے، دشمن اپنا کام کر گئے تھے۔''

اب محمود بڑی حد تک سمجھ گیا تھا کہ ان چند افراد کے پیچھے اصل میں کیا کھیل چل رہا تھا۔ واقعی مغرب اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کی بالادستی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ معاملے کی سنگینی رفتہ رفتہ عیاں ہو رہی تھی اور اب اسے اپنی اور عمارہ کی زندگیوں کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ پھر مایوسی کی بات یہ تھی کہ وسیم احمد کا ایجاد کیا ہوا پروسیس بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا مگر پھر یہ لوگ کیوں ان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے جس کا مطلب ہے کہ انہیں پورا یقین نہیں تھا کہ پروسیس ختم ہو گیا ہے۔ اس نے جیانگ سے پوچھا۔ ''کیا تم لوگ اس پروسیس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟''

''بدقسمتی سے بالکل نہیں جانتے کیونکہ ابھی بات چیت ابتدائی مراحل میں تھی۔ چینی حکام کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتے ہی ہم نے وسیم احمد پر زور دینا شروع کر دیا تھا کہ وہ فوری چین منتقل ہو جائے۔ مگر یا تو انہیں ہم پر بھی اعتبار نہیں تھا یا پھر انہیں خطرے کا احساس نہیں تھا اور جب تک خطرے کا احساس ہوا، وہ سامنے آ چکا تھا۔''

''اگر وہ پروسیس مکان کے ساتھ تباہ ہو چکا ہے تو اب یہ لوگ ہمارے پیچھے کیوں ہیں؟''

''کیونکہ ان کو خدشہ ہوگا کہ وسیم احمد نے پروسیس عمارہ کو نہ دے دیا ہو۔''

محمود نے بے ساختہ عمارہ کے بیگ کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا۔ ''کیا چچا جان نے تمہیں کاغذ یا اسی طرح کی لکھی ہوئی چیز دی ہے؟''

عمارہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پاپا نے ایسی کوئی چیز نہیں دی ہے۔''

وہ سچ کہہ رہی تھی کیونکہ چپ جو بیگ کے اسٹرپ میں چھپی تھی، وہ کاغذ یا اس جیسی نہیں تھی۔ محمود نے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس میں کیا ہے؟''

''میرے کپڑے اور جینس ہیں۔'' عمارہ نے کہا۔ ''لو تم دیکھ لو۔''

محمود نے بیگ لے کر چیزیں دیکھیں۔ محمود نے کتابیں بھی دیکھیں مگر ان میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے وسیم احمد کے پروسیس سے متعلق سمجھا جاتا۔ جیانگ نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے وہ ضائع ہو گئی ہے مگر دشمن اس پر یقین نہیں کریں گے۔ وہ عمارہ اور تمہیں اپنے قبضے میں لے کر خود سے تصدیق کریں گے اور وہ کس طرح تصدیق کریں گے، تمہیں بھی اس کا اندازہ ہوگا۔''

''تب ہم کیا کریں؟'' محمود پریشان ہو گیا۔ ''ہم عام سے لوگ ہیں۔ سی آئی اے جیسی خوفناک تنظیم کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟''

''چین کی حکومت اور یہاں چین کا سفارت خانہ تم لوگوں کو تحفظ فراہم کرے گا۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہم سفارت خانے تک پہنچ جائیں۔''

''پولیس سے مدد نہیں لے سکتے؟''

جیانگ نے نفی میں جواب دیا۔ ''پولیس ان کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ وسیم احمد کے گھر پر حملہ کرنے والے سی آئی اے کے چھ ایجنٹس بھی دھماکے میں مارے گئے تھے لیکن پولیس رپورٹ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ سارہ کی موت گولی لگنے سے ہوئی لیکن پولیس نے اسے بھی حادثہ ظاہر کیا ہے۔ اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ پولیس سے رابطہ کرنے کی صورت میں تمہیں کتنی مدد ملے گی؟''

''ولنگٹن میں جو ہوا ہے، اس کے بعد پولیس لازمی ہمیں تلاش کر رہی ہوگی۔'' محمود نے فکرمندی سے کہا۔ ''پتا نہیں ابراہیم علی کے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟''

''انہوں نے چچا کو مار دیا ہوگا۔'' عمارہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔ ''وہ ہمیں بھی مار دیں گے۔''

''اس سے پہلے کہ وہ ہمیں تلاش کر لیں، ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔'' محمود بولا تو جیانگ نے انکار کر دیا۔

''ابھی یہاں سے نکلنا خطرے والی بات ہے۔ اس گاڑی کے بارے میں پولیس کو پتا چل گیا ہوگا اور اگر ہم ہائی وے پر سفر کریں گے تو فوراً پکڑے جائیں گے۔ ابھی ہمیں یہیں رکنا چاہیے۔ وہ ہمیں جنگلوں میں آسانی سے تلاش نہیں

کر سکتے۔''

عمارہ یہ سن کر سہم گئی۔ ''ہم سفاری میں ہیں۔۔۔ یہاں شیر چیتے ہوتے ہیں؟''

جیانگ نے اسے تسلی دی۔ ''یہ سرد موسم ہے، اس وقت جانور شمال کی طرف چلے جاتے ہیں۔ یہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور اگر کوئی جانور آ گیا تو ہمارے پاس ہتھیار ہیں۔''

اگست کے آخر میں بھی جنوبی افریقا میں موسم سرد ہوتا ہے، یہاں سردیاں اپریل سے ستمبر تک ہوتی ہیں۔ چینیوں نے فی الحال یہیں رکنے کا فیصلہ کیا تھا اس لیے عمارہ اور محمود آس پاس گھومنے پھرنے لگے۔ محمود، عمارہ کو کار سے ذرا دور لے گیا اور اس نے پوچھا۔ ''سچ سچ چچا جان نے تمہیں اس بارے میں نہیں بتایا ہے؟''

عمارہ نے پھر معصومیت سے نفی میں سر ہلایا۔ اپنی ذہنی کیفیت سے قطع نظر وہ خوب صورت اور جوان لڑکی تھی پھر محمود کی چچا زاد تھی۔ اس کا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس نے محبت سے عمارہ کو دیکھا۔ ''تمہیں پتا ہے خاندان میں سب تمہارے بارے میں جانتے ہیں۔ سب نے تمہاری تصویریں بھی دیکھی ہیں؟''

''فیس بک پر نا؟'' وہ خوش ہو کر بولی۔ ''پاپا نے میرا اکاؤنٹ بھی بنایا تھا۔''

یہ حقیقت تھی۔ برسوں سے دوری کے بعد اور منگیتر والا معاملہ پرانا ہونے کی وجہ سے اب سب کو وسیم کی یاد تڑپانے لگی تھی۔ ماں اسے یاد کرتے کرتے گزر گئی مگر اس وقت جذبات تازہ تھے۔ اس لیے کسی نے وسیم احمد کو اطلاع نہیں دی مگر اب علیم احمد اور ان کے بچے پچھتاتے تھے۔ وسیم کی خطا اتنی بڑی نہیں تھی کہ اسے اتنی بڑی سزا دی جاتی۔ پھر محمود کا چچا سے رابطہ ہوا تو سب کی محبت ابھر آئی۔ نوجوان نسل کو عمارہ میں دلچسپی تھی اور بڑے وسیم کے لیے تڑپ رہے تھے۔ وہ اس سے ملنا چاہتے تھے۔ خاص طور سے علیم احمد بے تاب تھے۔ برسوں سے انہوں نے وسیم احمد کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر کیا قسمت تھی۔ بیٹا لاش کی صورت میں واپس پہنچنے والا تھا اور وہ اس کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ عمارہ اور محمود دونوں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے لگے۔ ماں باپ کا ذکر آیا تو عمارہ رونے لگی۔ اس کا دل بہلانے کے لیے محمود اسے دوسرے رشتے داروں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس کا بچکانا ذہن جلد بہل گیا اور وہ اشتیاق سے سب کے بارے میں پوچھنے لگی۔

محمود نے کہا۔ ''ہم یہاں سے نکل جائیں پھر ہم پاکستان چلیں گے۔ اب تم ہمیشہ ہمارے ساتھ رہو گی۔''

یہ سنتے ہی عمارہ کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں پاکستان نہیں جا سکتی۔''

''کیوں۔۔۔'' محمود نے پوچھنا چاہا لیکن اسی لمحے کہیں دور سے کسی خشک ٹہنی کے چٹخنے کی آواز آئی۔ محمود چونک گیا۔ اس نے جلدی سے عمارہ کو اس درخت کے پیچھے ہونے کا اشارہ کیا جس کے ساتھ وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر وہ دبے قدموں کار کی طرف آیا۔ اس نے ایک تنے کی اوٹ سے جھانکا تو اسے زیان، جیانگ اور ان کا تیسرا ساتھی چوکنا نظر آئے۔ زیان جاگ گیا تھا اور اس کی حالت خاصی بہتر لگ رہی تھی۔ جیانگ اور تیسرا چینی جھاڑیوں کی طرف گئے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ محمود نے زیان سے آہستہ سے پوچھا۔ ''یہ آواز کیسی تھی؟''

''میرے ساتھی دیکھ رہے ہیں۔'' زیان بولا۔ ''تم پستول استعمال کرنا جانتے ہو؟''

''ہاں لیکن میرا نشانہ بہت اچھا نہیں ہے۔''

زیان نے اسے ایک چھوٹا بریٹا دیا اس کے ساتھ اس کے دو اضافی میگزین بھی تھے۔ محمود نے اسے پستول لوڈ ان لوڈ کر کے اور میگزین تبدیل کر کے دکھایا تو وہ مطمئن ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''میری بات غور سے سنو، ہمیں بہر صورت عمارہ کو چینی سفارت خانے تک پہنچانا ہے، یہ وہیں امریکیوں سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ یہ بتاؤ تم جنوبی افریقا کے شہروں اور راستوں سے واقف ہو؟''

''نہیں، میں پہلی بار یہاں آیا ہوں۔''

زیان نے اسے ایک چھوٹا سا ڈیجیٹل میپ دیا۔ اس کے ساتھ جی پی ایس بھی تھا اور یہ دنیا میں کہیں بھی درست ترین لوکیشن بتا سکتا تھا۔ زیان نے کہا۔ ''اس کی مدد سے تم کسی کی راہنمائی کے بغیر بھی سفر کر سکتے ہو۔ اگر تم ہم سے بچھڑ جاؤ تو عمارہ کو لے کر خود پریٹوریا پہنچنے کی کوشش کرنا۔''

محمود نے سر ہلایا۔ ''کیا تم ہم سے الگ ہو رہے ہو؟''

زیان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ابھی تو نہیں لیکن امریکی اپنے نقصان پر پاگل ہو جانے والی قوم ہے۔ اس وقت وہ پوری شدت سے ہمیں تلاش کریں گے اور اس کے لیے انہوں نے پولیس اور مقامی انتظامیہ کی مدد بھی حاصل کر لی ہوگی۔ ہم ولنگٹن سے صرف بیس میل دور ہیں اور اس علاقے میں تلاش سب سے زیادہ ہوگی اس لیے ہمیں کسی بھی چیز کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

محمود نے پستول اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ اسی لمحے جھاڑیوں سے جیانگ نمودار ہوا اور اس نے پاس آکر آہستہ سے کہا۔ ''پولیس اور ان کے ساتھ کم سے کم دو امریکی ہیں' وہ سڑک کے آس پاس دیکھ رہے ہیں۔ انہیں یہاں آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔''

زیان کھڑا ہو گیا۔ ''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

''کیسے؟ سڑک کی طرف تو وہ ہیں؟'' جیانگ نے کہا۔

''ہم آگے جائیں گے۔'' زیان نے کہا۔ ''بیس کلو میٹر کے بعد ہمیں ہائی وے ملے گی۔ اگر وہاں تک پہنچ گئے تو...''

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' جیانگ نے کہا۔

اس نے ایک تفصیلی نقشہ نکال لیا تھا۔ ''اگر ہم سڑک سے ہٹ کر سفر کرتے ہیں تو راستے میں آنے والے دریا کو کیسے عبور کریں گے؟''

''اسے بعد میں دیکھیں گے' ابھی تو یہاں سے نکلنا ہے۔''

محمود، عمارہ کو لے آیا۔ تیسرا چینی بھی آ گیا تھا۔ وہ سب گاڑی میں بیٹھے اور جیانگ نے اس کا رخ سفاری کی طرف کر دیا۔ کار کے چلنے سے دھول اڑنے لگی تھی۔ محمود نے کہا۔ ''ان کو پتا چل جائے گا کہ یہاں کوئی گاڑی ہے۔''

''وہ ویسے بھی یہاں آنے والے تھے۔'' تیسرے چینی نے کہا۔ وہ نوجوان تیز اور پھرتیلا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے دوست؟'' محمود نے پوچھا۔

''رومیو فان لی۔'' وہ بولا۔ اسی لمحے عقب سے کسی کے چلّانے کی آواز آئی پھر رائفل سے برسٹ مارے جانے لگے۔ انہوں نے سر نیچے کر لیے تھے مگر گولیاں ان سے دور سنسناتی ہوئی درختوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ محمود نے عمارہ کا سر نیچے کر رکھا تھا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ خون کی کشش نے اپنا اثر دکھایا تھا۔ ان چند گھنٹوں میں وہ اس پر یوں اعتبار کرنے لگی تھی جیسے برسوں سے جانتی ہو۔ کار جھاڑیوں سے نکل کر درختوں تک آئی تو پیچھے سے فائرنگ رک گئی لیکن یہ یقینی تھا کہ اب پولیس اور امریکی ان کے پیچھے آئیں گے اور ان سے بچنا آسان کام نہیں تھا۔ جیانگ پوری توجہ سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ ایسی جگہوں سے گزرنے سے گریز کر رہا تھا جہاں راستہ ملنے کا امکان کم ہو۔ وہ کہیں پھنسنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ زرد کار کا انجن طاقتور اور اس کے چوڑے ریڈیل ٹائر کچے ناہموار راستوں پر سفر کے لیے بہترین تھے۔ کار کو جھٹکے لگ رہے تھے اور زیان کو تکلیف ہو رہی تھی لیکن وہ خاموشی سے برداشت کر رہا تھا۔ رومیو عقب میں دیکھ رہا تھا' اس نے مطلع کیا۔

''پیچھے کم سے کم دو گاڑیاں آ رہی ہیں۔''

''گاڑیاں مسئلہ نہیں ہیں۔'' زیان نے کہا۔ ''لیکن اگر ہیلی کاپٹر استعمال کیے گئے تو ہم سچ مچ مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

رومیو نے سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی مشین گن نکالی۔ پھر وہ چھت پر لگا خانہ کھول کر نشست پر کھڑا ہو گیا۔ زیان نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ درختوں سے نکل کر وہ کھلے میدان میں آئے جس میں چار پانچ فٹ اونچی گھاس تھی اور اس سے آگے مشکل سے نظر آ رہا تھا۔ محمود نے کہا۔ ''اس طرح اندھا دھند ڈرائیو ٹھیک نہیں ہے۔ آگے کوئی پتھر یا گڑھا آ گیا تو ہم سب مارے جائیں گے۔''

''ہم نہیں رک سکتے۔'' زیان نے کہا۔

محمود نے سوچا اور پھر وہ بھی نشست پر کھڑا ہو کر رومیو کی پشت سے پشت ملا کر خانے سے باہر نکل آیا۔ وہ سامنے دیکھ رہا تھا اور اس نے جیانگ کی راہنمائی شروع کر دی۔ ''ذرا دائیں طرف... گڑھا ہے... ہاں اب سیدھے چلو... رفتار تیز کرو' آگے کچھ نہیں ہے۔''

جیسے ہی پہلی گاڑی نظروں میں آئی، رومیو نے اس کی طرف چھوٹا برسٹ مارا۔ زیان غرایا۔ ''جلد بازی مت کرو... ان کے پاس آنے کا انتظار کرو پھر ٹائروں کا نشانہ لو۔''

رومیو اپنی جلد بازی پر پشیمان ہوا۔ اس کا ازالہ اس نے یوں کیا کہ تیزی سے قریب آتی گاڑی کے ٹائروں کا نشانہ لے کر ذرا طویل برسٹ مارا۔ اس نے چلتی اور جھٹکے لیتی گاڑی سے فائر کیا تھا۔ دوسری گاڑی بھی اچھل کود رہی تھی اس لیے نشانہ ٹائروں کے بجائے بونٹ اور ونڈ اسکرین بنی تھی۔ گولیوں نے اس پر جال بنا دیا تھا اور یقیناً ڈرائیور کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ محمود نے جس گڑھے سے جیانگ کو خبردار کیا تھا' پیچھے آنے والی گاڑی اسی میں اتر گئی۔ رفتار کی وجہ سے اس کا اگلا حصہ گڑھے کی تہ سے لگا تو وہ الٹ گئی۔

''ایک تو گئی۔'' رومیو نے قہقہہ لگایا۔ وہ بہت خوش ہو رہا تھا۔

اب وہ گھاس کے میدان سے نکل آئے تھے اور ایک خشک ریتیلے میدان میں سفر کر رہے تھے۔ یہ جگہ خطرناک تھی کیونکہ دور دور تک کوئی آڑ نہیں تھی۔ دوسری گاڑی ایک لینڈ روور تھی جسے ایسے ہی علاقوں میں سفر کے لیے بنایا گیا ہے۔

اس کا انجن زیادہ طاقتور تھا اور رفتار بھی تیز تھی۔ وہ تیزی سے پاس آنے لگی۔ اس کے اوپری حصے میں ایک شخص موجود تھا اور اس کے پاس بھی خودکار رائفل تھی۔ اس نے برسٹ مارا تو گولیاں رومیو کے آس پاس سے گزر گئیں۔ وہ جلدی سے نیچے ہوا۔ پھر اس نے جوابی برسٹ مارا مگر مشین گن کی مار محدود تھی جبکہ لینڈ روور والے امریکی کی رائفل کی مار زیادہ تھی۔ رومیو نے پلٹ کر میدان کی طرف دیکھا تو کچھ آگے زمین سے ذرا اٹھی ایک چٹان تھی۔ رومیو نے جیانگ سے کہا کہ وہ اس طرف چلے۔ جیانگ نے کار کا رخ چٹان کی طرف کر دیا۔ رومیو نے جھک کر سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی کولڈ ڈرنک ٹن سائز کی چیز نکالی۔ محمود نے پوچھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''دھوئیں کا بم۔'' رومیو نے جواب دیا۔ ''جب میں کہوں تو کار چٹان سے بچا کر گزارنا۔''

جیانگ اس کی حکمتِ عملی سمجھ گیا تھا۔ اس نے رفتار بڑھائی۔ لینڈ روور دو سو گز پیچھے تھی۔ جب چٹان بیس گز دور رہ گئی تو رومیو نے بم پیچھے اچھال دیا اور اس سے دھواں نکل کر پھیلنے لگا۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ چند سیکنڈ میں پیچھے دس بارہ گز چوڑی جگہ دھواں دھواں ہو گئی تھی' جیانگ نے نہایت مہارت سے بالکل نزدیک لا کر کار کو چٹان کے پاس سے گزارا تھا۔ جب تک لینڈ روور اس جگہ تک آتی، دھواں گہرا اور زیادہ جگہ تک پھیل گیا تھا۔ اس لیے دھوئیں سے نکلنے کے بعد لینڈ روور کو بچنے کا موقع نہیں ملا... اس کے ڈرائیور نے اسٹیئرنگ گھمایا مگر اس کا زیادہ نقصان ہوا۔ لینڈ روور ایک طرف سے چٹان پر چڑھی اور الٹ گئی۔ اس نے کئی قلابازیاں کھائیں اور پھر پہلو کے بل گر گئی۔

☆☆☆

ڈیوڈ کارٹر کا غصے سے برا حال تھا۔ اس سے پہلے اسے کبھی یوں پے درپے ناکامیاں نہیں ملی تھیں۔ برسوں پہلے اس نے روانڈا اور برونڈی کی خانہ جنگی میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ اس خانہ جنگی میں تقریباً دو ملین افریقی لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ ڈیوڈ کارٹر نے کامیابی سے صلح کی تمام کوششیں ناکام بنا دی تھیں۔ اس خانہ جنگی کا بنیادی مقصد اس خطے میں پائی جانے والی جھیلوں میں موجود میتھین گیس کے ذخائر کو استعمال سے بچانا تھا۔ چینی کمپنیاں یہاں سے گیس حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ خانہ جنگی کی وجہ سے ان کے منصوبے دھرے رہ گئے۔ اس کے بعد بھی ڈیوڈ نے اپنی کئی ذمے داریاں بہترین انداز میں پوری کیں لیکن کچھ عرصے سے اس پر زوال آیا ہوا تھا۔ زمبابوے میں سفید فاموں کو حکومت کے خلاف بغاوت کے لیے استعمال کرنے کا منصوبہ ناکام رہا۔ اسی طرح کانگو کی پٹی میں سی آئی اے کا اہم ترین مشن ناکام رہا تھا۔ اب اسے اس مشن میں مشکلات کا سامنا تھا۔ اس نے وسیم احمد کو ختم کر کے ایک مقصد تو حاصل کیا تھا لیکن جب تک اس کے پروسیس کے خاتمے کی تصدیق نہیں ہو جاتی، اس کا مشن مکمل نہ ہوتا۔

جان کی طرف سے اطلاع آنے پر وہ اپنے باقی چار ایجنٹس کے ساتھ خود نکل آیا تھا۔ جب تک وہ ونگٹن پہنچا، پولیس آ چکی تھی۔ جان کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی اور وہ وین کے پاس کھڑا کافی پی رہا تھا۔ دو پولیس والے وین کے ٹائر بدل رہے تھے۔ ڈیوڈ کو دیکھ کر وہ مستعد ہو گیا اور اس نے تفصیلی رپورٹ دی لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ اس پر آنچ نہ آنے پائے۔ ڈیوڈ نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ''اب تمہاری حالت کیسی ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں سر۔'' جان نے جلدی سے کہا۔ ''معمولی زخم ہے، مجھے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔''

ڈیوڈ پولیس چیف کے پاس آیا۔ ''ان لوگوں کی گرفتاری کے لیے اب تک کیا کیا گیا ہے؟''

''آس پاس کی تمام شاہراؤں اور راستوں کی ناکا بندی کر دی گئی ہے لیکن اب تک کہیں سے زرد کار کو دیکھنے کی اطلاع نہیں ملی ہے۔''

''تب وہ اسی علاقے میں ہیں۔'' ڈیوڈ نے کہا۔ ''اس علاقے کا نقشہ نکالو۔''

پولیس چیف نے نقشہ نکال کر کار کے بونٹ پر پھیلایا۔ اس دوران میں طبی عملہ ابراہیم علی کی لاش پلاسٹک کور میں ڈال کر لے جا رہا تھا۔ ڈیوڈ نے اسے سرسری نظروں سے دیکھا اور پھر نقشے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد اس نے ونگٹن کے شمال مغرب کی طرف جانے والی شاہراہ پر انگلی رکھی۔ ''وہ اس طرف گئے ہوں گے۔ اس سڑک پر آگے کوئی چیک ہے؟''

''بالکل، یہاں چیک ہے۔'' پولیس چیف نے ایک دوراہے پر انگلی رکھی۔ یہاں سے سڑک دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک حصہ مشرق کی طرف اور دوسرا مغرب کی طرف جا رہا تھا۔ ''اگر وہ یہاں سے گزرے ہوتے تو مجھے اطلاع مل جاتی۔''

''وہ اس سے پہلے سڑک کے آس پاس ہیں۔'' ڈیوڈ نے یقین سے کہا۔ ''میرے آدمی نے ایک چینی کو زخمی کر دیا

تھا۔ ممکن ہے وہ اس کی وجہ سے کہیں رک گئے ہوں۔"

ڈیوڈ نے دو ایجنٹس پولیس کے ساتھ کر دیے۔ انہیں حکم دیا کہ وہ اس سڑک کے دائیں بائیں کے علاقوں کو کھنگالیں۔ وہ ایک پولیس کار اور ایک لینڈ روور کے ساتھ روانہ ہوئے۔ جان اور دوسرے دو ایجنٹس اس کے ساتھ تھے۔ مارک کی لاش وہیں تھی لیکن اسے پولیس کے حوالے نہیں کیا گیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد ایک سادہ گاڑی آئی اور مارک کی لاش لے کر چلی گئی۔ اسے فوری طور پر امریکا روانہ کیا جانا تھا۔ مقامی پولیس کے ریکارڈ میں مارک کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا۔ پولیس چیف اگرچہ سفید فام تھا لیکن اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے غیر ملکیوں کی مداخلت کھل رہی تھی۔ اگر اوپر سے واضح حکم نہ ہوتا تو شاید وہ ڈیوڈ سے تعاون کرنے سے انکار کر دیتا۔ ڈیوڈ اس کے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر آ گیا۔ کچھ دیر بعد ہی انہیں اطلاع ملی کہ ان لوگوں کو سڑک سے کچھ دور تلاش کر لیا گیا ہے اور اب پولیس کار اور لینڈ روور ان کے تعاقب میں تھی۔ ڈیوڈ فوری طور پر جان اور دوسرے ایجنٹس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایک پولیس کار اور تھی مگر ابھی وہ راستے میں تھے کہ اطلاع آ گئی کہ تعاقب میں جانے والی دونوں گاڑیاں حادثے کا شکار ہو گئی تھیں اور چینی لڑکی سمیت بچ نکلنے میں کامیاب رہے۔ ڈیوڈ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اطلاع دینے والے ایجنٹ کو ریڈیو پر شوٹ کر دے۔ اس نے فوری طور پر نقشے پر وہ مقام دیکھا جہاں لینڈ روور موجود تھی اور پھر اس نے جیمس کو کال کی۔

"ایک ہیلی کاپٹر بھیجو۔" اس نے لوکیشن بتائی۔ "اگلے آدھ گھنٹے کے اندر ہیلی کاپٹر یہاں ہونا چاہیے۔"

"یس سر۔" جیمس نے جواب دیا۔

جیمس سے بات کر کے ڈیوڈ نے ڈرائیور سے رفتار بڑھانے کو کہا۔

☆☆☆

زیان کی جرسی پر خون کا دھبا نمودار ہو رہا تھا اور اب اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار بھی دکھائی دے رہے تھے۔ مگر جیانگ نے تعاقب کرنے والوں سے پیچھا چھوٹنے کے بعد کار کی رفتار کم کرنا چاہی تو زیان نے منع کر دیا۔ "نہیں، ہر ممکن رفتار سے ڈرائیو کرو۔"

"وہ پیچھے رہ گئے ہیں۔"

"اب وہ ہیلی کاپٹر استعمال کریں گے۔" زیان نے کہا۔ "وہ جنگی ہیلی کاپٹر بھی منگوا سکتے ہیں۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہیے۔"

محمود ڈیجیٹل میپ پر اپنی لوکیشن دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "ہمیں ہائی وے کے دائیں طرف جانا چاہیے۔ اس طرح بھی تلاش کرنے والے گمراہ ہو سکتے ہیں۔"

"اس طرف دریا ہے۔" زیان نے کہا۔ "اسے صرف سڑک کے پل سے عبور کیا جا سکتا ہے۔"

"اس طرف ایک پرانا متروک پل ہے۔" جیانگ نے کہا۔ "اسے اب استعمال نہیں کیا جاتا اس لیے سڑک بھی ویران رہتی ہے۔ اگر ہم کوشش کریں تو اس پل سے دوسری طرف جا سکتے ہیں۔"

زیان نے منظوری دے دی۔ جیانگ نے کار کا رخ مشرق کی طرف موڑ دیا۔ وہ سڑک سے زیادہ دور نہیں گئے تھے اور اس کے متوازی سفر کر رہے تھے اس لیے دس منٹ بعد وہ ہائی وے پر تھے۔ اسے کراس کر کے وہ دوبارہ سفاری میں سفر کرنے لگے۔ یہاں راستہ گھنے جنگلوں اور جھاڑیوں سے گزر رہا تھا اس لیے رفتار خود بہ خود سست ہو گئی تھی۔ انہیں سفر کرتے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ جھٹکوں اور دھول مٹی نے سب کا برا حال کر دیا تھا۔ زیان کی حالت ان سے زیادہ خراب تھی اس لیے ایک جگہ رک کر رومیو نے اس کی پٹی تبدیل کی۔ زخم پر خون روکنے کے لیے پاؤڈر چھڑکا اور نئی پٹی کر دی۔ ساتھ ہی اس نے انرجی ڈرنک کے ساتھ اسے پین کلر دی تھی۔ اس دوران میں جیانگ گاڑی کا جائزہ لے رہا تھا۔ پیٹرول ٹینک نصف تھا مگر اس نے ڈکی سے ایک پندرہ لیٹر کا کین نکال کر ٹینک میں الٹ دیا۔ وہ سب پیاسے تھے۔ پانی پی کر اور کچھ دیر آرام کے بعد وہ دوبارہ روانہ ہوئے۔ محمود جو مسلسل میپ دیکھ رہا تھا، اس نے زیان سے کہا۔

"متروک پل ذرا جنوب کی طرف ہے۔ اس طرف جھاڑیاں ہیں۔"

انہیں متروک پل کی ٹوٹ پھوٹ جانے والی سڑک تک پہنچنے میں پندرہ منٹ لگے اور مزید دس منٹ بعد وہ پل کے ساتھ تھے۔ پل کی حالت واقعی مخدوش تھی اور اس کے لوہے کے گارڈر جا بہ جا ٹوٹے ہوئے تھے۔ فرش کے کنکریٹ میں کئی سوراخ تھے۔ انہوں نے اتر کر پل کا معائنہ کیا۔ رومیو نے کہا۔ "بہت خطرناک ہے۔"

"لیکن ہمیں پار جانا ہے۔" جیانگ بولا۔ "باقی سب پیدل جائیں، میں کار لے جاتا ہوں۔"

"کار میں لے جاتا ہوں۔" رومیو نے پیشکش کی مگر جیانگ نے انکار کر دیا۔ زیان تشویش زدہ تھا۔

"مجھے یہ ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔"

"اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہم کار نہیں چھوڑ سکتے۔" جیانگ نے کہا۔ "پہلے سب سامان سمیت پل کے پار جائیں گے۔"

انہوں نے ڈکی سے سامان نکالا اور احتیاط سے پل کے پار چلے گئے۔ یہ مشکل سے سو گز لمبا پل تھا لیکن نیچے دریا بہت گہرائی میں تھا۔ انہوں نے کھانے پینے کا سامان، میڈیکل کٹ اور اسلحہ نکال لیا تھا، البتہ فاضل ایندھن کے کین چھوڑ دیے تھے۔ جیانگ ان کے ساتھ سامان لے کر گیا تھا۔ وہ واپس روانہ ہوا۔ اس نے کار میں بیٹھنے سے پہلے پل کا معائنہ کیا پھر کار اسٹارٹ کر کے پل پر چڑھائی تو اس کے بوجھ سے گارڈر چرچرانے لگے اور پل واضح طور پر ہلتا ہوا محسوس ہوا.... ان کے دل رک گئے.... خاص طور سے زیان بہت مضطرب ہو گیا تھا۔ اس کا جیانگ کے ساتھ برسوں کا تعلق تھا اور وہ باس ماتحت نہیں بلکہ ایک ٹیم بن گئے تھے۔ اس نے زیرلب جیانگ کو محتاط رہنے کو کہا۔ وہ بہت سست روی سے کار چلا رہا تھا اور پل کے ٹوٹے حصوں سے بچ رہا تھا۔ اس نے پانچ منٹ میں نصف پل عبور کیا تھا۔ اس سے آگے کا پل زیادہ مشکل نہیں تھا۔ زیان نے سکون کا سانس لیا اور اسی لمحے آسمان پر ایک ہیلی کاپٹر نمودار ہوا۔

☆☆☆

لینڈ روور میں موجود ایجنٹس سڑک تک آ گئے تھے اور دونوں خاصے زخمی تھے۔ ایک کا بازو ٹوٹ گیا تھا اور دوسرے کی پسلیوں میں فریکچر تھا۔ دونوں ہی اب ڈیوٹی کے قابل نہیں رہے تھے۔ لینڈ روور بھی بیکار ہو گئی تھی۔ ڈیوڈ کے یہاں پہنچنے تک ہیلی کاپٹر آ گیا تھا۔ یہ فوج کا نیم جنگی ہیلی کاپٹر تھا اور اصل میں فضائی نگرانی کے کام آتا تھا۔ ان دنوں یہ سفاری رینجرز کے زیر استعمال تھا۔ ڈیوڈ نے جان سے کہا۔ "تم اسی سڑک پر آگے جاؤ اور دوراہے پر پہنچ کر رک جانا۔ میں تم سے رابطہ کروں گا۔"

جان کو ہدایت دے کر وہ ہیلی کاپٹر میں آیا۔ اس میں پائلٹ کے علاوہ صرف ایک اور فرد کی گنجائش تھی۔ ڈیوڈ اس سیٹ پر آ گیا۔ اس نے ہیڈ فون لگایا اور پائلٹ کو پرواز کا حکم دیا۔ پائلٹ نے اڑنے سے پہلے اسے آگاہ کیا کہ اس کے پاس ایک گھنٹے کی پرواز کا ایندھن ہے۔ بلندی پر آنے کے بعد ڈیوڈ نے اسے لوکیشن بتائی جہاں لینڈ روور نے زرد کار کو کھویا تھا۔ ہیلی کاپٹر دو منٹ میں اس جگہ پہنچ گیا۔ ڈیوڈ نے پائلٹ سے ہیلی کاپٹر بلند کرنے کو کہا۔ وہ بلندی سے اس علاقے کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ پائلٹ نے حکم کی تعمیل کی۔ ہیلی کاپٹر تقریباً چار ہزار فٹ کی بلندی پر آیا تو آس پاس کا علاقہ بھی صاف نظر آنے لگا۔ ڈیوڈ نے بہ غور دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ ان لوگوں نے مشرق اور شمال کا رخ کیا ہوگا۔ ان کی منزل ملک کا شمالی حصہ ہو سکتا تھا۔ جنوب کی طرف اور مغرب کی طرف جانا بیکار تھا۔ اس کے باوجود اس نے پائلٹ کے ساتھ تقریباً آدھ گھنٹے تک اس علاقے کا تفصیلی معائنہ کیا۔ پھر اس نے پائلٹ کو ہائی وے کے دائیں طرف چلنے کا حکم دیا۔ ڈیوڈ کے پاس اس کے جدید ترین آئی فون میں جنوبی افریقا کا مکمل نقشہ موجود تھا۔ اب تک کسی ناکابندی سے زرد کار کی اطلاع نہیں ملی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اب تک سڑک سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے لیکن شمال کی طرف جانے کے لیے انہیں کم سے کم دریا عبور کرنے پڑتے۔ ڈیوڈ نے پائلٹ سے پوچھا۔

"اس علاقے میں مخصوص ہائی ویز کے علاوہ دریا عبور کرنے کا کوئی ذریعہ ہے؟"

"نہیں۔" پائلٹ نے جواب دیا۔ "البتہ ایک پرانا پل ہے جو اب استعمال نہیں ہوتا۔"

کارکردگی

میچ کے دوران ایک کھلاڑی نے زبردست چھکا مارا گیند مرغیوں کے ایک فارم میں گری۔ مرغے نے اپنی تمام مرغیوں کو بلایا اور انہیں گیند دکھائی۔

"دیکھو لڑکیو!" اس نے مرغیوں سے کہا۔ "مجھے شکوہ کرنا اچھا تو نہیں لگتا۔ اب تم خود دیکھو، پڑوس کی مرغیاں کتنی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔"

ترس

ایک صاحب علیک سلیک کے بعد اپنے دوست سے کہنے لگے۔ "یار آج مجھے تم پر بڑا ترس آ رہا ہے۔"

"وہ کیوں؟" دوست نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہی صاحب بولے۔ "بات یہ ہے کہ میری بیوی نے ایک قیمتی ساڑی خریدی ہے اور اسے پہن کر دکھانے کے لیے اس نے تمہاری بیگم کو مدعو کیا ہے۔"

(ڈی آئی خان سے اعتزاز احسن کا انتخاب)

ڈیوڈ نے آئی فون پر اس پل کو تلاش کیا اور گوگل ارتھ میں اسے پل مل گیا۔ یہ سڑک سے کوئی چھ میل شمال میں تھا۔ ڈیوڈ نے ہیلی کاپٹر کا رخ اس طرف موڑنے کا حکم دیا۔ پائلٹ نے رخ موڑ دیا لیکن ساتھ ہی اسے خبردار کیا کہ اب پندرہ منٹ کی پرواز کا ایندھن رہ گیا ہے۔ ہیلی کاپٹر کو بلندی پر لے جانے سے ایندھن خرچ ہونے کی شرح بڑھ جاتی ہے۔ مگر ڈیوڈ نے اسے پرواز کرتے رہنے کا حکم دیا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ لوگ اسی طرف گئے ہوں گے۔ ہیلی کاپٹر نے دو منٹ میں یہ فاصلہ طے کیا اور پل کے پاس آتے ہی ڈیوڈ کو زرد کار نظر آگئی۔ وہ پل کراس کر رہی تھی۔ پل کے دوسری طرف باقی افراد موجود تھے۔ ڈیوڈ نے دیکھتے ہی پائلٹ کو حکم دیا۔

''ہتھیار تیار کرو۔''

ہیلی کاپٹر میں چار بیرل والی ایک بھاری مشین گن اور ایک راکٹ پوڈ تھا جس میں چھ راکٹ تھے۔ پائلٹ نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہتھیاروں کا کنٹرول ڈیوڈ کو منتقل کر دیا۔ ہیلی کاپٹر دریا کے دوسری طرف آگیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی پل کے دوسری طرف موجود افراد بھاگے۔ وہ دریا کی طرف اتر کر پل کے نیچے چلے گئے تھے۔ ڈیوڈ نے مشین گن کا رخ پل کراس کرتی کار کی طرف کیا اور برسٹ مارا۔ اسے تجربہ نہیں تھا اس لیے برسٹ کار سے آگے پل پر لگا۔ ہیلی کاپٹر کو بھی جھٹکا لگا۔ پائلٹ نے چلّا کر کہا۔ ''ہمارے پاس اب صرف دس منٹ کا ایندھن رہ گیا ہے۔''

''ہیلی کاپٹر اور نیچے لاؤ۔'' ڈیوڈ غرایا۔ کار پہلے حملے سے بچنے کے بعد تیزی سے آگے آرہی تھی۔ اس بار ڈیوڈ نے راکٹ استعمال کیا اور یہ بھی نشانے پر نہیں لگا مگر اس نے پل کا ایک گارڈر اڑا دیا۔ اس کے ساتھ ہی پل وسطی حصے سے نیچے جھکنے لگا۔ ڈیوڈ مسکرایا۔ اس نے دوسرا راکٹ مارا اور پل کے وسط میں بڑا سا سوراخ ہو گیا۔ اس کے جھکنے کی رفتار اتنی تیز ہو گئی تھی کہ اب کار آگے آنے کے بجائے پیچھے سرک رہی تھی۔ تیسرے راکٹ نے باقی کسر پوری کر دی اور پل اب تیزی سے بیٹھ رہا تھا۔ زرد کار اس کے ملبے میں شامل تھی۔

☆☆☆

زیان نے ہیلی کاپٹر کی مشین گن دیکھتے ہی کہا۔ ''نیچے چلو... پل کے نیچے۔''

وہ سب افراتفری میں بھاگے اور دریا کی طرف اتر کر پل کی آڑ میں آگئے۔ زیان ذرا اوپر رکا تھا۔ وہ جیا تنگ کو دیکھ رہا تھا جو ابھی وسط میں تھا۔ ہیلی کاپٹر سامنے کی طرف سے نیچے آرہا تھا۔ اس سے پہلا برسٹ چلا تو زیان نے چلّا کر جیا تنگ کو رفتار تیز کرنے کو کہا۔ خود جیا تنگ کو بھی خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ احتیاط ترک کر کے تیزی سے کار آگے لانے لگا مگر ہیلی کاپٹر سے راکٹ فائر ہوا اور اس نے ایک گارڈر تباہ کر دیا۔ پل جھکنے لگا۔ زیان نے دیکھا کہ کار کی رفتار سست ہو گئی تھی اور دوسرا راکٹ لگنے کے بعد وہ دوبارہ پیچھے کی طرف جانے لگی تھی۔ وہ چلّایا۔

''جیا تنگ! کار سے اتر جاؤ۔''

مگر جیا تنگ کو موقع نہیں ملا، تیسرا راکٹ لگنے کے بعد پل تیزی سے بیٹھنے لگا اور جیا تنگ کار سمیت اس کے ملبے کا ایک حصہ بن کر دریا کی گہرائیوں کی طرف جانے لگا۔ زیان نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک خوفناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ ملبا دریا کی گہرائیوں میں گرا تو زیان چونک گیا۔ اس نے ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھا جو گھوم کر اب ان کی طرف آرہا تھا۔ وہ پل کے بچے ہوئے حصے کے نیچے بھی محفوظ نہیں تھے۔ مشین گن کا ایک برسٹ یا ایک راکٹ انہیں مارنے کے لیے کافی تھا۔ زیان نے اپنی خودکار رائفل شانے سے اتاری اور ہیلی کاپٹر کی طرف اس کا رخ کر کے مسلسل فائر کیے۔ اس نے رائفل کو سنگل موڈ پر رکھا تھا۔ اس طرح گولی کی حد بڑھ جاتی ہے۔ اس کی کوشش تھی کہ ہیلی کاپٹر کے ایندھن کے ٹینک کو نشانہ بنائے۔ وہ کامیاب نہیں ہوا مگر اس کی فائرنگ کا اثر یہ ہوا کہ ہیلی کاپٹر تیزی سے دور چلا گیا۔ زیان جلدی سے پل کے نیچے آیا جہاں وہ دبکے بیٹھے تھے۔ جیا تنگ کی موت نے ان کے چہرے بھی دھواں کر دیے تھے۔ خاص طور سے رومیو کا چہرہ ستا گیا تھا۔ محمود نے زیان سے کہا۔

''ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں، پل کا یہ حصہ بھی گر سکتا ہے۔''

زیان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، یہ کنکریٹ کے ستون بہت مضبوط ہیں۔ یہاں سے نکل کر ہم ہیلی کاپٹر کی مشین گن سے نہیں بچ سکتے۔''

''جیا تنگ...'' عمارہ نے دکھی لہجے میں پوچھا تو زیان نے صرف نفی میں سر ہلایا۔ عمارہ رونے لگی۔ اسے ان لوگوں سے انسیت ہو گئی تھی۔ محمود اسے تسلی دینے لگا۔ وہ پل کے ستونوں کی آڑ میں دبکے ہوئے تھے۔ یہاں وہ براہ راست فائرنگ سے محفوظ تھے لیکن اگر راکٹ فائر کیا جاتا تو یہ آڑ بھی زیادہ موثر نہ رہتی۔ زیان اور رومیو اپنی رائفلوں کے ساتھ پوری طرح تیار تھے کہ ہیلی کاپٹر اگر دریا کی طرف آئے تو وہ مزاحمت کریں مگر حیرت انگیز طور پر ہیلی کاپٹر نے مزید حملے سے گریز کیا۔ وہ بلند ہوا اور جنوب کی طرف پرواز کر گیا۔ رومیو نے حیرت سے کہا۔

''یہ واپس چلا گیا۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کا ایندھن ختم ہونے والا ہو گا۔'' زیان نے درست تجزیہ کیا۔ ''یہ ہمارے لیے موقع ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ دوبارہ واپس آئے، ہمیں آگے روانہ ہو جانا چاہیے۔''

وہ پل کے نیچے سے نکلے اور شمال کی طرف چلنے لگے۔ سہ پہر ہو رہی تھی اور کچھ دیر میں سورج غروب ہو جاتا تو انہیں تاریکی کی آڑ مل جاتی۔ دن کی روشنی ان کے لیے خطرناک ہو سکتی تھی۔ وہ تیزی سے دریا کی ڈھلان سے نکلے کیونکہ یہاں سوائے چھوٹی جھاڑیوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ اگر کوئی اور ہیلی کاپٹر آجاتا تو یہاں ان کے چھپنے کے لیے جگہ نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد عمارہ کی ہمت جواب دینے لگی۔ وہ صبح سے ان کے ساتھ بھاگ دوڑ میں تھی اور اس سے پہلے اسے کبھی ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے محمود سے کہا۔ ''میں تھک گئی ہوں۔''

محمود نے زیان کی طرف دیکھا۔ ''ہمیں کہیں رکنا ہو گا۔''

اس نے انکار کیا۔ ''یہاں خطرہ ہے۔ ہیلی کاپٹر دوبارہ آسکتا ہے اور چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہمیں ان درختوں تک جانا ہو گا تبھی ہم رک سکتے ہیں۔'' زیان نے دور درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

محمود نے دوبارہ نہیں کہا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ زیان زخمی ہونے کے باوجود چل رہا تھا اور اس نے سامان بھی اٹھا رکھا تھا۔ محمود نے عمارہ سے کہا۔ ''بس تھوڑی ہمت اور کر لو... ہمیں زیادہ دور نہیں جانا ہے۔''

عمارہ نے سر ہلایا، وہ سست روی سے چل رہی تھی اس لیے محمود نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ عمارہ نے اس کی طرف دیکھا مگر اس کے انداز میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ محمود حیران ہوا۔ کوئی لڑکی کیا اس قدر معصوم ہو سکتی ہے جیسی عمارہ تھی۔ شاید اس کا ذہن عمر سے پیچھے تھا لیکن محمود نے دیکھا تھا کہ آج کل دس بارہ سال کی لڑکیاں بھی بہت ہوشیار ہوتی ہیں۔ اس کا دھیان بٹانے کے لیے محمود اس سے وسیم احمد اور سارہ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ ماں باپ کا ذکر آیا تو سچ مچ عمارہ کا دھیان بٹ گیا۔ وہ بہت محبت اور جذب کے ساتھ محمود کو ان کے بارے میں بتانے لگی۔ ویسے تو اسے ماں باپ دونوں سے پیار تھا لیکن وہ باپ کے بہت قریب رہی تھی۔ وسیم احمد علمی آدمی تھا اور اس کا تھر میں بھی زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں گزرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ عمارہ کو پورا وقت دیتا تھا۔ حد یہ کہ جب وہ ہائیڈروجن والے پروسیس پر کام کر رہا تھا اور اس نے مکان کے تہ خانے میں اپنی لیب بنا رکھی تھی تو عمارہ وہاں بھی موجود رہتی تھی۔ وسیم اسے بتاتا رہتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ عمارہ کچھ نہیں سمجھ رہی مگر وہ باپ کی توجہ سے خوش ضرور ہوتی تھی۔

''ماما کہتی تھیں، میں ان کی زندگی ہوں۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔'' عمارہ کہتے کہتے رو دی.... محمود اسے چپ کرانے لگا۔

''مت روؤ اگر چچا چچی نہیں ہیں تو ہم تو ہیں۔ پاکستان میں دادا جان ہیں، تمہارے دو چچا ہیں، سات کزنز ہیں۔ ہم سب تمہارا خیال رکھیں گے۔''

''لیکن میں پاکستان نہیں جا سکتی۔''

''کیوں، اب تمہارا گھر وہاں ہے۔ ہم سب وہاں ہیں۔''

''بس میں نہیں جا سکتی۔'' عمارہ نے کہا۔ اسے پتا نہیں چلا تھا کہ وہ کب درختوں کے پاس پہنچ گئے اور ان کی آڑ ملتے ہی وہ ڈھیر ہو گئے۔ سب تھکن اور جیا تنگ کا دکھ محسوس کر رہے تھے۔

☆☆☆

''سر! ہمارے پاس اتنا ایندھن نہیں ہے کہ سڑک تک پہنچ سکیں۔'' پائلٹ نے ڈیوڈ کو آگاہ کیا۔

''لعنت ہو پھر کہاں تک جا سکتے ہیں؟''

پائلٹ نے لوکیشن بتائی تو ڈیوڈ نے ریڈیو پر جان سے رابطہ کیا اور اسے لوکیشن سے آگاہ کر کے حکم دیا۔ ''وین سمیت یہاں آجاؤ۔''

اسے جیمس بیکر سے بھی بات کرنا تھی مگر اس نے فوجی ریڈیو کا استعمال مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس پر کی جانے والی گفتگو اور جگہوں پر بھی سنی جا رہی تھی۔ جب جنوبی افریقا میں سفید فام نسل پرست حکومت تھی تو انہیں یہاں ہر سہولت حاصل تھی لیکن رنگ دار حکومت آنے کے بعد یہ سہولتیں محدود ہوتی چلی گئیں۔ اب انہیں یہاں بہت دیکھ بھال کر کام کرنا پڑتا تھا۔ فوج اور پولیس میں کیونکہ سفید فام اکثریت میں تھے اس لیے وہ یہاں اپنی مرضی کر لیتے تھے۔ مگر سیاسی سطح پر انہیں مشکلات کا سامنا تھا۔ وہ ہائی وے سے کوئی دو میل دور اتر گئے تھے۔ جان وین سمیت یہاں سے کچھ ہی دور تھا۔ وہ جلد آگیا اور ڈیوڈ نے جیمس سے رابطہ کیا۔ ''کسی دوسرے ہیلی کاپٹر کا بندوبست کرو، اس کا ایندھن ختم ہو گیا ہے۔''

''مشکل ہے جناب! یہ بھی مشکل سے اور ذاتی سورس کی بنا پر ملا ہے۔ ہاں، پرائیویٹ چوپر مل سکتا ہے۔''

''نہیں گن شپ چاہیے۔''

''اس صورت میں امریکی فوج سے درخواست کرنی پڑے گی۔ ایک جنگی جہاز یہاں سے سو میل دور سمندر میں موجود ہے وہاں سے ہیلی کاپٹر آسکتا ہے۔ اس میں تقریباً پون گھنٹے کا وقت لگے گا۔''

''منگواؤ، یہ بہت ضروری ہے۔''

''ایک اہم اطلاع ہے، حکومت کے ایک اہم عہدے دار نے امریکی سفیر سے رابطہ کر کے کمپنی کا غیر اعلانیہ آپریشن رکوانے کی بات کی ہے۔''

''اسے جہنم میں جھونکو۔'' ڈیوڈ غرایا۔

''جناب، اس سے مشکلات ہو سکتی ہیں۔'' جیمس بیکر نے دبے لفظوں میں کہا۔ ''پولیس اپنا تعاون واپس لے سکتی ہے۔''

''ہمیں اب کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے انہیں تلاش کر لیا ہے اور ان کی گاڑی تباہ کر دی ہے۔ وہ جنگلوں میں بھٹک رہے ہیں اور میں انہیں زیادہ دور جانے نہیں دوں گا۔''

جیمس خوش ہو گیا۔ ''یہ تو اچھی خبر ہے۔ میں ابھی ہائی کمانڈ سے رابطہ کرتا ہوں۔''

ڈیوڈ نے اس علاقے کا تفصیلی نقشہ پھیلایا اور اسے دیکھنے لگا۔ پولیس اور اس کے آدمیوں نے کاریس کی طرف جانے والی سڑکوں کی ناکا بندی کی تھی کیونکہ اس وقت وہ لوگ کار میں سفر کر رہے تھے مگر اب کار نہیں رہی تھی تو ان کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ کاریس کی طرف جاتے۔ وہ مشرق کی طرف سفر کرتے..... تو وورسسٹر کی طرف جانے والی ہائی وے پر نکل سکتے تھے اور وہاں سے ان کے لیے کسی گاڑی کا بندوبست کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ ہائی وے پر کنٹینر ٹرکوں کا ہجوم رہتا تھا جو کیپ ٹاؤن سے پورے ملک میں سامان لاتے اور لے جاتے تھے۔ چھوٹی گاڑیوں کے مقابلے میں ان ٹرکوں کو چیک کرنا زیادہ دشوار تھا۔ ڈیوڈ نے محسوس کیا کہ وہ ہائی وے کی طرف جانے کی کوشش کریں گے کیونکہ یہ دریا کے متروک پل کے پار صرف پانچ میل دور تھی۔ وہ رات ہونے سے پہلے سڑک تک جا سکتے تھے۔ پیدل اس سفر میں دو گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگتا۔ اس سے پہلے ان کو روکنا لازمی تھا۔

چند منٹ بعد جیمس نے اطلاع دی کہ بحر اوقیانوس میں موجود امریکی جنگی جہاز یو ایس ایس کولمبس سے ایک بڑا جنگی اور ٹرانسپورٹر ہیلی کاپٹر روانہ ہو چکا ہے اور وہ چالیس منٹ میں یہاں ہو گا۔ اس کے لیے جنوبی افریقا کی انتظامیہ سے اجازت بھی حاصل کر لی گئی تھی۔ چالیس منٹ بعد ہیلی کاپٹر میدان میں جنوبی افریقا کی فوج کے ہیلی کاپٹر کے ساتھ اتر رہا تھا۔ اس میں پائلٹ اور نیوی گیٹر کے علاوہ چھ افراد کی گنجائش تھی اس لیے ڈیوڈ اپنے تینوں ساتھیوں کے ہمراہ اس میں سوار ہو گیا۔ ان کی وین مقامی پولیس پہنچا دیتی۔

☆☆☆

چن زی اور ڈین پی لیو پریٹوریا کے چینی سفارت خانے میں تھے۔ گزشتہ چھ گھنٹے سے ان کا زیان اور اس کے آدمیوں سے رابطہ نہیں تھا۔ وہ احتیاطاً مخصوص فریکوئنسی کا ریڈیو استعمال کرتے تھے اور موبائل استعمال کرنے سے گریز کرتے تھے کیونکہ چینی جانتے تھے کہ امریکی جنوبی افریقا کے موبائل نیٹ ورک میں رسائی رکھتے ہیں۔ نگران کی طرف سے ریڈیو پر بھی رابطہ نہیں کیا گیا تھا۔ البتہ کچھ دوسرے ذرائع سے معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔ جنوبی افریقا کی فوج کا ایک رینجرز ہیلی کاپٹر کیپ ٹاؤن کے پاس ایک ائربیس سے کہیں گیا تھا اور اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ دوسری اطلاع ایک چینی جاسوس سیارچے سے ملی تھی۔ ولنگٹن کے پاس دریا پر ایک متروک پل کسی وجہ سے تباہ ہو کر دریا میں گر گیا تھا اور جب اس جگہ کی واضح تصاویر لی گئیں تو پل کے ملبے میں ایک زرد کار نمایاں نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں... فکر مند ہو گئے۔

''یہ زیان کی گاڑی ہے؟''

ڈین پی لیو نے سر ہلایا۔ ''ایسا ہی لگ رہا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ سب مارے گئے ہیں۔''

''گاڑی میں ہی ریڈیو نصب تھا۔'' ڈین پی لیو مایوسی سے بولا۔

مگر کچھ دیر بعد ہی ایک اور ذریعے سے اطلاع آئی کہ ایک جنگی ہیلی کاپٹر امریکی بحری جہاز سے آیا ہے۔ اس خبر نے انہیں پُرامید کر دیا۔ امریکیوں کی سرگرمیاں بتا رہی تھیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ چین دوسرے ملکوں سے برابری کی بنیاد پر تعلق رکھتا ہے اس لیے اسے جنوبی افریقا میں وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں جو امریکیوں نے حاصل کر رکھی تھیں۔ پھر بھی چینیوں نے کچھ ایسے انتظامات کر رکھے تھے کہ انہیں اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ وہ جارحانہ حکمتِ عملی پر یقین نہیں رکھتے تھے لیکن دشمن سے

غافل رہنے کے قائل بھی نہیں تھے۔ ایک بڑی اسکرین پر جنوبی افریقا کا تفصیلی نقشہ تھا۔ ڈین نے پل والے علاقے پر انگلی رکھی۔ ''اگر وہ یہاں تھے تو انہیں لازمی مشرق کا رخ کرنا چاہیے۔ وورسسٹر جانے والی ہائی وے پر انہیں لازمی مدد مل جائے گی۔''

چن زی نے دیکھا۔ ''یہاں سے سڑک تک کا فاصلہ پانچ میل ہے اور وہ دو گھنٹے میں یہاں تک پہنچ گئے ہوں گے۔ اب فرض کیا جائے کہ وہ ہائی وے تک پہنچ گئے ہوں گے تو انہوں نے کیا کیا ہو گا۔''

''انہوں نے زبردستی کسی سے لفٹ لی ہو گی۔ ممکنہ طور پر کسی کنٹینر ٹرک سے کیونکہ اس میں چھپنے کی گنجائش بہت ہوتی ہے۔''

سفارت خانے میں چینی خفیہ سروس کا ایک ایلیٹ دستہ موجود تھا جسے صرف انتہائی ضرورت کے وقت استعمال کیا جاتا تھا۔ چن زی نے ڈین سے کہا۔ ''تم روانہ ہو جاؤ، ہم انہیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ ہمارے لیے بہت بڑا موقع ہے۔ اگر یہ ہاتھ سے نکل گیا تو چین کا بہت زیادہ نقصان ہو گا۔''

ڈین خوش ہو گیا۔ اس کی بھی یہی خواہش تھی کہ عام معمول سے ہٹ کر اس مشن میں اپنے لوگوں کی مدد کی جائے۔ اس کے خیال میں چین اب اس قابل ہو گیا تھا کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں اپنے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ اس کے اور ایلیٹ اسکواڈ کے لیے جوہانس برگ میں ایک ہیلی کاپٹر موجود تھا جو انہیں ملک کے جنوبی حصے کی طرف لے جاتا۔

☆☆☆

وہ درختوں کے نیچے بیٹھے تھے کہ اچانک ہی کوئی ہیلی کاپٹر آ جائے تو وہ نظروں سے محفوظ رہیں۔ محمود کو کسی قدر تعجب تھا کہ اگر ان کے پیچھے امریکی تھے تو وہ بہت معمولی سے انداز میں انہیں تلاش کر رہے تھے۔ اس نے زیان سے ذکر کیا تو اس نے کہا۔ ''امریکی اب ماضی کی طرح اس ملک میں آزاد نہیں رہے ہیں۔ سی آئی اے یہاں موجود ہے لیکن اس پر کئی پابندیاں لگی ہیں اور امریکی مقامی حکومت کی اجازت کے بغیر بہت سے معاملوں میں کچھ نہیں کر سکتے۔ چین سے جنوبی افریقا کے تعلقات ماضی کے مقابلے میں بہت بڑھے ہیں۔ اس لیے امریکی چاہنے کے باوجود ہمارے خلاف کھل کر کارروائی نہیں کر پا رہے ہیں۔ اس کے باوجود تم نے دیکھ لیا کہ انہوں نے جنوبی افریقی فضائیہ کا ہیلی کاپٹر حاصل کر لیا اور اس سے ہم پر حملہ کیا مگر یہ مدد محدود ہے ورنہ اب تک کوئی دوسرا ہیلی کاپٹر آ چکا ہوتا۔''

''پولیس تو ان کی پوری طرح مدد کر رہی ہے۔ چچا اور چچی کی موت کو حادثہ قرار دے دیا۔''

''فوج اور پولیس میں آج بھی سفید فام اکثریت میں ہیں اور ان کی وجہ سے امریکی مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔''

رومیو نقشہ دیکھ رہا تھا اس نے زیان سے کہا۔ ''ہم ہائی وے سے تین میل دور ہیں۔ اس لیے ہمیں روشنی میں وہاں پہنچنا چاہیے وہاں سے ہمیں کوئی گاڑی مل جائے گی۔ اس علاقے سے جتنی جلد دور نکل جائیں، اتنا اچھا ہے۔''

زیان نے اتفاق کیا۔ اس کی حالت خراب ہو رہی تھی اس لیے رومیو نے اسے تین عدد انجکشن اور دیے۔ تیسرا انجکشن طاقت کا تھا۔ اس سے زیان کو توانائی ملی اور وہ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ البتہ عمارہ پندرہ منٹ کے آرام کے بعد بھی چلنے کے لیے تیار نہیں تھی، اس نے فریاد کی۔ ''میں بہت تھک گئی ہوں۔''

رومیو اس کے پاس آیا اور بولا۔ ''دیکھو، ہم اپنی جان پر کھیل کر صرف تمہیں بچانے آئے ہیں۔ تم نے دیکھا ہمارا باس زخمی ہے اور جیانگ اپنی جان سے گیا۔ اگر ہم یہاں بیٹھے رہے تو امریکی آ جائیں گے۔ اگر تم ان کے ہاتھ لگ گئیں تو وہ تمہیں مار دیں گے۔''

عمارہ کی آنکھیں پھیل گئیں..... ''میں نے کیا، کیا ہے؟''

''امریکی سمجھتے ہیں کہ وسیم احمد نے اپنی ایجاد کا فارمولا تمہیں دیا ہے یا تمہیں اس بارے میں معلوم ہے۔ وہ ہر صورت تمہیں اپنے قبضے میں لینا یا مارنا چاہتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں تمہارے لیے اچھا نہیں ہو گا اس لیے چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

عمارہ جلدی سے کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ''تو چلو، بیٹھے کیوں ہو۔''

محمود ہنس دیا۔ ''اب تمہیں جلدی ہو رہی ہے۔''

آرام کے دوران میں انہوں نے کچھ کھا پی لیا تھا اور اب بہتر حالت میں تھے۔ اس بار محمود نے سامان اٹھا لیا کیونکہ زیان اور رومیو نے اسلحہ اٹھایا ہوا تھا بلکہ تقریباً سارا اسلحہ رومیو کے پاس تھا۔ زیان نے صرف اپنی رائفل اٹھا رکھی تھی۔ زخم بچانے کے لیے اس نے بائیں طرف رائفل رکھی تھی۔ محمود ڈیجیٹل میپ کی مدد سے سمت اور راستہ دیکھ رہا تھا۔ پانچ بجے کے قریب وہ ہائی وے کے پاس نکلے مگر فوراً انہیں

واپس جھاڑیوں میں گھسنا پڑا کیونکہ سڑک پر ایک پولیس کار موجود تھی اور آس پاس پولیس والے بھی تھے۔ پتا نہیں پولیس معمول کی ڈیوٹی پر تھی یا ان کی تلاش میں یہاں موجود تھی۔ زیان نے کہا۔ ”ہمیں ہائی وے کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف بڑھنا ہوگا۔“

”میری ایک تجویز ہے۔“ محمود نے کہا۔ ”ہمیں ہائی وے کے پار چلے جانا چاہیے۔ اس طرف تلاش اتنی نہیں ہو گی۔“

زیان نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، یہ جگہ خطرناک ہے۔ ہمیں موقع دیکھ کر ہائی وے کے دوسری طرف چلے جانا چاہیے۔“

یہ موقع انہیں ایک برساتی نالے کی صورت میں ملا۔ وہ سڑک کے نیچے سے گزر رہا تھا جو بارش نہ ہونے کی وجہ سے خشک پڑا ہوا تھا۔ وہ اس سے گزر کر ہائی وے کے دوسری طرف آ گئے۔ شام قریب تھی اور ہائی وے سے مسلسل بھاری ٹریفک گزر رہا تھا۔ رومیو نے کہا۔ ”اگر ہم کسی کنٹینر ٹرک پر قابو پالیں تو سب افراد اس میں چھپ کر سفر کر سکتے ہیں اور ڈرائیور کو ایک آدمی قابو میں رکھ سکتا ہے۔“

”وہ ایک آدمی کون ہوگا؟“ زیان نے سوال کیا۔ ”چینی نقوش دیکھتے ہی ناکے کی پولیس ہوشیار ہو جائے گی۔“

رومیو نے محمود کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے کہا۔ ”میں کسی کو گن پوائنٹ پر نہیں رکھ سکتا۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ کام اس کے بس کا نہیں ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ پکڑا گیا تو ہم کنٹینر میں چوہوں کی طرح گھیر لیے جائیں گے۔ اس لیے کوئی اور طریقہ سوچو۔“

رومیو نے تیزی سے تاریک ہوتے مشرقی افق کی طرف دیکھا۔ ”تب بہتر ہے ہم کوئی فیملی والی گاڑی حاصل کریں اور متبادل راستوں سے یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔“

وہ نالے سے باہر نکل آئے ..... یہاں ایک چھوٹی سی ذیلی سڑک گزر رہی تھی۔ ابھی وہ آپس میں بحث کر رہے تھے کہ ہائی وے کی طرف سے ایک چھوٹی ڈبل کیبن پک اپ اس سڑک پر مڑی۔ زیان نے رومیو سے کہا۔ ”اسے روکنا ہوگا۔“

عمارہ اور محمود کنارے پر رہے۔ رومیو اور زیان سڑک پر اس طرح آ گئے کہ پک اپ کے گزرنے کی جگہ نہیں رہی اور پھر ان کے ہاتھ میں موجود ہتھیار دیکھ کر ڈرائیور کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے شرافت سے پک اپ روک دی۔ رومیو نے کور کیے رکھا اور زیان ڈرائیور کے پاس آیا تو وہ ایک ادھیڑ عمر سفید فام عورت نکلی۔ زیان کے اشارے پر وہ دونوں ہاتھ اٹھائے نیچے اتر آئی۔ اس نے حیرت سے زیان کو دیکھا اور جلدی سے بولی۔ ”میرے پاس پرس اور موبائل ہے۔“

”دونوں چیزیں ادھر دے دو۔“ زیان نے کہا تو عورت نے پھرتی سے اپنا پرس اس کے حوالے کر دیا۔ اس میں اس کا موبائل بھی تھا۔ زیان نے ایک چھوٹے پرس سے عورت کا ڈرائیونگ لائسنس نکالا اور اس پر لکھا نام پڑھا۔ ”مسز رابن فاس۔“

”پلیز مجھے کچھ مت کہنا اگر تم چاہتے ہو تو گاڑی بھی لے جاؤ۔“

”تم کہاں رہتی ہو؟“

”یہاں سے کچھ دور ہمارا فارم ہاؤس ہے۔“

”فارم ہاؤس میں کون کون رہتا ہے؟“

”میں، میرا شوہر اور ہمارا ایک ملازم ہے۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”مارتھا رابن فاس۔“

”ہم تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔“ زیان نے کہا اور ان لوگوں کو اشارہ کیا۔ عمارہ اور محمود آ کر پک اپ کے پچھلے حصے میں گھس گئے۔ پھر زیان، مارتھا کے ساتھ اگلے حصے میں آیا اور آخر میں رومیو بھی پک اپ پر سوار ہو گیا۔ مارتھا نے لرزتے ہاتھوں سے پک اپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ وہ جنہیں ڈاکو سمجھ رہی تھی، وہ اس کے گھر مہمان ہونے جا رہے تھے۔ زیان نے خود کو غیر نمایاں رکھا تھا اور ان تینوں سے بھی کہا کہ وہ ذرا سر جھکا کر رکھیں اگر کوئی راستے میں دیکھے بھی تو ان کے خدوخال نظر نہ آئیں۔ رومیو سیٹ پر نیچے ہو گیا تھا۔ محمود اور عمارہ بھی ذرا جھک کر بیٹھ گئے۔ زیان سیٹ پر نیم دراز تھا۔ البتہ اس کی گن کا رخ مارتھا کی طرف تھا اور اس نے اسے خبردار کیا تھا کہ کسی غلط حرکت کی صورت میں وہ آگے کی صورتِ حال دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے گی۔ مارتھا بے حد خوف زدہ تھی۔ اس نے راستے میں کئی بار زیان سے کہا کہ وہ سب سامان لے لے اور اسے جانے دے مگر ہر بار زیان نے اسے ڈرائیونگ جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔

ساڑھے پانچ بجے وہ ایک فارم ہاؤس میں داخل ہوئے جہاں سخت سرما گزر جانے کے بعد کاشت کی جانے والی مکئی کی فصل کے پودے سر اٹھا رہے تھے۔ فارم ہاؤس اچھی حالت میں تھا۔ اس کے کناروں پر شاہ بلوط کے مضبوط اور بلند درخت لگے ہوئے تھے۔ مکان فارم ہاؤس کے آغاز میں

دائیں طرف تھا۔ لکڑی سے بنے اس دو منزلہ مکان کے چاروں طرف جدید طرز کا لان تھا اور ڈرائیو وے میں ایک چیروکی جیپ موجود تھی۔ مارتھا نے پک اپ اس کے پیچھے روک دی۔ زیان نے اس سے پوچھا۔

”رابن فاس اور تمہارا ملازم کہاں ہوں گے؟“

”رابن اس وقت گھر میں ہوتا ہے اور ہمارا ملازم کلارک پیچھے مویشی خانے میں ہوگا۔ وہ مویشیوں کو چارا ڈالتا ہے۔“

زیان نے نیچے اترنے کے بعد رومیو سے کہا۔ ”فارم کا جائزہ لو اور جو ملے اسے مکان میں لے آؤ۔“

فارم ہاؤس الگ تھلگ تھا اور آس پاس کوئی مکان یا دوسرا فارم ہاؤس نہیں تھا اس لیے یہ خدشہ نہیں تھا کہ کوئی انہیں دیکھ لے گا۔ اتنے میں مکان کا داخلی دروازہ کھلا اور مارتھا کی طرح ایک ادھیڑ عمر سفید فام باہر نکلا۔ اپنی بیوی کے ساتھ کئی اجنبی افراد کو دیکھ کر وہ تیزی سے نیچے آیا اور پھر اس کی نظر زیان اور رومیو کے اسلحے پر گئی۔ وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مارتھا کی طرف دیکھا تو وہ کانپتی آواز میں بولی۔

”رابن! یہ مجھے راستے میں ملے تھے اور یہ زبردستی میرے ساتھ آئے ہیں۔“

”ہم کسی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے، بشرطیکہ ہماری بات پر عمل کیا جائے۔“ زیان نے کہا۔ ”پہلا حکم یہ ہے کہ اندر چلو۔“

مکان اندر سے بھی بہت خوب صورت اور پُرآسائش انداز میں سجا ہوا تھا۔ وہ سب لاؤنج میں آئے۔ رابن نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”تم لوگ کیا چاہتے ہو؟“

”تم سے یا اس مکان سے کچھ نہیں چاہتے۔“ زیان نے جواب دیا۔ ”اس لیے کوئی احمقانہ حرکت مت کرنا۔ تمہارا ملازم کلارک کہاں ہے؟“

”وہ مویشی خانے میں ہے۔“ رابن نے بھی وہی جواب دیا۔ دس منٹ بعد رومیو سیاہ فام نوجوان کلارک کو لے آیا۔

”فارم میں اور کوئی نہیں ہے۔“

”کوئی یہاں آئے گا...... تمہارا ملنے والا یا کوئی مہمان؟“

”نہیں، آج کوئی نہیں آئے گا۔“ رابن نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”ٹھیک ہے، اگر کوئی آ گیا تو یہ اس کے اور تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔“

زیان کے خیال میں یہ ایک اچھی پناہ گاہ تھی اور وہ ان میاں بیوی سے علاقے کے بارے میں معلومات بھی حاصل کر سکتے تھے۔ مگر فی الحال وہ آرام کرتے اور کھاتے پیتے۔ زیان نے مارتھا کو ڈنر تیار کرنے کے لیے کچن میں بھیج دیا اور محمود کو اس کی نگرانی پر لگا دیا۔ رابن اور کلارک ان کے ساتھ تھے۔ وہ نشست گاہ میں آ گئے۔ رومیو نے اصرار کر کے زیان کا زخم دیکھا۔ وہ خشک ہو رہا تھا مگر آس پاس کسی قدر سوجن بھی تھی۔ زیان کو آرام کی ضرورت تھی۔ مکان میں کھانے پینے کے مکمل انتظامات تھے۔ محمود نے سب سے پہلے کافی تیار کرائی۔ رومیو نے بیئر کی بوتلیں تلاش کر لی تھیں۔ مارتھا نے اسٹو اور پڈنگ بنائی تھی۔ اگلے ایک گھنٹے میں وہ شکم سیر ہو گئے تھے۔ محمود اور عمارہ نے گوشت نہیں لیا تھا۔ انہوں نے پڈنگ کھا کر پیٹ بھر لیا تھا۔ ڈنر کے بعد زیان کے حکم پر رومیو نے رابن، مارتھا اور کلارک کو مکان کے اسٹور روم میں بند کر دیا۔ اس سے نکلنے کا سوائے ایک دروازے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ انہوں نے احتجاج کیا لیکن ہتھیاروں کے آگے وہ ماننے پر مجبور ہو گئے۔ زیان نے رابن سے اس پورے علاقے کا ایک بڑا نقشہ حاصل کر لیا تھا۔ اس نے نقشہ میز پر پھیلایا۔ اس میں ہر سڑک اور راستہ واضح تھا۔ ندی نالوں اور دریاؤں پر کہاں پل تھے، یہ بھی نشان دہی تھی۔ محمود دیکھ رہا تھا اور وہ دونوں آپس میں بحث کر رہے تھے کہ کون سا راستہ بہتر رہے گا۔ اچانک محمود نے ایک جگہ انگلی رکھی۔

”یہ دیکھو ائر کلب...“

رومیو اور زیان نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ محمود نے کہا۔ ”زمینی راستہ بہت طویل ہے اور اس میں جگہ جگہ چیکنگ سے گزرنا پڑے گا اور یہ ناممکن ہے کہ ہم بچ کر نکل جائیں اس لیے اگر ائر کلب سے کوئی طیارہ حاصل کر لیں تو آسانی سے پریٹوریا کے پاس پہنچ سکتے ہیں۔“

رومیو اور زیان اس تجویز پر اچھل پڑے۔ ”یہ خیال تو آیا نہیں...... واقعی یہ بہت آسان ہے۔“ زیان نے کہا اور نقشے پر دیکھا۔ ”ائر کلب یہاں سے کوئی بیس میل کے فاصلے پر ہے۔“

انہوں نے متبادل راستے دیکھے اور ایک راستہ بھی تلاش کر لیا۔ زیان نے انگلی سے واضح کیا۔ ”اگر ہم اس راستے سے جائیں تو کسی سے ٹکرانے کا امکان کم ہوگا۔“

محمود خوش تھا کہ وہ اس کی بات مان گئے تھے پھر اسے خیال آیا۔ ”ان لوگوں کا کیا ہوگا؟ ہمارے جاتے ہی یہ

پولیس کو اطلاع کردیں گے۔"

"تم فکر مت کرو، ہمارے پاس ان کا علاج ہے۔"

محمود کا رنگ اڑ گیا۔ "تت... تم انہیں قتل کردو گے۔"

"نہیں، ہم بے سبب کسی کو قتل نہیں کرتے۔" زیان نے جواب دیا۔ "ہم انہیں بے ہوش کرجائیں گے، ہمارے پاس انجکشن ہیں۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" محمود نے سکون کا سانس لیا۔

"لیکن ایک مسئلہ ہے۔" رومیو بولا۔ "طیارہ تو مل سکتا ہے لیکن اسے اڑائے گا کون؟"

زیان نے کہا۔ "میں طیارہ اڑا سکتا ہوں لیکن پھر ہمیں ائر ٹریفک کنٹرول کی اجازت کے بغیر سفر کرنا ہوگا۔ ہم زمینی راہنمائی کے بغیر راستہ بھٹک سکتے ہیں۔ پائلٹ تلاش کرنا پڑے گا۔"

"پائلٹ کہاں سے ملے گا؟"

"میں بتاؤں۔" صوفے پر بیٹھی عمارہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"بتاؤ۔" محمود نے کہا۔

"ایک بار پاپا مجھے اور ماما کو آئی لینڈ کی سیر کے لیے لے گئے تھے، انہوں نے کال کرکے پائلٹ بک کیا تھا۔"

"کال کرکے مگر کسے کال کرکے؟"

"پاپا نے انٹرنیٹ پر ایڈ دیکھا تھا۔" عمارہ نے سادگی سے بتایا تو ان تینوں نے خود کو احمق محسوس کیا، یہ سامنے کی بات تھی۔ مکان میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ موجود تھا۔ رومیو نے اس پر سرچ کیا تو اتفاق سے اسی ائر فیلڈ کے ایک پائلٹ جارج کا ایڈ مل گیا۔ اس کے پاس ایک چھ نشستوں والا بائی پلین تھا جو وہ کرائے پر چلاتا تھا۔ اس کا فون نمبر تھا۔ رومیو نے مکان کے فون سے اسے کال کی۔ خوش قسمتی سے پائلٹ رات کے لیے دستیاب تھا۔ رومیو نے بالکل انگریزوں کے لہجے میں بات کی اور اسے آج رات گیارہ بجے تیار رہنے کو کہا۔ مگر اس نے پرواز کے لیے سمت غلط بتائی تھی۔ اس نے جارج سے کہا کہ وہ ڈربن جانا چاہتا ہے۔ اس نے جارج کی بتائی ہوئی رقم ڈن کردی تھی اور اسے یقین دلایا تھا کہ پرواز سے پہلے اس کا معاوضہ ادا کردیا جائے گا۔ ساڑھے نو بجے انہوں نے سب سے پہلے رابن، مارتھا اور کلارک کو بے ہوشی کے انجکشن لگائے۔ وہ اس کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے اس لیے انہیں زبردستی کرنا پڑی۔ خاص طور سے مارتھا نے بہت شور مچایا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے زہر کا انجکشن دے رہے ہیں۔

"اب یہ آٹھ گھنٹے سوتے رہیں گے۔" رومیو نے بتایا۔ اس نے انہیں اٹھا کر بیڈز پر لٹا دیا اور انہیں کمبل اوڑھا دیا اس سے نیند کا دورانیہ طویل ہوجاتا۔ وہ مکان کی روشنیاں بجھا کر باہر آئے۔ ڈرائیونگ رومیو نے سنبھالی۔ وہ وقت سے پہلے ائر کلب پہنچ جانا چاہتے تھے۔ زیان نے راستے میں کہا۔

"ہمیں پوری طرح ہوشیار رہنا ہوگا کیونکہ جو بات ہمارے ذہن میں آسکتی ہے، وہ دوسروں کے ذہن میں بھی آسکتی ہے۔ ہمیں ذہنی طور پر دشمن کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔"

زیان کی زبان سے نکلنے والی بات کے بعد ان کے دلوں میں یہ خدشہ آ گیا تھا۔ اگر یہ راستہ بھی بند ہوگیا تو وہ یہاں سے کیسے نکلیں گے؟

☆☆☆

ڈیوڈ کسی زخمی سانپ کی طرح تلملا رہا تھا۔ صرف پانچ منٹ کی وجہ سے وہ لوگ اس کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ اگر ہیلی کاپٹر میں اتنے وقت کا ایندھن ہوتا تو وہ ان سب کو ختم کرسکتا تھا۔ اس کے بعد صرف ان کی لاشیں اٹھانے کا مرحلہ رہ جاتا۔ پھر دوسرا ہیلی کاپٹر تاخیر سے آیا تو یقیناً ان لوگوں کو ہائی وے تک پہنچنے کا موقع ملا ہوگا۔ اس نے درمیانی جنگل دیکھا تھا، اس ہیلی کاپٹر میں انفرا ریڈ ٹارگٹ پوڈ موجود تھا اور اس کی مدد سے جنگل کا جائزہ لیا گیا تھا۔ یہاں جانور ضرور تھے لیکن کوئی آدمی دکھائی نہیں دیا۔۔۔ پانچ بجے وہ ہائی وے پر پرواز کر رہے تھے۔ یہاں بھاری ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ کسی گاڑی یا کنٹینر میں چھپ کر نکلنا آسان تھا۔ ڈیوڈ نے وورسسٹر کے پولیس چیف ورنر کائل سے رابطہ کیا اور اسے علاقے کی تمام ہائی ویز پر ناکابندی کا حکم دیا۔

"کسی بھی گاڑی کو بغیر مکمل چیکنگ کے نہ جانے دیا جائے۔"

اگرچہ پولیس پہلے ہی مستعد تھی اور ہائی وے پر چیکنگ جاری تھی مگر گاڑیوں کی مکمل تلاشی نہیں لی جارہی تھی۔ ڈیوڈ کی فرمائش پر پولیس نے تمام ہائی ویز کی مکمل ناکابندی شروع کردی۔ چھ بجے تک ہر گاڑی کو مکمل تلاشی کے بعد آگے جانے دیا جارہا تھا۔ مگر عمارہ سمیت باقی افراد کا سراغ نہیں ملا تھا۔ ہر گزرتے لمحے اس کی جھنجلاہٹ بڑھ رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر وورسسٹر کے پولیس ہیڈ کوارٹر کے لان میں اترا ہوا تھا اور ڈیوڈ اندر پولیس چیف ورنر کائل کے ساتھ موجود تھا۔ ورنر پرانے آدمیوں میں سے تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو آخری لمحے تک جنوبی افریقا میں تبدیلی کی مخالفت کرتے

رہے تھے۔ اب وہ یہاں کا پولیس چیف تھا اور ساتھ ہی امریکا کا بہت بڑا حامی بھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ڈیوڈ کے ساتھ مکمل تعاون کر رہا تھا۔ ڈیوڈ کو یقین تھا کہ ورنر کے آدمی اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہوں گے۔ اس لیے اگر لڑکی اور اس کے ساتھی نہیں ملے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ وہ اسی علاقے میں تھے۔ رات نو بجے تک کہیں سے اطلاع نہیں آئی تھی۔

"مجھے امید نہیں ہے کہ وہ سڑک کا راستہ اختیار کریں گے۔" ورنر نے کہا۔ "اس سارے علاقے میں آنے جانے کے لیے چند ہی ہائی ویز ہیں اور ان سے گزرے بغیر کوئی شمال یا مشرق کی طرف نہیں جاسکتا۔" ورنر نے اپنے دفتر کی دیوار پر لگے نقشے کی مدد سے وضاحت کی۔ "یہاں، یہاں اور یہاں پولیس نے ناکا لگا رکھا ہے۔"

"ذیلی سڑکیں بھی تو ہیں۔"

"درست لیکن دریا کو عبور کرنے کے لیے ہائی وے ون سے گزرنا لازمی ہوگا۔ دوسری صورت میں مونٹی گو کے پل سے وہ آگے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دریا کراس کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

ڈیوڈ سوچ میں پڑ گیا۔ اگر وہ لوگ کسی طرح دریا عبور کر جاتے تب بھی آگے ان کو اسی قسم کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ پورے جنوبی افریقا کی پولیس کو ان کے بارے میں خبردار کردیا گیا تھا۔ ڈیوڈ کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ان کی منزل پریٹوریا میں چین کا سفارت خانہ ہوسکتا ہے۔ یہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں ان کو پناہ مل سکتی تھی۔ جان کی رپورٹ کے مطابق چینی اس معاملے میں پوری طرح شامل ہوگئے تھے۔ مارک کو جس چینی نے قتل کیا تھا، جان نے اسے ایجنٹ زیان گن کی حیثیت سے شناخت کرلیا تھا۔ سی آئی اے کے ڈیٹا بیس میں تمام چینی ایجنٹس کا ریکارڈ موجود تھا۔ زیان کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ افریقا میں چینی فیلڈ ایجنٹس کا سربراہ ہے۔ اس کی بذات خود اس مہم میں موجودگی ظاہر کر رہی تھی کہ لڑکی چینیوں کے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہے اور اسی وجہ سے ڈیوڈ کو یقین کی حد تک شک تھا کہ لڑکی کے پاس وسیم احمد کا ایجاد کیا ہوا پروسیس فارمولے کی صورت میں موجود ہے۔

ورنر کی بات نے ڈیوڈ کو الجھا دیا تھا۔ زمینی راستے سے اتنی دور جانا واقعی آسان نہیں تھا، اس میں پکڑے جانے کا رسک بہت زیادہ تھا۔ اس نے ورنر سے کہا۔ "اس علاقے میں پرائیویٹ ائر کلب ہوں گے جہاں طیارے رکھے جاتے ہیں؟"

"بالکل ہیں، کیپ ٹاؤن سے موسل بے تک اس علاقے میں کوئی سو بھی ائر کلب ہیں اور طیاروں کی تعداد کم سے کم بھی ہزاروں میں ہوگی۔"

ڈیوڈ بے چین ہوگیا۔ "یہاں ایسے پرائیویٹ آپریٹر بھی ہیں جو لوگوں کو کہیں بھی لے جاسکتے ہیں اور ان کو کہیں کوئی رپورٹ نہیں کرنا پڑتی؟"

"ایسا ہی ہوتا ہے۔" ورنر نے اسے غور سے دیکھا۔ "ملک میں کہیں آنے جانے پر صرف اے ٹی ایف کو اطلاع دینی پڑتی ہے۔ مسافروں کے بارے میں رپورٹ کرنا ضروری نہیں ہے۔"

ڈیوڈ سوچ میں پڑ گیا۔ ایک ہزار سے زائد طیاروں اور ان کے پائلٹوں کی چھان بین آسان کام نہیں تھا۔ اس نے اگلا سوال کیا۔ "کیا ایسا کوئی طریقہ ہے کہ کسی بھی ائر فیلڈ سے کوئی طیارہ روانہ ہو تو ہمیں معلوم ہوجائے؟"

"ایسا کوئی میکنزم نہیں ہے۔" ورنر نے نفی میں سر ہلایا۔ جنوبی افریقا میں ائر ٹریفک بہت زیادہ ہے اور فضا میں موجود یا جانے والے کسی نجی طیارے کے بارے میں پہلے سے معلومات لینے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ کوئی بھی پائلٹ جو ایک مخصوص شناخت رکھتا ہے، وہ بس اطلاع دینے کا پابند ہے کہ وہ ٹیک آف یا لینڈنگ کرنے والا ہے اور وہ کہاں جا... یا آرہا ہے۔"

ڈیوڈ نے ایک بار پھر نقشے کا معائنہ کیا۔ اس نے اس ممکنہ جگہ کے آس پاس کے ائر فیلڈز کا جائزہ لیا جہاں وہ لوگ دریا پار کرکے نکلے ہوں گے۔ اس کی توجہ ہائی وے ون کے ساتھ ڈی ڈوس سے پہلے ایک ائر فیلڈ کی طرف گئی۔ ڈیوڈ نے اس ائر فیلڈ اور پھر اس کے آس پاس کی کوئی نصف درجن ائر فیلڈ پر نشانات لگائے اور ورنر سے کہا۔ "ان سب سے رابطہ کرکے پولیس کی طرف سے ہدایت دو کہ کوئی بھی طیارہ ٹیک آف کرے تو اس کی منزل کی اطلاع تمہیں دی جائے۔"

ورنر سر ہلا کر اپنے کام میں لگ گیا۔ کچھ دیر میں اس نے تمام ائر فیلڈز حکام کو ہدایت جاری کردی تھی۔ ساڑھے دس بجے اسے ہائی وے ون کے پاس والی ائر فیلڈ کی طرف سے اطلاع ملی کہ ایک پائلٹ جارج نے ڈربن تک جانے کے لیے کلیئرنس لی ہے۔ ورنر نے جارج کا نمبر لیا اور کال کی۔ جارج نے اسے بتایا کہ اسی علاقے کا ایک کسان ڈربن جا رہا ہے۔ اس نے جارج کا طیارہ بک کرایا ہے۔ ورنر نے مایوسی سے فون بند کردیا اور ڈیوڈ کی طرف دیکھا۔ "وہ نہیں ہے۔"

''اس سے معلوم کرو کہ بک کرانے والا کون ہے؟''

ورنر نے دوبارہ کال کی۔ جارج نے بتایا کہ رابن بین فاس نامی کسان نے طیارہ بک کرایا تھا۔ ورنر نے رابن بین فاس کا نمبر لیا اور پھر فون ڈائریکٹری سے اس کی تصدیق کی۔ پونے گیارہ بج رہے تھے۔ ورنر نے رابن کا نمبر ملایا مگر دوسری طرف بیل جا رہی تھی اور کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ ڈیوڈ یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے ریڈیو پر جان سے کہا کہ وہ ہیلی کاپٹر کو ایک منٹ کے نوٹس پر پرواز کے لیے تیار رکھے۔ ورنر کی دوسری ناکام کوشش کے بعد ڈیوڈ کھڑا ہو گیا۔ اس نے ورنر سے کہا۔ ''جارج سے رابطہ کر کے اسے پرواز کرنے سے منع کر دو۔ اس کا طیارہ کسی صورت فضا میں نہیں جانا چاہیے اور اپنے آدمیوں کو ائر فیلڈ کی طرف روانہ کر دو۔''

ورنر نے سر ہلایا... ڈیوڈ دفتر سے نکل گیا۔ اس کا رخ ہیلی کاپٹر کی طرف تھا جس کے پنکھے گردش میں آ چکے تھے۔

☆☆☆

ائر فیلڈ زیادہ دور نہیں تھی لیکن کچے اور غیر آباد راستوں سے گزرنے کی وجہ سے وہ تقریباً پون گھنٹے میں ائر فیلڈ تک پہنچے پھر انہوں نے گیٹ کی طرف سے جانے سے گریز کیا تھا اور پک اپ جھاڑیوں میں روک لی۔ رومیو نے دوربین سے ائر فیلڈ کا جائزہ لیا۔ وہاں درجن بھر طیارے کھڑے تھے اور بس ایک چھوٹی سی عمارت تھی۔ ایک بائی پلین میں ایندھن بھرا جا رہا تھا۔ رومیو نے زیان سے کہا۔ ''میرا خیال ہے یہی طیارہ ہے۔''

زیان طیارے کے بجائے اس کے آس پاس کا معائنہ کر رہا تھا کہ وہاں کوئی نگرانی تو نہیں کر رہا۔ محمود نے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں طیارے تک پہنچ جانا چاہیے۔''

''اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔'' زیان نے کہا۔ ''ابھی پرواز میں پون گھنٹا ہے۔''

عمارہ اونگھ رہی تھی۔ اسے سونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ جلد سو جانے کی عادی تھی۔ اس نے محمود سے کہا۔ ''مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''کچھ دیر رک جاؤ، ہم طیارے میں جائیں گے تب تم سو جانا۔'' محمود نے اسے دلاسا دیا۔

زیان نے تائید کی۔ ''یہ کم سے کم تین گھنٹے کا سفر ہو گا اس لیے تمہیں سونے کا موقع ملے گا۔''

رومیو فکر مند ہو گیا۔ ''تین گھنٹے کا وقت زیادہ ہے۔ اس دوران میں امریکی پتا چلا سکتے ہیں کہ ہم کہاں ہیں۔ وہ فضائی طاقت استعمال کر سکتے ہیں۔''

''ایک بار پرواز کے بعد طیارے کا کنٹرول ہمارے ہاتھ میں ہو گا۔'' زیان نے اپنی حکمتِ عملی واضح کی۔ ''طیارے کا ریڈیو اور دوسرے مواصلاتی آلات بند کر دیے جائیں گے اور ہم ہزار فٹ سے کم بلندی پر پرواز کریں گے۔ اس طرح ریڈار کی زد سے محفوظ رہیں گے۔''

حکمتِ عملی مناسب تھی بشرطیکہ وہ طیارے میں سوار ہو کر فضا میں پہنچ جاتے۔ ساڑھے دس بجے زیان نے چلنے کو کہا اور وہ پک اپ سے اتر کر رن وے کی طرف سے ائر فیلڈ میں داخل ہوئے۔ زیان اور رومیو نے اپنا اسلحہ چھپا لیا تھا۔ ایندھن بھرنے والے اور دوسرے افراد وہاں سے چلے گئے تھے اور بائی پلین کے پاس صرف ایک آدمی تھا جو سگریٹ پی رہا تھا۔ رومیو آگے آیا اور اس نے پوچھا۔ ''جارج؟''

آدمی چونکا۔ ''ہاں میں ہوں۔''

''طیارہ ہم نے بک کرایا ہے۔''

جارج کی آنکھوں میں ان لوگوں کو دیکھ کر شک اتر آیا۔ ''یہ کیا چکر ہے دوست... علاقے کا پولیس چیف مجھے کئی بار کال کر چکا ہے وہ...'' موبائل کی بیل پر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے موبائل نکالا۔ ''لو پھر اس کی کال آ گئی۔''

اس سے پہلے کہ وہ کال ریسیو کرتا، رومیو نے پھرتی سے پستول نکال کر اس پر تان لیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ ''یہ... یہ کیا؟''

''کال ریسیو کرو اور یہ ظاہر کرو کہ اب تک کوئی نہیں آیا ہے۔''

جارج نے لرزتے ہاتھوں سے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف ورنر نے اسے پرواز نہ کرنے کا حکم دیا اور پھر ان لوگوں کے بارے میں پوچھا۔ جارج نے رومیو کی مرضی کے مطابق جواب دیا کہ کوئی نہیں آیا ہے۔ جیسے ہی کال ختم ہوئی، رومیو نے موبائل اپنے قبضے میں لے لیا اور جارج کو حکم دیا۔ ''پرواز کی تیاری کرو۔''

''لل... لیکن پولیس چیف...'' وہ ہکلایا۔

رومیو نے پستول اس کے سر سے لگا دیا۔ ''لگتا ہے تمہیں پولیس چیف کا حکم اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ٹھیک ہے طیارہ ہم خود بھی لے جا سکتے ہیں۔''

جارج نے ہتھیار ڈال دیے۔ ''میں نے انکار تو نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ چکر کیا ہے؟ تم لوگ مجرم ہو؟''

''اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔''

جارج تقریباً چالیس سال کا سفید بالوں والا شخص تھا۔

اس نے پرواز کی تیاری شروع کی۔ پولیس کا سن کر زیان اور رومیو دونوں پریشان ہو گئے۔ اب جارج پرواز کرتا تو پولیس جان جاتی کہ وہ اسی طیارے میں ہیں۔ انہوں نے وقت سے پہلے روانگی کا فیصلہ کیا کیونکہ جارج پہلے ہی کلیئرنس لے چکا تھا اس لیے اب دوبارہ رابطے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے روانگی سے پہلے جارج کو بتا دیا تھا کہ ان کی منزل جوہانس برگ یا پریٹوریا ہو گی.... اسے ریڈیو یا مواصلاتی آلات کی مدد کے بغیر پرواز کرنا تھی۔ جارج یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ بہت خطرناک ہو گا۔ اگر ریڈیو آف ہوا تو طیارے کو مار گرایا جا سکتا ہے۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔''

مجبوراً جارج نے طیارے کا انجن اسٹارٹ کیا۔ اس میں اتنا ایندھن تھا کہ یہ آرام سے جوہانس برگ پہنچ سکتا تھا۔ وہ سب طیارے میں آ گئے۔ زیان نے پائلٹ کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی تھی۔ رومیو، محمود اور عمارہ پیچھے آ گئے۔ طیارے نے رن وے پر مختصر دوڑ کے بعد اڑان بھری اور پھر تقریباً ہزار فٹ کی بلندی پر آ گیا۔ اسی لمحے اس کے پاس سے ایک بڑا جنگی ہیلی کاپٹر گزرا۔

☆☆☆

ڈیوڈ اور اس کے ماتحت ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر ائر فیلڈ کی طرف روانہ ہوئے..... گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ پائلٹ نے بتایا تھا کہ وہ پانچ منٹ میں ائر فیلڈ پر ہوں گے۔ ڈیوڈ مطمئن تھا کہ طیارہ گیارہ بجے پرواز کرے گا اور وہ اس سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ اس نے پائلٹ سے کہا کہ ہیلی کاپٹر کو اس طرح رن وے پر اتارے کہ وہ استعمال کے قابل نہ رہے۔ پانچ منٹ بعد وہ ائر فیلڈ کے پاس تھے اور اسی لمحے ایک بائی پلین ان کے پاس سے گزرا..... ڈیوڈ نے اس میں چار پانچ افراد کی جھلک دیکھی تھی، اس نے چلا کر پائلٹ سے کہا۔ ''یہ وہی ہیں۔ ان کا پیچھا کرو۔''

پائلٹ نے ہیلی کاپٹر کا رخ تبدیل کیا لیکن اتنی دیر میں تیز رفتار بائی پلین کوئی دو کلومیٹرز آگے جا چکا تھا اور ویسے بھی وہ رفتار میں ہیلی کاپٹر سے کہیں تیز تھا۔ پائلٹ نے ہیلی کاپٹر کی رفتار تیز کی اس کے باوجود بائی پلین ہر گزرتے لمحے اس سے دور ہو رہا تھا۔ ڈیوڈ نے حکم دیا۔ ''شوٹ اٹ۔''

''میں اسے میزائل سے گرا دوں؟'' پائلٹ نے تصدیق چاہی۔

''تو اور کیا کہہ رہا ہوں احمق۔'' ڈیوڈ اس پر گرجا۔ ''میزائل فائر کرو۔''

پائلٹ نے ویپن کنٹرول سسٹم آن کیا۔ ہیلی کاپٹر میں فضا سے فضا میں مار کرنے والے سائڈ وائنڈر میزائل تھے۔ وہ بائی پلین کو لاک آن کرنے لگا جو اب تقریباً چار کلومیٹرز دور جا چکا تھا۔ جیسے ہی میزائل نے طیارے کو لاک کیا، پائلٹ نے میزائل فائر کر دیا۔ تاریکی میں ایک شعلہ چمکا اور پھر بہت تیزی سے بائی پلین کی طرف لپکا۔

☆☆☆

زیان نے مڑ کر ہیلی کاپٹر کو دیکھا اور پھر جارج سے کہا۔ ''رفتار تیز کرو۔''

''اس بلندی پر یہ رفتار بھی زیادہ ہے۔'' جارج نے جواب دیا۔

''میں کہہ رہا ہوں رفتار تیز کرو، ممکنہ حد تک...''

بائی پلین اس وقت دو سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑ رہا تھا اور یہ چار سو میل کی رفتار سے پرواز کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے لیے بلند ہونا لازمی تھا۔ جارج نے بادل ناخواستہ طیارے کو ذرا بلند کرتے ہوئے انجن کو طاقت دی تو رفتار بڑھنے لگی۔ رومیو جو پیچھے دیکھ رہا تھا، اس نے اطلاع دی۔ ''ہیلی کاپٹر پیچھے آ رہا ہے۔''

''رفتار بڑھاؤ۔'' زیان نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ''جلدی ورنہ ہم سب مارے جائیں گے۔''

جارج نے اس کے لہجے سے خطرہ محسوس کر لیا تھا۔ طیارہ اب تین سو میل فی گھنٹے کی رفتار پر آ گیا تھا۔ اچانک رومیو چلایا۔ ''میزائل... انہوں نے میزائل فائر کیا ہے۔''

جارج کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے فلائنگ اسٹک کھینچی اور طیارے کے انجن کو پوری طاقت دی۔ یہ ایک عام طیارہ تھا اور اس میں ایسے آلات نہیں تھے جو کسی میزائل کی آمد کی اطلاع دیتے۔ رومیو اور محمود مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ تاریکی میں ایک شعلہ ان کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی رفتار طیارے سے کہیں تیز تھی اور لگ رہا تھا کہ وہ کچھ دیر میں طیارے سے آ ٹکرائے گا۔ وہ خوف زدہ تھے کیونکہ یقینی موت پیچھے تھی۔ میزائل اب اتنا پاس آ گیا تھا کہ اس کی دم کے ساتھ فن صاف دکھائی دے رہے تھے۔ رومیو چلایا۔ ''وہ پاس ہے۔''

جارج نے اچانک ہی طیارے کو دائیں طرف موڑا اور اس وجہ سے وہ بچ گئے۔ میزائل تیزی سے ان کے پاس سے گزرا۔ اس کی رفتار یقیناً آواز سے زیادہ ہو گئی تھی۔ نشانہ خطا ہونے پر میزائل آگے جا کر چکر کاٹنے لگا۔ وہ گھوم کر دوبارہ ان کی طرف آ رہا تھا۔ جارج نے اس بار طیارے کو بائیں طرف کاٹا اور وہ ایک بار پھر بال بال بچے۔ میزائل

دوبارہ عقب میں آ گیا تھا اور تیزی سے طیارے کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ اس بار بچنے کے امکانات کم تھے۔ جارج طیارے کو سیدھا اور تیز رفتار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میزائل تیزی سے نزدیک آیا۔ ان کی سانسیں بھی رک گئیں۔ محمود نے آنکھیں بند کر لیں اور کلمہ پڑھنے لگا کیونکہ اب بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مگر قدرت کو ابھی ان کی موت منظور نہیں تھی۔ اچانک اجل کی طرح لپکنے والے میزائل کے عقب سے نکلتا شعلہ معدوم ہو گیا اور پھر میزائل کسی بے جان وجود کی طرح نیچے گرنے لگا۔ رومیو جو ایک لمحے پہلے تک میزائل کو آتے دیکھ رہا تھا، خوشی سے چلّانے لگا۔

''گر گیا۔''

جارج نے ماتھے پر آیا پسینا صاف کیا۔ ''خوش قسمتی سے میزائل کی حد ختم ہو گئی ورنہ اس وقت ہم ٹکڑوں میں بٹ کر زمین پر گر رہے ہوتے۔''

زیان نے بھی سکون کا سانس لیا۔ ساتھ ہی وہ دوبارہ متحرک ہو گیا۔ اس نے کمانڈ سنبھالتے ہوئے جارج کو حکم دیا۔ ''طیارے کو ہزار فٹ سے نیچے لے آؤ۔''

جارج بلندی کم کرنے لگا۔ ہیلی کاپٹر پیچھے رہ گیا تھا۔ زیان سوچ رہا تھا کہ اس مصیبت سے اتنی آسانی سے جان نہیں چھوٹے گی۔ پریٹوریا تک جانے میں کئی گھنٹے لگ سکتے تھے اور امریکی اپنی فضائیہ کی مدد سے ان کے طیارے کو... بہ آسانی تلاش کر سکتے تھے۔ جنوبی افریقا کے پاس بحرِ ہند میں امریکی بیڑا موجود تھا اور اس سے اڑ کر کوئی بھی جنگی طیارہ ایک گھنٹے میں یہاں آ سکتا تھا۔ زیان نے جارج سے کہا۔ ''آگے کوئی ائر فیلڈ ہے جہاں ہم اتر سکیں؟''

''ہم سو میل شمال کی طرف آ چکے ہیں اور یہاں سے کوئی ڈھائی سو میل دور کمبرلے میں ایک ائر فیلڈ ہے۔ میں وہاں آتا جاتا رہتا ہوں۔''

''کتنا وقت لگے گا؟''

''اگر میں پوری رفتار سے چلوں تو پچاس منٹ لگ سکتے ہیں۔''

''بس تو کمبرلے چلو۔'' زیان نے فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

ایک اور ناکامی ڈیوڈ کے حصے میں آئی تھی۔ جب میزائل بائی پلین کو ہٹ کرنے والا تھا اسی وقت اس کا راکٹ بوسٹر ایندھن ختم ہونے سے جواب دے گیا۔ مگر وہ ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے پائلٹ سے کہا کہ بحرِ ہند امریکی کمانڈ سے رابطہ کرے۔ پائلٹ نے رابطہ کیا اور ڈیوڈ سے بات کرنے کو کہا۔ ڈیوڈ نے ریڈیو پر موجود کرنل سے فوری فضائی مدد کا مطالبہ کیا۔ ''یہ بہت ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے، ہم دو ہارنٹ روانہ کر رہے ہیں۔'' کرنل نے جواب دیا۔ ''لیکن انہیں جنوبی افریقا آنے میں آدھا گھنٹا لگے گا۔''

ڈیوڈ کے خیال میں آدھا گھنٹا زیادہ تھا مگر اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اگر جنوبی افریقا میں کوئی امریکی بیس ہوتا تو یہی امداد صرف دس منٹ میں آ سکتی تھی۔ ڈیوڈ سوچ رہا تھا کہ زیان نہایت چالاک شخص ہے۔ کیا وہ اتنی لمبی پرواز کا خطرہ مول لے گا جس میں اسے آسانی سے تلاش کیا جا سکے؟ آسان کام یہ ہوتا کہ وہ راستے میں کسی نجی ائر فیلڈ پر اتر جاتا اور وہاں سے طیارہ بدل لیتا۔ اس کا مشن دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک چانس لیا تھا کہ بائی پلین بدستور فضا میں ہو اور ہارنٹ اسے مار گرائیں مگر اس کے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ ایسا ہوگا نہیں۔ اس نے پائلٹ کو حکم دیا۔ ''پوری رفتار سے جوہانس برگ چلو۔''

''جناب! اس میں چار گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگ سکتا ہے۔''

ڈیوڈ جانتا تھا... وقت تیزی سے اس کے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔

☆☆☆

ڈین اپنی ایلیٹ ٹیم کے ساتھ راستے میں تھا کہ اسے چن زی کی کال آئی۔ ''وہ لوگ وہاں سے روانہ ہو چکے ہیں۔''

''یہ کیسے پتا چلا؟''

چن زی نے بتایا کہ وورسسٹر کے پولیس چیف نے ایک ائر فیلڈ سے پرواز کرنے والے بائی پلین کی تلاش کے لیے اے ٹی ایف سے مدد چاہی ہے لیکن مذکورہ طیارہ ریڈار پر نہیں ہے۔ ڈین مضطرب ہو گیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ امریکی جان گئے ہیں۔ اس صورت میں وہ اپنی فضائی طاقت استعمال کر سکتے ہیں۔''

''اس کا خدشہ ہے... لیکن ہم بے خبر ہیں، زیان کیا کر رہا ہے اور کہاں ہے۔''

وہ جانتے تھے کہ رابطے میں خطرات زیادہ تھے اس کے باوجود ان کی خواہش تھی کہ زیان ان سے رابطہ کرے اور وہ اس کی مدد کر سکیں۔ چن زی نے کہا۔ ''بہتر ہے کہ ہم جوہانس برگ یا اس کے آس پاس رہ کر ان کا انتظار کریں۔''

ڈین نے مایوسی کے عالم میں اپنے ساتھیوں کو واپسی کا حکم دیا۔

☆☆☆

جارج کو شاید اپنی جان چھوٹنے کی امید نظر آئی تھی اس لیے وہ جلد از جلد کمبرلے پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ریڈیو اور نیوی گیشن کے بغیر یہ کام بہت دشوار تھا لیکن جارج اس روٹ پر طویل عرصے سے پرواز کر رہا تھا اور اسے زمینی نشانیاں ازبر تھیں۔ وہ انہی نشانیوں کے سہارے کمبرلے کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ پچاس منٹ بعد اس نے اعلان کیا۔

''ہم کمبرلے کے پاس ہیں۔''

''کیا تم بغیر اطلاع کے لینڈ کر سکتے ہو؟''

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' جارج نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جب تک میں درخواست نہیں کروں گا، رن وے لائٹس آن نہیں ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے، تم صرف اجازت کے لیے ریڈیو آن کرو گے اور اجازت لیتے ہی آف کر دینا۔''

جارج نے ائر فیلڈ کے پاس پہنچ کر ریڈیو آن کیا اور اجازت مانگنے لگا۔ کچھ دیر بعد ائر فیلڈ سے جواب ملا کہ رن وے لائٹس آن کی جا رہی ہیں۔ اجازت ملتے ہی جارج نے زیان کی ہدایت کے مطابق ریڈیو آف کر دیا۔ نیچے رن وے لائٹس آن ہو گئی تھیں۔ جارج لینڈنگ کی تیاری کرنے لگا۔ عقب میں بیٹھا رومیو اسے انجکشن دینے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے میڈیکل کٹ سے پہلے سے تیار چھوٹی سی سرنج نکالی جس میں بے ہوشی کی دوا موجود تھی۔ جارج نے بائی پلین اتارا اور اسے ٹیکسی کراتا ہوا رن وے پر ایک طرف کھڑے طیاروں تک لے جانے لگا۔ جیسے ہی اس نے طیارہ روکا، عقب سے رومیو نے سرنج کی سوئی اس کی گردن میں اتار دی۔ جارج کو جھٹکا لگا اور دوا نے چند سیکنڈ میں اسے بے ہوش کر دیا۔ زیان نے چابی گھما کر انجن بند کیا اور طیارے کی اندر کی لائٹس بھی بند کر دیں۔ رومیو نے محمود سے کہا۔ ''نیچے اترو۔''

محمود اور عمارہ نیچے اتر آئے اور رومیو نے بے ہوش جارج کو گھسیٹ کر پیچھے والی نشست پر ڈال دیا۔ اب اسے یہاں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا جب تک وہ خاص طور سے پچھلے حصے میں نہ جھانکے۔ زیان اور رومیو بھی نیچے اتر آئے۔ یہ بڑا ائر فیلڈ تھا اور یہاں تیس پینتیس طیارے کھڑے ہوئے تھے۔ عمارت بھی خاصی بڑی تھی۔ نیچے اترتے ہی انہیں عمارت کی طرف سے ایک شخص آتا دکھائی دیا۔ اس نے عملے کی وردی پہن رکھی تھی۔ قریب آنے پر اس نے تارچ کی روشنی میں ان سب کا جائزہ لیا اور پھر بائی پلین دیکھ کر چونکا۔

''تم جارج کے ساتھ آئے ہو، وہ کہاں ہے؟''

''وہ واش روم میں گیا ہے .....'' زیان نے کہا۔ ''ہم ٹورسٹ ہیں۔ اس کے ساتھ شمال کی طرف جا رہے تھے۔ طیارے میں کوئی مسئلہ ہوا تو اسے یہاں لینڈنگ کرنا پڑی۔ اگر جارج نہیں جا سکا تو ہمیں کوئی دوسرا طیارہ مل سکتا ہے؟ ہم ادائیگی کریں گے۔''

''کیوں نہیں، اتفاق سے ایک پائلٹ ہے۔ آؤ میں تمہیں اس سے ملواتا ہوں۔''

عمارت میں ایک شخص بیئر سے شغل کر رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا شغل خاصی دیر سے جاری تھا۔ نشے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ محمود نے زیان سے سرگوشی میں کہا۔ ''اگر یہ شخص پائلٹ ہے تو میں اس کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا۔''

''امریکیوں کے ہاتھ آنے سے بہتر ہے کہ تم اس کے ساتھ چلو۔'' زیان نے مشورہ دیا کیونکہ وہی پائلٹ تھا۔ رومیو نے اس سے مذاکرات کیے اور وہ مان گیا۔ زیان نے کہا۔

''ہمیں صبح سے پہلے جوہانس برگ پہنچنا ہے۔''

اس وقت سوا بارہ بجے تھے۔ پائلٹ این چارلس نے کہا۔ ''آدھا گھنٹا لگے گا، مجھے طیارے میں ایندھن بھرنا ہے اور چیک بھی کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' رومیو نے کہا۔ اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے کافی پی اور واش روم سے ہو کر آئے۔ ائر فیلڈ بڑا تھا لیکن رات کے اس پہر یہاں صرف چند افراد تھے۔ خوش قسمتی سے ریڈیو پر کوئی مستقل آدمی نہیں تھا۔ یہ تو ان کے طیارے کی آواز سن کر رات کا نگران ریڈیو پر آ گیا اور اس نے ان کے لیے رن وے لائٹس آن کر دیں۔ لینڈنگ کے بعد اس نے لائٹس دوبارہ بند کر دی تھیں۔ محمود نے خدشہ ظاہر کیا۔ ''ہمارے جانے کے بعد اس نے جارج کو دیکھ لیا تو پولیس کو اطلاع کر دے گا۔''

''مجبوری ہے، یہاں کوئی جگہ نہیں ہے ورنہ ہم جارج کو وہاں ڈال جاتے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔''

عمارت کے لاؤنج میں لگے نقشے سے انہوں نے اندازہ کیا کہ جوہانس برگ یہاں سے چار سو میل کے فاصلے پر تھا اور انہیں دو گھنٹے اور لگ سکتے تھے۔ چارلس نے آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت لیا تھا۔ اس کا طیارہ ایک پرانا سیسنا تھا۔ بہ ظاہر اس کی حالت بھی پائلٹ کی طرح خستہ لگ رہی تھی مگر چارلس نے یقین دلایا کہ طیارہ بہترین حالت میں

ہے اور وہ بہ حفاظت جوہانس برگ پہنچیں گے۔ اگرچہ ان میں سے کسی کو بھی پورا یقین نہیں تھا لیکن ان کے پاس کوئی اور چوائس بھی نہیں تھی۔ وہ سوا ایک بجے کیبرلے سے روانہ ہوئے۔ زیان نے چارلس سے کہا۔ ”طیارے کو ٹریفک زون میں رکھنا اور اسے بالکل اسی ہائٹ پر اڑانا جو اس قسم کے طیاروں کے لیے طے ہے۔“

این چارلس حیران ہوا مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ چھوٹے طیاروں کے لیے فلائٹ ہائٹ پانچ سے پندرہ ہزار فٹ تھی۔ وہ طیارے کو چھ ہزار فٹ کی بلندی پر لے آیا۔ اس بلندی پر کیبن پریشر کا مسئلہ بھی نہیں ہوتا۔ اس نے رفتار ایک سو اسّی میل فی گھنٹا رکھی تھی۔ اس کے سیسنا کا پرانا انجن کام ٹھیک کر رہا تھا مگر زیادہ پریشر نہیں دے پا رہا تھا، اس لیے رفتار محدود تھی۔ دو گھنٹے بعد وہ جوہانس برگ کے پاس تھے۔ چارلس نے بتایا تو زیان نے کہا۔ ”کسی ایسے ائر فیلڈ پر اترو جو نسبتاً چھوٹا۔۔۔ جوہانس برگ اور پریٹوریا کے درمیان ہو۔“

”تم نے جوہانس برگ تک آنے کو کہا تھا۔“ اس نے اعتراض کیا۔

”پریشان مت ہو، تمہیں اس کا معاوضہ بھی ملے گا۔“ زیان نے خشک لہجے میں جواب دیا تو چارلس نے پھر اعتراض نہیں کیا۔ مزید آدھ گھنٹے بعد وہ ایک چھوٹے رن وے پر اتر رہے تھے۔ عمارہ سو گئی تھی۔ طیارے کو جھٹکا لگا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے محمود سے پوچھا۔

”ہم کہاں ہیں؟“

”جوہانس برگ میں۔“

عمارہ خوش نظر آنے لگی۔ زیان اور رومیو بھی خوش تھے کیونکہ وہ اپنی منزل کے پاس آ گئے تھے اور یہاں وہ کال کر کے مدد بھی حاصل کر سکتے تھے۔ مگر جب وہ طیارے سے باہر آئے تو انہیں پتا چلا کہ یہاں سے ہائی وے خاصی دور ہے اور وہاں تک جانے کے لیے کوئی کنوینس بھی نہیں۔ ائر فیلڈ کے نگران نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ لوگوں کو یہاں سے پیدل ہی جانا ہوگا۔“

انہوں نے چارلس کو معاوضہ دیا تو وہ خوش ہو گیا۔ اس نے کہا کہ وہ ان کے ساتھ ہی چلے گا۔ زیان نے انکار کیا۔ ”ہم تمہیں نہیں لے جا سکتے۔“

”میرا مطلب ہے، میں ہائی وے تک تمہارے ساتھ چلوں گا آج میں ذرا جشن مناؤں گا۔“

زیان دوبارہ انکار کر کے اسے مشکوک نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے مجبوراً مان گیا۔ وہ پیدل ہی ہائی وے کی طرف چل پڑے۔

☆☆☆

ڈیوڈ کو امید نہیں تھی کہ جنگی طیاروں کو بائی پلین مل سکے گا اور ایسا ہی ہوا۔ وہ ابھی راستے میں تھا کہ اسے ناکامی کی اطلاع مل گئی۔ اس دوران میں وہ سوچ رہا تھا کہ اب زیان اینڈ پارٹی کیا کریں گے۔ یہ تو لازمی تھا کہ وہ جہاں اترے تھے، وہاں سے انہوں نے دوسرا طیارہ لے لیا ہوگا اور یہ جاننا تقریباً ناممکن تھا کہ انہوں نے کہاں طیارہ تبدیل کیا تھا۔ البتہ ایک بات یقینی تھی کہ ان کی منزل جوہانس برگ یا پریٹوریا کی کوئی ائر فیلڈ تھی۔ اس نے ریڈیو پر جیمس سے پوچھا کہ اس علاقے میں کتنی نجی ائر فیلڈز ہیں؟ اس نے فوری چیک کر کے بتایا۔ ”یہاں دو درجن نجی ائر فیلڈز ہیں۔“

”ان سب سے رابطہ کرو اور معلوم کرتے رہو کہ کوئی ایسا طیارہ اترا ہے جس میں مطلوبہ چار افراد ہیں۔“

”میں معلوم کرتا ہوں۔“

ہیلی کاپٹر کو جوہانس برگ کی طرف پرواز کرتے ہوئے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ راستے میں پندرہ منٹ کے لیے ایک ائربیس پر اترے تھے تاکہ فیول لے سکیں۔ جیمس نے کچھ دیر بعد بتایا کہ اس نے کام شروع کر دیا ہے۔ اب جوہانس برگ اور پریٹوریا کے آس پاس تمام نجی ائر فیلڈز سے اس کا رابطہ تھا۔ آدھ گھنٹے بعد جب ڈیوڈ کا ہیلی کاپٹر جوہانس برگ سے نصف گھنٹے کی مسافت پر رہ گیا تھا، جیمس نے اطلاع دی۔ ”وہ یہاں پہنچ گئے ہیں۔ پندرہ منٹ پہلے وہ جوہانس برگ سے ذرا آگے ایک نجی ائر فیلڈ پر اترے ہیں اور آپ کا اندازہ درست ہے۔ وہ دوسرے طیارے میں یہاں تک آئے ہیں۔ طیارے کا پائلٹ ان کے ساتھ ہی ائر فیلڈ سے نکلا ہے۔ اس کا طیارہ یہیں موجود ہے۔“

”فوری طور پر وہاں نگرانی کراؤ۔ جوہانس برگ کا فیلڈ یونٹ کہاں ہے؟“

”وہ سفارت خانے سے روانہ ہو گیا ہے۔“

”اس سے کہو کہ آس پاس کے علاقوں کو دیکھے اور پولیس کو بھی الرٹ کر دو۔“

”پولیس کو الرٹ کیا جا چکا ہے مگر یہاں پولیس نے فل اسکیل آپریشن سے انکار کر دیا ہے۔ البتہ پٹرولنگ پولیس کو خبردار کر دیا ہے۔“

”لعنت ہو۔“ ڈیوڈ کا موڈ جو کسی قدر بہتر ہوا تھا پھر خراب ہو گیا۔ وہ اب تک زیان سے پیچھے ہی رہا تھا۔ اسے ان کا سراغ مل رہا تھا لیکن کسی قدر تاخیر سے۔ یہاں ان کا

غائب ہونا زیادہ پریشان کن تھا۔ کیونکہ یہ آباد علاقہ تھا اور یہاں چینی بھی موجود تھے جو ان کی مدد کرتے تھے۔ اس نے جیمس سے کہا۔ ”سفارت خانے کے فیلڈ یونٹ کو روک دو۔ طیارے کی نگرانی کا کام پولیس کے سپرد کر دو اور آس پاس جتنے بھی فیلڈز ایجنٹس ہیں انہیں بھی پریٹوریا بھیج دو۔ وہ چینی سفارت خانے جانے کی کوشش کریں گے۔“

ڈیوڈ نے بھی پریٹوریا جانے کا فیصلہ کیا۔ امریکی سفارت خانہ چینی سفارت خانے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اصل معرکہ وہیں ہوگا۔ اس لیے کہیں اور وقت ضائع کرنا بیکار تھا۔ امریکی سفیر کے توسط سے وہ مقامی حکومت پر بہتر طریقے سے دباؤ ڈال سکے گا۔ جب اس کا ہیلی کاپٹر امریکی سفارت خانے کے ہیلی پیڈ پر اتر رہا تھا تو مشرق کی طرف سے صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

چن زی اور ڈین سفارت خانے کے مخصوص کمرے میں تھے۔ ان تک اطلاعات پہنچ رہی تھیں۔ جوہانس برگ اور پریٹوریا کی پولیس الرٹ کی اطلاع بھی مل گئی تھی اور اس کا مطلب تھا کہ زیان لڑکی کو لے کر یہاں تک آ گیا تھا مگر وہ اب کہاں تھا؟ اس سے وہ بے خبر تھے۔ سفارت خانے کے تمام فون اور انٹرنیٹ لائنیں زیر نگرانی تھیں اور وائرلیس رابطوں کی بھی نگرانی کی جا رہی ہوگی۔ ایسے میں زیان کا رابطہ نہ کرنا بھی بہتر ہو سکتا تھا۔ چینی فیلڈ یونٹ کے ایجنٹ سفارت خانے کے آس پاس موجود تھے تاکہ زیان لڑکی کو لے کر سفارت خانے کی طرف آئے تو وہ اس کی مدد کر سکیں۔ ان کو واضح ہدایت تھی کہ وہ راستہ روکنے والوں سے پوری قوت سے نمٹیں۔ انہیں معلوم تھا کہ امریکی بھی کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ وہ زیان اور لڑکی کو روکنے کے لیے ہر حد سے گزر جاتے اور انہیں قتلِ عام کرنا پڑتا تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ چن زی نے اپنے نائب سے کہا۔ ”آخری معرکے کا وقت آ گیا ہے۔ ہمیں ہر صورتِ حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“

”مجھے زیان پر پورا اعتماد ہے۔ وہ یقیناً امریکیوں کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ اب تک کے حالات بتا رہے ہیں، وہ انہیں بہت ذہانت سے شکست دیتا آ رہا ہے۔“

کچھ دیر بعد انہیں پتا چلا کہ جوہانس برگ پولیس کی بھاری تعداد ایک پرائیویٹ ائر فیلڈ پہنچ گئی ہے۔ ان دونوں کے ذہن میں بیک وقت خیال آیا کہ زیان لڑکی کو لے کر اسی ائر فیلڈ پر اترا ہوگا۔

☆☆☆

رومیو اور زیان ذرا پیچھے چل رہے تھے۔ عمارہ اور محمود ان سے آگے تھے اور چارلس سب سے آگے تھا۔ رومیو نے آہستہ سے کہا۔ ”کیا ہم رابطہ کر کے مدد طلب نہیں کر سکتے؟“

”یہ رسکی ہے۔ مجھے یقین ہے امریکی تمام چینلز کی نگرانی کر رہے ہوں گے اور جیسے ہی ہم رابطہ کریں گے، انہیں ہمارا سراغ مل جائے گا۔ ہم صرف اسی وجہ سے بچے ہوئے ہیں کہ ہم نے اب تک رابطے کی کوشش نہیں کی۔ امریکی صرف اندازوں سے ہمارا پیچھا کر رہے ہیں مگر رابطے کی صورت میں انہیں یقینی پتا چل جائے گا کہ ہم کہاں ہیں؟“

”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”میرا ارادہ چائنا ٹاؤن جانے کا ہے۔“ زیان نے کہا۔ ”فی الحال سفارت خانے کی طرف جانا بھی خطرناک ہو گا۔“

ہائی وے ائر فیلڈ سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ صبح قریب تھی اور سڑک پر رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اِکّا دُکّا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ سڑک کے پار ذرا دور صنعتی علاقہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں روشنیاں تھیں اور شفٹوں میں کام کرنے والی فیکٹریوں میں کام جاری تھا۔ زیان نے اس طرف چلنے کو کہا لیکن پہلے اس نے چارلس کو جوہانس برگ کی طرف جانے دیا۔ جب وہ ذرا دور نکل گیا تو وہ بھی ہائی وے کراس کر کے صنعتی علاقے میں داخل ہوئے۔ زیان کا زخم پھر تکلیف دے رہا تھا کیونکہ انجکشن کا اثر ختم ہو رہا تھا۔ اس نے رومیو سے کہا۔ ”یہاں سے کسی گاڑی کا بندوبست کرو اور کوشش کرنا کہ خاموشی سے کام ہو جائے۔“

وہ ایک پارک کے ساتھ رک گئے۔ رومیو آگے بڑھ گیا۔ محمود اب تک ان کا ساتھ دیتا آیا تھا مگر جوہانس برگ پاس آنے کے بعد اس کا خیال بدل گیا تھا۔ اس نے زیان سے کہا۔ ”اس وقت چینی سفارت خانے جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ ہمیں پاکستانی سفارت خانے جانا چاہیے۔“

زیان نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم دونوں صرف چینی سفارت خانے میں محفوظ رہ سکتے ہو۔ پاکستانی سفارت خانہ بھی تمہیں امریکیوں سے نہیں بچا سکتا۔“

محمود شرمندہ ہو گیا۔ اسے لگا کہ زیان اسے طعنہ دے رہا ہے کہ پاکستانی حکومت اپنے شہریوں کے تحفظ کے معاملے میں بے حس ہے۔ اس نے تسلیم کیا۔ ”ٹھیک ہے، ہم وہاں محفوظ نہیں ہوں گے لیکن ضروری نہیں ہے کہ چینی سفارت خانے جائیں۔ ہم جنوبی افریقا کی حکومت سے بھی

مدد مانگ سکتے ہیں۔"
زیان نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم دیکھ چکے ہو، یہاں کی حکومت امریکیوں کا مکمل ساتھ دے رہی ہے۔ وہ فوراً تمہیں ان کے حوالے کردیں گے۔"
عمارہ ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ وہ محمود کے پاس آئی اور بولی۔ "ہمیں ان کے ساتھ جانا ہے۔"
محمود کا موڈ آف ہوگیا شاید اس لیے کہ عمارہ اس کی کزن تھی لیکن وہ زیان کی حمایت کررہی تھی۔ "یہ ہمیں پتا نہیں کہاں لے جا رہا ہے۔ ہم کسی خطرے میں نہیں پڑ سکتے۔"
"یہ ہماری حفاظت کررہے ہیں۔"
محمود کی بات نے زیان کو چوکنا کردیا۔ اس نے اچانک پستول نکال کر محمود پر تان لیا۔ "اپنا پستول میرے حوالے کردو۔"
"یہ کیا کررہے ہو؟" عمارہ محمود کے سامنے آگئی۔
"اب تم ہمیں گن پوائنٹ پر لے جاؤ گے۔" محمود نے تلخی سے کہا۔
"ہم تمہارے ساتھ مخلص ہیں۔" زیان نے صاف گوئی سے کہا۔ "لیکن میں تمہیں اجازت نہیں دوں گا کہ تم اپنی کسی حماقت سے امریکیوں کے ہاتھ میں پہنچ جاؤ۔ اپنا پستول مجھے دے دو۔ میں تیسری بار نہیں کہوں گا۔"
محمود کو لگا کہ اس نے پستول نہیں دیا تو زیان کچھ کر گزرے گا۔ مجبوراً اس نے پستول اور اس کے اضافی میگزین نکال کر زیان کو دے دیے اور عمارہ سے کہا۔ "دیکھا تم نے ان کی اصلیت۔"
"تم اسے بہکانے کی کوشش نہ کرو۔" زیان نے پستول اور میگزین بیگ میں ڈال لیے۔ اس دوران میں رومیو ایک کار لے آیا۔ اس نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے زیان کی طرف دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ "کار کہاں سے لی؟"
"یہاں سے کچھ دور ایک گلی میں کھڑی تھی۔ لاک آسانی سے کھل گیا۔"
وہ سب کار میں آگئے۔ زیان نے رومیو سے کہا۔ "محمود کا ذہن پلٹ رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ اپنے طور پر عمارہ کی حفاظت کرسکے گا۔"
"تم کسی صورت ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ کیا تم نے اپنے چچا چچی اور ابراہیم علی کی موت سے کوئی سبق نہیں سیکھا ہے؟" رومیو نے تلخی سے کہا۔ "تمہیں یہ خوش فہمی کیسے ہوگئی؟"

محمود اب شرمندہ ہورہا تھا، اس نے کہا۔ "مجھے ان معاملات کا تجربہ نہیں ہے۔"
"اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہم پر اعتماد کرو۔ ٹھیک ہے عمارہ کو بچانے میں ہمارا مفاد بھی ہے لیکن تم دیکھو اس سے تمہیں فائدہ ہورہا ہے، نقصان نہیں۔"
"چینی سفارت خانے تک جانے سے عمارہ کیسے بچ جائے گی؟" محمود بولا۔ "ظاہر ہے ہم ساری عمر تو سفارت خانے میں نہیں رہ سکتے۔"
"یہ میں نہیں جانتا لیکن میرے بڑے اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل رکھتے ہوں گے۔"
"تب تم سفارت خانے کیوں نہیں چل رہے ہو؟"
"کیونکہ مجھے یقین ہے سفارت خانے کے آس پاس امریکی ایجنٹ موجود ہوں گے اور وہ عمارہ کو کسی صورت صحیح سلامت اندر جانے نہیں دیں گے۔ اس وقت ہم ایک عارضی پناہ گاہ تک جارہے ہیں جہاں ہم سکون سے بیٹھ کر پلان بنا سکیں گے اور پھر اس پلان پر عمل کرکے عمارہ کو سفارت خانے میں پہنچائیں گے۔"
آدھ گھنٹے بعد جب سورج طلوع ہورہا تھا تو وہ جوہانس برگ کی ایک چینی آبادی میں داخل ہورہے تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے مکان پر اترے۔ انہیں اتار کر رومیو کار چھوڑنے چلا گیا۔

☆☆☆

سورج طلوع ہوا تو ڈیوڈ اور جان ایک بند وین میں چینی سفارت خانے کے سامنے موجود تھے۔ وین جدید ترین مواصلاتی آلات سے لیس تھی اور اس میں آس پاس نظر رکھنے کے مکمل انتظامات تھے۔ ڈیوڈ اور اس کے تین ساتھیوں کے علاوہ وہاں امریکی اسپیشل فورس سے تعلق رکھنے والے دو درجن افراد سادہ لباس میں پھیلے ہوئے تھے۔ چینی سفارت خانہ چاروں طرف سے کھلا تھا اور اس میں داخل ہونے کے دو گیٹ تھے۔ ایک سامنے کی طرف تھا اور ایک عقبی سمت میں تھا۔ لیکن عقب والا گیٹ بند رہتا تھا اور وہاں صرف ایک گارڈ موجود تھا جبکہ سامنے والا گیٹ کھلا ہوا تھا اور یہاں چار سے پانچ مسلح گارڈز موجود تھے۔ گیٹ کے دونوں بڑے پٹ بند تھے اور ایک پٹ میں ایک چھوٹا دروازہ یوں لگا ہوا تھا کہ آدمی اس سے دو حصوں میں دائیں بائیں گھوم کر ہی اندر داخل ہوسکتا تھا۔ جان نے کہا۔
"صرف یہی ایک راستہ ہے اندر جانے کا۔"
"دوسرے راستے پر بھی نظر رکھنی ہے۔" ڈیوڈ نے

کہا۔ "ممکن ہے وہ اس سے اندر پہنچ جائیں۔"
ڈیوڈ نے آس پاس کی عمارتوں پر چار ایسے اسنائپرز کو لگایا تھا جو ہزار گز کے فاصلے سے کولڈ ڈرنک ٹن کے وسط میں گولی کا سوراخ کرسکتے تھے۔ ان کے پاس جدید ترین پن پوائنٹ نشانہ لگانے والی رائفلیں تھیں۔ وہ ڈیوڈ کے اشارے کے منتظر تھے۔ ڈیوڈ نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس آخری مرحلے میں وہ ناکام نہیں رہے گا اور لڑکی زندہ چینی سفارت خانے میں داخل نہیں ہوسکے گی۔ سفارت خانے کا مین گیٹ جس سڑک پر تھا، اس کی دونوں طرف سے اس کے آدمیوں نے ناکا بندی کی ہوئی تھی۔ کوئی ان کی نظروں سے بچ کر سفارت خانے کی طرف نہیں آسکتا تھا۔ ایسی ہی نگرانی عقبی سڑک پر تھی۔ ڈیوڈ کے ساتھی مکمل طور پر مسلح تھے۔ ڈیوڈ کا اشارہ ملنے پر وہ حرکت میں آجاتے۔ اب انہیں صرف انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

چن زی اور ڈین اسکرین پر سفارت خانے کے آس پاس موجود افراد کی سرگرمیاں دیکھ رہے تھے۔ وہ سب سادہ لباس میں تھے لیکن اپنے انداز اور حلیے سے اسپیشل فورس کے نظر آرہے تھے۔ بہ ظاہر کوئی ہتھیار نہیں تھا مگر ان کا پوری طرح مسلح ہونا یقینی تھا۔ ڈین نے تشویش سے کہا۔ "وہ اس حصار سے کیسے گزریں گے؟"
"زیان بھی اس سے واقف ہوگا اسی لیے اس نے آتے ہی یہاں کا رخ نہیں کیا ہے۔" چن زی نے یقین سے کہا۔ "وہ کوئی منصوبہ بنا کر ہی اس طرف آئے گا۔"
"مگر وہ ہے کہاں؟"
چن زی نے گہری سانس لی۔ "امریکیوں کی طرح ہم بھی بے خبر ہیں کہ وہ لڑکی سمیت کہاں ہے اور کیا کررہا ہے؟"

☆☆☆

زیان اس چھوٹے سے مکان میں تھا اور رومیو اس کے زخم کا معائنہ کررہا تھا۔ اگرچہ مسلسل حرکت کرنے سے زخم کی حالت بہتر نہیں ہوئی تھی مگر زخم خراب بھی نہیں تھا۔ رومیو نے اسے اینٹی بایوٹک انجکشن دے دیا مگر اس نے پین کلر کے لیے منع کردیا۔ "یہ مجھے روانگی سے پہلے دینا۔"
اس مکان کا مالک چینی ینگ لوئی... بوڑھا لیکن چست قسم کا آدمی تھا۔ اس میں ایک غیر محسوس سی پھرتی تھی۔ زیان نے آتے ہی اس سے اکیلے میں ملاقات کی اور اس کے بعد ینگ لوئی انہیں اپنی بیوی کے سپرد کرکے مکان سے چلا گیا۔ ینگ کی بیوی نے ان کے لیے ناشتا بنایا۔ محمود اور عمارہ کے لیے اس نے انڈے اور نوڈلز بنائے تھے جبکہ زیان اور رومیو کے لیے مخصوص چینی ناشتا تیار کیا تھا۔ ناشتے کے بعد رومیو نے زیان کے زخم کی مرہم پٹی کی۔ ینگ دو گھنٹے بعد آیا۔ اس نے ایک بار پھر زیان سے اکیلے میں ملاقات کی۔ رومیو، محمود اور عمارہ کے پاس تھا۔ وہ اپنے طور پر عمارہ سے سوالات کررہا تھا کہ وسیم احمد نے اسے کچھ دیا یا بتایا تو نہیں تھا۔ عمارہ چپ رہتی یا نفی میں جواب دیتی۔ اتنا تو رومیو بھی سمجھ گیا تھا کہ جس سوال کا جواب اس کے پاس نہ ہو، وہ اس پر چپ رہتی ہے۔ کچھ دیر بعد زیان ان کے پاس آیا اور اس نے کہا۔ "ہم کچھ دیر میں یہاں سے چینی سفارت خانے روانہ ہوں گے۔"
"اس میں خطرہ ہے۔ تم نے بتایا تھا کہ امریکی وہاں گھیرا ڈال کر بیٹھے ہوں گے؟" محمود نے کہا۔
"ہاں۔" زیان نے نرمی سے جواب دیا۔ "مگر میں نے ایک منصوبہ بنایا ہے اور سب کو مل کر اس پر عمل کرنا ہے۔"
"منصوبہ کیا ہے؟"
زیان نے انہیں بتانے لگا کہ انہیں کیا کرنا تھا۔ وہ سب غور سے سنتے رہے۔ جب زیان چپ ہوا تو محمود نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔ لیکن کیا عمارہ اپنا کردار ٹھیک طریقے سے ادا کرسکے گی؟"
"میں کرلوں گی۔" عمارہ نے کہا۔ "میں سمجھ گئی ہوں۔"
زیان مسکرایا۔ "تم بہت بہادر لڑکی ہو کیونکہ تمہاری رگوں میں دو بہادر قوموں کا خون ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے باپ کی روح کے سامنے سرخرو ہوگی۔"
عمارہ نے سر ہلایا۔ "میرے پاپا کہتے تھے، انسان کے لیے زندہ رہنے سے زیادہ عزت سے زندہ رہنا اہم ہے۔ ذلت کی زندگی سے موت بہتر ہوتی ہے۔"
"انہوں نے اپنے الفاظ کو ثابت بھی کیا۔" زیان نے کہا اور عمارہ کی طرف دیکھا۔ "وقت کم ہے، تمہیں تیار ہونا ہوگا اور پھر میں تمہیں سمجھاؤں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"
زیان نے عمارہ کو ینگ کی بیوی کے سپرد کیا۔ خود وہ رومیو کے ساتھ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔ اسے کچھ معلومات درکار تھیں۔ زیان نے خفیہ ایجنسی کا مخصوص اکاؤنٹ کھولا اور اس کی مدد سے ایک جاسوس سیٹلائٹ سے رابطہ کیا۔ وہ چینی سفارت خانے کے آس پاس کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ امریکی پوری تیاری سے وہاں موجود ہوں گے۔ ایک گھنٹے میں وہ اپنا کام مکمل کرچکا تھا اور نئی معلومات کی روشنی میں اس نے اپنا پلان معمولی سا تبدیل کیا۔ اس دوران

میں عمارہ اور محمود تیار ہو گئے تھے۔ زیان نے ان کا جائزہ لیا۔ خاص طور سے عمارہ کا اور پھر وہ سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ اس نے کمپیوٹر میں سفارت خانے کی کچھ تصاویر محفوظ کی تھیں۔ وہ عمارہ کو دکھا کر سمجھاتا رہا۔ جب تک وہ سمجھ نہیں گئی اور اس نے خود زیان کو نہیں بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے، وہ مطمئن نہیں ہوا۔ عمارہ کسی قدر خوف زدہ تھی مگر زیان کے حوصلہ دلانے پر وہ راضی ہو گئی۔ محمود البتہ پریشان تھا۔ اس نے زیان سے کہا۔

''یہ اکیلی غیر محفوظ ہو جائے گی، مجھے اس کے ساتھ رہنے دو۔''

''نہیں، تمہارے ساتھ یہ نظروں میں آجائے گی اور ہماری ساری حکمتِ عملی ناکام ہو جائے گی۔ تم مطمئن رہو۔ عمارہ بہت باصلاحیت لڑکی ہے اور ضرورت پڑنے پر یہ سب کر سکتی ہے۔''

وہ فخر سے بولی۔ ''پاپا بھی یہی کہتے تھے کہ میں سب کر سکتی ہوں۔''

رومیو تیار ہو کر آگیا تھا اور اب زیان کی باری تھی۔ اسے تیار تو نہیں ہونا تھا مگر اسے پین کلر اور طاقت کا انجکشن لینا تھا تاکہ اس آخری معرکے کے لیے تیار ہو سکے۔ رومیو نے اسے انجکشن دیے۔ پھر اس نے اپنا سامان بیگ میں رکھا اور اسے پشت سے باندھ لیا۔ بارہ بجے وہ ینگ کے مکان سے نکلے۔ مکان کے سامنے ایک ڈیلیوری وین کھڑی تھی اور... بہ ظاہر یہ ڈبل روٹی اور انڈے سپلائی کرتی تھی لیکن اس کے پچھلے حصے میں ایک خفیہ خانہ تھا۔ وہ چاروں اس میں آگئے۔ وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نوجوان چینی لڑکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ یہ انتظام ینگ نے کیا تھا۔ وین ایک دھچکے سے آگے بڑھی تو وہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔

☆☆☆

ڈیوڈ وقت گزرنے کے ساتھ بے چین ہو رہا تھا۔ انتظار اس کے اعصاب کو متاثر کر رہا تھا۔ اس کا تجربہ تھا کہ انتظار ہمیشہ کارکردگی کو متاثر کرتا ہے۔ اس لیے جب حالات اس کے قابو میں ہوتے تھے تو وہ مخالف کو انتظار کراتا تھا مگر آج حالات اس کے قابو میں نہیں تھے اس لیے وہ خود منتشر ہو رہا تھا۔ اس نے خود کو تازہ دم کرنے کے لیے کافی لی۔ وہ بھی گزشتہ چھتیس گھنٹے سے جاگ رہا تھا اور اسے نیند بھگانے والی دوا لینی پڑی تھی مگر اس کا ذہن بار بار سست ہو رہا تھا۔ اسے چست کرنے کے لیے وہ کافی کا سہارا لے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والے چند گھنٹے اس کی زندگی کے اہم ترین گھنٹے ہو سکتے ہیں اور اس میں فیصلہ ہونا تھا کہ وہ کامیاب ہو کر ہیرو بنتا ہے یا پھر ناکامی کے بعد اسے گھر یا کسی معمولی عہدے پر بھیج دیا جائے گا۔ بارہ بجے اس نے جان اور دوسرے ایجنٹوں سے رپورٹ لی۔ جان اب باہر تھا اور ایک بلند جگہ سے سفارت خانے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ اس دو رویہ سڑک کے دوسری طرف تھے اور یہ جگہ ایک پارک کے ساتھ تھی۔ فٹ پاتھ پر لوگ آجا رہے تھے مگر سڑک اتنی مصروف نہیں تھی۔

ڈیوڈ نے ناشتا نہیں کیا تھا اور اب اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے بکس کھولا اور اس میں رکھے سینڈوچز سے انصاف کرنے لگا۔ وین میں اس کے ساتھ صرف ایک آدمی تھا اور یہ ڈرائیور تھا مگر وہ سیٹ پر نہیں تھا۔ ڈیوڈ نے اس سے پوچھنے کی زحمت نہیں کی حالانکہ وہ بھی صبح سے اس کے ساتھ تھا۔ جان اور دوسرے ایجنٹس نے معمول کی رپورٹ دی تھی۔ بہ ظاہر ہر طرف سکون اور سناٹا تھا لیکن یہ سکون و سناٹا ہی آنے والے طوفان کی پیش گوئی کر رہا تھا۔ ڈیوڈ نے ایک بار پھر سب کو الرٹ رہنے کو کہا۔ وہ سب مخصوص فریکوئنسی کے ریڈیو سے آپس میں منسلک تھے۔ اس مخصوص بینڈ کی فریکوئنسی کوئی دوسرا ریڈیو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ ورنہ وہ چینی سفارت خانے کے پاس اتنی بے احتیاطی سے ریڈیو استعمال نہ کرتے۔

ایک بجے جنوب کی سمت تعینات ایک ایجنٹ نے کہا۔ ''ایک ہجوم اس طرف آرہا ہے۔''

ڈیوڈ چونکا۔ ''ہجوم کیا مطلب؟''

''جناب، یہ سو سے اوپر افراد ہیں اور کسی میراتھن کے انداز میں دوڑ رہے ہیں۔ یہ سفارت خانے والی سڑک پر ہیں۔''

ڈیوڈ کے اندر گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے کہا۔ ''ہوشیار ہو جاؤ... یہ کوئی چکر ہے۔''

''جناب، یہ سب چینی نژاد لوگ ہیں۔'' اسی ایجنٹ نے پھر اطلاع دی۔ ''وہ سفارت خانے سے سات سو میٹرز دور آگئے ہیں۔''

''ان کو چیک کرو۔ ان میں ہی زیان اور لڑکی ہوگی۔'' ڈیوڈ نے چلا کر کہا۔ ''چیک کرو... ان کے نظر آتے ہی ان کو شوٹ کر دو۔''

''جناب، یہ بہت زیادہ ہیں۔'' ایجنٹ نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''ان کی تعداد کم سے کم بھی دو سو ہے اور یہ سب مخصوص فاصلے سے پھیل کر دوڑ رہے ہیں۔ اکثر نے اپر

پہن رکھے ہیں۔ ان میں مرد، عورتیں اور بوڑھے بھی ہیں۔''

ڈیوڈ سمجھ رہا تھا، یہ زیان کی حکمتِ عملی تھی۔ اس نے حکم دیا۔ ''سب سڑک پر آجاؤ اور ان کے درمیان آ کر لڑکی کو دیکھو۔ کسی کو بغیر چیک کیے گزرنے مت دینا۔''

مگر دو درجن ایجنٹس جو دور پھیلے ہوئے تھے، وہ دو سو افراد کو کیسے چیک کرتے؟ ڈیوڈ کے حکم پر وہ تیزی سے سمٹ کر اس طرف جانے لگے۔ اب دوڑنے والے سفارت خانے سے نصف کلومیٹر کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ جان بھی سڑک پر آگیا تھا۔ وہ بھاگنے والوں کو چیک کر رہا تھا۔ وہ سب ہوشیار اور تجربے کار لوگ تھے اس لیے وہ منظم انداز میں اپنا کام کر رہے تھے۔ دوڑنے والے تقریباً سو میٹر لمبے اور چار میٹر چوڑے قافلے کی صورت میں تھے۔ ان کے درمیان میں ایک ڈیڑھ میٹر کا فاصلہ تھا اور اسی وجہ سے جان اور اس کے آدمیوں کو چیک کرنے میں آسانی ہو رہی تھی۔ اگر وہ چھوٹے ہجوم کی صورت میں ہوتے تو انہیں چیک کرنا بہت مشکل ہو جاتا۔

ڈیوڈ مسلسل اپنے آدمیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خود وین سے باہر نکل کر زیان اور لڑکی کو روکے مگر اس کا یہاں رہنا ضروری تھا۔ جب ہجوم کی اطلاع ملی اور اس نے آس پاس کے سارے ایجنٹوں کو اس طرف روانہ کیا تب بھی اس کے ذہن میں تھا کہ یہ دھوکا ہو سکتا ہے۔ اس کے آدمی ان بھاگنے والوں کو چیک کرنے میں مصروف ہو جاتے تو زیان لڑکی کو لے کر کہیں اور سے سفارت خانے میں داخل ہو جاتا۔ اس نے چاروں اسنائپرز کو حکم دیا کہ وہ آس پاس دیکھتے رہیں اور اگر انہیں کوئی مشکوک فرد نظر آئے تو فوری اسے مطلع کریں اور کوئی سفارت خانے میں جانے کی کوشش کرے تو اسے شوٹ کر دیں۔ ہر فرد مستعد اور مصروف ہو گیا تھا۔ جان اور تمام ایجنٹس عمارہ، زیان اور محمود کی تصویریں دیکھ چکے تھے اس لیے وہ ان کی نظروں سے نہیں بچ سکتے تھے۔ پھر جان نے اس نوجوان لڑکی کو دیکھ لیا جو ایجنٹوں سے کترا کر گزر رہی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ لڑکی نے اس کے پاس سے گزرنا چاہا لیکن جان نے اس کا بازو تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے اسے چھپا ہوا پستول دکھایا۔

''آواز مت نکالنا، میرے ساتھ آؤ۔''

لڑکی کسی خوف زدہ چڑیا کی طرح اس کے ساتھ کھنچی آئی تھی۔ جان نے ڈیوڈ کو مطلع کیا۔ ''میرا خیال ہے، میں نے لڑکی کو حاصل کر لیا ہے۔''

''اسے چیک کرو۔'' کچھ دیر بعد ڈیوڈ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

جان کے ساتھ دو ایجنٹ اور آگئے تھے اور انہوں نے لڑکی کو فٹ پاتھ پر لگے دو درختوں کے درمیان اس طرح چھپا لیا کہ اب وہ کسی کو نظر نہیں آرہی تھی۔ عمارہ کا حلیہ بدلا ہوا تھا لیکن جان نے اسے پھر بھی پہچان لیا تھا۔ جان نے ایک آلہ نکال کر اسے عمارہ کے جسم پر اوپر سے نیچے تک پھیرا۔ جب آلہ اس کے بیگ کے پاس آیا تو اس نے بپ دی۔ جان نے بیگ اتار لیا۔ اس نے آلے سے دوبارہ چیک کیا اور اسے اسٹرپ میں چھپی ہوئی چپ مل گئی۔ یہ آلہ کسی بھی الیکٹرانک آلے یا میموری چپ کی نشان دہی کر سکتا تھا۔ چپ مل جانے کے بعد اس نے عمارہ کی مکمل تلاشی بھی لی لیکن اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ جان خوش تھا کہ بالآخر وہ کامیاب رہے۔ اس نے پستول عمارہ کی پسلیوں سے لگایا اور ڈیوڈ کو چپ کی اطلاع دی۔

''میں لڑکی کو شوٹ کر رہا ہوں۔''

''نہیں۔'' ڈیوڈ نے اسی انداز میں کہا۔ ''اسے جانے دو۔''

جان کو جھٹکا لگا۔ ''کیا کہہ رہے ہو باس... اسے جانے دوں؟''

''ہاں، تم نے سنا نہیں۔'' ڈیوڈ غرایا۔ ''اسے جانے دو، کچھ مت کہنا۔ ہمارا کام ہو گیا ہے۔ اب یہ زندہ بھی رہے تو ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''

جان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایک منٹ پہلے تک باس اس لڑکی کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا اور اب وہ اسے جانے کی اجازت دے رہا تھا۔ جان متفق نہیں تھا لیکن باس ڈیوڈ تھا۔ اس کے پاس تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے پستول ہٹایا اور عمارہ سے کہا۔ ''جاؤ۔''

عمارہ دوڑنے والوں میں شامل ہو گئی اور اب وہ چینی سفارت خانے کی طرف جا رہی تھی۔ اس وقت وہ سفارت خانے سے صرف تین سو میٹرز دور رہ گئی تھی۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی اور ایک منٹ سے بھی پہلے وہ سفارت خانے کے گیٹ کے پاس پہنچ گئی تھی۔ جان نے ڈیوڈ سے کہا۔ ''اسے زندہ جانے کی اجازت دینا ٹھیک نہیں ہے، اب بھی اسے روکا جا سکتا ہے۔''

ڈیوڈ کی طرف سے جواب نہیں ملا۔ بھاگنے والے سفارت خانے کے پاس سے گزرتے جا رہے تھے اور صرف عمارہ اندر کی طرف مڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اپر پوش بھی مڑا تھا۔ جان کی چھٹی حس اشارہ دینے لگی، اس نے پھر

کہا۔ ”باس! حکم دو اسے شوٹ کیا جائے؟“

اس بار بھی جواب نہیں آیا تو جان وین کی طرف لپکا۔ اس نے اسنائپر کو حکم دیا۔ ”لڑکی کو شوٹ کردو۔“

”یہ حکم صرف باس دے سکتا ہے۔“ ایک اسنائپر نے کہا۔

”میں کہہ رہا ہوں۔“ جان دوڑتے ہوئے غرایا۔ ”کوئی گڑبڑ ہے۔ باس کی طرف سے جواب نہیں آرہا ہے، لڑکی کو شوٹ کردو۔“

عمارہ، رومیو کے ساتھ سفارت خانے کی حد میں داخل ہوگئی تھی اور اسے چاروں طرف سے گارڈز نے گھیر لیا تھا۔ وہ تیزی سے اسے عمارت کے اندر لے جارہے تھے۔ اسنائپرز نے عمارہ کو نشانہ بنانے کے لیے پہلے گارڈز کو نشانہ بنایا۔ ایک گولی کھا کر گرا تو دوسرے گارڈ نے اس کا خلا پُر کردیا۔ دوسرا گارڈ گرا تو وہ عمارت کے نزدیک تھے۔ تیسرا نشانہ رومیو بنا۔ وہ جھٹکا کھا کر عمارہ سے ٹکرایا تو اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ”تم ٹھیک ہونا؟“

اب رومیو کے ساتھ دو گارڈز تھے۔ رومیو نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے اسے آگے دھکیلا۔ ”رکو مت، اسی طرح جھک کر چلتی رہو۔ سر مت اٹھانا۔“

وہ جانتے تھے کہ عمارہ کے نظر آتے ہی اسنائپر اسے شوٹ کردیں گے۔ اسی لیے وہ گولیاں کھانے کے باوجود اسے تحفظ دے رہے تھے۔ دروازے تک آتے آتے تیسرا گارڈ بھی گر گیا تھا۔ فائرنگ کی آواز اور گارڈز کے گرنے سے سفارت خانے میں افراتفری مچ گئی تھی اور دوسرے گارڈز بھی باہر آگئے تھے مگر وہ اسنائپرز کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکتے تھے کیونکہ وہ ان کے ہتھیاروں کی حد سے باہر تھے۔ البتہ سفارت خانے کے باہر موجود چینی ایلیٹ دستہ حرکت میں آگیا تھا۔ ان کی جوابی کارروائی سے ایک اسنائپر مارا گیا۔ مگر تین ابھی محفوظ تھے۔ رومیو اور آخری گارڈ نے عمارہ کو سینڈوچ کی طرح دبالیا تھا۔ اس کوشش میں چوتھا گارڈ چھلنی ہوگیا۔ اسے بیک وقت تین گولیاں لگی تھیں۔ رومیو نے پوری قوت استعمال کرتے ہوئے عمارہ کو دھکیلا اور اسے لیتا ہوا دروازے کے اندر جاگرا۔ اس نے فوراً ہی اسے دیوار کی آڑ میں دھکیل دیا کیونکہ گولیاں دروازے سے گزر کر اندر تک آرہی تھیں۔ پھر رومیو خود بھی گر گیا۔ عمارہ کانپتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

جان پوری رفتار سے بھاگتا ہوا وین کی طرف آیا۔ راستے میں ہی اسنائپرز نے اسے ناکامی کی اطلاع دی۔ چار چینی گارڈز گرے تھے لیکن لڑکی اور اس کے ساتھ سفارت خانے میں داخل ہونے والا فرد اندر پہنچنے میں کامیاب رہے تھے۔ جان کا غصے سے بُرا حال ہوگیا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈیوڈ کو بھی کوئی حادثہ پیش آگیا ہے لیکن جب اس نے وین کا سلائڈنگ ڈور کھولا تو اندر ڈیوڈ اور ڈرائیور صحیح سلامت بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ڈیوڈ نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنا ہاتھ اوپر کیا جس میں ایک موٹا دھاتی کڑا تھا۔ اس پر ایل ای ڈی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ جان اسی دنیا کا فرد تھا۔ اسے شناخت میں دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ آواز سے پھٹ جانے والا بم تھا۔ چند سیکنڈ بعد بم کی روشنیاں بجھ گئیں اور اس کا آٹومیٹک لاک کھل گیا۔ جان نے گہری سانس لی۔

”ہم ناکام رہے... لڑکی سفارت خانے میں پہنچ گئی ہے۔“

ڈیوڈ نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم نے حماقت کی۔ اگر تم اسنائپرز کو حکم نہ دیتے تو معاملہ سنبھالا جاسکتا تھا لیکن اب ہم سب رگڑے میں آئیں گے۔ پیک اپ کرو۔“

☆☆☆

وین سے چند قدم دور مین ہول سے نیچے اتر کر زیان تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ کوئی نصف کلومیٹر بعد وہ باہر آیا اور اس نے اپنے جسم سے پلاسٹک اپر اتار کر اسے مین ہول میں ڈالا اور اوپر سے ڈھکن لگا دیا۔ اس کا لباس بالکل صاف ستھرا تھا، حالانکہ وہ کمر تک غلیظ کیچڑ سے گزر کر آیا تھا۔ بدبو سے اس کا برا حال تھا مگر ایک سیکرٹ ایجنٹ کو اس قسم کی مشکلات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ وہاں موجود چھوٹی سی کار میں محمود اس کا منتظر تھا۔ زیان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور وہ سفارت خانے کی طرف روانہ ہوگئے۔ اسے یقین تھا کہ امریکی وہاں سے جاچکے ہوں گے۔ جب وہ سفارت خانے کے سامنے پہنچے تو وہاں امریکی وین نہیں تھی۔ جس وقت تمام امریکی ایجنٹس ہجوم میں عمارہ کو تلاش کررہے تھے اور اسنائپر سفارت خانے کے آس پاس دوربینیں مرکوز کیے ہوئے تھے، وہ خاموشی سے مین ہول سے نکلا اور وین کا دروازہ کھول کر ڈیوڈ اور ڈرائیور کو پستول کی زد پر لے لیا۔

جس وقت جان نے عمارہ کو پکڑنے کی اطلاع دی اور ڈیوڈ نے اسے تلاشی کے بعد چھوڑنے کا حکم دیا۔ تو زیان کا پستول اس کے سر سے لگا ہوا تھا۔ زیان نے واضح کردیا تھا کہ اس کی زندگی لڑکی کی زندگی سے مشروط ہے۔ دوسری صورت میں کچھ نہیں ہوگا اور وہ واپس چلا جائے گا۔ اس نے میموری چپ امریکیوں کی تحویل میں جانے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ ڈیوڈ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور جب عمارہ سفارت خانے میں پہنچ گئی تو زیان نے ڈیوڈ کی کلائی سے کڑا باندھا اور اسے ایک منٹ کے وقت کے ساتھ ایکٹو کرکے وین سے اتر گیا۔ اسے کافی وقت مل گیا تھا۔ جب تک امریکیوں کو اصل صورتِ حال کا پتا چلتا، وہ خاصا آگے نکل گیا تھا۔ سفارت خانے میں گارڈز نے وہ جگہ گھیر لی تھی جہاں گارڈز گرے تھے۔ ان میں سے ایک جسے چار گولیاں لگی تھیں، اپنی جان سے گزر گیا تھا لیکن باقی تین زندہ تھے اور سفارت خانے کا طبی عملہ ان کی جان بچانے کی کوشش کررہا تھا۔ چینی سفیر اور دوسرے لوگ بھی آگئے تھے۔ زیان کو دیکھتے ہی چن زی اور ڈین آگے آئے اور اسے تقریباً پکڑ کر اندر لے گئے۔ چن زی اس وقت کچھ غصے میں تھا۔

”یہ تم کیا کرتے پھر رہے تھے... دیکھا تم نے نتیجہ؟ ایک آدمی جان سے گیا اور تین زخمی ہیں۔ لڑکی آگئی ہے لیکن اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔“

”لڑکی کہاں ہے؟“ زیان نے پوچھا۔

عمارہ اندر ایک کمرے میں تھی اور اس کی حالت بہتر تھی۔ وہیں ایک ڈاکٹر رومیو کی دیکھ بھال کررہا تھا۔ اس نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی اس لیے گولی جسم میں نہیں اتر سکی تھی لیکن اس کی قوت نے پیچھے سے ایک پسلی توڑ دی تھی اور اندر خون جم گیا تھا۔ عمارہ اسے اور محمود کو دیکھ کر خوش ہوئی..... زیان نے اس سے پوچھا۔ ”تم ٹھیک ہو، ان لوگوں نے کچھ کہا تو نہیں؟“

عمارہ نے سر ہلایا۔ ”لمبا آدمی مجھے شوٹ کرنے والا تھا لیکن پھر اسے کسی نے روک دیا۔“

”تم سے کیا لیا؟“

عمارہ نے بتایا کہ لمبے سفید فام نے اس سے کیا لیا تھا تو چن زی اچھل پڑا۔ ”میموری چپ امریکی لے گئے؟“

عمارہ نے معصومیت سے سر ہلایا۔ ”میرے پاپا نے کہا تھا کہ امریکی روکیں تو ان کو یہ دے دینا۔“

چن زی نے بے ساختہ زیان کی طرف دیکھا۔ ”کیا وسیم احمد ڈبل کراس کررہا تھا؟“

”اسے ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“ زیان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ ہم سے ڈیل نہیں کررہا تھا اس لیے ڈبل کراس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تب امریکی میموری چپ کیسے لے گئے؟“ ڈین کو بھی غصہ آگیا تھا۔ ”تمہیں تمہارے طریقہ کار کے مطابق کام

کرنے کی اجازت اس لیے نہیں دی تھی کہ ہم آخر میں خالی ہاتھ رہ جائیں۔“

”ہم خالی ہاتھ نہیں ہیں۔ یہ ہمارے پاس ہے۔“ زیان نے عمارہ کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ ایک لڑکی ہے۔“ چن زی مایوسی سے بولا۔ ”اسے وسیم احمد کے پروسیس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“

ڈین نے عمارہ کی طرف دیکھا۔ ”تم اپنے باپ کے پروسیس کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟“

عمارہ نے نفی میں سر ہلایا تو چن زی نے زیان کو سخت نظروں سے دیکھا۔ ”اب بتاؤ اس کا کیا فائدہ ہے؟“

عمارہ بولی۔ ”میرے پاپا نے کہا تھا جب میں چینی سفارت خانے پہنچ جاؤں تو بیجنگ یونیورسٹی کے پروفیسر کون شی تاؤ سے بات کروں۔“

چن زی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تم پروفیسر سے کیا بات کروگی؟“

”یہ میں انہی کو بتاؤں گی۔“ عمارہ نے کہا۔

”میری درخواست ہے کہ اس کی بات پر عمل کیا جائے۔“ زیان نے کہا۔ وہ قطعی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اگرچہ چن زی اور ڈین متفق نہیں تھے لیکن زیان کی سنجیدگی دیکھتے ہوئے وہ مان گئے۔ سفارت خانے کے ایک محفوظ سفارتی چینل سے بیجنگ یونیورسٹی کے پروفیسر کون شی تاؤ سے رابطہ کیا گیا۔ پروفیسر کا شمار چین کے چند ذہین ترین ماہرین طبیعات میں ہوتا تھا اور ساتھ ہی وہ اپلائیڈ فزکس کے بھی ماہر تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ویڈیو کال پر تھے۔ عمارہ نے چینی زبان میں کہا۔

”انکل! میں وسیم احمد کی بیٹی عمارہ احمد ہوں۔“

”کیسی ہو میری بچی... مجھے تمہارے باپ کے بارے میں سن کر بہت دکھ ہوا۔“

باپ کے ذکر پر عمارہ کی آنکھیں نم ہوگئیں لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔ ”انکل! میرے پاپا نے کہا تھا کہ انہیں کچھ ہوجائے تو میں آپ سے رابطہ کروں اور آپ کو ایک ایکویشن لکھواؤں۔“

پروفیسر کون شی کے ساتھ یہاں موجود تمام افراد چونک گئے۔ مگر زیان معمول کے مطابق رہا جیسے اسے معلوم ہو۔ پروفیسر نے کاغذ اور پنسل سنبھال لی۔ عمارہ نے رک رک کر بولنا شروع کیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور زبان حرکت میں تھی۔ وہ ایک خاص رفتار سے بول رہی تھی۔ وہ جو کہہ رہی تھی، اس میں ہندسے تھے، انگریزی کے حروف تھے اور

بعض ریاضی کی علامتیں تھیں۔ رفتہ رفتہ پروفیسر کے سامنے موجود کاغذ پر کئی لائنیں وجود میں آ گئی تھیں مگر عمارہ بول رہی تھی۔ ایک منٹ گزر گیا اور پھر دو منٹ ہو گئے۔ تقریباً چار منٹ بعد عمارہ چپ ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول کر پروفیسر کون شی سے پوچھا۔

''میں نے جو بتایا ہے، وہ آپ نے سب لکھا ہے؟''

پروفیسر پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے عمارہ سے کہا۔ ''کیا تم ایک بار پھر یہ سب دہرا سکتی ہو؟''

''میں دہرا سکتی ہوں۔'' اس نے اعتماد سے کہا اور پھر آنکھیں بند کر کے بولنے لگی۔ پروفیسر ایک ایک لفظ کی تصدیق کر رہا تھا۔ چار منٹ بعد جب عمارہ رکی تو پروفیسر کا منہ مارے حیرت کے کھلا ہوا تھا۔ تقریباً ساڑھے چار سو حروف پر مبنی ایکویشن میں ایک کومے کا فرق بھی نہیں تھا۔ عمارہ نے وہ سب یوں بتایا تھا جیسے اس کے سامنے لکھا ہوا ہو اور وہ دیکھ کر بتا رہی ہو۔ دوسرے بھی عمارہ کو ناقابلِ یقین نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پروفیسر کون شی نے بہ مشکل کہا۔

''ناقابلِ یقین... اگر یہ میرے سامنے نہ ہوا ہوتا تو میں کبھی اس پر یقین نہ کرتا۔''

چن زی نے مداخلت کی۔ ''پروفیسر! یہ کیا ہے اور تم وسیم احمد کو کیسے جانتے ہو؟''

''وسیم احمد میرا نیٹ فرینڈ تھا اور اس نے مجھے بہت پہلے اس پروسیس کے بارے میں بتایا تھا۔ اس وقت میں نے اس کی کچھ مدد بھی کی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اس کی ایجاد کردہ پروسیس کی ایکویشن ہے۔ میں جلد اسے پوری طرح سمجھ جاؤں گا۔''

''پروفیسر! یہ قومی امانت ہے۔'' چن زی نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' وہ بولا۔

عمارہ نے پروفیسر کون شی سے پوچھا۔ ''انکل! میں نے اپنا کام کر دیا ہے نا؟''

''ہاں میری بچی... تم نے انسانوں کے لیے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔'' پروفیسر کون شی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''ہم ہمیشہ تم پر فخر کریں گے جیسے تمہارے باپ پر فخر کریں گے۔''

باپ کے ذکر پر عمارہ کی آنکھیں بھیگ گئیں لیکن اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ چن زی نے کہا۔ ''اب تم دونوں چین جاؤ گے۔''

''پاکستان کیوں نہیں؟'' محمود بے چین ہو گیا۔

''جب تک یہ معاملہ دب نہیں جاتا، تمہیں چین میں رہنا ہو گا۔ ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔''

☆☆☆

ساتھ مہینے بعد بیجنگ میں...

محمود انسٹی ٹیوٹ سے آنے کے بعد اپنے اپارٹمنٹ کے اندر آیا تو خوشی سے اچھل پڑا۔ عمارہ وہاں موجود تھی۔ چین آنے کے بعد اسے ایک تھراپی سینٹر منتقل کر دیا گیا تھا جہاں وہ تعلیم بھی حاصل کر رہی تھی اور جدید تھراپی سے اس کا علاج بھی جاری تھا۔ ساتھ ہی چینی ماہرین اس کی حیرت انگیز تصویری یادداشت کا تجزیہ بھی کر رہے تھے۔ محمود کو بیجنگ ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ اور اسکالرشپ مل گئی تھی۔ اس کے بعد آج دوسری بار اس کی عمارہ سے ملاقات ہو رہی تھی۔ ویسے نیٹ پر اس سے بات ہوتی رہتی تھی۔ وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔ ''تم کب آئیں؟''

وہ معصومانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ ''ابھی... میرے ساتھ رومیو بھی ہے۔''

رومیو سرکاری گارڈ کے طور پر اس کے ساتھ رہتا تھا۔ زیان واپس اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا تھا۔ رومیو ڈرائنگ روم میں تھا۔ اس نے محمود سے ہاتھ ملانے کے بعد خوش خبری سنائی۔ ''تم لوگ اب پاکستان جا سکتے ہو لیکن بس کچھ دن کے لیے۔''

''یعنی اب ہمیں امریکیوں سے خطرہ نہیں رہا ہے؟''

رومیو نے سر ہلایا۔ ''ویسے امریکی ناقابلِ اعتبار قوم ہے لیکن ہم نے ان سے ضمانت حاصل کر لی ہے کہ تم دونوں کو نہیں چھیڑا جائے گا۔''

محمود خوش ہو گیا۔ وہ کب سے ماں باپ اور گھر والوں سے ملنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اس کی گھر والوں سے بھی بات ہوتی رہتی تھی لیکن جسمانی دوری کھلتی تھی۔ تنہائی ملتے ہی اس نے عمارہ سے کہا۔ ''سنو، جب ہم پاکستان سے آئیں گے تو دو نہیں رہیں گے ایک ہو جائیں گے۔''

عمارہ کو تعجب ہوا۔ ''وہ کیسے؟''

''جب ہوں گے تو دیکھ لینا۔''

محمود پہلے ہی ماں باپ اور دادا سے کہہ چکا تھا کہ وہ عمارہ سے شادی کرے گا اور انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اگرچہ عمارہ بہتری کے باوجود ذہنی لحاظ سے پسماندہ تھی لیکن محمود کو یقین تھا کہ وہ اسے اپنی محبت سے سنبھال لے گا۔ وہ ساری عمر اس کا خیال رکھے گا۔ یہ اس کی محبت بھی تھی اور اس کا فرض بھی...

ہیروں کی خیرات

امجد رئیس

ہر کام کی کامیابی کا انحصار اس کے بے داغ منصوبے میں مضمر ہوتا ہے... ان دونوں نے بھی اپنی طرف سے مکمل منصوبہ بندی کی تھی... اور کامیابی بھی حاصل کر لی تھی... مگر اچانک ہی قسمت کی ستم ظریفی نے ہاتھ دکھا دیا...

جرم کرنے کے دلدادہ دو چلبلے وارداتیوں کے کارنامے کا دلچسپ قصہ...

پیٹ ہاپکنز بے خیالی کے عالم میں پلازا فاؤنٹین کے قریب کھڑا، لڑکی کو فاؤنٹین کے پانی میں سکّے اچھالتے دیکھ رہا تھا۔ چند سکّے پانی میں پھینک کر وہ چلی گئی۔ پیٹ ہاپکنز دولت حاصل کرنے کے لیے نت نئے آئیڈیاز کی تلاش میں رہتا تھا۔ تاہم اس کو آئیڈیا اتنی آسانی سے نہیں ملتا تھا۔

لڑکی پلازا فاؤنٹین میں سکّے اچھال کر جا چکی تھی۔ پیٹ نے سورج کی تمازت محسوس کی اور وہاں سے جانے سے قبل سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی نگاہ پہلے ڈاؤن ٹاؤن ڈائمنڈ

ایکسچینج کی عمارت کی کھلی کھڑکی پر پڑی... دفعتاً اس کے ذہن میں بجلی سی چمکی۔ اسے انوکھا آئیڈیا مل گیا تھا۔ اس نے وہاں سے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور ٹہلتے ہوئے پھر سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی عمارت کی چوتھی منزل پر تھی۔

فاؤنٹین پر کچھ اور بچے آ گئے تھے اور اِکا دُکا سکے اچھال رہے تھے۔ پیٹ فون بوتھ کی طرف چل پڑا۔ وہاں سے اس نے پلازا میں جانی اسٹوپ کو کال کی۔ جانی کا ریکارڈ یہاں بالکل صاف تھا۔ اس بات کا امکان بعید ترین تھا کہ پولیس دور تک کوئی سرا تلاش کرتی اور جانی کی کیلی فورنیا میں دس سال قبل کی واردات تک پہنچ جاتی۔

"جانی! پیٹ بات کر رہا ہوں۔ تمہیں یہاں پا کر خوشی ہوئی۔"

"اوہ پیٹ بوائے... کہاں ہو؟"

"یہیں پلازا کے نیچے۔"

"وہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ایک جاب ہے، وہ بھی تمہارے مطلب کی۔"

"کیسی جاب؟" جانی محتاط لگ رہا تھا۔

"مجھ سے "برج پارک بار" میں ملاقات کرو۔"

"کب؟"

"ایک گھنٹے میں۔" پیٹ نے کہا۔

جانی نے توقف کیا۔ "دو گھنٹے کر لو۔" وہ بولا۔

"او کے، سی یو۔"

☆☆☆

برج پارک بار، سہ پہر میں یہ ایک خاموش اور پُرسکون جگہ تھی۔ جانی سے میٹنگ کے لیے یہ جگہ پیٹ کے حسبِ منشا تھی۔ یہاں اس نے کھلی میز کے بجائے عقبی سمت میں ایک بوتھ منتخب کیا اور بیئر کا آرڈر دیا۔

جانی دس منٹ تاخیر سے پہنچا۔ وہاں پہنچ کر وہ اس طرح سرگرداں دکھائی دیا جیسے کسی لڑکی کو تلاش کر رہا ہے پھر معمولی تردد کے ساتھ وہ پیٹ تک پہنچ گیا۔

"کیا کہانی ہے؟" اس نے پیٹ کے بالمقابل بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

بارٹینڈر فون پر کسی کے ساتھ بلند آواز میں الجھ رہا تھا۔ باقی جگہ تقریباً ویران تھی۔

"ڈاؤن ٹاؤن ڈائمنڈ ایکسچینج۔" پیٹ نے آگے جھک کر سرگوشی کی۔ "ہم مٹھی بھر پتھر وہاں سے اڑا سکتے ہیں... تقریباً 5 لاکھ ڈالرز کی مالیت کے برابر۔"

"کیا بکواس ہے؟" جانی حواس باختہ نظر آیا۔ کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔ "لیکن کس طرح؟"

"تم یہ کام کر سکتے ہو۔" پیٹ نے کہا۔ "اور میں باہر انتظار کروں گا۔"

"بہت خوب... یعنی پولیس مجھے دبوچ لے گی۔" جانی نے ناگواری سے کہا۔

"کوئی کسی کو نہیں پکڑے گا۔" پیٹ نے سکون سے کہا۔ "تم کسی امیر زادے کی طرح چوتھی منزل پر پہنچو گے اور ہیروں کی ٹرے نکلواؤ گے۔ وقت دوپہر کا ہو گا۔ اس وقت گاہکوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ اس وقت میں ہال میں افراتفری پھیلانے کا انتظام کروں گا اور تم مٹھی بھر کر بیش قیمت پتھر اٹھا لینا۔"

"پھر کیا کروں گا... پتھروں کو نگل جاؤں گا؟"

"یار، پوری بات تو سنو۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔" پیٹ نے اسے سمجھایا۔ "تم مٹھی بھر کر پتھر کھڑکی سے باہر پھینک دینا۔"

"یار! تمہاری باتیں میرے سر سے گزر رہی ہیں۔"

"جانی! میں سنجیدہ ہوں۔"

"خاک سنجیدہ ہو۔" جانی بڑبڑایا۔ "اے سی کی وجہ سے کھڑکیاں بند ہوں گی۔"

"میں نے آج کھڑکی کھلی دیکھی ہے... وہی توانائی بچاؤ مہم کا معاملہ ہے۔" پیٹ نے کہا۔ "کوئی بھی چار منزل طے کر کے، ہیروں کے ساتھ چار منزل واپس نہیں اتر سکتا... لیکن ہیرے چار منزل تنہا اتر سکتے ہیں۔"

"پیٹ! مجھے تو یہ پاگل پن لگ رہا ہے۔" جانی نے تبصرہ کیا۔

"سنو کھڑکی کاؤنٹر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ تم ہیرے اٹھاتے ہی کھڑکی سے باہر اچھال دینا۔" پیٹ، پنسل سے کاغذ پر اسکیچ بنا کر اسے سمجھا رہا تھا۔ "تمہیں کاؤنٹر سے ہٹ کر کھڑکی تک جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تم ہر قسم کے شک سے بالاتر رہو گے۔ زیادہ سے زیادہ وہ تمہاری تلاشی لیں گے اور چند سوالات کریں گے اور بس... پھر وہ دوسرے گاہکوں کی جانب متوجہ ہو جائیں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" جانی نے کہا۔ "ہیرے باہر چلے جائیں گے اور تم انہیں کیچ کر لو گے؟" جانی کی آواز میں ہلکا سا طنز تھا۔ "تم تو ہال میں کسی قسم کی ہڑبونگ مچاؤ گے تو باہر پتھروں کا کیا بنے گا؟"

"یہی تو منصوبے کی نفاست ہے۔" پیٹ مسکرایا۔ "کھڑکی کے عین نیچے خوب صورت فوارہ اور تالاب ہے۔ ہیرے تالاب کی تہ میں پہنچ جائیں گے۔ گویا بینک کے والٹ میں محفوظ ہو جائیں گے۔ چلتے فواروں کی پھوار میں

کوئی وہاں ہیرے گرتے نہیں دیکھ سکے گا۔ نہ تہ میں کوئی ان کو دیکھ سکتا ہے کیونکہ وہ شیشے کی طرح شفاف ہیں۔ قیمتی ہیروں کی خوبیوں میں کلر، کیرٹ اور کٹ بہت ضروری ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ان کو پرکھا جاتا ہے۔"

"ہاں۔" جانی نے رضامندی میں سر ہلایا۔ "لیکن جب سورج تالاب پر آئے گا تو..."

"سورج کی رسائی نہیں ہے، تم چیک کر سکتے ہو۔ انعکاس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" پیٹ نے جواب دیا۔ "جب تک کسی کو پتا نہ ہو، کوئی وہاں پر ان کی موجودگی سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ ہم دوسرے یا تیسرے روز رات میں آرام سے آئیں گے اور ہیرے نکال لے جائیں گے۔" پیٹ مسکرایا۔

جانی کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر تعریفی انداز میں پیٹ کو دیکھتے ہوئے ہامی بھر لی۔

☆☆☆

اگلے روز ٹھیک سوا بارہ بجے جانی اسٹوپ، ڈاؤن ٹاؤن پلازا کی زیریں منزل سے چوتھی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ باوردی گارڈ نے اس پر محض ایک اچٹتی نظر ڈالی اور وہ داخلی دروازے سے گزر کر اندر داخل ہو گیا۔

پیٹ چوتھی منزل کے ہال وے سے جائزہ لے رہا تھا۔ اندرونی منظر واضح تھا۔ اندر بہت کم گاہک تھے۔

جانی کاؤنٹر کے شیشے میں جھانکتا ہوا عین کھڑکی کے بالمقابل کاؤنٹر پر جھک گیا۔ وہ کسی ٹرے کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ سیلز مین نے جیسے ہی جانی کی مطلوبہ ٹرے نکالنے کے لیے کمر کو خم دیا... پیٹ ٹہلتا ہوا آگے بڑھا اور موٹے شیشے کے داخلی دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔ دروازہ ابھی آدھا کھلا تھا کہ پیٹ چکرا کر نیچے گر گیا... اندر دروازے کے ساتھ گارڈ تشویش آمیز انداز میں اس کی مدد کے لیے آگے بڑھا۔ اندرونی افراد بھی داخلی دروازے کی جانب دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہوا مسٹر؟ تم ٹھیک تو ہو؟" گارڈ، پیٹ کے اوپر جھکا ہوا تھا۔

"مم... مجھے... سانس..." اس نے سر اٹھا کر پانی کا اشارہ کیا۔ چند افراد قریب آ گئے تھے۔ ان میں دو کلرک بھی تھے۔ ایک نے فوراً ہی پانی کا گلاس اسے دیا۔ پیٹ اچھی اداکاری کر رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ کے بل پر بیٹھا اور پانی کا گلاس غٹاغٹ چڑھا گیا۔ وہ کچھ دیر بیٹھا ہانپتا رہا پھر لڑکھڑاتا ہوا سوٹ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔

ایک کلرک نے اسے کرسی فراہم کی۔

"میں شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔" وہ بے خیالی میں بڑبڑایا اور کرسی پر گر گیا۔

"کیا تمہیں ڈاکٹر کی ضرورت ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"نہیں، مجھے گھر جانا چاہیے۔ آپ سب کا شکریہ۔"

اس نے جانی کی طرف دیکھنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ گارڈ نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ پیٹ آہستہ آہستہ باہر نکل گیا۔ وہ لفٹ تک پہنچا اور جلد ہی عمارت سے باہر نکل گیا۔ اس کا رخ فوارے کی جانب تھا...

فوارے پر ہر وقت پبلک موجود ہوتی تھی... کبھی کم، کبھی زیادہ۔ وہ غیر محسوس انداز میں ان میں گھل مل گیا۔ دھیرے دھیرے وہ تالاب کے کنارے تک پہنچ گیا۔ کافی بڑا تالاب تھا۔

فوارے کی طویل دھاریں مختلف زاویوں سے بلند ہو کر گھومتی ہوئی دور دور تک گر رہی تھیں۔ تالاب کی تہ میں اسے پھینکے گئے سکوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ پیٹ نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور سرسری انداز میں پلٹ کر وہاں سے نکل گیا۔ تاہم تالاب میں ایک سکہ اچھالنا وہ نہیں بھولا تھا۔

"مجھے اپنے اپارٹمنٹ میں جا کر فون کا انتظار کرنا چاہیے۔" اس نے خود سے کہا۔ تصور کی آنکھ سے اس نے دیکھا کہ پولیس، جانی سے لاحاصل تفتیش میں مصروف ہے۔ بے ساختہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

☆☆☆

جانی کی کال دو گھنٹے بعد موصول ہوئی۔

"کام کر دیا؟" پیٹ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"کر تو دیا۔ تاہم اتنا ہی وقت ملا تھا کہ میں ہیرے اٹھا کر باہر پھینک دوں۔"

"پھر؟"

"پھر کیا... ذرا دیر بعد ہی پولیس آ گئی۔ انہوں نے اپنی جانب سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن نہ میں وہاں سے ہلا تھا اور نہ ہی میرے پاس سے کچھ برآمد ہوا... وہ سب بشمول ڈائمنڈ ایکسچینج والے سخت حیران و پریشان تھے۔ کسی نے تمہارا ذکر کر ڈالا۔ لیکن تم تو اندر ہی نہیں آئے تھے۔ گارڈ سمیت کئی افراد گواہ تھے۔" جانی نے احوال گوش گزار کیا۔ "مزہ آیا۔ فول پروف منصوبہ تھا۔ لے دے کر میں رہ جاتا تھا۔ ان کے دماغ ماؤف تھے کہ میرا کیا کریں۔ میں اپنی جگہ قطعی پُرسکون تھا۔ مجھے تو ان کے تاثرات یاد کر کر کے ہنسی آ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اب بھی میرا تعاقب کر رہے ہوں۔ میں مطمئن ہونے

کے بعد دو گھنٹے میں برچ پارک میں ملوں گا۔"
"نہیں۔" پیٹ نے فوراً کہا۔ "آج نہیں، ہم کل ملیں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم روٹین کے ایک دو کام کر کے گھر چلے جاؤ۔"
"ٹھیک ہے۔ ویسے تمہاری کھوپڑی آج کل کافی تیز جارہی ہے۔" جانی نے تبصرہ کیا۔ "کل ملیں گے۔"

☆☆☆

اگلے روز وہ دونوں برچ پارک کے ایک بوتھ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پیٹ نے بیئر کا آرڈر دیا۔
"پیٹ! ہم نے کر دکھایا۔" جانی کا چہرہ چمک رہا تھا۔
"ہاں... سناؤ وہاں کیا ہوا؟" پیٹ بھی مسکرا رہا تھا۔
"میں نے بتایا کہ میں نے تو کچھ نہیں دیکھا۔ مجھ سے ہیروں کی ٹرے کے بارے میں پوچھا گیا۔ میرا جواب تھا کہ ہاں میں نے ٹرے نکلوائی تھی اور اس سے قبل کہ میں ہیروں کا جائزہ لیتا... دوسروں کی طرح مجھے بھی دروازے کی جانب متوجہ ہونا پڑا جہاں کوئی شخص گرا ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ چار گاہک وہاں اور تھے۔ میری جو پوزیشن تھی وہ ہر طرح سے صاف تھی لہٰذا وہ ان چاروں سے تفتیش کرنے لگے لیکن سب کچھ لاحاصل تھا۔
"ہم سب کی تلاشی بھی لی گئی، تنگ آ کر وہ ہمیں پلازا سے باہر لے گئے اور ایکسرے تک کر ڈالا کہ شاید ہمارے پاس کوئی مخصوص پاؤچ ہوگا اور ہم میں سے کسی نے ہیرے پاؤچ میں ڈال کر نگل لیے۔" یہاں تک پہنچ کر جانی نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ "میری تو جان پھر بھی جلد چھوٹ گئی۔ مجھ سے زیادہ وہ دوسرے چار گاہکوں پر شک کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے ایک کو پکڑ بھی لیا کیونکہ اس کے سابقہ ریکارڈ میں کار چوری کا ایک کیس تھا۔"
"میرا خیال ہے کہ یہ پولیس والے کچھ نالائق تھے کہ انہوں نے مجھے بالکل نظر انداز کر دیا۔" پیٹ نے کہا۔ "حالانکہ وہاں ہلچل میری وجہ سے ہوئی تھی۔ انہیں سوچنا چاہیے تھا کہ میں ملوث ہو سکتا ہوں۔"
"اب کیا ارادہ ہے؟" جانی نے بے قراری سے کہا۔
"ارادہ کیا ہے... آج رات ہیرے وہاں سے نکال لیں گے۔" میں نے واب دیا۔
"پیٹ! سچی بات ہے کہ ہیرے اٹھاتے اور پھینکتے وقت میری حالت خراب تھی۔ میں نے زیادہ نہیں اٹھائے کیونکہ اس صورت میں امکان تھا کہ پھینکتے وقت ایک آدھ وہیں گر جاتا اور... ٹائیں ٹائیں فش۔"
"گڈ!" پیٹ نے کہا۔ "کتنے تھے؟"
"پانچ، میرا خیال ہے کہ پانچ لاکھ ڈالرز سے کم نہ ہوں گے۔"
"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تین لاکھ ڈالرز بھی ہوئے تو بہت ہے۔" پیٹ مسکرایا۔
شام کے اخبارات میں تصدیق بھی ہوگئی اور مالیت کا بھی پتا چل گیا۔ مالیت پونے تین لاکھ ڈالرز تھی۔ پولیس کے پاس کوئی کلیو نہیں تھا۔

☆☆☆

دونوں رات گئے پلازا پہنچ گئے۔ تاہم پیٹ نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ معاملہ گرم تھا۔ کوئی انہونی ہو سکتی تھی۔ پیٹ کی چھٹی حس اسے عجلت پسندی سے روک رہی تھی۔
"ہمیں دو دن اور رکنا چاہیے۔" اس نے جانی کو قائل کیا اور دونوں واپس چلے گئے۔
دو دن بعد خوابوں میں رنگ بھرنے کی رات آگئی۔ نصف شب کے قریب وہ سیاہ لباس میں تالاب پر تھے۔ فوارہ رات کے وقت بند تھا۔ ساکت پانی میں انہیں ہیرے تلاش کرنے میں آسانی تھی۔
دو ہیرے تو انہیں فوراً ہی مل گئے۔ کچھ دیر میں تیسرا بھی ڈھونڈ لیا۔ پیٹ جانے کے لیے تیار تھا۔
"جانی! میرا خیال ہے کہ تین بھی بہت ہیں... نکل چلو۔"
"نہیں یار! کم از کم ایک اور تلاش کر لیں پھر چلتے ہیں۔" جانی نے اصرار کیا اور فلیش لائٹ پھر آن کر دی۔
اچانک وہ دونوں تیز روشنی میں نہا گئے اور ایک چیختی ہوئی آواز آئی۔ "وہیں رک جاؤ۔"
"لعنت ہے۔" جانی نے دوڑ لگائی۔ فلیش لائٹ اس نے وہیں پھینک دی تھی۔
دونوں پولیس والے کار سے نکل آئے۔ ایک نے گن تان لی تھی۔ جانی رک گیا۔ پیٹ، تالاب سے نکل کر ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔
"ایزی، آفیسر... تم نے ہمیں پکڑ لیا۔" پیٹ نے کہا۔
"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" جس کے ہاتھ میں گن تھی وہ جواباً غرایا اور گن کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔
"تالاب کے کوئن، ہر مہینے چیریٹی میں جاتے ہیں۔ تم دونوں بے حد بے شرم ہو کہ خیراتی ریزگاری چرانے آگئے۔ امید ہے کہ جج کم از کم 90 دن کی سزا تو سنائے گا... اب گاڑی سے لگ جاؤ تاکہ ہم تلاشی لے سکیں۔"

بے شناخت مجرم

جمال دستی

جعل سازی کا کارخانہ عقل سازی سے پروان چڑھتا ہے... وہ بھی ذہانت کی دولت سے مالا مال تھا... اور جلد سے جلد امیر بننا چاہتا تھا... مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ ریس کا تیز رفتار گھوڑا بیچ راستے میں لڑکھڑا بھی سکتا ہے اور یقینی فتح کے بجائے ہار مقدر بن سکتی ہے...

ان مجرموں کی تلاش کا سلسلہ جو سامنے ہونے کے باوجود نظروں سے اوجھل تھے...

جون کی ایک گرم دوپہر میں پرائیویٹ سراغ رساں باب سمز اپنے ٹھنڈے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس موسم میں ائرکنڈیشنر کے بغیر زندگی گزارنا کس قدر دشوار ہے۔ بہت سے لوگ گرمی کی شدت سے گھبرا کر دوسری جگہوں پر منتقل ہو جاتے ہیں لیکن وہ اپنا شہر چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اس شہر سے اس کا روزگار وابستہ تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ چونک گیا لیکن اس نے فون اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اسے اطمینان تھا کہ آنسرنگ مشین اس

پیغام کو محفوظ کرلے گی۔ کسی سے بات کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اسے دفتر سے باہر نکل کر حقائق کا سامنا کرنا پڑتا۔

لیکن جب اس نے یوک کاؤنٹی شیرف ڈپارٹمنٹ کے کارپورل میکس کی آواز سنی جو اسے فون پر بات کرنے کے لیے کہہ رہا تھا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”دن کے دو بجے ایسا کیا ضروری کام پڑ گیا؟ کیا تمہارے پاس صورتِ حال پر نظر رکھنے کے لیے گشتی پولیس کے لوگ موجود نہیں ہیں؟“

”وہ اپنا کام کر رہے ہیں لیکن میں تمہیں مصروف رکھنے اور ٹھنڈے کمرے سے باہر نکالنے کے لیے اپنے پانچ منٹ قربان کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔“

”میری ضرورت کیوں پیش آگئی؟“

”ایک خودکشی کا کیس ہے جس کے بارے میں شبہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ مرنے والے کو قتل کیا گیا ہے۔“

”تم کس کی بات کر رہے ہو؟“

”گریفتھ ٹیلر۔“ کارپورل نے صرف نام لینے پر اکتفا کیا۔

”ہاں، میں نے بھی وہ خبر پڑھی تھی۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ متوفی نے خودکشی کی تھی۔“

”پولیس کا بھی یہی خیال ہے۔“

”پھر کسے شبہ ہے کہ ٹیلر کو قتل کیا گیا ہے؟“ باب نے پوچھا۔

”اس کی بیوی کو یقین ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے حالانکہ پولیس سراغ رساں اپنی تفتیش مکمل کر چکے ہیں لیکن مسز ٹیلر اس سے مطمئن نہیں ہے۔“

”تم نے مجھے فون کیوں کیا اگر لیفٹیننٹ بائس مجھ سے مشورہ کرنا چاہتا ہے تو وہ خود مجھے فون کرے گا۔“

”وہ اپنا کام ختم کر چکا ہے لیکن میں مسز ٹیلر کی بہن کو جانتا ہوں۔ اسی نے مجھ سے یہ بات کہی تھی۔“

”کیا وہ بہت خوب صورت ہے؟“ باب نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”فضول باتیں مت کرو۔“ میکس جھینپتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہیں مسز ٹیلر سے بات کرلینی چاہیے۔“

”اگر اسے ضرورت ہوگی تو وہ خود مجھے فون کرے گی۔ ویسے بھی اب میں جاگ گیا ہوں لیکن اس کے باوجود باہر جانا پسند نہیں کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ اس کے فون کا انتظار کرو۔“

باب اپنے لیے کافی بنا رہا تھا کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے دوسری گھنٹی پر ریسیور اٹھایا اور بولا۔ ”مسمر انویسٹی گیشن... میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟“

”میری بہن نے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے علاوہ کوئی اور میری مدد نہیں کرسکتا۔“

”کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟“

”برینڈا ٹیلر۔ تم نے اخبار میں میرے شوہر کے بارے میں پڑھا ہوگا لیکن اس نے خودکشی نہیں کی۔ کیا تم اسے ثابت کرنے میں میری مدد کرو گے؟“

”تم میرے دفتر آجاؤ۔ یہاں ہم اطمینان سے بیٹھ کر بات کرسکتے ہیں۔“

”اس وقت میں ایک ضروری فون کا انتظار کر رہی ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم میرے پاس آجاؤ۔ ویسے بھی میں تمہیں اس کام کا معقول معاوضہ دینے کے لیے تیار ہوں۔“

”اگر میں نے محسوس کیا کہ تمہارے لیے کچھ کرسکتا ہوں تو میری خدمات حاضر ہیں۔“

برینڈا نے اسے اپنا پتا سمجھایا اور ایک گھنٹے بعد ملنے کا وقت طے کرلیا۔ باب نے اپنے بریف کیس میں کچھ ضروری چیزیں رکھیں۔ گوکہ اسے اس کیس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آرہی تھی لیکن میکس سے دوستی کی خاطر وہ برینڈا سے ملنے کے لیے تیار ہوگیا۔

اس کی گاڑی دفتر کے قریب واقع اکلوتے شیڈ میں کھڑی ہوئی تھی لیکن جیسے ہی اس نے کار کا دروازہ کھولا، اسے یوں لگا جیسے جہنم میں آگیا ہو لیکن بیس سال تک یوک کاؤنٹی کی حدود میں پٹرول کار چلانے کے بعد یہ اس کے لیے ایک معمول کی بات تھی۔ راستے میں کچھ دیر کے لیے وہ اپنے گھر پر رکا اور لیفٹیننٹ اے بائس کا نمبر ملانے لگا۔ وہ ٹیلر کی خودکشی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا لیکن بائس اس وقت اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھا۔

برینڈا ٹیلر شہر سے باہر جنوبی حصے میں رہائش پذیر تھی۔ باب نے گاڑی ڈرائیو وے میں پارک کی اور بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ گھنٹی بجانے کا تکلف کرتا، دروازہ کھل گیا اور سیاہ لباس پہنے ہوئے ایک باوقار عورت اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ ”مسٹر مسمر! تمہارے آنے کا شکریہ۔ میں برینڈا ٹیلر ہوں۔ پلیز اندر آجاؤ۔“

ہال کے آخری سرے پر پچاس انچ کا فلیٹ اسکرین ٹی وی نصب تھا۔ آتش دان پر نادر اور قیمتی اشیا رکھی ہوئی تھیں اور فرش پر رکھا مہاگنی کا سفید فرنیچر کمرے کی شان و شوکت میں اضافہ کر رہا تھا۔ برینڈا نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ ”کچھ پینا پسند کرو گے؟“

”نہیں شکریہ... میں راستے میں آئس ٹی لے چکا ہوں۔“ پھر وہ مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔ ”یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ تمہارے شوہر نے خودکشی نہیں کی اور اس بارے میں سب لوگوں کی رائے غلط ہے؟“

”گریفتھ کبھی بھی خودکشی نہیں کرسکتا۔ اسے اپنی زندگی بہت عزیز تھی پھر وہ ایسا کیوں کرتا؟“

”بعض اوقات انسان شدید افسردگی اور مایوسی کے عالم میں ایسا قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب اسے صحت کے مسائل درپیش ہوں یا کاروبار میں بہت بڑا نقصان ہوگیا ہو۔“

”تمہاری بات کسی حد تک درست ہے لیکن گریفتھ بہت زیادہ امیر نہیں تھا اور یہی چیز اس کے لیے اہمیت رکھتی تھی۔ پانچ سال پہلے اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اگر میں اس سے شادی کرلوں تو وہ دولت مند ہو جائے گا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے یہ وعدہ ہر حال میں پورا کرنا ہے۔“

باب نے کمرے کا جائزہ لیا اور اپنی بھویں اچکاتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم لوگ اب بھی کافی دولت مند ہو۔“

”ہاں، سب لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں لیکن یہ شان و شوکت محض ایک دکھاوا ہے۔ یہ مکان اور میری مرسیڈیز کار بھی قسطوں پر خریدی گئی ہے۔ گریفتھ کا بھی یہی کاروبار تھا۔ وہ کاریں لیز پر دیا کرتا تھا اور اس سلسلے میں اس کی کئی کار ڈیلرز اور مالیاتی اداروں میں کام کرنے والوں سے دوستی ہوگئی تھی۔ بعض اوقات میں اسے ناپسند کرتی تھی۔ خصوصاً مجھے وہ نوجوان ملازمت پیشہ عورتیں بالکل اچھی نہیں لگتی تھیں جنہوں نے گریفتھ سے کئی کاریں لیز پر لی تھیں۔ مجھے وہ لوگ بھی پسند نہیں تھے جو اس کے ساتھ جوا کھیلتے اور بے ایمانی سے جیت جاتے تھے۔ میں نہیں جانتی کہ وہ اس چیز کو سمجھتا تھا یا نہیں لیکن بہرحال ایک اچھی زندگی گزار رہا تھا۔“

”ممکن ہے کہ اسے یہ احساس ہوگیا ہو کہ وہ کبھی دولت مند نہیں بن سکتا۔“

”وہ جانتا تھا کہ اس کی منزل بہت قریب آگئی ہے۔ وہ مرنے سے کچھ دن پہلے بہت خوش تھا اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ ہم بہت جلد امیر بننے والے ہیں۔“

”اخبارات میں اس کی موت کے بارے میں جو خبر شائع ہوئی ہے، اس کے مطابق وہ اپنے دفتر میں مردہ پایا گیا

تھا۔ اس نے کمرا بند کر کے پستول سے اپنے آپ کو گولی ماری تھی۔“

”وہ اکثر نصف شب تک کام کیا کرتا تھا کیونکہ بیشتر لوگ رات کی تاریکی میں اس سے کاروباری معاملات طے کرنا پسند کرتے تھے۔ اس رات میں بھی ایک میٹنگ میں گئی ہوئی تھی۔ بہت تھکی ہوئی تھی اس لیے گھر آتے ہی سو گئی۔ پھر میری آنکھ شیرف کے سراغ رساں کے آنے پر ہی کھلی۔ اسی نے مجھے گریفتھ کی موت کے بارے میں بتایا۔ گریفتھ کی سیکریٹری جینی جب صبح کام پر آئی تو اس نے اپنے باس کو مردہ حالت میں پایا۔“

”کیا وہاں کوئی ایسا ثبوت یا شواہد ملے جس کی وجہ سے تمہیں شبہ ہو رہا ہو؟“ باب نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتی۔ میں نے تو لاش کی شناخت مردہ خانے میں کی تھی۔ ویسے بھی میں گزشتہ تین ماہ سے اس کے دفتر نہیں گئی تھی۔ اس لیے نہیں جانتی کہ وہاں کیا کچھ ہوتا رہا۔ اب بیمہ کمپنیوں نے مجھے اس وجہ سے انشورنس کی رقم دینے سے انکار کر دیا ہے کیونکہ پولیس رپورٹ کے مطابق اس نے خودکشی کی تھی۔ اب میں بالکل خالی ہو چکی ہوں اور اسی لیے مجھے سونے کے سکے بھی جینکی کو واپس فروخت کرنے پڑ گئے۔“

”سونے کے سکے؟“ باب نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں، گریفتھ کے پاس تیس عدد سونے کے سکے تھے جو چھ چھ کی ڈھیری میں اس کی میز پر رکھے ہوئے تھے۔ وہ جینکی کے ساتھ کاروبار کر رہا تھا۔ کیا کبھی تم نے اس سے سونا خریدا ہے؟“

”نہیں۔“

”تمہیں ضرور خریدنا چاہیے۔ آج کل ہر کوئی یہی کر رہا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ گریفتھ نے سونے کے سکے خریدے۔ اس کے بعد سے میں اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ میری خواہش تھی کہ ہم مزید سکے خریدیں لیکن اسے شروع کرنے کے لیے یہ تعداد بھی کافی تھی۔“

”یہ کس قسم کے سکے ہیں؟“ باب نے اپنی معلومات کے اضافے کے لیے پوچھا۔

”تم نے کروگرانڈ کا نام سنا ہوگا۔ ابتدا میں یہ جنوبی افریقا میں ڈھالے گئے تھے۔ بعد میں ان کا دائرہ دوسرے ملکوں تک بھی پھیل گیا اور انہیں سرمایہ کاری کے لیے ایک محفوظ اور منافع بخش ذریعہ سمجھا جانے لگا۔ گریفتھ نے ہمیں بتایا تھا کہ اس طرح ہم بہت جلد امیر بن سکتے ہیں۔ وہ ہمیشہ امیر بننے کے طریقے سوچتا رہتا تھا۔“

"یہ سکے اس کی میز پر پائے گئے تھے؟"

"ہاں اور اسی لیے پولیس سراغ رساں کا خیال ہے کہ یہ قتل کا کیس نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی چور یا قاتل سونے کے تیس سکے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"کیا تم اس سراغ رساں کا نام بتا سکتی ہو؟"

"نام تو مجھے معلوم نہیں، البتہ اس کا حلیہ بتا سکتی ہوں۔ وہ بھاری بدن کا گنجا شخص ہے اور اس نے جو براؤن سوٹ پہن رکھا تھا، وہ کافی تنگ تھا۔ اسے اپنی شخصیت میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح۔" باب مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں اس سے بات کروں گا۔"

"تمہیں میری مدد کرنا ہوگی اور ثابت کرنا ہوگا کہ گریفتھ نے خودکشی نہیں کی۔"

"تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟" باب نے پوچھا۔

"اس لیے کہ اس سے ہمارا نام اور ساکھ متاثر ہوئی ہے۔" اس نے ایک ہاتھ سے اپنے بالوں کو چھوا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "اس کے علاوہ انشورنس کا مسئلہ بھی ہے۔ اگر اس کی حادثاتی موت ہوئی ہوتی یا اسے قتل کیا گیا ہوتا تو اس صورت میں مجھے بیس لاکھ ڈالرز مل سکتے ہیں۔"

"مجھے دو دن کا وقت چاہیے۔" باب بولا۔ "پولیس سے معلومات حاصل کرنے اور تمام ثبوت و شواہد کا جائزہ لینے کے بعد سوچوں گا کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

باب نے بریف کیس سے ایک فارم نکالا اور اسے پُر کرنے کے بعد برینڈا کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے سرسری نظر ڈالی اور اس پر دستخط کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی ایک معقول رقم کا چیک بھی باب کے حوالے کر دیا۔

"مجھے تمہاری طرف سے ایک اتھارٹی لیٹر درکار ہوگا تاکہ میں گریفتھ کے دفتر کا معائنہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے عملے سے کچھ سوالات کر سکوں۔ اس کے علاوہ مجھے اس کے تمام دوستوں اور کاروباری شراکت داروں کی فہرست چاہیے جس میں ان کے نام کے ساتھ ٹیلی فون نمبرز اور پتے بھی درج ہوں۔"

برینڈا نے سر ہلایا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کئی کاغذات تھے جو اس نے باب کو تھما دیے۔ وہ اس سے مصافحہ کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔

راستے میں اس نے شیرف کے دفتر کا فون ملایا اور سراغ رساں لیفٹیننٹ بائس سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا رابطہ پولیس سراغ رساں سے ہو گیا۔ وہ اپنی مخصوص پاٹ دار آواز میں بولا۔

"کیا چاہتے ہو... ریٹائرڈ سارجنٹ سمتھ؟"

باب اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہیں گریفتھ ٹیلر کی خودکشی کا کیس یاد ہے؟"

"اوہ، معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خوب صورت بیوہ نے تمہاری خدمات حاصل کر لی ہیں؟"

"اس کا خیال ہے کہ ٹیلر نے خودکشی نہیں کی۔"

"بیس لاکھ ڈالرز ملنے کی امید ہو تو میں بھی اس طرح سوچ سکتا ہوں۔"

"کیا تم مجھے تھوڑا وقت دے سکتے ہو؟"

"جلدی سے آجاؤ۔" وہ اس پر احسان کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔"

پچیس منٹ بعد وہ شیرف کے دفتر میں تھا۔ اس نے استقبالیہ پر رک کر ہیری سے کچھ باتیں کیں اور دفتر میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بائس کا کمرا اس کی جسامت اور کام کے لحاظ سے چھوٹا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی الماریاں اور میز فائلوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے باب سے ہاتھ ملایا اور خوش دلی سے پوچھا۔

"کافی چلے گی؟"

باب نے تائید میں سر ہلایا تو وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کافی کے دو کپ تھے۔ باب نے کافی کا گھونٹ لیا اور بولا۔ "برینڈا کو شک ہے کہ اس کے شوہر کو قتل کیا گیا ہے۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"مجھے تو یہ سیدھا سادہ خودکشی کا کیس لگتا ہے۔ یہ اس کی فائل ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لو تو تمہارا کافی وقت بچ جائے گا۔"

باب نے سرسری انداز میں فائل کے صفحات پلٹنا شروع کیے تو بائس بولا۔ "پستول پر انگلیوں کے نشانات کے علاوہ یہ بات بھی اہم ہے کہ رات کے اس پہر کسی اجنبی شخص کو اس عمارت میں داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا گیا اور نہ ہی اس کے دفتر سے کوئی چیز چوری ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کی میز پر جو سونے کے سکے رکھے ہوئے تھے، انہیں بھی کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھے تو قتل کا کوئی محرک نظر نہیں آتا۔ تم ان کاغذات کی نقل تیار کروا لو اور اگر کسی جرم کا شائبہ نظر آئے تو سب سے پہلے مجھے بتاؤ گے کیونکہ ہم جرائم کو دیکھتے ہیں جبکہ

پرائیویٹ سراغ رساں صرف انشورنس کے تنازعات حل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"بالکل!"

"میری میٹنگ شروع ہونے والی ہے۔ تم باہر بیٹھ کر اس فائل کا مطالعہ کر سکتے ہو۔ کام ختم کرنے کے بعد یہ فائل واپس کر دینا۔"

باب نے وہ فائل بائیں ہاتھ میں پکڑی۔ بریف کیس بغل میں دبایا اور دائیں ہاتھ میں کافی کا کپ پکڑے باہر آ گیا۔ برآمدے کے آخری سرے پر ایک خالی میز پڑی ہوئی تھی۔ وہ کرسی گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گیا اور فائل کا مطالعہ کرنے لگا۔ دو گھنٹے بعد اس نے فائل بائس کو واپس کر دی اور پوچھا۔ "وہ پستول کس کا تھا؟"

"اس بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ آخری بار اس کی رجسٹریشن بارٹو کے رہائشی ایک کرین آپریٹر کے نام پر ہوئی تھی لیکن اس کے انتقال کے بعد اس کی بیوی نے وہ ریوالور بیچ دیا۔ یہ 1982ء کی بات ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے بعد یہ ریوالور مختلف لوگوں کے ہاتھوں فروخت ہوتا رہا۔"

"انگلیوں کے نشانات بھی واضح نہیں ہیں۔ ایک اچٹتا سا نشان دستے پر جبکہ نال پر انگوٹھے کا نشان نظر آ رہا ہے۔"

"لیکن یہ نشانات اسی کے ہیں۔ اس کے علاوہ ریوالور پر کچھ دھبے بھی نظر آ رہے ہیں۔"

"اس فائل کو دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں بھی شبہات پیدا ہو گئے ہیں اور میرے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ واقعی خودکشی کا کیس ہے۔"

"میں تم سے اتفاق کر لیتا اگر شبہ کرنے کی کوئی وجہ موجود ہوتی۔ بہرحال، تم کوشش کر کے دیکھ لو پھر مجھے فون کرنا۔"

"ضرور۔" باب نے اپنے کاغذات سمیٹے اور مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے آرنی کا نمبر ملایا جو اسٹیٹ انشورنس میں کلیم کی سربراہ تھی۔ اس نے فوراً ہی باب کی آواز پہچان لی اور بولی۔ "ہائے باب! میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"میں گریفتھ ٹیلر کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیوہ نے بیس لاکھ ڈالرز حاصل کرنے کے لیے تمہاری خدمات حاصل کی ہیں۔ اسے ثابت کرنا ہوگا کہ یہ خودکشی نہیں بلکہ حادثاتی موت ہے۔ کیا تم ایسا کر سکو گے؟"

"فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اس کی موت بڑے عجیب و غریب انداز میں ہوئی تھی۔"

"ٹھیک ہے، تم کوشش کر کے دیکھ لو۔"

☆☆☆

نو بجے وہ ہیون کیفے پہنچا تو وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ ویٹرس نے اس کے لیے عقبی کونے میں ایک میز تلاش کی۔ وہ اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھتا ہوا میز کی جانب بڑھ گیا۔ ابھی وہ توس پر مکھن لگا رہا تھا کہ ڈیوڈ براؤن وہاں داخل ہوا۔ وہ مقامی اخبار میں رپورٹر تھا۔ اس نے باب کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور سیدھا اس کی میز پر چلا آیا۔ باب نے اس کے لیے کافی بنائی اور بولا۔ "کیا تمہارے پاس گریفتھ ٹیلر کے بارے میں ایسی معلومات ہیں جو اخبار میں شائع نہ ہوئی ہوں؟"

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اس کی بیوی ثابت کرنا چاہتی ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے تاکہ اس طرح وہ انشورنس کی رقم حاصل کر سکے۔"

"وہ جیکی جونز کے لیے کام کرتا تھا جو سونے کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا ہے۔ کیا کبھی تم نے سونا خریدا ہے؟"

"نہیں... اپنے بارے میں کیا کہو گے؟"

"میری ساری کمائی سابقہ بیویوں کو چلی جاتی ہے۔" براؤن ہنستے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اس شہر میں ہم دو ہی ایسے احمق ہیں جو جیکی کے ساتھ مل کر سونے کے کاروبار میں امیر نہیں ہوئے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" باب نے بے دلی سے کہا۔

"جہاں جاتا ہوں لوگ سونے کی ہی باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ سارا شہر سونے کے بخار میں مبتلا ہو گیا ہے۔"

"شاید مجھے جیکی سے ملنا پڑے۔"

"اس کے لیے تمہیں وقت لینا ہوگا ورنہ قطار میں لگ کر انتظار کرتے رہو۔"

ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ ونٹر ہیون کا میئر ریستوران میں داخل ہوا اور ان کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے نیلے رنگ کی قمیص اور خاکی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تہ کیا ہوا اخبار اور کافی کا کپ تھا۔ اس نے ڈیوڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں یہاں

بیٹھ کر کیا سازش کررہے ہو؟''

''میں باب کو سمجھا رہا تھا کہ اسے بھی جیکی کے کاروبار میں سرمایہ کاری کرنی چاہیے۔''

''ایک سال پہلے یہ قدرے آسان تھا اور کوئی بھی شخص تھوڑے سے پیسوں کے ساتھ اس کاروبار میں شریک ہوسکتا تھا پھر گریفتھ کی آمدنی دیکھ کر سب نے اس دریا میں چھلانگ لگادی۔ اب سونے کی قلت ہوگئی ہے اور اس کے لیے کم از کم پچاس ہزار ڈالرز درکار ہیں۔ کیا تمہارے پاس اتنی رقم ہے باب؟''

''دیکھنا پڑے گا۔'' باب نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

''تم اتنی بڑی رقم کی سرمایہ کاری کرسکتے ہو لیکن میرے لیے یہ ممکن نہیں۔'' میٹز مایوسی سے بولا پھر وہ ڈیوڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ڈیوڈ! تم نے کل کے اخبار میں کیا لکھ دیا تھا؟''

باب اس بے مقصد گفتگو سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ویٹر کو بلا کر بل منگوایا اور ادائیگی کرکے وہاں سے رخصت ہوگیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے بریف کیس سے پیڈ نکالا اور اس میں سے ایک نمبر تلاش کرکے فون ملایا۔ یہ ٹیلر کے دفتر کا نمبر تھا۔ جواب میں ایک سریلی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''امپیریل یوک لیزنگ۔''

''میں جینی ریس سے بات کرنا چاہوں گا۔''

''بول رہی ہوں۔'' جینی نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ ''میں تمہاری کیا مدد کرسکتی ہوں؟''

''میرا نام باب سمز ہے اور مسز ٹیلر نے شوہر کی موت کی تحقیقات کے لیے میری خدمات حاصل کی ہیں۔ غالباً اس نے تمہیں بتادیا ہوگا؟''

''ہاں، اس نے مجھے فون کیا تھا۔ میں اس سلسلے میں تمہارے کیا کام آسکتی ہوں؟''

''میں تمہارا دفتر دیکھنا اور تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

باب نے کار کا رخ جینی فل ولیج کی طرف موڑ دیا جو کہ شہر کے جنوبی کنارے پر واقع تھا۔ امپیریل یوک لیزنگ کے دفتر کے باہر دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جینی نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ جینی کی عمر بیس کے لگ بھگ ہوگی اور وہ خاصی پرکشش تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنا مخصوص جملہ دہرایا۔

''سارجنٹ سمز! میں تمہاری کیا مدد کرسکتی ہوں؟''

''تم تو بہت چھوٹی ہو پھر تم نے میرے بارے میں کیسے جان لیا؟''

''میرے انکل لیری پولیس ڈپارٹمنٹ میں ہیں اور وہ تمہیں جانتے ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے ہدایت کی ہے کہ تمہارے ساتھ پوری طرح تعاون کروں۔''

''کیا وہ اب بھی فارغ وقت میں گالف کھیلتا ہے؟''

''ہاں، آنٹی وینڈا کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچنے کا یہی ایک راستہ ہے۔ یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ تم اپنی ضرورت بتاؤ۔''

''مجھے گریفتھ ٹیلر کے بارے میں بتاؤ۔ وہ بحیثیت باس کیسا شخص تھا؟''

''اسے آگے بڑھنے کی لگن تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے کسی بھی دوسرے شخص کے مقابلے میں سب سے زیادہ کاریں لیز پر دی ہیں۔ اس کی موت کے بعد تمام معاملات مجھے ہی دیکھنا پڑ رہے ہیں۔ میں دو سال پہلے اس کمپنی میں آئی تھی۔ ہم بہت اچھی طرح کام کررہے تھے۔ اسے کاغذی کارروائی اور تفصیلات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لہٰذا میں ہی لیزنگ کمپنیوں سے معاملات طے کرتی اور ڈلیوری کا شیڈول تیار کرتی۔ وہ لوگوں سے ملنا اور ان سے باتیں کرنا پسند کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک نئے کاروبار کی تلاش میں رہتا تھا کیونکہ اسے امیر بننے کی خواہش تھی جبکہ میرے خیال میں وہ پہلے ہی کافی دولت مند تھا۔ اس کا باقی ماندہ کام مکمل کرنے کے بعد میری ملازمت بھی ختم ہوجائے گی۔''

''تم خود یہ کام کیوں نہیں سنبھال لیتیں؟''

''میری عمر صرف چوبیس سال ہے۔ کوئی بھی مجھ سے کاروبار کرنا پسند نہیں کرے گا۔''

''تم مالی معاملات کے لیے کسی دوسرے شخص کی خدمات حاصل کرسکتی ہو اور انتظامی امور اپنے ہاتھ میں رکھو۔ مثلاً لوگوں سے رابطے میں رہنا، گاڑیاں خریدنا اور انہیں فروخت کرنا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنی معاونت کے لیے کوئی نہ کوئی مناسب شخص ضرور مل جائے گا۔''

''کیا ایسا ممکن ہے؟'' وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔

''کیوں نہیں، تم اب بھی لوگوں کو گاڑیاں لیز پر دے رہی ہو۔ اسے جاری رکھو اور مسز ٹیلر کو اس کا حصہ دیتی رہنا۔ وہ خوش ہوجائے گی۔''

''میں اس پر غور کروں گی۔ دیکھنا ہوگا کہ فنانس

کمپنیاں کیا کہتی ہیں۔ یہ حقیقت میں ایک منافع بخش کاروبار ہے۔ اگر آپ ایک اچھا سودا کرنے میں کامیاب ہوگئے تو کسی کو آپ کے منافع سے غرض نہیں ہوتی۔''

''فنانس کمپنیوں کو سرمایہ کاری سے دلچسپی ہوتی ہے۔ تم اس کام کو سمجھتی ہو اس لیے وہ تم پر بھروسا کرسکتے ہیں۔''

''تم نے میری مشکل آسان کردی۔ مزید کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''کیا مرنے سے پہلے گریفتھ کو کوئی پریشانی لاحق تھی؟''

''کوئی خاص نہیں، وہ ہمیشہ نئے آئیڈیاز کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اس شام بھی جب میں یہاں سے گئی تو وہ فون پر کسی سے باتیں کررہا تھا اور دوسری صبح میں نے اسے مردہ حالت میں پایا۔''

''کیا تم بتاسکتی ہو کہ وہ کس سے باتیں کررہا تھا؟''

''غالباً جیکی جونز سے۔ وہ ایک دوسرے سے فون پر اس طرح باتیں کرتے تھے جیسے شطرنج کھیل رہے ہوں۔''

''کیا تم مجھے اس کا دفتر دکھاسکتی ہو؟''

''کیوں نہیں، میرے ساتھ آؤ۔''

ٹیلر کے دفتر میں اس کی میز کے دوسری جانب ملاقاتیوں کے لیے چمڑے کے سیٹ کور اور پشت والی دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جبکہ وہ خود گھومنے والی کرسی پر بیٹھا کرتا تھا۔ بائیں جانب ایک کاؤچ اور سامنے والی دیوار پر فائل کیبنٹ لگا ہوا تھا۔ جینی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''اس نے میرے فون کا جواب نہیں دیا تو میں دروازہ کھول کر اندر چلی آئی۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے بازو نیچے کی جانب لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے پورے سر پر خون پھیلا ہوا تھا جس کے چھینٹے میز پر رکھے کاغذوں پر بھی آئے تھے۔ میں نے احمقوں کی طرح اسے آواز دی۔ مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ مرچکا ہے۔''

''معاف کرنا، تم صرف اس کی سیکریٹری تھیں یا تمہارے درمیان کوئی اور تعلق بھی تھا؟''

''گریفتھ نے میری خوب صورتی سے متاثر ہوکر ملازمت نہیں دی تھی۔ میں اس کے بہت سے کام کرتی تھی اور وہ میری کارکردگی سے خوش تھا۔ ہمارے درمیان ہنسی مذاق بھی چلتا رہتا تھا اور ہم کبھی کبھی رات گئے دیر تک کام کرتے رہتے تھے۔''

''کوئی اور بات جو تمہیں یاد آرہی ہو؟'' باب نے

یادداشت

ایک ڈاکٹر کسی خاتون کے کوائف لکھ رہا تھا۔

''اچھا تو آپ کو چلنے میں بھی تکلیف ہے اور سانس بھی جلد پھول جاتا ہے، بھلا آپ کی عمر کیا ہے؟'' ڈاکٹر نے قلم روک کر پوچھا۔

''میں اگلے سال 30 سال کی ہوجاؤں گی۔''

ڈاکٹر نے لکھا۔ ''حافظہ بھی کمزور ہے۔''

ناراضی

میٹرنٹی وارڈ کے باہر ایک صاحب بے تابی سے ٹہل رہے تھے اور سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے۔ آخر لیڈی ڈاکٹر باہر آئی اور ان صاحب کو بتایا۔

لیڈی ڈاکٹر۔ ''آپ ایک خوب صورت اور صحت مند بچے کے باپ بن گئے ہیں۔''

ان صاحب نے گہرا سانس لے کر شکریہ ادا کیا اور وہاں سے رخصت ہونے لگے تو لیڈی ڈاکٹر نے انہیں واپس بلایا اور حیرت سے پوچھا۔ ''کیا آپ خوشی کے اس موقع پر اپنی بیوی سے دو چار باتیں نہیں کریں گے؟''

وہ صاحب رکھائی سے بولے۔ ''جی نہیں، پچھلے دو سال سے اپنی بیوی سے میری بول چال بند ہے۔''

لیڈی ڈاکٹر کی حیرت بڑھ گئی۔ ''بول چال بند ہے اور آپ بچے کے باپ بن گئے!''

وہ صاحب گویا برا منا کر بولے۔ ''اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟ اب اتنی بھی ناراضی نہیں ہے۔''

بے خبر

تھکا ماندہ ڈاکٹر سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر منہ بناتا ہوا اٹھا اور بستر سے ہی بولا۔ ''کون ہے؟''

باہر سے آواز آئی۔ ''صاحب دروازہ کھولیں۔ مجھے کتے نے کاٹ لیا ہے۔''

''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ میرے آرام کا وقت ہے۔'' ڈاکٹر نے غصے سے کہا۔

''جی ہاں! مجھے تو اچھی طرح معلوم ہے مگر کتے کو معلوم نہیں تھا۔'' باہر سے آواز آئی۔

(محمد حفیظ، حیدرآباد)

پوچھا۔
اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ”میں اسے اس حال میں دیکھ کر پریشان ہوگئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟“
”کیا تم نے اس کے پاس کوئی ریوالور دیکھا تھا؟“
”اس بارے میں میں کچھ نہیں جانتی۔“
باب نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا جیسے کسی سراغ کی تلاش میں ہو پھر اس نے جینی سے پوچھا۔
”کیا اس دوران میں اسے کوئی اجنبی فون کال موصول ہوئی تھی یا کوئی ایسی بات جو معمول سے ہٹ کر ہو؟“
”نہیں لیکن اس کاروبار میں اجنبی لوگوں کے فون آنا معمول کی بات ہے۔“
”دفتر سے کوئی چیز غائب تو نہیں ہوئی یا تمہیں یہاں کی ترتیب میں کچھ فرق محسوس ہوا ہو؟“
”نہیں، یہاں تک کہ سونے کے سکّے بھی موجود تھے۔“
”کیا ان پر بھی خون کے چھینٹے پڑے تھے؟“
”نہیں، وہ سکّے میز کے ایک کونے پر بڑی ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس شخص کے پاس تیس عدد سونے کے سکّے ہوں، وہ کیوں اپنے آپ کو گولی مارے گا۔“
باب نے کندھے اچکائے اور اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ جینی اس کی جانب کاغذات کا پلندا بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”برینڈا نے فون کر کے کہا تھا کہ تمہیں کچھ ریکارڈ کی ضرورت ہوگی۔ میں نے اسی لیے بینک گوشوارہ اور ٹیلی فون کالز کے ریکارڈ کی نقول تیار کرلی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ چاہیے تو بتادو۔“
”کیا اس کے پاس کوئی ڈائری تھی جس میں ملاقاتوں کی تفصیل درج ہو؟“
”ہاں، اس میں گزشتہ تین ماہ کی ملاقاتوں کی تفصیل موجود ہے۔“ وہ اس کی جانب ایک ڈائری بڑھاتے ہوئے بولی۔
”ایڈریس بک بھی ہوگی؟“
”ہاں لیکن خون کے چھینٹے پڑنے سے وہ خراب ہوگئی۔ میرا خیال ہے کہ شیرف کے آدمی اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس کے علاوہ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟“
”نہیں، تمہاری مدد کا شکریہ۔“
وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”اگر ضرورت محسوس کرو تو تم مجھے دوبارہ فون کرسکتے ہو۔“
باب دروازہ کھول کر باہر جانے لگا تو وہ اس کے عقب میں آتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ میں اس کاروبار کو چلاسکتی ہوں؟“
”بالکل، لوگ اب بھی کاریں لیز پر لیتے ہیں۔ پھر وہ تم سے کیوں نہیں خریدیں گے۔“
جینی کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بولی۔ ”میں تمہارے لیے بھی ایک نئی کار کا بندوبست کرسکتی ہوں۔ یہ گاڑی تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔“
”یہ سرکاری گاڑی ہے جو میں نے نیلام میں خریدی تھی اور اب بھی بہترین حالت میں ہے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ دس سال تک تنگ نہیں کرے گی۔“
”جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ”جب گاڑی تبدیل کرنا چاہو تو مجھے ضرور فون کرنا۔“
باب دفتر جا کر کاغذات کا معائنہ کرنا چاہ رہا تھا لیکن جیکی جونز کے دفتر کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ تھوڑی دیر وہاں رک کر اس سے کچھ باتیں کرنا چاہئیں۔ اس طرح کی اچانک ملاقاتوں سے بہت سی کارآمد باتیں معلوم ہوجاتی ہیں۔ جیکی کا دفتر ایک وکٹورین ہاؤس کے ٹاپ فلور پر واقع تھا جس کا مرکزی دروازہ ایک انتظارگاہ میں کھلتا تھا۔ وہ اسے عبور کر کے دوسرے دروازے تک پہنچا۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ جیکی ایک بیش قیمت مہاگنی کی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”باب سمز! کیسے ہو؟ میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“
”یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا تم سے گریفتھ ٹیلر کے بارے میں کچھ بات کرلوں۔“
”اس کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“
”برینڈا نے یہ جاننے کے لیے میری خدمات حاصل کی ہیں کہ کیا واقعی اس کے شوہر نے خودکشی کی تھی۔ لہٰذا میں جاننا چاہوں گا کہ اس کے ساتھ تمہارے کاروباری تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ تم چاہو تو برینڈا سے فون پر بات کرسکتے ہو۔“
”میں اسے ضرور فون کروں گا تاکہ معلوم ہوسکے کہ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا سیل فون اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ دفتر کے باہر ایک آٹھ فٹ طویل ایکوریم تھا جس کی تہ میں لکڑی کا فرش بنا کر ریت کی تہ بچھادی گئی تھی اور اس پر سونے کے سکّے اس طرح پڑے ہوئے تھے جیسے پانی کی سطح پر تیر رہے ہوں۔

”آٹھ سو ستر۔“ جیکی نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔ ”میں جب بھی کوئی کامیابی حاصل کرتا ہوں تو اس میں ایک سونے کا سکّہ ڈال دیتا ہوں۔ میرا ہدف ایک ہزار کا ہے۔“
”میں نے کسی کو اتنے پرانے انداز میں دولت جمع کرتے نہیں دیکھا۔“
”تم نہیں سمجھ سکو گے۔“ جیکی نے کہا۔ ”بہرحال، میں نے برینڈا سے وعدہ کیا ہے کہ اس سلسلے میں جو ہوسکا وہ ضرور کروں گا۔ میں چارلس کو بلاتا ہوں تاکہ وہ ریکارڈ لے کر آجائے۔“
کچھ ہی دیر بعد چارلس بغل میں ایک فائل دبائے چلا آیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ جیکی کے بہت قریب ہے۔ جیکی نے اس کا تعارف باب سے کروایا۔ چارلس نے کرسی پر بیٹھتے ہی فائل کھول کر زانو پر رکھ لی اور کچھ کاغذات باب کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے سوچا کہ اگر ہم دونوں مل کر ان کاغذات کا جائزہ لیں تو زیادہ آسانی رہے گی۔ اس کے بعد تم چاہو تو کوئی سوال پوچھ سکتے ہو۔“
ان کاغذات میں پہلا اندراج چودہ ماہ قبل ہوا تھا جب گریفتھ نے ایک ہزار ڈالرز مالیت کا سونا خریدا۔ ایک ماہ بعد اس نے مزید ایک ہزار ڈالرز کی سرمایہ کاری کی۔ اس کے ساتھ ہی ہر خریداری پر اس کا منافع بڑھتا گیا۔ اپنی موت سے ایک ہفتہ قبل اس نے ایک لاکھ ڈالرز نکلوائے تھے اور آخری اندراج تیس سونے کے سکّے کیش کرانے کے بارے میں تھا۔
”یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں ان اعداد و شمار کو سمجھ سکا ہوں یا نہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس نے ایک سال سے بھی کم وقت میں دو مرتبہ اپنے سرمایہ کو دگنا کیا۔“
جیکی نے سر ہلایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”گریفتھ بہت تیز بندہ تھا اور مارکیٹ کو سمجھتا تھا جبکہ ہمارے بہت سے گاہک تیس چالیس فیصد منافع پر ہی مطمئن ہوجاتے ہیں اور وہ نقد منافع لینے کے بجائے سونے کی شکل میں ہمارے پاس چھوڑ دیتے ہیں۔ اس وقت بھی ہمارے پاس والٹ میں گاہکوں کے آٹھ ہزار سکّے رکھے ہوئے ہیں۔“
”اس نے ایک لاکھ ڈالرز کیوں لیے تھے؟“ باب نے پوچھا۔
”مسٹر ٹیلر نے اپنے حصے کا منافع کیش کروایا تھا۔ شاید انہیں کسی کو ادائیگی کرنا تھی۔“
”کیا تم مختصراً بتاسکتے ہو کہ گریفتھ نے کتنی سرمایہ کاری کی تھی اور کس طرح وہ اتنی بڑی رقم کا مالک بن گیا؟“
جیکی نے اپنا چشمہ اتارا اور اسے ایک چھوٹے سے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم سونا خریدتے اور بیچتے ہیں۔ خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو۔ ہم لوگوں سے سونا لے کر اس کے عوض نقد رقم فراہم کرتے ہیں پھر ایک مقررہ مدت کے بعد اصل رقم بمع منافع وصول کر کے سونا واپس کر دیتے ہیں۔“
”گویا تم نے گریفتھ سے پیسے لے کر سونا خریدا، اسے کچھ عرصہ اپنے پاس رکھا اور قیمت بڑھنے پر فروخت کر کے پچاس فیصد منافع کمالیا۔“
”میں تمہارے شبہات سمجھ رہا ہوں لیکن گریفتھ دوسرے لوگوں سے مختلف تھا۔ وہ سونے کی خرید و فروخت کے لیے ہمارا کمپیوٹر پروگرام استعمال کرتا۔ اسے مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ تھا اور جانتا تھا کہ کب سونا خریدنا اور بیچنا ہے۔ اس کے اندازے بالکل درست ثابت ہوتے تھے۔ ہم نے بھی اس کی تقلید کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔“
باب نے یوں سر ہلایا جیسے پوری بات اس کی سمجھ میں آگئی ہو پھر جیکی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس نے ایک لاکھ ڈالرز کہاں خرچ کیے ہوں گے؟“
”کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اسے جوا کھیلنے کی عادت تھی ورنہ وہ بہت پہلے امیر ہوچکا ہوتا۔“
”جس رات اس کی موت واقع ہوئی، اس سے پہلے تمہاری اس سے بات ہوئی تھی؟“
”ہاں، دو مرتبہ۔ ہم نے کچھ نئے لوگوں کی سرمایہ کاری کے بارے میں گفتگو کی تھی۔“
کچھ دیر خاموشی رہی پھر باب اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”تم دونوں کا بہت بہت شکریہ۔ اب میں چلتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے گاہکوں کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔“
جیکی نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”تم بھی ان لوگوں میں کیوں شامل نہیں ہوجاتے۔ یقین جانو، جلد امیر بننے کا اس سے اچھا طریقہ اور کوئی نہیں۔“
”میں ہر ہفتے لاٹری کا ٹکٹ خریدتا ہوں۔ کیا امیر بننے کا اس سے اچھا شارٹ کٹ کوئی اور ہوسکتا ہے؟“
دفتر پہنچ کر اس نے میز پر جینی کے دیے ہوئے کاغذات پھیلائے اور ان کا بغور مطالعہ کرنے لگا۔ لیکن دو

گھنٹے کی عرق ریزی کے بعد بھی اسے کوئی کام کی بات معلوم نہ ہوسکی۔ البتہ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ موت سے چند ماہ قبل گریفتھ کی ان لوگوں سے ملاقاتیں بڑھ گئی تھیں جو سونے میں سرمایہ کاری کے خواہش مند تھے۔ گھر آنے کے بعد وہ کچھ دیر اپنے پالتو کتے کے ساتھ کھیلتا رہا پھر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ اس دوران میں برینڈا کا دو مرتبہ فون آیا لیکن اس نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی کیونکہ اسے مطمئن کرنے کے لیے فی الحال اس کے پاس کوئی نئی بات نہیں تھی۔

دوسرے دن دفتر پہنچ کر باب نے ایک نمبر ڈائل کیا جو سینٹرل آرکنساس کا تھا اور اس نمبر پر گریفتھ نے مرنے سے پہلے ایک مہینے میں پانچ مرتبہ فون کیا تھا لیکن اب اس پر ریکارڈنگ آرہی تھی کہ یہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد برینڈا ٹیلر کا فون آگیا۔ وہ تیز آواز میں بولی۔ ”میں کل سے دس مرتبہ فون کرچکی ہوں لیکن تم نے ایک بار بھی جواب نہیں دیا۔“

”میں فون کرنے ہی والا تھا۔ یہ بتاؤ کہ آرکنساس میں تمہارا یا گریفتھ کا کوئی جاننے والا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کوئی دوست یار رشتے دار وغیرہ؟“

”نہیں، وہاں ہمارا کوئی واقف کار نہیں۔“ برینڈا نے کہا۔ ”تمہیں کوئی ایسی بات معلوم ہوئی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ گریفتھ نے خودکشی نہیں کی؟“

”یہی جاننے کی کوشش کررہا ہوں۔“ باب نے کہا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ گریفتھ نے جیکی سے ایک لاکھ ڈالرز لیے تھے... وہ کہاں خرچ کیے؟“

”تم کس رقم کی بات کررہے ہو؟“

”جیکی نے بتایا ہے کہ گریفتھ نے مرنے سے کچھ عرصہ پہلے اپنے حصے میں سے ایک لاکھ ڈالرز وصول کیے تھے۔ جیکی کا خیال ہے کہ گریفتھ نے یہ رقم جوئے میں ہار دی۔“

”میں نہیں مانتی۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو مجھے ضرور معلوم ہوتا۔“

”کیا تم اس کی سرگرمیوں کے بارے میں سب کچھ جانتی تھیں؟“

”ہاں، مجھے تو جینی اور گریفتھ کے تعلقات کے بارے میں بھی معلوم تھا۔“

”کیا تم جینی کو اپنا پارٹنر بنانا پسند کروگی؟ اس سے پہلے کہ وہ اپنا کاروبار شروع کردے۔“ باب نے اسے ٹٹولا۔

”خیال برا نہیں ہے۔“ برینڈا نے بے دلی سے کہا۔

”لیکن میں نہیں سمجھتی کہ گریفتھ جوئے میں اتنی بڑی رقم ہار سکتا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ اپنی پریشانی مجھے ضرور بتاتا۔ ورنہ اس جوئے خانے میں اور بھی کئی لوگوں سے میری واقفیت ہے۔ وہ مجھے یہ بات بتا سکتے تھے۔“

”اور بھی کئی جگہوں پر جوا ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے کہیں اور یہ بازی لگائی ہو۔“

”شاید تم نہیں جانتے کہ گزشتہ چند ہفتوں سے وہ بڑے خوش گوار موڈ میں تھا اور اس نے کئی بار مجھ سے کہا کہ وہ بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہونے والا ہے۔“

”تمہارا کہنا ہے کہ آرکنساس میں کسی سے کوئی واقفیت نہیں ہے۔ پھر وہ میمفس کیوں گیا تھا؟“

”اس بات کو بھول جاؤ اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ اس نے ایک لاکھ ڈالرز کس کو دیے؟“

”اسی لیے تو جاننا چاہ رہا ہوں کہ وہ میمفس کیوں گیا تھا؟“

”اسے لیزنگ کے لیے ایک لیموزین کی ضرورت تھی اور اسے پتا چلا تھا کہ وہاں ایک شخص کے پاس اس کا مطلوبہ ماڈل موجود ہے جو اسے مناسب قیمت پر مل سکتی ہے۔ اگر اس کے علاوہ کچھ اور نہیں پوچھنا تو جلد از جلد معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ گریفتھ نے وہ رقم کہاں خرچ کی اور اسے کس نے قتل کیا؟“

باب نے فون رکھنے کے بعد ایک بار پھر کاغذات پر نظر دوڑائی۔ ایک کاغذ پر کچھ پوائنٹس نوٹ کیے اور جینی کا نمبر ڈائل کرکے اس سے لیموزین کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں تو وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے لیے وہ مناسب نہیں رہے گی۔ بہتر ہوگا کہ گریفتھ کی لیکسس لے لو۔ میں نے اس کی صفائی کروادی ہے تاکہ اسے لیز پر دے سکوں۔“

”اگر کوئی لیموزین لیز پر لینا چاہے تو وہ کتنے میں پڑے گی؟“

”مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ اگر واقعی تم یہ گاڑی لینا چاہتے ہو تو معلوم کرکے بتا سکتی ہوں۔“

”تم جانتی ہو کہ گریفتھ مرنے سے ایک مہینے پہلے میمفس کیوں گیا تھا؟“

”اس نے بتایا تھا کہ وہ سونے کے بارے میں ایک سیمینار میں شرکت کرنے جارہا ہے۔“

”اسی زمانے میں اس نے آرکنساس میں کسی کو فون بھی کیے تھے۔ اس کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟“

”نہیں، مجھے ان فون کالز کے بارے میں کچھ علم

نہیں۔“

باب نے فون رکھ دیا۔ اب وہ مسلسل ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ گریفتھ کس مقصد کے تحت میمفس گیا تھا اور آخری دنوں میں اس کی ٹیلی فون پر کس سے بات ہوتی رہی تھی اور وہ نمبر کس کا تھا؟ بالآخر اس نے تھامسن سے مدد لینے کا فیصلہ کیا جو کمپیوٹر کے ذریعے گڑے مردے اکھاڑنے کا ماہر تھا۔

”میں ایک فون نمبر دے رہا ہوں جو فی الوقت کسی کے استعمال میں نہیں۔ تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ کس کے نام پر تھا؟“

”ٹھیک ہے، میں تمہیں فیکس کردوں گا اور اگر تمہارے پاس انٹرنیٹ کی سہولت ہے تو ای میل بھی کرسکتا ہوں۔“

”نہیں، فیکس ہی ٹھیک رہے گا۔“

باب نے فون رکھنے کے بعد ایک بار پھر کاغذات کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ اس کی نظریں جیکی جونز کی جانب سے دیے گئے مالیاتی گوشوارے پر جم کر رہ گئیں۔ یہ چھ صفحات پر مشتمل تھا اور اس میں گریفتھ کے کاروبار کی تمام تفصیلات درج تھیں۔ باب کافی دیر تک ان میں سر کھپاتا رہا پھر اس نے وہ کاغذات میز پر رکھے اور فلورنس ولا کی جانب روانہ ہوگیا۔ یہ جگہ شہر کے شمال میں واقع تھی جہاں اسے جمی واٹکن سے ملنا تھا۔ وہ گھر پر نہیں ملا لیکن اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ اپنے عملے کے ساتھ جھیل کے قریب کسی کونڈو کمپلیکس کی صفائی میں مصروف ہے۔ باب کو دیکھتے ہی وہ اپنے ٹریکٹر سے اتر کر اس کی کار کے قریب آیا اور پسینا پونچھتے ہوئے بولا۔ ”سارجنٹ سمو! کیا تمہیں بھی کسی جگہ کی صفائی کروانی ہے؟“

”نہیں، میں صرف یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کیا تم اب بھی ایلیکس کلب کی صفائی کے لیے جاتے ہو؟“

”نہیں، میرا عملہ یہ کام کرتا ہے۔ کبھی کبھی رات میں جاکر کام دیکھ لیتا ہوں۔ اب مجھ سے اس عمر میں ویکیوم کلینر نہیں چلایا جاتا۔“

”میرا خیال تھا کہ شاید تم نے بھی گریفتھ ٹیلر کے بارے میں سنا ہو کہ اس نے جوئے میں ایک بڑی رقم ہار دی؟“

”ایلیکس کلب کے مالکان اس بات کو پسند نہیں کریں گے کہ ان کا صفائی کا عملہ وہاں کے بارے میں کوئی بات کرے بلکہ وہ اس پر ناراض بھی ہوسکتے ہیں۔“

”بے فکر رہو۔ میری زبان پر کبھی تمہارا نام نہیں آئے گا۔“

”بڑے شرم کی بات ہے کہ مسٹر ٹیلر نے خودکشی کرلی۔ وہ صحیح معنوں میں شریف انسان تھے اور ہارنے کے باوجود

درویشی کا کمال

حضرت رابعہ بصریؒ

کو ایک شب پچھلے پہر نیند آگئی۔ کوئی چور اس تاک میں تھا وہ آپ کے حجرے میں داخل ہوا۔ کچھ دیر ادھر ادھر چیزیں تلاش کرتا رہا۔ جب کوئی قیمتی چیز نہیں ملی تو اس نے رابعہ کی چادر ہی اٹھالی لیکن جب اس نے واپسی کے لیے قدم اٹھائے تو اسے محسوس ہوا کہ بینائی جاچکی ہے۔ گھبرا کے بھاگنے کی فکر کی لیکن دروازے سے ٹکرا کر گر گیا گرنے کی آواز سے رابعہ کی آنکھ کھل گئی۔ پوچھا ”کون ہے؟“

چور نے شرمساری سے جواب دیا ”بی بی! میں ہوں چور اور اپنی حرکت پر نادم ہوں“

رابعہ نے پوچھا ”تو کیا سمجھ کر میرے حجرے میں داخل ہوا تھا؟“

چور نے جواب دیا ”بی بی میں جھوٹ نہیں بولوں گا مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ سو رہی ہیں اس لیے میں اندر آگیا اور یہاں میری بینائی جاتی رہی اگر بینائی نہ جاتی تو آپ مجھے ہرگز نہ پکڑتیں“

آپ نے کہا ”میں نیند میں تھی تو کیا ہوا۔ میرا دوست (اللہ) تو جاگ رہا تھا۔ میں نے تجھے معاف کیا۔“

مسکراتے رہتے تھے۔“

”کیا مرنے سے پہلے اس نے جوئے میں کوئی بڑی رقم ہاری تھی؟“

”گزشتہ ایک سال میں تو ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اگر وہ پانچ دس ہزار ڈالرز بھی ہار جاتے تو یہاں کے لوگوں کے لیے ایک بڑی خبر ہوتی۔“

”کیا جیکی جونز بھی جوا کھیلتا ہے؟“

”نہیں، اسے ڈر ہے کہ ہارنے کی صورت میں اس کا ایک سونے کا سکہ کم نہ ہوجائے۔ البتہ اس کا پارٹنر چارلس میکی کھیلتا ہے۔“

باب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور گھر واپس آگیا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد آرام کی غرض سے کرسی پر نیم دراز تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہاں چارلس میکی کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”کیا میں تمہارا تھوڑا سا وقت لے سکتا ہوں؟“

”اندر آجاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ اسے عقبی پورچ کی جانب لے گیا اور اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“

''مسٹر ٹیلر کا فون آیا تھا۔ وہ ان ایک لاکھ ڈالرز کے بارے میں پریشان تھی جو گریفتھ نے ہم سے لیے تھے۔ ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں کہ اس نے ان پیسوں کا کیا کیا۔ شاید تم اس بارے میں کچھ معلوم کرسکو۔ وہ ہم پر مقدمہ کرنے کی دھمکی دے رہی ہے۔ میں اس کا دکھ سمجھتا ہوں لیکن ہم کسی کو غلط الزام تراشی کی اجازت نہیں دے سکتے۔''

''کیا اس نے تم سے نقد رقم لی تھی؟''

''ہاں، سو سو ڈالر کے نوٹوں کی دس گڈیاں تھیں جو وہ اپنے بریف کیس میں لے کر گیا تھا۔''

''اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' باب نے پوچھا۔

''میں اسے سارا ریکارڈ دکھا چکا ہوں لیکن وہ کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہیں، اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم اسے سمجھاؤ۔''

''تمہارا ریکارڈ کوئی عام آدمی نہیں سمجھ سکتا، میں بھی نہیں۔''

''اگر تم اس سلسلے میں کچھ مدد کرسکو تو ہم تمہارے بہت شکر گزار ہوں گے۔''

''کوشش کروں گا۔''

وہ اسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ چارلس نے اس سے مصافحہ کیا۔ جب وہ اپنی مرسیڈیز میں بیٹھنے لگا تو باب نے پوچھا۔ ''کیا یہ گاڑی بھی تم نے گریفتھ سے لیز پر لی تھی؟''

چارلس مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، اسی بہانے ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔''

دوسرے دن باب دفتر پہنچا تو اس کی فیکس مشین پیغامات سے بھری ہوئی تھی۔ تھامسن کی اطلاع کے مطابق وہ نمبر جے ایس انٹر پرائزز کا تھا۔ جے ایس اس کمپنی کے مالک جان اسٹیونس کے نام کا مخفف تھا جسے تین ماہ قبل میمفس میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس کی لاش دریائے مسی سپی سے ملی تھی۔ اخبار میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق اس کی موت گریفتھ کے میمفس جانے کے دو ہفتے بعد واقع ہوئی تھی۔ تھامسن نے اس اخبار کی نقل بھی فیکس کی تھی جس میں اسٹیونس کی آخری رسومات کی تفصیل شائع ہوئی تھی جس میں اس کا بھائی بھی موجود تھا۔ چنانچہ باب نے اس سے ملنے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے پہلے اس نے گریفتھ کا مالیاتی گوشوارہ تھامسن کو فیکس کر دیا تاکہ وہ اسے آسان زبان میں ترجمہ کر کے اسے سمجھنے کے قابل بنا دے۔

اس نے آرکنساس کی مقامی ڈائریکٹری میں مقتول کے بھائی آرمر اسٹیونس کا نمبر تلاش کیا۔ رابطہ کرنے پر اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ گالف کھیلنے گیا ہوا ہے۔ اس نے باب کا نمبر لے لیا اور کہا کہ جیسے ہی اس کا شوہر گھر واپس آیا، وہ اسے فون کر کے مطلع کر دے گی۔ دوسرا فون اس نے لیفٹیننٹ بائس کو کیا اور بتایا کہ گریفتھ ٹیلر آرکنساس میں جس شخص سے ٹیلی فون پر رابطے میں تھا، اسے گریفتھ کی موت سے ایک ہفتہ پہلے قتل کر دیا گیا۔''

بائس نے بڑے اطمینان سے اس کی بات سنی اور کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم مجھے تفصیلات بتا دو۔ میں اپنے طور پر معلومات حاصل کرتا ہوں۔''

''ایک بات اور۔'' باب نے کہا۔ ''گریفتھ نے اپنی موت سے کچھ دن پہلے جیکی سے ایک لاکھ ڈالرز لیے تھے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ رقم کہاں گئی؟''

''یہ جاننا بہت ضروری ہے تاکہ ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔''

آدھ گھنٹے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے آرمر اسٹیونس بول رہا تھا۔ ''تم نے مجھے کس سلسلے میں فون کیا تھا؟ کیا میرے بھائی پر کچھ واجبات ہیں؟ میرا خیال ہے کہ ہم نے تمام واجبات ادا کر دیے ہیں۔ حالانکہ میرا بھائی گزشتہ دو سال سے شدید پریشانی میں مبتلا تھا۔ اس کی بیوی کو کینسر ہو گیا تھا اور بلوں نے اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ اس کے باوجود اس نے تمام واجبات ادا کرنے کی پوری کوشش کی۔''

''مجھے تمہارے بھائی کی موت پر افسوس ہے مسٹر اسٹیونس! میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں اور ایک شخص کی موت کی تحقیقات کر رہا ہوں جس نے تمہارے بھائی سے کئی مرتبہ ٹیلی فون پر بات کی اور ایک مرتبہ اس سے ملنے بھی آیا تھا۔ کیا تم گریفتھ ٹیلر نامی کسی شخص کو جانتے ہو؟''

''نہیں، جان اپنے معاملات خود ہی دیکھا کرتا تھا اور وہ میرے خیال میں دانتوں کا بہترین ڈیزائنر تھا۔ کیا مسٹر ٹیلر بھی دندان ساز تھے؟''

''نہیں، وہ کاریں لیز پر دیا کرتا تھا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ مصنوعی دانت بنانے کے علاوہ تمہارا بھائی دانتوں کی بحالی سے متعلق کیا کام کرتا تھا؟''

''دانتوں کے درمیانی خلا کو پُر کرنا، ٹیڑھے دانتوں کو مناسب شکل میں لانا، ٹوٹے ہوئے دانتوں کی جگہ نئے دانت لگانا اور دانتوں پر سونے کا خول چڑھانا وغیرہ وغیرہ۔''

سونے کا نام سن کر باب چونک گیا اور بولا۔ ''کیا وہ سونے سے متعلق کوئی اور کام بھی کیا کرتا تھا؟''

''وہ ایک فنکار تھا اور لوگوں کے لیے زیورات، نیکلس، انگوٹھیوں اور بروچ وغیرہ کے خوب صورت ڈیزائن تیار کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک روز وہ ایسا ڈیزائن تخلیق کرے گا جس کی بدولت وہ راتوں رات امیر بن جائے۔ کچھ اور پوچھنا چاہتے ہو؟''

''مسٹر ٹیلر سونے کے کاروبار سے منسلک تھے۔ کیا تمہارے بھائی نے بھی کبھی سونے کے سکے خریدے یا فروخت کیے؟''

''وہ تمغے بنایا کرتا تھا اور اس پر اسے کئی دفعہ ایوارڈ بھی ملا۔ پوری ریاست کے اسکولوں میں اسی کے بنائے ہوئے تمغے کھیلوں کے مقابلے میں جیتنے والوں کو دیے جاتے تھے۔''

''پھر تو اس نے خوب دولت اور شہرت کمائی ہوگی؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اس کے لیے بہت زیادہ پبلسٹی کی ضرورت ہے۔ پھر وہ ٹھوس سونا نہیں ہوتا تھا بلکہ ان پر سونے کا پانی چڑھا دیا جاتا تھا۔ اس کام میں بھی اسے مہارت حاصل تھی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ جان کی موت کا تعلق مسٹر ٹیلر سے ہے؟''

''فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' باب نے کہا۔ ''کیا تم نے اس کے کاغذات کا مطالعہ کرنے کے دوران اس کے اثاثوں کے حوالے سے کوئی غیر معمولی بات محسوس کی؟''

''میرا خیال ہے کہ وہ کچھ نئے تمغے ڈھالنے کے بارے میں کام کر رہا تھا جن کی تعداد ایک سے پانچ ہزار تک ہو سکتی ہے۔ کیا ان معلومات سے تمہیں کسی نتیجے پر پہنچنے میں مدد مل سکتی ہے؟''

''معلوم نہیں لیکن یوک کاؤنٹی شیرف کے دفتر سے لیفٹیننٹ بائس تمہیں فون کرے گا۔ وہی تمہارے بھائی کے قتل کی تحقیقات کر رہا ہے۔''

''مجھے اس کے ساتھ تعاون کر کے خوشی ہوگی کیونکہ یہاں کی پولیس تو ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہے۔''

دوسری صبح اسے تھامسن کی کال موصول ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں نے اس فائل کو غور سے پڑھا ہے اور کئی حیرت انگیز انکشافات ہوئے ہیں۔ مثلاً گریفتھ ٹیلر نے گزشتہ چھ ماہ میں دو سو سترہ سودے کیے اور ہر ایک میں اسے غیر معمولی منافع ہوا جو کہ ناممکن ہے۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے بارہ نومبر کے سودے پر ہے۔ اس روز مارکیٹ میں سونے کی جو قیمت تھی، اس کی نسبت کاغذات میں بہت کم رقم ظاہر کی گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ سب کاغذی کارروائی ہے۔ اس نے مارکیٹ سے سونا خریدا ہی نہیں تھا۔''

باب کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور وہ بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ میں نے جیکی کے یہاں سونے کے سکوں کا جو ڈھیر دیکھا تھا، اس کی حقیقت کچھ اور ہے۔ اگر اصل سکے کی قیمت پانچ سو ڈالر ہے اور کوئی ماہر کاریگر پچاس ڈالر میں سونے کا پانی چڑھا ہوا سکہ بنا کر دیتا ہے تو لامحدود منافع یقینی ہے۔''

''لیکن جب لوگ اپنا سونا واپس لینا چاہیں تو انہیں اصلی سکے دینا ہوں گے۔'' تھامسن نے کہا۔

''میں نے سنا ہے کہ لوگ زیادہ منافع کے لالچ میں اپنا سونا جیکی کے پاس ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس امید پر کہ ان کے سکوں کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی۔ جس طرح لوگ بینک میں اپنا منافع چھوڑ دیتے ہیں تاکہ ان کی اصل رقم میں اضافہ ہوتا رہے۔''

''اوہ، مجھے یہ معاملہ اپنے کچھ دوستوں کے علم میں لانا ہوگا جن کا تعلق ایجنسیوں سے ہے۔'' تھامسن نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں بھی کچھ لوگوں سے بات کرتا ہوں... تم رابطے میں رہنا۔''

اس کے بعد باب نے بائس کو فون کر کے پوچھا کہ گریفتھ کی جیب سے جو سکہ برآمد ہوا تھا، اس کی لیبارٹری رپورٹ کیا ہے؟ بائس نے جواب میں کہا کہ یہ خودکشی کا کیس تھا اس لیے لیبارٹری میں تجزیہ کروانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ باب نے اصرار کیا کہ اس سکے کو لیبارٹری میں بھیجا جائے کیونکہ اب تک جو پیش رفت ہوئی ہے، اسے دیکھتے ہوئے اس سکے کا تجزیہ بہت ضروری ہے۔

دو دن بعد باب اپنے مخصوص ریستوران میں ناشتا کر رہا تھا کہ ڈیوڈ براؤن وہاں آ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے جیکی جونز کے بارے میں کچھ سنا؟''

''اسے کیا ہوا؟'' باب نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''وہ فرار ہو گیا ہے۔ اس کے ایک دوست کا دوست سیکریٹری آف اسٹیٹ کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ اس نے جیکی کے دوست کو فون پر بتایا کہ جیکی جونز انٹر پرائزز کے ریکارڈ کی چھان بین ہو رہی ہے۔ جیکی کے دوست نے اسے فون کیا کہ وہ اپنا سونا فروخت کر کے نقد رقم لینا چاہتا ہے۔ پھر اس نے اپنے ایک اور دوست کو بھی یہی مشورہ دیا۔ ان دونوں کو آج صبح جیکی سے ملنا تھا لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو جیکی اور چارلس غائب تھے۔ یہ بات پورے شہر میں پھیل گئی ہے اور اب اس کے دفتر کے باہر لوگوں کا جم غفیر اکٹھا ہو گیا ہے۔''

باب نے جلدی جلدی ناشتا ختم کیا اور بل ادا کر کے

وہاں سے چل دیا۔ براؤن بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ جیکی کے دفتر کے باہر لوگوں کا ہجوم تھا جو اپنے غم و غصے کا اظہار نعروں کی صورت میں کررہے تھے۔ بائس اسے باہر ہی مل گیا۔ اس نے باب کو بتایا۔ ”جیکی اور چارلس غائب ہو گئے ہیں۔ تحقیقاتی افسران اور پولیس دفتر کے ریکارڈ کی چھان بین کررہے ہیں جبکہ میں یہاں شیرف سے گریفتھ کے قتل کے سلسلے میں بات کرنے آیا ہوں۔“

”قتل!“ باب نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”تم تو اسے خودکشی قرار دے چکے تھے؟“

”ہاں لیکن تحقیقات سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ گریفتھ اور جان اسٹیونس کو ایک ہی ریوالور سے نشانہ بنایا گیا ہے اسی لیے ہم نے نئے سرے سے اس کیس کی تحقیقات شروع کردی ہیں۔“

”یہ ٹیلر کی بیوہ کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔“

”تمہارا شبہ درست نکلا۔ گریفتھ کی جیب سے برآمد ہونے والا سکہ جعلی تھا۔ اس پر بڑی مہارت سے سونے کا پانی چڑھا دیا گیا تھا تاکہ وہ اصلی نظر آئے۔ دفتر کے صحن میں جعلی سکوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے جبکہ نقد رقم اور اصلی سونے کے سکے غائب ہیں اور اسی بات نے لوگوں کو مشتعل کردیا ہے۔“

فون کی گھنٹی بجی۔ بائس نے کچھ دیر بات کی پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”جیکی اوکالا میں اپنے بھائی کے گھر چھپا ہوا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ یہ محض حساب کتاب کی گڑبڑ ہے اور وہی اس کی وضاحت کرسکتا ہے۔“

ایک ہفتے بعد بھی چارلس کا کوئی پتا نہ چل سکا۔ بائس کا کہنا تھا کہ اس نام کے کسی شخص کا وجود نہیں۔ وہ جعلی پاسپورٹ پر امریکا آیا تھا۔ اصلی چارلس میکی کئی برس پہلے کیپ ٹاؤن میں انتقال کرچکا تھا۔ ہم صرف نقلی چارلس کی انگلیوں کے نشانات سے اسے تلاش کررہے ہیں۔ ایک نہ ایک دن وہ ضرور پکڑا جائے گا۔ تب ہی ہم اس سے ٹیلر کی موت اور گمشدہ ایک لاکھ ڈالرز کے بارے میں کچھ معلوم کرسکیں گے۔“

”اسی نے جان اسٹیونس کو بھی قتل کیا تھا؟“

”ہاں، وہ گزشتہ ایک سال سے اس سے رابطے میں تھا اور ہر مہینے اس سے ملنے جایا کرتا تھا۔ وقوعہ والے روز بھی وہ میمفس میں ہی تھا۔“

”جان کو قتل کرنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟“

”پولیس کا خیال ہے کہ جان کو اس کے کاروبار کے بارے میں معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔ اس پر اس نے معاوضہ بڑھانے کا مطالبہ کیا اور دھمکی دی کہ بصورت دیگر وہ پولیس کو مطلع کردے گا۔ چنانچہ اسے راستے سے ہٹا دیا گیا۔“

”ٹیلر کو کیوں قتل کیا گیا؟“

”وہ دور اندیش شخص تھا۔ جان کی موت کے بعد اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ فراڈ زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ چنانچہ اس نے قرض کی ادائیگی کے بہانے اپنے ایک لاکھ ڈالرز نکال لیے۔ چارلس وقتی طور پر خاموش ہوگیا لیکن وہ جانتا تھا کہ گریفتھ ایک لاکھ ڈالرز سے اپنا کاروبار شروع کرسکتا ہے چنانچہ اس نے متوقع حریف کو سامنے آنے سے پہلے ہی اسے راستے سے ہٹا دیا اور رقم کا بریف کیس لے کر چلتا بنا۔ گریفتھ کے دفتر سے ملنے والے انگلیوں کے نشانات سے اس بات کی تصدیق ہوگئی ہے کہ وقوعہ کی رات وہ وہاں آیا تھا۔“

تین ہفتے بعد باب ٹیلر لیزنگ کمپنی کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اسے دفتر کے باہر جینی کھڑی نظر آئی جو مزدوروں کو کچھ ہدایات دے رہی تھی۔ باب نے گاڑی روکی اور اس کے پاس چلا گیا۔ جینی اسے دیکھتے ہی بولی۔ ”تم اس وقت امپیریل یوک لیزنگ کی نئی مالکن سے مخاطب ہو۔ تم نے ہی مجھے یہ مشورہ دیا تھا۔ اس کے لیے میں ہمیشہ احسان مند رہوں گی۔“

”برینڈا نے یہ کمپنی تمہیں فروخت کردی؟“ باب نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں، اب اسے اس کام سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ تمہاری مہربانی سے وہ بیس لاکھ ڈالرز کی مالک بننے والی ہے۔“

”مجھے حیرت ہے کہ گریفتھ کو جیکی کے کاروبار کی نوعیت کا کیسے اندازہ ہوا؟“

”وہ ایک میل دور سے خطرے کی بو سونگھ لیتا تھا۔ جب اس نے کاغذات دیکھے تو شک میں پڑ گیا پھر اسے کچھ ثبوت مل گئے۔ اس سلسلے میں وہ ایک مرتبہ میمفس بھی گیا اور جب اسے جعل سازی کا یقین ہوگیا تو اس نے خاموش پارٹنر بن جانا ہی مناسب سمجھا اور ایک دن بہانہ کرکے اپنی رقم نکال لی۔ لیکن وہ بھول گیا تھا کہ مجرموں کا ساتھ دینا آسان لیکن ان کے چنگل سے نکلنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔“

”میرا کام ختم ہوگیا۔ اب میں چھٹیاں گزارنے کینیڈا جارہا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گی؟“

وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔ ”بشرطیکہ تم مجھ سے ایک کار لیز پر حاصل کرو۔“

باب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”منظور ہے۔“ جینی کی قربت کے عوض یہ سودا مہنگا نہ تھا۔

اندازِ دگر

بشریٰ امجد

جرم کرنے کی ٹھان لی جائے تو پھر راستے بھی نکل آتے ہیں اور نت نئے طریقے بھی دریافت ہوتے چلے جاتے ہیں... ایک ایسی ہی منفرد کہانی کے تانے بانے... لوگ مر رہے تھے... لیکن نہ کوئی قاتل تھا اور نہ ہی مقتول...

سوچ و ذہانت کے نرالے انداز... انوکھے اطوار اور دل پسند انجام کا خوب صورت انعام...

”اچھی خاصی بکواس ہے، کون یقین کرے گا؟ سپر نیچرل؟... یعنی مافوق الفطرت؟“

”یہ سچ ہے۔“ ایڈی ورتھ نے معمول کے مطابق ایک ہاتھ دل کے مقام پر رکھا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ جب بھی اس کے کسی اندازے کو متنازعہ بنایا جاتا تو وہ دل پر ہاتھ رکھ لیتی تھی۔

”ڈاکٹر آربکل کے گھر کے سامنے وہ آدمی رات بھر کھڑا رہا تھا اور اگلے روز ڈاکٹر صاحب مردہ پائے گئے تھے۔“

”بھئی آربکل بیمار تھا۔ وہ دل کا مریض تھا۔ جلد یا بدیر اسے مرنا تھا۔ یہی مسز کلیپ کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ ایک پرانے اور پیچیدہ عارضے میں مبتلا تھی۔“

”لیکن وہاں بھی وہ ساری رات اس کے گھر کے سامنے کھڑا رہا تھا۔“

”یعنی وہ آدمی جو گرے کے نام سے معروف ہوگیا ہے... کیونکہ وہ ہروقت گرے رنگ کے لباس میں ہوتا ہے اور تمہارے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ وہ جس گھر کے سامنے رات بھر کھڑا رہے، اس گھر کا مکین اگلے روز مرجاتا ہے؟“

”کیا ایسا نہیں ہے؟“ ایڈی نے اعتراض کیا۔

”میں مانتا ہوں کہ ایسا ہے۔ جلد یا بدیر ہر ایک کو مرجانا ہے لیکن کیا مرنے والا ”گرے“ کی وجہ سے مرتا ہے؟ اس پر کون یقین کرے گا؟“

”میں اتنا جانتی ہوں کہ یہ حقیقت ہے اور تم جانتے ہو کہ وہ اس وقت کہاں کھڑا ہے؟“

رائے ورتھ نے کرسی کھسکائی اور کھڑا ہوگیا۔

”میری سمجھ کے مطابق تم ہیجان کا شکار ہوجاتی ہو۔ اگر ہم افریقا میں رہائش پذیر ہوتے تو شاید میں کچھ سوچتا لیکن یہاں... وہم ہے یہ سب تمہارا۔“

”باہر دیکھو۔“ ایڈی نے سرگوشی کی۔ اب اس کے دونوں ہاتھ دل کے آس پاس تھے۔ ”تم جانتے ہو کہ میں کتنی بیمار ہوں۔ میرے ساتھ بحث مت کرو۔ باہر دیکھو۔“

رائے چلتا ہوا کھڑکی کے قریب گیا۔ وہ شخص سڑک پر ان کے گھر کی طرف رخ کیے کھڑا تھا۔ پورے چاند کی روشنی میں اس

کا سراپا نمایاں تھا۔ وہ ایک کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے گرے رنگ کا ٹاپ کوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ اسی رنگت کی پتلون، ہیٹ بھی گرے رنگ کا تھا۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ میں پولیس کو فون کروں؟" رائے نے پوچھا۔ "میرے خیال میں پولیس اسے گرفتار کرلے گی۔"

"تم ہوگو کے پاس جاؤ۔" ایڈی نے زور دیا۔ "وہ پولیس فورس میں ہے۔ اسے علم ہوگا کہ کیا کرنا چاہیے؟"

"کافی رات ہوگئی ہے۔ پڑوسیوں کو تنگ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔"

"پلیز۔" ایڈی نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

رائے نے غصے سے اپنی بیوی کی جانب دیکھا۔ کتنی موٹی ہو گئی ہے۔ تمام جسم پر گوشت کے لوتھڑے لٹک رہے ہیں اور چہرہ؟ یہ وہ حسین چہرہ تو نہیں ہے... جس نے رائے کو دیوانہ بنایا تھا۔

اس نے کندھے اچکائے اور فون کی جانب بڑھ گیا۔ وہ جلدی سے بولی۔ "رائے! ہوگو سڑک کے پار ہی تو رہتا ہے۔"

رائے نے بیزاری سے سر ہلایا۔ ان کی شادی کو بارہ برس بیت گئے تھے اور رائے، ایڈی کے بدلتے ہوئے سراپا اور سوچ سے تنگ آچکا تھا۔

"میں یہیں بیٹھی ہوں۔" ایڈی نے کہا۔ "تم عقبی راستہ استعمال کرنا تاکہ اس کی نظروں میں نہ آؤ۔"

"میں سامنے سے جاؤں گا۔ یہ میرا گھر ہے۔ میں کوئی چور نہیں ہوں کہ عقبی راستہ استعمال کروں۔ دیکھتا ہوں کہ وہ کیا کرلے گا۔"

"میری دوا... رائے۔" وہ کراہی۔ "مجھے دوا کی ضرورت ہے۔"

"تم ہمیشہ یہی کرتی ہو۔ میں ایک کام کرنے جاتا ہوں تو دوسرا کام بتا دیتی ہو... آخر تمہاری یہ عادت کب ختم ہوگی؟"

بہرحال اس نے پانی کا گلاس، چمچ اور دوا بیوی کو دی۔ نارنجی رنگ کی گولیاں نگل کر ایڈی آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

رائے نے کوٹ، جیکٹ اور گلوز لیے پھر بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ اپنے ارادے کے برخلاف عقبی دروازے سے نکلا تھا۔ گرے دائیں بائیں متوجہ نہیں تھا۔ اس کی نگاہ سامنے کی جانب تھی، رائے عین اس کے سامنے سے ہو کر گزرا۔

ڈور بیل کے جواب میں ہوگو بذاتِ خود برآمد ہوا۔ وہ دراز قامت اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ کوریا کی جنگ میں اس نے بہادری کا تمغہ بھی وصول کیا تھا۔ بعدازاں وہ پولیس میں چلا گیا۔

"میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ تمہارے آنے کا مقصد کیا ہے؟" ہوگو نے کہا۔ "میرا مشورہ ہے کہ تم دونوں میاں بیوی گرے کو بالکل نظرانداز کردو اور اس کا منصوبہ اسی کے منہ پر مار دو۔"

"منصوبہ؟" رائے نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں۔" سارجنٹ ہوگو نے جواب دیا۔ "گرے خود کو "موت کے ہرکارے" کے طور پر نمایاں کر رہا ہے... وہ بھی بغیر کسی غیر قانونی حرکت کے... وہ بیمار رہائشیوں کو چنتا ہے پھر ان کو فون کرتا ہے کہ اگر وہ دو ہزار ڈالرز خرچ کرڈالیں تو وہ ان کے گھر کے سامنے نظر نہیں آئے گا۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ کتنے ہی لوگ اسے ادائیگی کرچکے ہیں... قسمت اس کے ساتھ ہے۔ لوگ اسے آسیب سمجھنے لگے ہیں۔"

"بڑا انوکھا طریقہ کار ہے۔" رائے نے کہا۔ "لیکن اس نے ابھی تو کوئی فون نہیں کیا۔"

"ہوسکتا ہے، کل کرے۔ جب تمہاری بیوی زیادہ خوف زدہ ہو چکی ہوگی۔ میں اسے وہاں سے ہٹوا سکتا ہوں لیکن اس طرح اس کو شہرت ملے گی... دوسرے ہم اسے زیادہ دن قید میں نہیں رکھ سکتے۔ آزاد ہوتے ہی وہ پھر سابقہ روش پر لوٹ آئے گا۔ مجھے بھی حادثاتی طور پر اس کے طریقہ کار کا علم ہوا ہے۔ اس کے ایک شکار کا بھتیجا کورٹ ہاؤس میں اسٹینوگرافر ہے... مصیبت یہ ہے کہ اس کا آسیبی یا غیر انسانی کردار مستحکم ہو چکا ہے اور کوئی بھی اس کے خلاف گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"بہتر ہے کہ تم اسے یہاں سے ہٹانے کے بارے میں سوچو... ایڈی کی خاطر۔" رائے نے کہا۔ "ایڈی کی حالت ابتر ہے، تم جانتے ہو..."

"اوکے، ہم اسے اس علاقے سے بھگانے کی کوشش کریں گے۔ اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ باز نہیں آئے گا..."

"میں اس کی موجودگی اور ایڈی کی حالت سے پریشان ہوں۔ تمہیں ایڈی اور بچوں کی خاطر کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے، میں کوئی بندوبست کرتا ہوں۔" ہوگو نے رائے کو اطمینان دلایا۔

رائے واپس چل پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہوگو کی اطلاعات پر ایڈی نئی بحث کھڑی کردے گی۔ بظاہر ہوگو سے ملاقات امید افزا نہیں تھی لیکن رائے سوچ رہا تھا کہ اچھا ہوا کہ وہ اس سے مل لیا۔

گرے کے عین سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے رفتار دھیمی کرلی۔ "دوست، فون کالز پر وقت ضائع مت کرنا... تمہیں رقم مل جائے گی۔ میری بیوی کا معاملہ نمٹانے میں جلدی کرو، اس کی حالت کافی خراب ہے۔"

اس نے گرے کے چہرے پر پُراسرار مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوتے دیکھی۔

رائے قدم بڑھاتا ہوا مطمئن انداز میں گھر میں داخل ہوگیا۔

موقع شناس

آصف ملک

عقل مند لوگ ہواؤں کے تیور بھانپ کر فوراً سے پیشتر اپنا رخ تبدیل کرلیتے ہیں... موقع... مقام اور ماحول کے مطابق اپنی حکمتِ عملی مرتب کرنے والے ایک موقع شناس کا دلچسپ اور تفریح سے بھرپور ایڈونچر... اچانک ہی وہ ناموافق حالات کی گرفت میں آگیا..... نادانستگی میں بھڑوں کے چھتے میں جا گھسا تھا...

شاپنگ اسٹور کے باہر ایک عورت اپنے بچے کو لے کر نکل رہی تھی کہ بچے نے میری طرف اشارہ کیا۔ "مام کیمرا..."

میں نے اپنے شانے سے کیمرا اتارا اور یوں پوز کرنے لگا جیسے بچے کی مووی بنا رہا ہوں۔ وہ خوش ہوگیا۔ اس کی ماں نے میرا شکریہ ادا کیا اور اپنی گاڑی کی طرف چلی گئی۔ میں شاپنگ سینٹر میں آیا۔ اگرچہ مجھے کچھ چیزیں خریدنا تھیں مگر اصل کام ایک شخص سے ملنا تھا۔ کیمرے کی وجہ سے

ایک بے لگام سرپٹ دوڑتے گھوڑے کو نکیل ڈالنے کا سنسنی خیز احوال

اکثر لوگ مجھے فوٹو گرافر سمجھ رہے تھے۔ درحقیقت وہ غلط نہیں سمجھ رہے تھے۔ میں فوٹو گرافر ہی ہوں لیکن میں عام فوٹو گرافی نہیں کرتا بلکہ کچھ خاص لمحات کی فوٹو گرافی کرتا ہوں۔ ایسے لمحات جو بعد میں میرے لیے سودمند ثابت ہوں اور یہی میرا پیشہ ہے۔ میں جو کرتا ہوں اسے عام طور سے لوگ بلیک میلنگ سمجھتے ہیں مگر میں اسے سماج کی اصلاح سمجھتا ہوں۔ کیونکہ میں جو کرتا ہوں اس کے بعد لوگ عام طور سے غلط حرکات کرنے سے گریز کرتے ہیں اور کچھ تو ہمیشہ کے لیے تائب ہو جاتے ہوں گے۔ یہ میرا اندازہ ہے مجھے اس بارے میں صحیح سے پتا نہیں ہے کیونکہ میں نے کبھی اس بارے میں سروے نہیں کیا۔ میں جسے ایک بار بلیک میل کرتا ہوں، دوبارہ اس سے رابطہ نہیں کرتا۔

شاپنگ سینٹر کے آخری حصے میں جہاں موویز اور میوزک سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز رکھی تھیں، وہاں ایک شخص میرا منتظر تھا۔ وہ چھوٹے قد کا عام سا اور بہ مشکل قبول صورت شخص تھا۔ اس نے گزشتہ رات ایک موٹیل میں ایک کال گرل سے ملاقات کی تھی اور میں نے اس ملاقات کے کچھ حصے اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیے تھے۔ یہ شخص شادی شدہ تھا۔ اگر میری بنائی ہوئی مووی اس کی بیوی یا بچے دیکھ لیتے تو یقیناً اس کے حق میں بُرا ہوتا اس لیے وہ ہر قیمت پر یہ مووی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے صرف دو ہزار ڈالرز طلب کیے تھے کیونکہ میں جانتا تھا وہ اتنی رقم ہی آسانی سے دے سکتا ہے اور میں کسی کو بلاوجہ مشکل میں ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ عام طور سے بلیک میلر حضرات اپنے شکار کو آخری حد تک نچوڑنا پسند کرتے ہیں۔ وہ انہیں بالکل کنگال کر دیتے ہیں۔ آخر میں ان کے پاس مرنے مارنے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہتا ہے۔ لیکن میں اپنے شکار سے ایک بار اور اتنی رقم لیتا ہوں جتنی وہ دے سکتا ہے اور پھر اسے بھول جاتا ہوں۔ میں اس کے پاس آیا تو وہ چوکنا ہو گیا۔

"رچرڈ۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "میں جان ہوں۔"

"میں رقم لے آیا ہوں۔" اس نے کہا اور ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اسے کھول کر اندر جھانکا اور لفافہ اپنی جیب میں رکھ لیا پھر کیمرا آن کر کے اسے اس کی مووی کے چند کلپس دکھائے۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"پلیز۔" وہ تھوک نگل کر بولا۔ "اسے ڈیلیٹ کر دو۔"

"کیوں نہیں۔" میں نے کہا اور مووی کیمرے کی میموری سے ڈیلیٹ کر دی۔ "اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن..."

"لیکن کیا؟" وہ گھبرا گیا۔

"اس کی ایک کاپی انٹرنیٹ پر محفوظ ہے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اگر میں یہاں سے صحیح سلامت نکلنے میں کامیاب رہا اور پولیس وغیرہ نے مجھے نہیں روکا تو وہ کاپی بھی ڈیلیٹ کر دی جائے گی۔ دوسری صورت میں وہ چند گھنٹوں کے اندر دس ہزار ویب سائٹس پر اَپ لوڈ کر دی جائے گی۔"

اس کا چہرہ سفید پڑ گیا، وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "پلیز نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن تم مجھے پھر بلیک میل نہیں کرو گے۔"

"اس کا تمہیں جلد پتا چل جائے گا لیکن اب تم بھی آوارہ عورتوں کے چکر میں نہیں پڑو گے۔ تمہاری بیوی ہے تم اسی تک محدود رہو گے۔ ممکن ہے اگلا بلیک میلر میری طرح رحم دل نہ ہو۔" میں نے اسے تنبیہ کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ کسی نے میرا راستہ نہیں روکا۔ ویسے میں نے آتے ہوئے اچھی طرح دیکھ لیا تھا وہاں پولیس والی صورت کوئی نہیں تھی۔ اس معاملے میں مجھے خصوصی مہارت ہے، میں دور سے جان لیتا ہوں کہ فلاں سادہ لباس شخص اصل میں پولیس مین ہے۔ ایک دو بار میرے شکار نے دھوکا کیا اور پولیس کو بلا لیا انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا اور ان کی رسوائی کا تماشا بہت سے لوگوں نے دیکھا۔ میں نے اپنا حلیہ معمولی سا تبدیل کیا ہوا تھا اور اسے نام بھی غلط بتایا تھا۔ میرا اصل نام ڈینیل گلبرٹ تھا۔ دو ہزار ڈالرز کما کر میرا موڈ خوشگوار ہو گیا۔ مہینے میں ایسے دو تین شکار مل جاتے تھے اور میرا گزارا اچھا ہو جاتا تھا۔ ذاتی طور پر مجھے کوئی علت نہیں تھی۔ ایک گرل فرینڈ تھی بس اسی تک محدود تھا۔ وہ ابھی شادی نہیں چاہتی تھی اس لیے ہم دونوں خوش تھے۔ ویک اینڈ میں اس کے ساتھ گزارتا تھا ہم کہیں ڈنر کرتے اور پھر کسی نائٹ کلب میں وقت گزارتے۔ میری کل تفریح یہی تھی۔

میرا دائرۂ عمل نیویارک اسٹیٹ ہے۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ نیویارک تو شہر ہے جو امریکا کا سب سے بڑا شہر بھی ہے۔ لیکن یہ شہر جس ریاست میں ہے وہ بھی نیویارک کہلاتی ہے اور مزے کی بات ہے اس ریاست کا دارالحکومت نیویارک شہر نہیں بلکہ البانے ہے۔ میرا تعلق البانے سے ہے۔ شمالی امریکا میں چھوٹی سی جگہ پر نصف درجن سے بھی زیادہ ریاستیں ہیں۔ یہاں آبادی زیادہ اور دولت بھی بہت ہے۔ امریکا کا اقتصادی اور معاشی مرکز اصل میں یہی ہے۔ جہاں دولت زیادہ ہوتی ہے وہاں بے چینی اور لاقانونیت بھی زیادہ ہوتی ہے اور ایسی جگہوں پر مجھے اچھا شکار مل جاتا ہے۔ اس ویک اینڈ کے بعد میں کام کا سوچ رہا تھا۔ شام کے وقت میں تیار ہو کر باہر آیا اور شمال کی طرف جانے والی ہائی وے پر آ گیا۔ یہ بہت مصروف شاہراہ تھی اور اس پر بے شمار موٹلز، ڈرائیو اِن اور ایسے ہی تفریحی مقامات تھے۔ سامان لانے لے جانے والے ٹرک ڈرائیور یہاں رکتے تھے اور تفریح کرتے تھے کچھ عام لوگ بھی آتے تھے اور مجھے ان میں اپنا شکار مل جاتا۔

میں ایک گیس اسٹیشن پر رکا۔ یہاں خاصا رش تھا۔ گاڑیاں قطار میں لگی ہوئی تھیں اور باری باری گیس ڈلوا رہی تھیں۔ گاڑیوں کی کئی قطاریں تھیں۔ میرے برابر میں ایک بڑی وین کھڑی تھی۔ اس میں آگے اور پیچھے کئی افراد سوار تھے۔ ایک بار میری نظر اس طرف گئی تو میں نے ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں بہت زیادہ خوف تھا۔ اس نے اپنے آس پاس موجود افراد کو دیکھا اور پھر زیادہ حرکت کیے بغیر صرف ہونٹ ہلا کر مجھ سے کچھ کہا۔ میں نے غور کیا۔ وہ بار بار حرکت کر رہی تھی۔ بالآخر میں سمجھ گیا، وہ کہہ رہی تھی۔ "ہیلپ......" اسی لمحے میری آگے والی گاڑی آگے ہوئی اور پیچھے والی نے مجھے ہارن دیا، میں نے لڑکی کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور گاڑی آگے کر دی۔ آگے نکلنے کے بعد میں نے سائڈ مرر اس طرح سیٹ کیا کہ مجھے وین میں بیٹھے افراد نظر آنے لگے۔

ڈرائیونگ اور فرنٹ سیٹ پر موجود افراد صورت سے خطرناک لگ رہے تھے۔ عقب میں دو افراد تھے اور لڑکی ان کے درمیان...... بیٹھی تھی۔ وین کا پچھلا حصہ خالی دکھائی دے رہا تھا لیکن لڑکی نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں بھی کوئی تھا، وہ کچھ کہہ رہی تھی اس کے ساتھ بیٹھے مرد نے اسے جھٹکے سے واپس سیدھا کیا۔ دال میں کچھ زیادہ ہی کالا تھا۔ میں نے زیادہ حرکت کیے بغیر اپنا وائر کیمرا نکالا اور اسے اس کے یونٹ سے منسلک کیا۔ وائر کیمرا انگلیوں میں دبا کر میں نے ہاتھ باہر نکالا اور اسکرین پر دیکھ کر وین اور اس میں موجود افراد کی مووی بنانے لگا۔ وائر کیمرا مشکل سے ایک بٹن کے برابر تھا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تب بھی اسے کیمرا نہ سمجھتا۔ ڈیجیٹل زوم کی مدد سے میں نے وین میں موجود افراد کے چہرے واضح کیے۔ اسی اثنا میں اگلی والی گاڑی میں گیس ڈال دی گئی اور وہ روانہ ہو گئی۔ اب میری باری تھی۔ میں نے سروس بوائے سے کہا۔ "ٹینک فل کر دو۔"

وین اب اور پیچھے رہ گئی تھی کیونکہ اس طرف ایک بڑی گاڑی تھی جس کی ٹینکی فل ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ وین میں موجود افراد کے چہروں پر اضطراب نمایاں تھا۔ میری گاڑی کا ٹینک چھوٹا تھا اس لیے وہ کچھ دیر میں فل ہو گیا اور میں آگے نکلا۔ اس وقت بھی وین سے آگے ایک گاڑی موجود تھی۔ میں نے باہر نکل کر ہائی وے پر جانے کے بجائے گاڑی ایک طرف روک لی۔ یہ تو واضح تھا کہ لڑکی کسی مشکل میں تھی۔ گاڑی میں موجود افراد اسے زبردستی ساتھ لے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ فاصلہ آنے کے بعد میں نے اپنا بہترین ڈیجیٹل ہائی پاور زوم لینس والا کیمرا نکالا اور وین میں موجود افراد کی تصویریں لینے لگا۔ میں نے کوشش کی کہ چہرے صاف آئیں اور وین کا نمبر بھی آ جائے۔ اسی طرح لڑکی ان لوگوں کے درمیان نمایاں ہو۔ اس بار زاویہ ایسا تھا کہ تقریباً تمام افراد کے چہرے نظر آ گئے۔ وین کے عقبی حصے میں کوئی فرش پر لیٹا ہوا تھا کیونکہ کئی بار ایک ہاتھ نمایاں ہوا تھا۔

یہ کام کر کے میں سوچنے لگا کہ ان کی مدد کیسے کی جائے۔ براہِ راست مداخلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ کئی تھے اور صورت سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔ اسی لمحے ایک پولیس کار گیس اسٹیشن میں داخل ہوئی اور اسے دیکھ کر مجھے خیال سوجھا۔ میں کار سے اتر کر گیس اسٹیشن کے فون بوتھ والے حصے کی طرف بڑھا یہاں دو بوتھ تھے اور دونوں خالی پڑے تھے میں نے ایمرجنسی کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے آپریٹر نے جواب دیا۔ میں نے کہا۔ "ہائی وے انیس پر بیگ بری گیس اسٹیشن میں ایک وین میں کچھ مشکوک افراد ایک لڑکی کو یرغمال بنائے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے یہاں ایک پولیس کار بھی موجود ہے اگر وہ کارروائی کرے تو لڑکی اور ممکنہ طور پر اس کا ایک ساتھی بازیاب ہو سکتے ہیں۔ میں وین کا نمبر دہرا رہا ہوں مجھے امید ہے یہ کال ریکارڈ ہو رہی ہو گی۔" میں نے وین کا نمبر بتا کر کال کاٹ دی اور اپنی انگلیوں کے نشان صاف کر کے باہر نکل آیا۔ اس وقت تک وین کا نمبر آ گیا تھا اور اس میں گیس ڈالی جا رہی تھی۔

میں واپس گاڑی میں آیا اور مضطرب انداز میں وین اور کچھ دور موجود پولیس کار کو دیکھنے لگا۔ پولیس کار گیس ڈلوانے نہیں آئی تھی بلکہ پولیس والے وہاں موجود اسٹور سے کچھ لے رہے تھے۔ وقت گزر رہا تھا اگر ایمرجنسی والے بر وقت کارروائی کرتے تو پولیس وین کو روک سکتی تھی۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور وین گیس ڈلواتے ہی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ وہ

میری گاڑی کے پاس سے گزری تھی اور اس میں موجود لڑکی نے میری طرف دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ میں نے جھنجلا کر اسٹیرنگ پر ہاتھ مارا۔ شاید ایمرجنسی میں میری بات کو مذاق سمجھا گیا تھا۔ کیونکہ میں نے اپنا نام پتا کچھ نہیں بتایا تھا۔ وین شمال کی طرف گئی تھی۔ میں گاڑی سے اتر کر دوبارہ فون بوتھ کی طرف آیا۔ دوبارہ ایمرجنسی کا نمبر ملایا اور آپریٹر کو اپنی پہلی کال کا حوالہ دیا یہ دوسری آپریٹر تھی۔ میں نے اطلاع دی کہ وین شمال کی طرف گئی ہے۔

"پولیس اب بھی کارروائی کرے تو انہیں روک سکتی ہے۔"

"اپنا نام بتاؤ پلیز۔"

"جہنم میں جاؤ۔" میں نے ریسیور رکھ دیا اور واپس کار کی طرف آیا۔ پولیس کار بدستور اسٹور کے باہر موجود تھی اور پولیس والے اس کے بونٹ سے ٹکے ہوئے کھاتے پیتے ہوئے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ مزید چند منٹ بعد میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور شمال کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہاں سے آخری امریکی ریاست ورمونٹ سو کلومیٹرز کے فاصلے پر تھی اور اس کے بعد کینیڈا کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں بہت گھنے جنگل تھے اونچے نیچے پہاڑ تھے اور بے شمار دریا اور ندی نالے تھے۔ موسم ابر آلود ہو رہا تھا اور بارش کا امکان لگ رہا تھا۔ جولائی کا آخر تھا۔ مگر موسم خنک ہو رہا تھا اور اگر بارش ہو جاتی تو موسم اچھا خاصا سرد ہو جاتا۔ رات کے وقت ہائی وے کے اس حصے میں ٹریفک کم تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وین چار پانچ کلومیٹرز آگے نکل گئی ہوگی۔ اس لیے میں نے تیز ڈرائیو کی۔ دس منٹ بعد مجھے آگے کسی گاڑی کی عقبی روشنیاں دکھائی دیں۔ وہ بھی خاصی تیز جا رہی تھی۔ درمیانی فاصلہ اتنی تیزی سے کم نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے زوم لینس کیمرے کو نائٹ موڈ پر کیا اور اس سے اگلی گاڑی کا جائزہ لیا۔ اس میں پانچ چھ افراد نظر آرہے تھے۔ لیکن یقین سے کہنا مشکل تھا کہ یہ وہی وین تھی یا پھر کوئی دوسری گاڑی تھی۔

اچانک ہی وین سڑک سے نیچے اتر گئی اور جب تک میں اس جگہ پہنچا وہ ایک کچے راستے پر خاصی آگے جا چکی تھی۔ گھنے درختوں میں اس کی ہیڈ لائٹس چمک رہی تھیں۔ میں نے سوچا اور پھر اپنی گاڑی بھی اس کچے راستے پر اتار دی۔ راستہ خاصا خراب تھا اور اس پر کہیں کہیں پانی بھی جمع تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری گاڑی کے ٹائر پھنس نہ جائیں۔ یہ فور وہیل ڈرائیو نہیں تھی جب کہ وین فور وہیل ڈرائیو تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب مجھے گاڑی کہیں روک دینی چاہیے۔ میں نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر گاڑی وہاں چھپا دی اور اپنا کیمرا بیگ اور ٹارچ لے کر نیچے اتر آیا۔ وین کی روشنی اب بھی درختوں کے درمیان جھلک رہی تھی۔ کچا راستہ بار بار گھوم رہا تھا اس لیے وین بہت دور نہیں گئی تھی۔ میں درختوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے اس طرف جانے لگا۔ مجھے امید تھی کہ وین اس طرف آئی تھی تو ان لوگوں کا ٹھکانا کہیں آس پاس ہی ہوگا۔ اس کچے راستے پر بہت دور تک سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔

وین کے پیچھے آتے ہوئے اور کچے راستے پر اترنے کے دوران میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس لڑکی کی یا وین میں موجود دوسرے فرد کی مدد کیسے کروں گا۔ وہ کم سے کم چار تھے اور ان کا مسلح ہونا بھی یقینی تھا جب کہ میرے پاس صرف ایک چاقو تھا۔ یہ خیال مجھے پیدل تعاقب کرتے ہوئے آیا مگر اب میں خاصا آگے آگیا تھا اور واپس جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں صورتِ حال دیکھ کر ہی اپنی ٹانگ اڑاتا۔ بلاوجہ فوت ہونے کا مجھے شوق نہیں تھا۔ مجھے لڑکی سے ہمدردی تھی لیکن یہاں تک آنے کا اصل مقصد وہی تھا جس کے لیے میں کیمرا لے کر گھومتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ مجھے ایسا سین کیمرے میں محفوظ کرنے کا موقع مل جاتا جو بعد میں میرے لیے سود مند ہوتا۔ یہ لوگ خطرناک تھے لیکن اپنے انداز سے بڑی پارٹی لگ رہے تھے اور بڑی پارٹی سے بڑا مال کھینچا جا سکتا تھا۔ درختوں تلے تاریکی تھی اس لیے میں نے ٹارچ کو فوکس موڈ میں روشن کر کے اس کی روشنی اپنے سامنے پیروں تک محدود کرلی تھی۔ دور سے اس کی چمک دیکھنا مشکل تھا۔ پھر بھی میں بہت احتیاط کر رہا تھا۔

اب تک وین کے انجن کے غرانے کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن اچانک ہی یہ آواز رک گئی۔ میں نے آگے دیکھا۔ روشنی جھلک رہی تھی اور پھر وہ بھی بند ہوگئی۔ وین کہیں رک گئی تھی۔ میں مزید محتاط ہوگیا۔ اب میں نے اپنے چھوٹے ڈیجیٹل کیمرے کو نائٹ موڈ پر کیا اور اس کی اسکرین پر راستہ دیکھتے ہوئے آگے بڑھا۔ اس وقت ٹارچ استعمال کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ بالآخر میں درختوں سے نکل کر ایک کھلی جگہ پہنچا۔ وہاں ہموار زمین پر لکڑی کا ایک کیبن موجود تھا اور وین اسی کے سامنے کھڑی تھی۔ بہ ظاہر وہاں کوئی نظر نہیں آرہا تھا لیکن میں نے کیمرے سے دیکھ کر اپنی تسلی کرلی۔ اگر کوئی باہر ہوتا تو اس کا جسم سرخ دھبے کی صورت میں اسکرین پر نظر آتا۔ کیبن بڑا تھا۔ یہ کم سے کم تیس فٹ لمبا اور پندرہ فٹ چوڑا تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر ایک چھوٹا کیبن تھا جو یقینا

واش روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اب اندر سے روشنی جھلکنے لگی تھی اور یہ روشنی آگ سے کی جا رہی تھی کیونکہ یہاں بجلی نہیں تھی۔ کیبن کے داخلی دروازے کے سامنے ایک چھوٹا سا برآمدہ بھی تھا۔

میں گھوم کر عقب کی طرف آیا۔ یہاں لکڑی کا ٹاور بنا کر اس پر پانی کی ٹینکی رکھی ہوئی تھی۔ پیچھے کی طرف دو بڑی کھڑکیاں تھیں۔ ایک میں روشنی تھی اور دوسری تاریک تھی۔ میں نے وائر کیمرا نکالا اسے ایک چھوٹی آنکھ نکلی سی منسلک کیا اور پھر اسے یونٹ سے لگا لیا۔ کھڑکی کے عین نیچے بیٹھتے ہوئے میں نے کیمرا شیشے سے لگایا۔ اسکرین پر کمرے کا منظر دکھائی دیا۔ یہ کیبن کا کچن، ڈائننگ اور لاؤنج پر مشتمل حصہ تھا۔ دیواروں پر لگے کیروسین لیمپ جلا دیے گئے تھے اور وہاں اچھی خاصی روشنی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل کی ایک کرسی پر ایک نوجوان جھولنے کے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی پشت کیمرے کی طرف تھی اس لیے اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن وہ ان چاروں میں سے نہیں تھا کیونکہ وہ چاروں سامنے ہی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ یقیناً وہی شخص تھا جو وین کے عقبی حصے میں لیٹا ہوا تھا۔ ایک طرف لڑکی بھی ایک کرسی پر سمٹی سی بیٹھی تھی۔ اس نے منی اسکرٹ اور اوپر ڈھیلی سی فراک پہن رکھی تھی لیکن اس کا گریبان خاصا کشادہ تھا۔ مجموعی طور پر وہ دلکش اور کمسن لڑکی تھی لیکن اس وقت خوف سے اس کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ وہ لوگ بول رہے تھے لیکن آوازیں واضح نہیں تھیں۔ میں نے چھوٹا سا آلۂ سماعت نکال کر اس کا سننے والا حصہ کھڑکی پر رکھا اور ائرفون کان میں لگایا فوراً ہی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔ یہ آلہ آواز ریکارڈ بھی کرتا تھا اور میں نے اس کا ریکارڈر آن کر دیا تھا۔ ان چاروں میں سب سے لمبا تڑنگا اور خونخوار نظر آنے والا شخص کہہ رہا تھا۔

"تمہارے پاس آخری موقع ہے، مجھے بتا دو وہ گاڑی کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔" لڑکا بلبلا کر رو دیا تھا۔ یقیناً اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ "میں قسم کھا کر کہتا ہوں میں نے کار ویک برج کے پاس چھوڑ دی تھی، ہم نے صرف تفریحاً کار چرائی تھی۔"

"وہ ویک برج کے پاس نہیں ملی۔" لمبے آدمی نے خطرناک لہجے میں کہا۔ "لگتا ہے تم اپنی گرل فرینڈ کو عبرتناک حالات سے گزرتے دیکھنا چاہتے ہو؟"

"نہیں پلیز... نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

لڑکی سسکیاں لے کر رونے لگی مگر یہ لوگ منت سماجت اور رونے دھونے سے متاثر ہونے والے نہیں لگ رہے تھے۔ لمبے آدمی نے اشارہ کیا اور ان میں سب سے پستہ قد لیکن کسرتی جسم والے نوجوان نے لڑکے کے لمبے بال پکڑ کر پیچھے کھینچے اس کا سر پیچھے ہوگیا۔ لڑکی کے رونے میں شدت آگئی مگر اس نے کچھ کہا نہیں تھا۔ ان میں ایک گنجا بھی تھا اور وہ خاصا عمر رسیدہ لگ رہا تھا۔ شاید چالیس بیالیس سال کا تھا اس نے لمبے آدمی سے کہا۔ "باس یہ اس طرح نہیں مانیں گے، تم اجازت دو تو اس لڑکی کو اس کے سامنے مزہ چکھائیں۔"

گنجا خاصا شوقین لگ رہا تھا اور اس کی نظر مسلسل لڑکی کے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ مگر لمبے آدمی نے اس کی امیدوں پر اوس گرادی۔ "ابھی نہیں... انہیں ایک موقع اور دیتے ہیں اگر یہ کار کا پتا بتا دیں تو پھر کچھ نہیں ہوگا۔"

"تم انہیں چھوڑ دو گے باس؟" پستہ قد نے حیرت سے کہا۔

"ہاں تو ان کا کیا کرنا ہے، ہمیں کار واپس چاہیے۔"

باس جھوٹ بول رہا تھا۔ ان کا لڑکی اور لڑکے کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ اپنی کار واپس لینا چاہتے تھے جسے ان دونوں نے تفریحاً چرایا تھا اور سیر سپاٹے کے بعد ویک برج کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ ویک برج البانے سے کچھ دور شمال مشرق میں ایک تفریح گاہ تھی کیونکہ یہ ایک دریا کے ساتھ ساتھ اور برج کے تقریباً نیچے تھی اس لیے یہ علاقہ ویک برج کہلاتا تھا۔ لڑکی انیس بیس برس کی تھی اور لڑکا بھی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مجھے ان دونوں پر ترس آنے لگا۔ لمبے آدمی نے لڑکے سے کہا۔ "میں تمہیں سوچنے کے لیے ایک گھنٹا دیتا ہوں، اس کے بعد ہم کیا کریں گے، یہ تم دیکھ لوگے۔"

اتنے میں گنجے نے لمبے آدمی کو اشارہ کیا اور وہ دونوں کھڑکی کی طرف آئے۔ یہ کچن کے سنک کے سامنے لگی کھڑکی تھی۔ گنجے نے سنک کا نل کھول دیا اور پانی زور و شور سے گرنے لگا اور پھر وہ رازداری سے آپس میں بات کرنے لگے۔ بڑی مشکل سے میں صرف چند لفظ سن سکا تھا ایک سرخ کار، دوسرا دو ملین ڈالرز اور تیسرا ویک برج تھا۔ یہ اگرچہ خاصے مبہم سے الفاظ تھے لیکن ان سے میرے ذہن میں ایک تصویر بن رہی تھی۔ جب وہ نل بند کر کے وہاں سے ہٹے تو میں نے وائر کیمرا اور آلۂ سماعت واپس بیگ میں رکھا اور کیبن کے سامنے کھڑی وین تک آیا۔ اس طرف لاؤنج کی کھڑکی پر پردہ تھا اس لیے اندر سے اس وقت تک کوئی مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا جب تک وہ پردہ ہٹا کر نہ جھانکتا۔ میں نے

وین کا بونٹ اٹھایا اور اس کے اندر والے حصے میں بیٹری سے نکلنے والا ایک تار الگ کر دیا۔ اب جب تک کوئی اسے خاص طور سے چیک نہ کرتا اسے تار کی علیحدگی کا پتا نہ چلتا۔ میں نے الگ کیا جانے والا تار لپیٹ کر بیگ میں رکھ لیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اب وہ فوری طور پر یہاں سے نہیں نکل سکتے تھے۔ انہیں دو کلومیٹرز دور ہائی وے تک جانا پڑتا اور پھر وہاں سے لفٹ لینا پڑتی۔

مجھے اپنی گاڑی تک پہنچنے میں دس منٹ لگے تھے اور میں ہائی وے پر آ کر البانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ویک برج تک پہنچنے میں مشکل سے بیس منٹ لگے تھے۔ دریائے البانے کے دائیں طرف کا علاقہ تفریح گاہوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں لائن سے کئی نائٹ کلب، بارز اور قحبہ خانے تھے۔ ظاہر ہے عیاش لوگ یہاں کا رخ کرتے تھے۔ ان تمام تفریح گاہوں کی پارکنگ ایک ہی تھی اور یہ خاصے بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں پارکنگ انتظامیہ کے دفتر تک آیا اور وہاں موجود آدمی کو ایک کارڈ دکھایا جس کے مطابق میں ایف بی آئی کا ایجنٹ تھا۔ ظاہر ہے کارڈ جعلی تھا لیکن کوئی اسے جعلی قرار نہیں دے سکتا تھا۔ بہ وقتِ ضرورت کام کے لیے ایسی کئی چیزیں میرے پاس ہوتی تھیں۔ بس قباحت یہ تھی کہ میں اکیلا تھا اور ایف بی آئی ایجنٹ ہمیشہ جوڑے کی صورت میں کام کرتے ہیں اگر وہ آدمی ہوشیار ہوتا تو مجھ سے میرے ساتھی کے بارے میں پوچھ سکتا تھا اگرچہ میرے پاس اس کا بھی جواب تھا لیکن وہ آدمی سادہ نکلا، اس نے مستعدی سے کہا۔

''یس آفیسر میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''مجھے پارکنگ کیمروں سے کچھ اسنیپ درکار ہیں۔''

اس نے دروازہ کھول کر مجھے اندر بلا لیا۔ یہ پارکنگ کے ساتھ سیکیورٹی سینٹر بھی تھا اور وہاں کیمروں پر ایک موٹا سا سیکیورٹی گارڈ موجود تھا اس نے میرے بارے میں سن کر برا سا منہ بنایا لیکن کیمروں کی ریکارڈنگ دکھانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں نے اس سے داخلی حصے پر مرکوز کیمرے کی ریکارڈنگ دکھانے کا مطالبہ کیا۔ اس نے وقت پوچھا۔ میں نے اندازاً دوپہر تین بجے کا وقت بتایا۔ اس نے تین بجے سے اس کیمرے کی ریکارڈنگ پلے کرنا شروع کر دی۔ کیمرا ایک فریم فی سیکنڈ کے حساب سے مووی بنا رہا تھا لیکن یہ بہت ہائی میگا پکسل کیمرا تھا۔ اس لیے ہر فریم بہت واضح تھا۔ سرخ کار پانچ بج کر ستائیس منٹ پر فریم میں آئی۔ میں نے اسے اسٹل کرا دیا اور پھر زوم کر کے دیکھا۔ کار میں

لڑکا اور لڑکی موجود تھے۔ پہلی بار میں نے لڑکے کی صورت دیکھی، وہ بھی اچھا خاصا دلکش تھا۔ مگر ان مجرموں نے یقیناً اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ دوسرے کیمروں کی ریکارڈنگ سے واضح تھا کہ انہوں نے کار پارکنگ کے ایک کونے میں کھڑی کر دی تھی۔ اس کے بعد وہ تفریح گاہ کی طرف چلے گئے۔ تقریباً بیس منٹ بعد سرخ کار پارکنگ سے باہر جاتی دکھائی دی۔ میں نے تمام کیمروں سے چیک کیا اور ایک کیمرے میں کار چلانے والی کی مبہم سی صورت دکھائی دی تھی۔ مگر وہ واضح نہیں تھا البتہ یہ بات یقینی تھی کہ کار لڑکا یا لڑکی لے کر نہیں گئے تھے۔ میں نے گارڈ سے کہا۔

''یہ ریکارڈنگ یو ایس بی میں کر کے دے دو۔''

''ہمیں اس کی اجازت نہیں ہے۔''

''مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے غرا کر کہا۔ ''میں یہ سب سامان لے جا سکتا ہوں بس مجھے ایک کال کرنا پڑے گی۔''

''چیف آفیسر کی فرمائش پوری کر دو۔'' دوسرے آدمی نے گارڈ کو سمجھایا تو اس نے بادلِ ناخواستہ ریکارڈنگ یو ایس بی میں کر دی۔

''اب ایک سوال اور ہے کسی اور نے بھی تم لوگوں سے سرخ کار کے بارے میں پوچھا تھا؟''

ان کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔ ''نہیں آفیسر...'' گارڈ نے کہنا چاہا۔

''جھوٹ مت بولو۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''میں ان کی تعداد اور حلیے بھی بتا سکتا ہوں۔ مجھے سچ سچ بتا دو تم لوگوں پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

''وہ ایوری اور اس کے ساتھی تھے۔'' دوسرے آدمی نے مردہ لہجے میں کہا۔

''تم نے ان کو بھی یہ سب دکھایا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اب میں سمجھ گیا کہ مجرم ان دونوں کے ساتھ اتنا نرم سلوک کیوں کر رہے تھے انہیں یقین نہیں تھا کہ کار لے جانے میں ان کا ہاتھ تھا مگر وہ انہیں چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ جب تک ان کا شک مکمل طور پر رفع نہ ہو جاتا۔ مگر ایوری اور اس کے ساتھی اتنے اچھے نہیں تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لڑکی اور لڑکے کو مار دیں گے۔ کیونکہ ان کی نیت لڑکی پر خراب ہو رہی تھی۔ خاص طور سے گنجا خبیث فطرت تھا۔ فی الحال وہ غائب کار کی وجہ سے مجبور تھے۔ میں پارکنگ سے ایک بار میں آیا۔ شام کے وقت وہاں اچھا خاصا رش تھا۔ میں نے بارٹینڈر کے پاس ایک اسٹول سنبھالا اور

اسے بیئر کا کہا۔ اس نے گلاس بھر کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے دس ڈالرز کا ایک نوٹ نکالا اور کاؤنٹر پر رکھا مگر آگے نہیں کیا۔ اس کے بجائے میں خود آگے جھکا اور آہستہ سے بولا۔ ''مجھے ایوری سے ملنا ہے؟''

''کیوں؟'' اس نے انکار نہیں کیا۔

''بزنس ہے۔''

اس نے سوچا اور کاؤنٹر صاف کرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور ایک چھوٹی سی چٹ میری انگلیوں میں دبا دی۔ ''اس نمبر پر کال کر لینا مگر میرا حوالہ مت دینا۔''

میں نے نوٹ چھوڑ دیا اور گلاس ختم کرنے لگا۔ اس دوران میں میری نظریں بارٹینڈر پر مرکوز تھیں لیکن اس نے نہ تو کوئی سرگرمی دکھائی اور نہ کسی کو اشارہ کیا۔ میں باہر آیا اور چٹ پر لکھا نمبر دیکھا یہ کسی فکسڈ فون کا تھا، میں نے وہیں ایک بوتھ سے نمبر ملایا۔ دوسری طرف کسی عورت نے کال ریسیو کی۔ میں نے ایوری کے بارے میں پوچھا تو اس عورت نے ناقابلِ بیان الفاظ میں اس کا نہایت واہیات پتا بتایا کہ وہ کہاں مل سکتا تھا۔ میں نے نرمی سے کہا۔ ''پلیز مجھے اس سے فوری کونٹیکٹ کرنا ہے اس لیے اس کا نمبر دے دو۔''

اس بار عورت نے کوئی فضول بات نہیں کی اور ایک سیل فون نمبر دے کر دھڑ سے فون بند کر دیا۔ میں نے یہ نمبر ملایا۔ چند لمحے بعد ایوری نے کال ریسیو کی۔ ''یس؟''

''ایوری...'' میں نے تصدیق چاہی۔

''بات کر رہا ہوں۔''

''تمہارے پاس ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہیں؟''

''تم کیسے جانتے ہو؟''

''میری بات غور سے سنو، انہیں کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری صورت میں معاملہ پولیس تک پہنچ جائے گا۔ میرے پاس کچھ تصویریں اور تم لوگوں کی آواز کی ریکارڈنگ بھی ہے۔ اسی کیبن میں جہاں تم موجود ہو۔''

وہ ایک لمحے کو چپ ہوا پھر اس نے پوچھا۔ ''تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے؟''

میں نے اسے عقبی کھڑکی سے دیکھے اور سنے مناظر بتائے اور کہا۔ ''تمہارا کوئی ساتھی جا کر وین اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرے، وین اسٹارٹ نہیں ہوگی۔''

ایوری نے فوراً کسی کو وین چیک کرنے کا حکم دیا۔ ایک منٹ بعد اس نے رپورٹ دی کہ وین اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے۔ میں نے کہا۔ ''اب تمہیں یقین آ گیا ہوگا؟''

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''فی الحال میں چاہتا ہوں تم معاملے کو جوں کا توں رکھو۔ لڑکی اور لڑکے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری صورت میں تم کسی ممکنہ فائدے سے محروم ہو جاؤ گے اور کسی بڑے نقصان سے دوچار ہو گے۔''

''لڑکی اور لڑکے کو کچھ نہیں ہوگا۔'' ایوری نے نرم لہجے میں کہا۔

''میری لڑکی سے بات کراؤ۔''

ایوری نے موبائل لڑکی کو دیا اور اس نے سہمے انداز میں کہا۔ ''ہیلو۔''

''تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں، تم کون ہو؟''

''تمہارا ایک ہمدرد۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تم اس مشکل سے نکلنا چاہتی ہو تو میرے کچھ سوالوں کا جواب دو۔''

''پوچھو۔''

''تم اور تمہارا بوائے فرینڈ ویک برج کی پارکنگ میں کار چھوڑ کر کہاں گئے تھے؟''

''بیلی اون میں۔'' لڑکی نے ایک نائٹ کلب کا نام لیا۔

''وہاں کتنی دیر رہے؟''

''ڈیڑھ گھنٹا۔''

''ان لوگوں کے ہتھے کیسے چڑھے؟''

''باہر نکلتے ہی۔''

''اس دوران میں تم لوگوں نے کسی کو اپنے ایڈونچر کے بارے میں بتایا؟''

''نہیں ہم آپس میں بات کر رہے تھے۔'' لڑکی روہانسی ہو گئی۔ ''میں نے شان کو منع بھی کیا تھا۔''

ایوری نے موبائل واپس لے لیا اور مجھ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے۔ تمہاری تسلی ہو گئی ہے۔''

''تم فکر مت کرو، میں اتفاق سے اس معاملے میں ملوث ہوا ہوں اور میری کوشش ہے کہ تمہاری چیز تم کو مل جائے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے تم تشدد سے گریز کرو۔''

''فکر مت کرو ہم ان کو اب ہاتھ بھی نہیں لگا رہے ہیں۔'' اس نے کہا تو مجھے اس کے انداز سے شرارت کی بو محسوس ہوئی۔

''اسی میں تمہاری عافیت ہے معاملہ دو ملین ڈالرز کا ہے۔'' میں نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا اور فون رکھ

دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پارکنگ سے کار کون لے کر گیا تھا۔ جب تک اس شخص کی شناخت سامنے نہیں آتی گاڑی آگے نہیں چل سکتی تھی۔ میں سوچتا رہا اور پھر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں نے ایوری سے مہلت حاصل کر لی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کم سے کم آج رات لڑکا اور لڑکی محفوظ رہیں گے۔ البانے کے پرانے علاقے میں جوگ رہتا تھا، اس کا پورا نام جوگ ویڈ تھا۔ میں نے اس کے اپارٹمنٹ پر دستک دی اس کے بجائے ایک لڑکی نے دروازہ کھولا اور اس نے اپنی ستر پوشی کے لیے محض ایک تکیہ آگے کیا ہوا تھا۔ اس کا حلیہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ میں بہت غلط وقت پر آیا تھا۔ اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''سوری میں مخل ہوا۔'' میں نے معذرت کی۔ ''لیکن مجھے جوگ سے بہت ضروری کام ہے۔''

''جوگ اس وقت نہیں آسکتا۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

اسی لمحے جوگ نے اندر سے چلا کر پوچھا۔ ''فیرا کون ہے؟''

''میں ہوں ڈینیل۔'' میں نے جواباً چلا کر مطلع کیا۔

اس بار جوگ دوسرے تکیے کے ساتھ رونما ہوا اور مجھے اندر لاؤنج میں لے آیا اس پر فیرا نے بائیکاٹ کیا اور دھڑ سے بیڈ روم کا دروازہ بند کر لیا۔ جوگ نے معذرت کی اور اس پیچھے اندر گیا کچھ دیر بعد وہ انسانیت کے جامے یعنی ایک شارٹ میں ملبوس باہر آیا۔ اس نے ایک بار پھر سوری کی اور فریج سے میرے لیے کولڈ ڈرنک نکال لایا۔ ''کوئی بات نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''میں خاتون کے جذبات سمجھ سکتا ہوں لیکن معاملہ ایمرجنسی کا ہے۔''

''کوئی کام؟'' اس نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں۔'' میں نے یو ایس بی دکھائی۔ ''اس میں ایک ویڈیو ریکارڈنگ ہے سی سی ٹی وی کیمرے کی۔ اس میں آدمی کی صورت واضح کرنی ہے۔''

جوگ نے اپنے لیے بیئر کا ٹن نکالا اور کمپیوٹر پر آ گیا اس نے ریکارڈنگ کمپیوٹر میں ڈالی اور اسے چلا کر دیکھنے لگا۔ وہ کچھ خاص سافٹ ویئر استعمال کر رہا تھا۔ میں اکثر اس سے کام لیتا رہتا تھا۔ اس لیے اس نے انتہائی مصروف وقت بھی مجھے بلا لیا اور اپنی گرل فرینڈ کی ناراضگی کی بھی پروا نہیں کی۔ جب میں نے اس کا ذکر کیا تو اس نے دانت نکال کر کہا۔ ''جب میں تمہاری دی فیس سے اسے شاپنگ کراؤں گا تو اس کی ناراضگی خود دور ہو جائے گی۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' میں نے اس سے اتفاق کیا۔ ''لیکن پہلے تم تصویر واضح کرو۔''

''یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔'' جوگ نے کہا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ اس نے ریکارڈنگ سے وہ حصہ الگ کیا جس میں کار لے جانے والا شخص نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ اسے واضح کرنے میں لگ گیا۔ اس کے لیے واقعی کوئی مسئلہ نہیں تھا تبھی میں اس قسم کے کام اسی سے کراتا تھا۔ وہ معاوضہ اچھا خاصا لیتا تھا لیکن کام بھی بہترین کر کے دیتا تھا۔ مشکل سے نصف گھنٹے میں اس نے کار ڈرائیو کرنے والے شخص کی تصویر نمایاں کر دی اور اسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا جیسے میں نے اسے پہلے کہیں دیکھا تھا۔ جوگ نے صرف تصویر واضح نہیں کی بلکہ اس نے تصویر الگ کر کے اسے فریم کر کے بھی دکھایا اور یہ سامنے کا پوز تھا جو کہیں زیادہ بہتر تھا۔ پھر اس نے اسے پرنٹ کر کے دیا۔ میں نے خوش ہو کر اسے دو سو ڈالرز دیے جو اس نے فوراً جیب میں رکھ لیے۔ ''میرا خیال ہے تمہارا کام ہو گیا؟''

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا اور اس کے اپارٹمنٹ سے رخصت ہو گیا۔ میرا رخ ایک بار پھر ویک برج کی طرف تھا۔ راستے میں ایک فوٹو شاپ سے میں نے تصویر کی مزید کچھ کاپیاں سائز چھوٹا کر کے کرائیں۔ ویک برج پر میں نے ایک اور بار کا رخ کیا۔ یہاں بارٹینڈر کے بجائے میں نے ایک ویٹرس سے مدد لی۔ میرے بیٹھتے ہی وہ نازل ہو گئی میں نے ایک وھسکی کا آرڈر کیا اور جب وہ وھسکی لے کر آئی تو میں نے بیس ڈالرز کے نوٹ کے ساتھ تصویر بھی میز پر رکھ دی۔ ''اگر تم اسے جانتی ہو تو یہ نوٹ تمہارا ہو سکتا ہے۔''

''میں نہیں جانتی۔'' اس نے انکار کیا تو میں نے ایک نوٹ کا اضافہ کر دیا۔ اس بار وہ ہچکچائی اور اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''یہ خطرناک ہے، میں کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتی۔''

''کوئی مشکل نہیں ہو گی۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔ ''کسی موقع پر تمہارا نام نہیں لیا جائے گا۔''

''یہ ہیک ہے میگ کا بھائی۔''

''میگ کون ہے؟''

''ایوری کے ساتھ ہوتا ہے، گنجا ہے۔''

اب میں سمجھ گیا کہ مجھے ہیک کیوں جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ وہ ایوری کے ساتھ گنجے کا بھائی تھا۔ دونوں کی صورتیں بہت مشابہ تھیں فرق صرف بالوں کا تھا۔ ہیک کے سر پر گھنے بال تھے۔ میں نے دونوں نوٹ آزاد کر دیے اور وہ ویٹرس کے لباس میں غائب ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے ایک

سو ڈالرز کا نوٹ نکال کر میز پر رکھا۔ وہ جاتے جاتے رک گئی اور اس نے حریص نظروں سے نوٹ کی جانب دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ''اب کیا ہے؟''

''ہیک کہاں ملے گا؟''

وہ پھر ہچکچائی اور اس کی ہچکچاہٹ دور کرنے کے لیے مجھے ایک نوٹ اور رکھنا پڑا۔ اگر وہ اداکاری بھی کر رہی تھی اور اس طرح کما رہی تھی تب بھی میں دینے پر مجبور تھا۔ دوسرا نوٹ دیکھ کر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''لیگ اِن چلے جاؤ۔ اس وقت وہ وہیں ملے گا۔''

لیگ ان اسی سڑک پر ایک نائٹ کلب تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ خاصا واہیات قسم کا کلب تھا۔ وہاں داخلہ محدود اور مشروط تھا اس لیے اندر جانے والوں سے زیادہ مشتاق کا ہجوم تھا۔ ان میں ستر فیصد تعداد لڑکیوں اور عورتوں کی تھی جو منتظر تھیں کہ کوئی انہیں اندر لے جائے۔ میں اندر جا سکتا تھا لیکن میں نے باہر انتظار کو ترجیح دی۔ اندر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لیے بہتر تھا اپنی گاڑی میں بیٹھا رہتا۔ سڑک کے پار گاڑی کھڑی کر کے میں نے سیٹ پیچھے کر لی اور نیم دراز ہو گیا۔ یہاں تاریکی تھی اس لیے امید تھی کہ دور سے کوئی اندازہ نہیں کر پاتا کہ گاڑی میں کوئی ہے یا نہیں۔ یہ خاصا صبر آزما انتظار تھا لیکن میں اس کا عادی تھا۔ تقریباً ایک بجے ہیک اندر سے نمودار ہوا۔ وہ نشے میں تھا کیونکہ اس سے سیدھا کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگائی اور دھواں چھوڑتا ہوا ایک گلی کی طرف بڑھا میں نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔

گلی میں اس کی کار کھڑی تھی۔ اس نے بہ مشکل کار باہر نکالی۔ یہ سرخ کار نہیں تھی۔ وہ روانہ ہوا تو میں بہت احتیاط سے اس کا پیچھا کرنے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے کار ویسٹ اینڈ کے ایک صنعتی علاقے میں روکی۔ وہ جس گلی میں رکا تھا وہاں لائن سے گودام تھے۔ میں گلی کے سرے پر رک گیا۔ ہیک کی کار ایک گودام کے سامنے رکی تھی۔ وہ کار سے اترا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا گودام کے چھوٹے دروازے سے اندر چلا گیا۔ اس وقت وہ پوری طرح چست تھا۔ شاید اس نے نشہ ختم کرنے والی کوئی دوا لی تھی۔ دس منٹ بعد وہ اندر سے دو بڑے اور خاصے بھاری بیگ اٹھائے نمودار ہوا۔ اس نے بیگ اپنی کار کی ڈکی میں رکھے اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں پھر اس کے پیچھے تھا۔ اس بار وہ رہائشی علاقے میں ایک گھر کے سامنے رکا اور اس کا گیراج کھول کر گاڑی اندر لے گیا۔ گاڑی کے اندر جاتے ہی گیراج کا دروازہ خود بہ خود بند ہو گیا۔ میں نے اپنی گاڑی گلی کے کونے پر روک لی تھی اور خود پیدل اتر کر اس گھر تک آیا۔ یہ دو منزلہ ڈچ ہاؤس تھا۔

سامنے سے داخلے کا راستہ نہیں تھا اس لیے میں عقبی حصے کی طرف آیا۔ پہلے وائر کیمرے کی مدد سے کھڑکیوں سے اندر کا جائزہ لیا پھر کچن میں کھلنے والے دروازے پر طبع آزمائی کی۔ یہ اندر سے لاک تھا مگر دھات کی ایک لچکیلی پتری نے لاک ہٹا دیا اور دروازہ کھل گیا۔ میں آہستگی سے اندر آیا۔ کچن تاریک اور خاموش تھا۔ ہیک نیچے نہیں تھا۔ لاؤنج کے ساتھ ہی سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ میں اوپر آیا تو ایک بیڈ روم سے شاور کی آواز آ رہی تھی۔ ہیک غسل کر رہا تھا۔ میں مطمئن

توکل

یمن کے کچھ لوگ حضرت عمرؓ فاروق کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا، تمہارا کیا کیا پیشہ ہے؟ انہوں نے کہا ہم کوئی کام نہیں کرتے، توکل پر گزارہ ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے جواب دیا۔ ''یوں کیوں نہیں کہتے کہ مفت خورے ہیں، اپنا بوجھ دوسرں پر ڈالتے ہیں، کماتے اور ہیں اور کھاتے ہم ہیں افسوس! ایسے نکمے اور ناکارہ لوگ اپنے آپ کو متوکل کہیں۔ سنو! تم کسی تعریف کے مستحق نہیں۔ توکل کرنا دہقان سے سیکھو جو ہل جوتتا، دانہ ڈالتا اور کھیت کو پانی دیتا ہے اور پھر اس قدر محنت و مشقت کے بعد اللہ پر توکل رکھتا ہے کہ خدا اس کی محنت کا پھل دے یا توکل پیشہ وہ سوداگر ہے جو لاکھوں کا مال کشتی میں ڈال کر اسے موج خیز دریا کے سپرد کر دیتا ہے تاکہ مالِ تجارتِ دوسرے شہر میں پہنچ کر بکے اور اسے نفع حاصل ہو۔

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، آپؐ نے فرمایا۔ ''سواری کہاں چھوڑ آئے ہو؟'' کہا۔ ''اونٹ بٹھا آیا ہوں۔'' آپؐ نے دریافت فرمایا۔ ''اس کا زانو باندھ آئے ہو؟'' جواب دیا۔ ''حضورؐ! میں اسے توکل پر کھلا چھوڑ آیا ہوں۔'' حضورؐ نے فرمایا۔ ''اونٹ کا پہلے زانو باندھو پھر توکل کرو۔''

حکایات مثنوی مولانا رومؒ

(مرسلہ: محمد یوسف سولنگی)

ہو کر نیچے آیا۔ گاڑی گیراج میں کھڑی تھی۔ اس کی ڈکی میں دونوں بیگ موجود تھے۔ میں نے باری باری دونوں کو کھول کر دیکھا، دونوں میں سو ڈالرز والے نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ یہ وہی دو ملین ڈالرز کی رقم تھی جس کا ذکر ایوری اور میگ نے کیا تھا۔ ساری گڈیاں بالکل نئے نوٹوں پر مشتمل تھیں۔ مگر ان کے ساتھ بینک سیل نہیں تھی۔ اگر یہ کسی بینک سے چرائی گئی تھیں تو ان پر بینک سیل ہونا لازمی تھی۔ پھر میری یادداشت میں حالیہ دنوں میں ایسی کوئی واردات نہیں تھی جس میں کسی بینک سے اتنی بڑی رقم چرائی گئی ہو۔

ہیک بدستور واش روم میں تھا۔ میں نے گھر میں گھوم پھر کر کچھ کام کیا اور پھر گاڑی میں موجود ریموٹ کی مدد سے گیراج کا دروازہ کھولا اور دونوں بیگ باہر نکالے اور پھر گیراج کا دروازہ بند کر دیا۔ دونوں بیگ اسی جگہ چھوڑ کر میں گاڑی لایا اور بیگ اس میں رکھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ ہیک کو خاصی دیر تک بیگز کی گمشدگی کا پتا نہیں چلے گا۔ میں واپس اسی گودام پہنچا جہاں سے ہیک نے یہ بیگ نکالے تھے۔ میری توقع کے عین مطابق وہاں سرخ کار موجود تھی۔ میں نے کار وہاں سے نکالی اور اپنی کار کے پاس لا کر دونوں بیگ اس میں واپس رکھے۔ مجھے سرخ کار تار جوڑ کو اسٹارٹ کرنا پڑی تھی۔ کار میں نے ایک جگہ چھوڑی اور وہاں سے واپسی میں مجھے خاصا وقت لگ گیا۔ جب میں فارغ ہوا تو صبح قریب تھی۔ گھر جانے سے پہلے میں نے ایک فون بوتھ سے ایوری کو کال کی۔ ”مجھے امید ہے سب جوں کا توں ہوگا۔“

”بالکل، سب پہلے جیسا ہے۔“

”تب میری لڑکے سے بات کراؤ۔“

”سنو مسٹر ان لوگوں سے تمہارا کیا تعلق ہے۔ تم ان کی فکر مت کرو۔“ ایوری نے سرد لہجے میں کہا۔

”ان لوگوں سے تمہارا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔“ میں نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن تم نے انہیں بلاوجہ پکڑ رکھا ہے۔“

”میری کار انہوں نے چرائی تھی۔“ اس نے یاد دلایا۔

”صرف تفریح کے لیے۔ لیکن جس نے ویک برج کی پارکنگ سے کار نکالی، اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی ڈکی میں کیا ہے۔“

ایوری ذرا دیر کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے پوچھا۔ ”تم اسے جانتے ہو؟“

”ہاں وہ تمہارے اندر کے لوگوں میں سے ہے لیکن اب سرخ کار اس کے پاس بھی نہیں ہے۔“

”پھر کس کے پاس ہے؟“

”میرے پاس۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ گھر آ کر میں لمبی تان کر سو گیا۔ مجھے اطمینان تھا کہ ایوری فی الحال لڑکی اور لڑکے کو کچھ نہیں کہے گا۔ سارا چکر سرخ کار اور اس میں موجود رقم کا تھا۔ اگلے دن میں دیر تک سوتا رہا۔ شام کو اٹھ کر اپنے لیے کافی اور سینڈوچ تیار کیے۔ اس دوران میں غور کرتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرے پاس دو ملین ڈالرز تھے لیکن ان دو ملین ڈالرز سے دو انسانوں کی زندگی منسلک تھی۔ میرے لیے مشکل نہیں تھا کہ میں ان کو بھول جاؤں اور یہ دو ملین ڈالرز ہضم کر لوں لیکن میرا ضمیر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ دوسرے یہ معاملہ مجھے مشکوک لگ رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ایک بار پھر سرخ کار میں موجود رقم کا معائنہ کروں۔ سورج غروب ہوتے ہی میں گھر سے روانہ ہوا اور سرخ کار والی جگہ پہنچا۔ ڈکی کھول کر بیگوں میں موجود رقم کا معائنہ کیا۔ جلد میں نے وہ چیز دیکھ لی جو شاید میرے لاشعور میں تھی اور میں حقیقت جان گیا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ بہت غور کرنے کے بعد میں نے ایک منصوبہ سوچ لیا۔ ایک فون بوتھ سے ایوری کو کال کی۔ میں نے پوچھا۔

”کیا تم دو ملین ڈالرز کی رقم واپس چاہتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔“ اس نے بے تابی سے کہا۔

”تب تمہیں ان دونوں کو چھوڑنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے ایک ہاتھ سے رقم دو اور دوسرے ہاتھ سے ان کو لے جاؤ۔“ اس نے عیاری سے کہا۔

”نہیں تبادلہ اس طرح نہیں ہوگا۔“ میں نے جوابی چالاکی سے کام لیا۔ ”میں تم لوگوں کے سامنے نہیں آنا چاہتا اس لیے تبادلہ سامنے آئے بغیر ہوگا۔“

”وہ کیسے؟“

”وہ ایسے کہ تم ان دونوں کو چھوڑ دو۔ میں اطمینان کر لوں گا کہ تم نے انہیں چھوڑ دیا ہے تو میں تمہیں اس جگہ کا پتا بتا دوں گا جہاں سرخ کار معہ رقم کے موجود ہے۔“

”اس کی کیا گارنٹی ہے؟“

”کس بات کی؟“

”یہی کہ رقم اور کار تمہارے پاس ہے؟“

”اس کا ثبوت تمہیں میگ کا بھائی ہیک دے گا۔ اگر تم اس کے گھر پہنچ جاؤ اور گیراج میں اس کی کار کی ڈکی

دیکھنے پر اصرار کرو تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ رقم اس کی کار کی ڈکی میں نہیں ہے لیکن وہ یہی سمجھ رہا ہے کہ رقم وہاں ہے۔“

”تم مجھے ایک گھنٹے بعد کال کرو۔“ اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں مسکرایا۔ اب کھیل شروع ہوا تھا۔ میں نے کار کا رخ ہیک کے گھر کی طرف کر دیا۔ میں نے وہاں ایک مناسب جگہ کار پارک کر دی۔ اس کے فوراً بعد ایوری اینڈ پارٹی وہاں پہنچ گئی تھی۔ ایک فرد کا مزید اضافہ ہو گیا تھا لیکن پستہ قد ساتھ نہیں تھا۔ شاید اسے لڑکی اور لڑکے کی نگرانی کے لیے پیچھے چھوڑا گیا تھا۔ گنجا میگ ساتھ تھا لیکن اس کی حیثیت بدل گئی تھی۔ ایوری اور اس کے دونوں ساتھی اسے آگے رکھ کر ہیک کے مکان کی طرف بڑھے۔ ان کے آتے ہی میں نے کیمرا سنبھال لیا۔ اندر جانے کے لیے انہوں نے بھی عقبی راستہ اختیار کیا تھا۔ مجھے بھی یہی امید تھی۔ تقریباً دس منٹ بعد مکان کے اندر سے فائروں کی آوازیں آئیں اور اس کے فوراً بعد ایوری اور اس کے دونوں ساتھی نمودار ہوئے۔ میرا زوم لینس کیمرا مسلسل ان کی بہترین تصاویر بنا رہا تھا۔ وہ عجلت میں اپنی کار میں بیٹھے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی میں کار سے اترا اور ہیک کے مکان کی طرف بڑھا۔ فائروں کی آواز پر ابھی تک کسی طرف سے ردعمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ وہ جاتے ہوئے سامنے کا دروازہ کھلا چھوڑ گئے تھے۔ ہیک کی لاش گیراج میں تھی جب کہ میگ کو لاؤنج میں شوٹ کیا گیا تھا۔ میں نے اپنا کام کیا اور وہاں سے نکل آیا۔ کچھ دیر میں وہاں پولیس کی آمد یقینی تھی۔

ایک گھنٹا ہو گیا تھا اس لیے میں نے ایوری کو ایک فون بوتھ سے کال کی۔ وہ بھی منتظر تھا۔ اس نے فوری کال ریسیو کی۔ ”اوکے رقم تمہارے پاس ہے لیکن جب تک رقم نہیں مل جاتی ہم انہیں نہیں چھوڑ سکتے۔“

”تب تم شوق سے انہیں رکھو۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”مجھے ان سے صرف ہمدردی ہے لیکن ان کی ہمدردی میں میں اپنی گردن نہیں کٹا سکتا۔ اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں تمہارے سامنے آ جاؤں گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔ تم بھی دو ملین ڈالرز بھول جاؤ۔“

”نہیں رکو۔“ اس نے اضطراب سے کہا۔ ”یہ بہت مشکل ہے۔“

”بالکل مشکل نہیں ہے۔ اگر تم اپنی پوزیشن پر غور کرو۔ دو ملین ڈالرز میرے قبضے میں ہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم نے لڑکی اور لڑکے کو کہاں رکھا ہے اگر ان کو کہیں اور منتقل کیا ہے تب بھی میرے پاس تصویروں، ویڈیو اور آواز کی صورت میں ثبوت ہیں وہ پولیس کو دینے کی دیر ہے کہ تمہاری تلاش شروع ہو جائے گی۔ ان کا ذرا سا نقصان خود تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“

اس بار ایوری نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”ٹھیک ہے میں ان دونوں کو چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔“

”تم انہیں ویک برج کے پاس چھوڑو گے۔ جب وہ بہ حفاظت وہاں سے روانہ ہو جائیں گے تب میں تم سے بات کروں گا۔“

ایوری مجبور تھا ورنہ اتنی آسانی سے میری بات نہ مانتا۔ اس سے بات کرتے ہی میں ویک برج کی طرف روانہ ہو گیا لیکن وہاں کار میں بیٹھے رہنے کے بجائے میں نے ایک بار کا انتخاب کیا جہاں سے پارکنگ کا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ ایوری اور اس کے ساتھی یقیناً میری تاک میں ہوتے اور اگر میں کار میں رہتا تو وہ مجھے تاڑ سکتے تھے۔ البتہ یہاں بار میں، میں محفوظ تھا۔ ایک گھنٹے بعد پارکنگ میں وین آ کر رکی۔ ان لوگوں نے متبادل تار کا بندوبست کر لیا تھا۔ اس سے ایوری اور اس کے ساتھیوں نے لڑکی اور لڑکے کو اتارا۔ وہ ابھی تک خوفزدہ تھے۔ ایوری نے ان سے کچھ کہا۔ وہ وہاں سے چلے گئے۔ ایوری اور اس کے دونوں ساتھی وہاں موجود رہے تھے۔ میں بار کے دروازے تک آیا اور وہاں سے دیکھا۔ لڑکا اور لڑکی ہائی وے کی طرف جا رہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا اور اس میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ ایک مسئلہ تو حل ہوا تھا۔ ایوری اور اس کے ساتھی منتظر تھے کہ میں ان سے رابطہ کروں لیکن فی الحال میرا ان سے رابطے کا موڈ نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد میں وہاں سے روانہ ہوا اور اپنے اپارٹمنٹ پہنچ کر میں نے پہلے ٹی وی لگا کر دیکھا حسب توقع اس میں لڑکے شان اور لڑکی میگی کی واپسی کی خبر تھی۔ پولیس کے مطابق انہیں نامعلوم افراد نے اغوا کیا تھا اور پھر چھوڑ دیا۔ شان کو کچھ زخم آئے تھے لیکن میگی محفوظ تھی۔ یہ خبر دیکھنے کے بعد میں نے اپنی کھینچی تصویروں اور ویڈیوز پر کام کیا۔ دو گھنٹے کی محنت کے بعد میں خاصا مواد تیار کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد مجھے لگا کہ شاید زندگی میں پہلی بار مجھے میری محنت کا درست صلہ ملے گا اور میں صحیح معنوں میں بلیک میلر کہلاؤں گا۔ کام کر کے میں مزے سے لمبی تان کر سو گیا۔ اگلی صبح بھی مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں جانتا تھا ایوری اور اس کے ساتھی رقم کے لیے تڑپ رہے ہوں گے لیکن

میرے پاس ان کے لیے مزید سرپرائز تیار تھے۔ مجھے امید تھی کہ انہیں سرپرائز پسند آئے گا۔ دوپہر لنچ کے بعد میں گھر سے نکلا اور اس جگہ پہنچا جہاں میں نے سرخ کار چھپائی تھی۔ وہاں میں نے کار میں کچھ چیزیں رکھیں اور رقم والے بیگز نکال کر اپنی کار کی ڈکی میں رکھے اور دوبارہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد ایک فون بوتھ سے ایوری کا نمبر ملایا وہ شاید موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا ابھی بیل بھی نہیں گئی تھی کہ اس نے کال ریسیو کر لی۔

''یس؟''

''ایوری میں بات کر رہا ہوں۔''

''تم دھوکے باز۔'' وہ غرایا۔ ''تم نے کہا تھا کہ میری رقم دے دو گے لیکن تم غائب ہو گئے۔ میں سچ کہتا ہوں اگر تم میرے ہاتھ آ گئے تو میں تمہیں...''

''نمونۂ عبرت بنا دو گے۔'' میں نے اس کی بات مکمل کی۔ ''میں غائب نہیں ہوا تھا بلکہ ذرا مصروف تھا۔ بہرحال وقت آ گیا ہے کہ تمہاری امانت تمہیں لوٹا دی جائے اس سے پہلے میں شان اور میگی کو چھوڑنے پر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

''اگر تم رابطے میں کچھ اور دیر کرتے تو میں انہیں دوبارہ اٹھا لیتا۔''

''یہ تمہاری زندگی کی آخری غلطی بھی ہو سکتی تھی بہرحال تم اس سے بچ گئے۔ اب غور سے سنو۔'' میں نے کہا اور اسے بتایا کہ سرخ کار کہاں کھڑی تھی۔ ''اس کی ڈکی میں دو ملین ڈالرز کی رقم موجود نہیں ہے لیکن تمہاری دلچسپی کی کچھ چیزیں اور بھی ہیں۔ پہلے تم انہیں دیکھ لو اس کے بعد میں تم سے دوبارہ رابطہ کروں گا اور یہ نمبر بند ہوا تو میں اگلی کال پولیس کو کروں گا۔''

''پولیس کو کیوں...؟'' اس نے تشویش سے پوچھا لیکن میں کال کاٹ چکا تھا۔ کھیل اب شروع ہوا تھا اور مجھے اپنی ہر چال بہت سوچ سمجھ کر چلنی تھی ورنہ میں مارا جاتا۔ یہ کھیل میرے اندازے سے بڑا ثابت ہوا تھا۔ فون بوتھ سے نکل کر میں اپنی گرل فرینڈ لیسلی کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ وہ مجھے بے وقت دیکھ کر حیران ہوئی لیکن ساتھ ہی خوش بھی ہوئی تھی۔

''آج تم اس طرف کیسے آ گئے؟''

''لیسلی میں تم سے بہت اہم بات کرنے آیا ہوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ بتاؤ تمہاری زندگی میں میری کیا اہمیت ہے؟''

اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈالیں اور آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

''میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔''

اس نے گہری سانس لی۔ ''میں ساری دنیا کو چھوڑ سکتی ہوں لیکن تم کو نہیں۔''

''اگر میں کہوں کہ سب چھوڑ کر میرے ساتھ چلو کبھی واپس نہ آنے کے لیے تو تمہارا کیا جواب ہوگا؟''

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے نرمی سے کہا۔ ''ڈینی کھل کر بات کرو... تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔''

یہ سچ تھا میں اس پر مکمل اعتماد کرتا تھا اس لیے میں نے اسے سب بتا دیا وہ خوفزدہ ضرور ہوئی تھی لیکن اس نے حوصلے سے کہا۔ ''تم نے ٹھیک کیا تمہارے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

میں خوش ہو گیا۔ ''تو بس تیاری کر لو ہمیں یہاں سے کہیں دور جانا ہوگا اس کا فیصلہ ہم یہاں سے نکلنے کے بعد کریں گے۔''

''میں تیار ملوں گی۔''

لیسلی نے اصرار کر کے مجھے ڈنر پر روک لیا اور میں جب رات گئے وہاں سے نکلا تو خود کو بہت آسودہ محسوس کر رہا تھا۔ ایوری سے بات کیے خاصی دیر ہو گئی تھی، میں نے مناسب سمجھا کہ اس سے بات کر لی جائے۔ میں نے اسے کال کی تو وہ میری آواز سنتے ہی پھٹ پڑا... اور بے نقط سنانے لگا۔ میں خاموشی سے سنتا رہا جب وہ تھک ہار کر چپ ہوا تو میں نے کہا۔ ''میں تمہارے جذبات سمجھ رہا ہوں۔ لیکن دوست تم نے اس دوران میں اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا کہ تم کس مصیبت میں پھنس گئے ہو۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں زیادہ نہیں صرف دس ملین ڈالرز چاہتا ہوں۔ ایک ہزار یورو کے نوٹوں کی صورت میں لیکن نوٹ.... پرانے ہوں۔''

''تمہارا دماغ درست ہے۔'' وہ غرایا۔ ''تمہیں معلوم ہے یہ کتنی بڑی رقم ہے؟''

''ہاں لیکن تمہاری زندگی اور آزادی سے بڑھ کر نہیں ہے۔''

''ان تصویروں اور ویڈیوز سے کچھ نہیں ہوتا۔'' اس نے ثابت قدمی سے کہا۔ ''اگر تم پولیس کو دے دو تب بھی میرا کچھ نہیں بگڑے گا، میں روپوش ہو جاؤں گا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، تم روپوش ہو سکتے ہو اور ممکن ہے پولیس تمہیں تلاش نہ کر پائے۔ لیکن اگر میں نے رقم ان تمام ثبوتوں کے ساتھ ایف بی آئی کو بھیج دی تو تم سوچ سکتے ہو کیا ہوگا؟''

اس پر اسے سانپ سونگھ گیا۔ خاصی دیر بعد اس نے بہ مشکل کہا۔ ''تم ایسا نہیں کرو گے۔''

''بالکل اگر مجھے دس ملین ڈالرز مل جائیں۔''

''سنو یہ رقم بہت زیادہ ہے۔'' وہ التجا پر اتر آیا۔

''جو تم لوگ کر رہے ہو اس لحاظ سے بالکل زیادہ نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے ایک منٹ میں ہاں یا ناں میں جواب دو تا کہ میں اگلا قدم اٹھا سکوں۔''

ایک منٹ میں تو نہیں لیکن دس منٹ میں وہ ہاں کرنے پر مجبور ہو گیا۔ رقم کے بندوبست کے لیے اس نے دو دن کی مہلت مانگی تھی۔ اس سے بات کر کے میں لیسلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب میں رقم سے بھرے دونوں سوٹ کیس اس کے فلیٹ میں لایا تو وہ دنگ رہ گئی تھی۔ اس نے بیگز دیکھ کر کہا۔ ''اتنی رقم... میرے خدا۔''

''یہ اصل رقم نہیں ہے وہ تو میں ان لوگوں سے وصول کروں گا اور وہ دس ملین ڈالرز ہوگی۔''

لیسلی ایک بار پھر حیران رہ گئی۔ اس نے تشویش سے کہا۔ ''ڈینی یہ بہت خطرناک کھیل ہے اگر تمہیں کچھ ہوا...''

''میں اپنے پتے بہت ہوشیاری سے کھیل رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں کامیاب رہوں گا لیکن اگر میں ناکام رہا اور واپس نہ آیا تو تم وہی کرو گی جو میں تم سے کہوں گا۔ تم فوراً ایف بی آئی سے رابطہ کرو گی اور ان سے پناہ طلب کرو گی۔''

لیسلی بدستور خوفزدہ تھی لیکن اس نے سر ہلایا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔ دو دن میں لیسلی کے گھر میں رہا اور اس کی پُر کیف قربت سے محظوظ ہوتا رہا۔ تیسرے دن میں وہاں سے نکلا اور ہائی وے کے ایک فون بوتھ سے ایوری کو کال کی۔ سچی بات ہے جب میں اسے کال کر رہا تھا تو میرے ذہن میں ناکامی کا خیال تھا میں نے بہت بڑی رقم مانگ لی تھی اور امکان تھا کہ وہ انکار کر دیں گے یا میرے خلاف جال بچھائیں گے بلکہ اس کا پورا امکان تھا۔ ایوری نے کال ریسیو کی۔

''رقم کا بندوبست ہو گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے اب غور سے سنو، کسی قسم کا جال بچھانے کی کوشش مت کرنا کیونکہ میں پھنسا تو تم بھی پھنسو گے۔ میں ایک ایک منٹ کے حساب سے چلوں گا اور اگر اس میں ذرا سی بھی تاخیر ہوئی تو میرا آدمی ایف بی آئی کو کال کر دے گا۔''

''تم بار بار دھمکی مت دو۔''

''یہ ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''دیکھو میں تمہارا کھیل سمجھ گیا ہوں۔ تم لوگ جعلی ڈالرز چھاپ رہے ہو لیکن یہ ڈالرز یہاں استعمال نہیں ہوتے ہیں بلکہ بیرونِ ملک جاتے ہیں جہاں ان کے پکڑے جانے کا امکان بہت کم ہوتا ہے میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''کہتے رہو۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔

''یہ کروڑوں کا بزنس ہے اور یقیناً تم لوگ انٹرنیشنل سطح پر کام کرتے ہو۔ ابھی تک تم لوگ محفوظ ہو کیونکہ قانون نافذ کرنے والے ادارے تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں۔ تم صرف دس ملین ڈالرز ادا کر کے سکون سے اپنا بزنس جاری رکھ سکتے ہو۔ تم لوگ بہت طاقتور ہو اور مجھے سب سے زیادہ فکر اپنی زندگی کی ہے۔ میں کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں ایف بی آئی کی پناہ میں جانے کو ترجیح دوں گا۔''

''او کے ہماری طرف سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔''

''تب غور سے سنو تمہیں رقم کب اور کہاں پہنچانی ہے۔'' میں نے کہا اور اسے جگہ اور طریقہ بتایا۔

''رقم پہنچ جائے گی۔'' اس نے کہا۔

رقم پہنچ گئی۔ یہ ایک کار میں تھی اور اسے نیویارک جانے والی ایک فیری میں سوار کرایا گیا تھا۔ یہ فیری دریائے ہڈسن سے ہوتی نیویارک پہنچ جاتی۔ وہاں میں فیری سے کار حاصل کر لیتا لیکن میرا پروگرام کچھ اور تھا۔ میں بھی ایک دوسری کار سمیت فیری میں سوار تھا اور راستے میں میں نے کار میں موجود رقم نکال لی تھی۔ آلات کی مدد سے میں نے چیک کر لیا کہ اس میں کوئی ٹریپ یا سگنل دینے والی چیز نہیں ہے۔ رقم ایک ہزار یورو کے پرانے نوٹوں پر مشتمل تھی۔ میں نے رقم دوسرے بیگ میں ڈال کر اپنی کار میں منتقل کر لی۔ اس کے بعد جعلی ڈالرز والے دو ملین اس کار میں منتقل کیے۔ میں نے اطمینان کر لیا تھا کہ یہاں ایوری کا کوئی آدمی نگرانی نہیں کر رہا تھا۔ انہوں نے میرے لیے جال یقیناً نیویارک میں بچھایا تھا جب میں کار لینے آتا اور ان کی نظروں میں آ جاتا لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے حلیہ بھی تبدیل کیا ہوا تھا۔ نیویارک کی بندرگاہ پر لیسلی میری منتظر تھی۔ اس نے میری ہدایت کے مطابق دوسری گاڑی حاصل کر لی تھی۔ بندرگاہ سے نکلتے ہی میں نے رقم اس میں منتقل کی اور اس گاڑی کو ایک جنک یارڈ میں چھوڑ دیا۔ ہم میامی کی طرف روانہ ہوئے اور میں نے راستے میں ایک جگہ سے ایوری کو کال کر کے بتا دیا کہ اس کی رقم کہاں ہے البتہ میں نے اسے تصویریں اور ویڈیوز نہیں دی تھیں۔ وہ میں نے اپنی حفاظت کے لیے اپنے پاس محفوظ کر لی تھیں۔

جواری

احمد اقبال

قسط نمبر: 2

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان
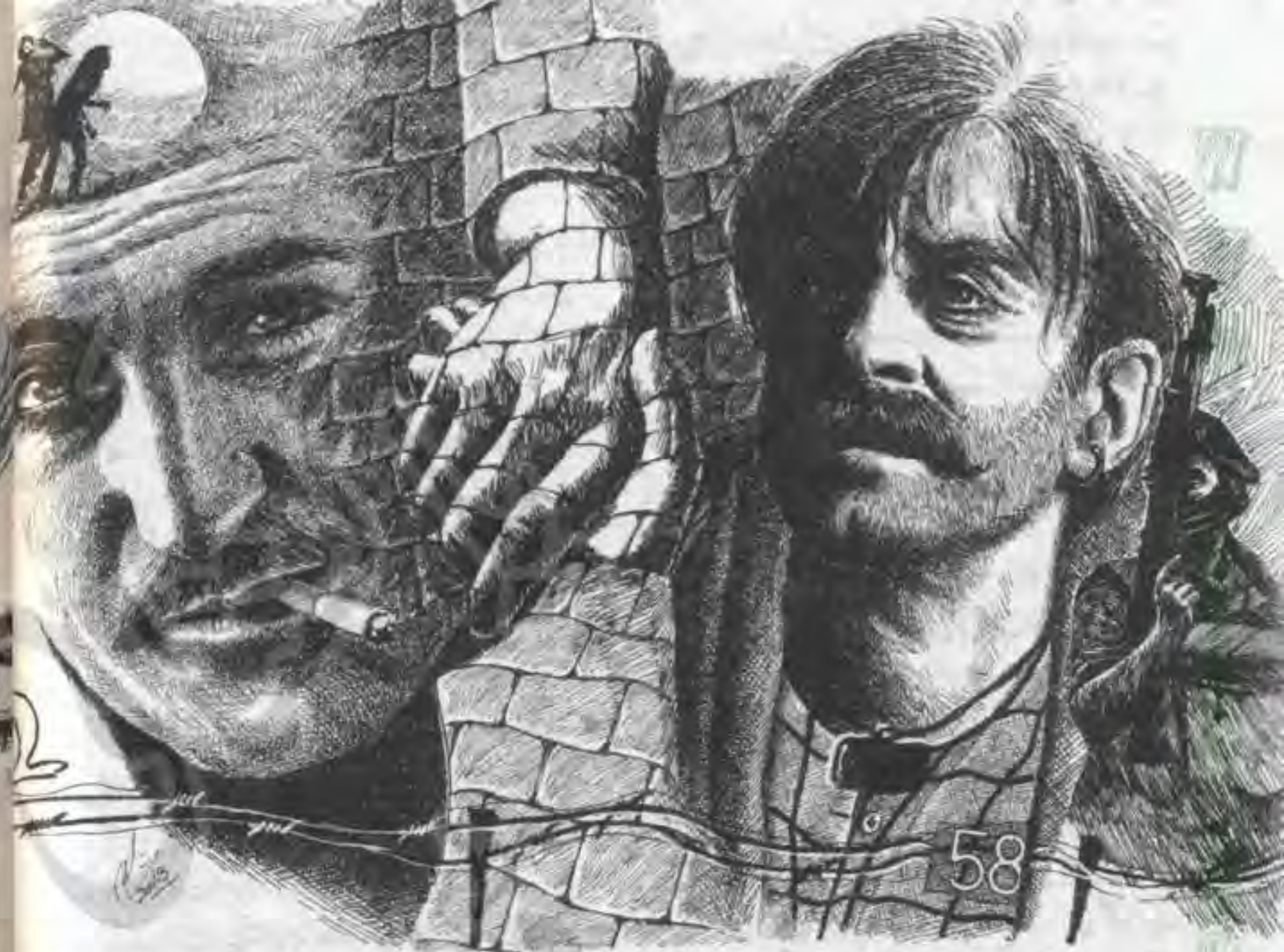
شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

پہلی قسط کے واقعات

ایم اے پاس خاور سکھر جیل میں سزائے موت کا منتظر تھا۔ اس پر قتل کا جھوٹا الزام ایک گینگ لیڈر نادر شاہ کے ایما پر عائد کیا گیا تھا۔ وہیں ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار گاما رستم بھی پھانسی کا منتظر تھا۔ اس کے ساتھی جیل پر حملہ کر کے اسے چھڑا لے جاتے ہیں۔ گاما، خاور کو ساتھ لے جاتا ہے۔ خاور ایک پرانی غیر آباد حویلی میں پناہ لیتا ہے۔ خاور کو اس حویلی کے کھنڈر میں نورین ملی جو لباس عروسی میں تھی اور اپنے شوہر کو قتل کر کے آئی تھی۔ اس کی پرورش کرنے والے چچا نے نورین کی تمام جائداد اور دولت پر قبضہ کر لیا تھا اور زبردستی اس کو اپنے پاگل بیٹے سے بیاہ دیا تھا۔ پاگل چچازاد کی دست درازی سے بچنے کے لیے نورین نے اسے قتل کر دیا اور کھڑکی کے راستے آسیب زدہ مشہور حویلی میں آ گئی۔ کسی نے اسے دیکھا تو بدروح سمجھ کے بھاگ گیا۔ نورین یہاں سلمان خان نامی ایک شخص سے چھپ کر ملتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وعدے کے مطابق وہ یہاں موجود ہوگا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ نورین پریشان تھی کہ صبح پولیس اسے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے گی۔ وہیں اس کی ملاقات خاور سے ہوئی۔ اس کھنڈر کی دوسری منزل پر خاور کو سلمان کی لاش نظر آئی۔ وہ اپنا وعدہ نبھانے پہنچا تھا لیکن قتل ہو گیا تھا۔ تلاشی پر خاور کو اس کی جیب سے دس لاکھ نقد ملے۔ خاور نے اپنے کپڑے اسے پہنائے اور خود اس کے کپڑے پہن کے رقم جیب میں ڈال لی۔ سلمان کے پاس ایک ریوالور بھی تھا جو خاور نے چھپا کے رکھ لیا۔ اس نے نورین سے یہ بات چھپائی، اپنا حلیہ بدلا اور نورین کو برقع میں چھپا کر لے گیا۔ وہ اکیلا نورین کے گھر گیا تو اسے علم ہوا کہ نورین پر شوہر کے قتل کا الزام ہے جبکہ نورین نے نکاح نہ ہونے کے باعث اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ خاور نے نورین سے جھوٹ بولا کہ سلمان جو پہلے سے بے روزگار تھا نوکری مل جانے پر دبئی چلا گیا ہے۔ باہر جانے میں خطرہ تھا کیونکہ فریدالدین (خاور) کے جیل سے فرار کی اطلاع کے بعد نادر شاہ نے اپنے کارندے اسے تلاش کرنے پر لگا دیے تھے جو کتوں کی طرح ہر جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ دوسرا خطرہ پولیس سے تھا جس کو خاور کے علاوہ نورین کی بھی تلاش تھی۔

اب آپ آگے پڑھیے

کانسٹیبل ایک موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کیے دونوں پیر زمین پر لگائے دونوں ہاتھوں سے ہینڈل تھامے انجن کو ریس دے رہا تھا اور کسی شہ سوار کی طرح پا بہ رکاب لگتا تھا جو گھڑ دوڑ کے نقطۂ آغاز پر اشارے کا منتظر ہو۔ درحقیقت وہ اپنے افسرِ اعلیٰ کی واپسی کا منتظر تھا جو دیوار کی طرف منہ کیے اپنے جسم کے فالتو پانی سے زمین کو سیراب کر رہا تھا۔

کانسٹیبل نے مجھے اس دخل درمعقولات پر خفگی سے دیکھا مگر اس کے سوال کرنے سے پہلے میں نے عاجزی سے کہا۔ "معاف کرنا...." اور دیوار کے شگاف کی مخالف سمت میں کھڑا ہو کے وہی کرنے لگا جو تھانے دار صاحب کر چکے تھے۔ اس کے سوا میرے پاس وہاں آنے کا کوئی معقول بہانہ بھی نہ تھا۔ نہ جانے کب سے یہ جگہ اشد ضرورت پوری کرنے کے لیے عوامی بیت الخلا کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔

تھانے دار اپنے ڈرائیور کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ کے نکل گیا تو میں نے بھی سکون کا سانس لیا۔ وہ شاید جلدی میں تھا ورنہ ضرور پوچھتا کہ میری اس بھوت نگر میں تشریف آوری کا مقصد کیا ہے۔

نورین ابھی تک اس ویران اور خستہ حال حویلی کے آخری تاریک گوشے میں کسی چمگادڑ کی طرح سرگرداں تھی۔ "شکر ہے تم آ گئے۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"تم نے کیا سمجھا تھا... میں تمہارے پیسے لے کر بھاگ گیا؟" میں نے کہا۔ "اتنی دیر تو نہیں لگائی میں نے۔"

"یہ کیا ہے؟" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "کیا لائے ہو؟"

"یہ تمہارے لیے ناشتا... اور یہ ہے چائے۔" میں نے شاپنگ بیگ گرد آلود فرش پر رکھے اور خود بھی دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔

"ایسے ہی بیٹھ گئے فرش پر؟ کپڑوں کا ستیا ناس ہو جائے گا۔"

"یہ تمہارا کام تھا کہ میرے واپس آنے تک فرش کو اچھی طرح صاف کر دو۔ اب نخرے مت کرو زیادہ ورنہ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ "چائے میں ٹھنڈی ہی لوں گی۔ یہ بتاؤ کھانے کو کیا لائے ہو؟ بھوک سے میرا دم نکل رہا تھا۔"

کچھ دیر ہم خاموشی سے گرم پوریاں اور چٹ پٹے چنے کھاتے رہے۔ "مزے کے ہیں۔" اس نے درمیان میں ایک مرتبہ کہا۔

میں اسٹرا سے گرم چائے پیتے ہوئے سلمان خان کے بارے میں سوچتا رہا جو اوپر فرشِ خاک پر سرد اور اکڑا ہوا پڑا تھا۔ کسی کو لوٹ کر دس لاکھ لانے والے عاشق جانباز نے لٹ جانے پر کوئی احتجاج نہیں کیا تھا مگر اس کی بے گور و کفن لاش نے میرے ذہن میں ان گنت سوالوں کو جنم دیا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ ابھی میری سوچ کے دائرے کا محور صرف ایک سوال تھا کہ اکیسویں صدی کی اس لیلیٰ تک اس کے مجنوں کے مرنے کی خبر کیسے دوں؟ دوں یا نہ دوں؟ اس کا ردِعمل نہ جانے کیا ہو۔ نورین ایک چیخ مارے، زمین پر گرے اور تڑپ کر جان دے دے۔ سچے عشق کا تو یہی تقاضا ہوتا۔ یا چیخ مار کے وہ مجھ پر حملہ کر دے اور اپنے پالش والے ناخنوں سے نوچ کے میرا چہرہ لہولہان کر دے۔ جھوٹ بولتے ہو تم۔ سلمان ایسے مجھے چھوڑ کے نہیں جا سکتا۔ سلمان نہیں مر سکتا۔

"خاور... کیا سوچ رہے ہو؟" نورین نے میرے شانے کو آہستہ سے ہلا کے کہا۔

میں چونک پڑا۔ "کچھ... کچھ بھی تو نہیں۔"

"جھوٹ۔" اس نے اسٹرا سے چائے پیتے ہوئے مجھ پر نظر جما کے کہا۔

میری آنکھیں اب تاریکی میں اس پیکرِ حسن و رعنائی کو یوں دیکھ سکتی تھیں جیسے اندھیرے سنیما ہال میں بیٹھا ہوا تماش بین فلم اسکرین پر کسی فلمی ہیروئن کے حسن و شباب کی تمام جلوہ سامانی کو دیکھتا ہے۔ میرا ذہن لامحدود امکانات اور سوالات کی یلغار سے ماؤف ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ نورین کو کیا بتاؤں؟ کیسے بتاؤں، بتاؤں کہ نہ بتاؤں؟ بتائے بنا چارہ نہ تھا مگر بتانے کے بعد صدمے کا جو شاک ویو آئے گا۔

پھر عقل نے مجھے جھنجوڑا۔ میاں افلاطون، سوچو نہیں... کچھ کرو۔ اور میں نے فوراً ایک سوال داغ دیا۔ "نورین... فرض کرو سلمان خان جس پر تمہیں اتنا اعتماد ہے، اچانک تمہیں پتا چلے..."

"کیا پتا چلے؟" وہ مضطرب ہو کے بولی۔

"یہی کہ... وہ نہیں آیا اور... نہیں آ سکتا۔ کوئی مجبوری ہے۔"

"کیوں نہیں آ سکتا... ایسی کیا مجبوری ہو سکتی ہے؟"

"وجہ کوئی بھی ہو سکتی ہے جو مجبوری بن جائے۔ مثلاً... مثلاً یہ کہ اسے کوئی روک لے۔ آنے ہی نہ دے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو... اسے روکنے والا کون ہے؟"

میں اِدھر اُدھر کسی قابلِ قبول بہانے کی تلاش میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا۔ "دیکھو نورین... دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ وہ بھی جسے ہم اپنی دانست میں ناممکن سمجھتے ہیں۔ مثلاً تم اپنی شادی کو ہی لو۔ تم سمجھتی تھیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا لیکن تمہارے سب اندازے اور ارادے غلط ثابت ہوئے۔"

"سلمان خان کی شادی کوئی بھی زبردستی نہیں کر سکتا۔ حالانکہ اس کی ایک منگیتر بھی ہے۔ رنگ اور وزن میں بھینس جیسی۔ لیکن وہ بہت پہلے اعلان کر چکا تھا کہ وہ دنیا میں کنواری رہ جانے والی آخری لڑکی ہوگی تب بھی وہ اسے قبول نہیں کرے گا۔"

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ "لوگ اچھے بھلے گھر سے نکلتے ہیں۔ دفتر جاتے ہیں یا سبزی لینے۔ یا تم جیسی محبوبہ سے ایفائے عہد کے لیے اور انہیں راہ میں فرشتۂ اجل اچک لیتا ہے... کہ ادھر کہاں جا رہے ہو۔ تمہارا ٹائم اس دنیا میں پورا ہو گیا، چلو میرے ساتھ۔"

وہ چلائی۔ "بکو مت... تم مجھے دہشت زدہ کرنا چاہتے ہو؟"

"میں تو... اس دنیا میں جو ہوتا ہے... وہ بتا رہا ہوں۔ کتنے لوگ راہ چلتے سڑک پر کسی حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ غلطی کسی اور کی ہوتی ہے... اغوا برائے تاوان کی وارداتیں بھی عام ہیں۔ سڑک پر کوئی موبائل فون مانگے تو انکار کی صورت میں یا مزاحمت پر..."

وہ مجھے مضطرب انداز سے دیکھتی رہی۔ "ضرور تمہیں ایسی کوئی بات معلوم ہوئی ہے جو تم مجھے ایک دم بتانا نہیں چاہتے۔"

اس وقت میں ہمت سے کام لیتا تو حقیقت کو اگل دیتا مگر نہ جانے کیوں میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ میں نے کہا۔ "نہیں نہیں... ایسی بات مجھے کون بتاتا۔ میں تو گیا ناشتا لینے اور آ گیا آدھے گھنٹے میں واپس۔ ہاں آج دن میں کوشش کی جائے تو اسپتال اور مردہ خانے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ پولیس کے پاس نہ تم جا سکتی ہو، نہ میں اتنا احمق ہوں۔ وہ ہم دونوں کی تلاش میں خاک چھان رہے ہوں گے۔"

میں نے نظر اٹھا کے دیکھا تو وہ رو رہی تھی۔ بالکل خاموشی سے آنسوؤں کے شبنمی قطرے اس کی غزالی آنکھوں سے نکل کر برگِ گل جیسے شفاف ریشمی گالوں پر بہہ رہے تھے۔ "خاور... حقیقت جو بھی ہو۔ پلیز کسی طرح معلوم کرو اور مجھے بتا دو۔"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تم میں حوصلہ ہے اتنا..."

"ہاں۔ بہت حوصلہ ہے مجھ میں۔ اور نہیں ہے تو میں پیدا کر لوں گی۔ ابھی تم مجھے نہیں جانتے، میں کیا چیز ہوں..."

میں نے اپنی مسکراہٹ کو دبا لیا۔ "اوکے۔ آج میں معلوم کر لوں گا کہ سلمان خان کے یہاں نہ پہنچنے کی وجہ کیا تھی۔ مجھے جہاں بھی جانا پڑا ضرور جاؤں گا لیکن ایک وعدہ تم بھی کرو مجھ سے... جب تک میں واپس نہ آ جاؤں، تم اس کمرے سے باہر بھی قدم نہیں رکھو گی۔"

"میں حویلی سے نکل کے کہاں جا سکتی ہوں؟"

میں نے جھلا کے کہا۔ "حویلی کی نہیں، میں اس کمرے کی بات کر رہا ہوں۔ یہ بالکل آخری حصے میں ہے۔

ہوسکتا ہے کہ پولیس مجھے یا تمہیں تلاش کرتی ہوئی حویلی میں بھی داخل ہوجائے۔ یہ نہ ہو کہ تم کسی بدروح کی طرح انہیں گھومتی پھرتی نظر آجاؤ۔ جن بھوت نظر تو آتے ہیں نا۔ اور کچھ میرے جیسے لوگ ہیں جو ان کے وجود پر یقین بھی نہیں رکھتے۔ یہ نہ ہو کوئی بہادر پولیس والا تمہیں دبوچ لے اور لے جائے اپنے ساتھ۔''

''میں... نہیں نکلوں گی اس کمرے سے۔'' وہ لرز کر بولی۔

دراصل مقصد یہ تھا کہ اس مختصر سے تاریک اور ویران کمرے کی قید سے گھبرا کے وہ حویلی کا جائزہ لینے نہ نکل کھڑی ہو۔ وہ یہاں پہلے بھی آتی رہی تھی اور کسی آسیب وغیرہ کے خیال سے خوف کا شکار نہیں تھی۔ وہ اوپر پہنچ جاتی تو سلمان خان کی سرد اکڑی ہوئی لاش کو خود دیکھ لیتی اور پھر شاک یا عالمِ دیوانگی میں نہ جانے کیا کرتی۔

''پہلے مجھے سلمان خان کے گھر کا پتا پھر سمجھاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''اور اس کے بعد اپنے گھر کا۔''

''میرے گھر کا کس لیے؟''

میں نے کہا۔ ''سوچ رہا ہوں اس بدبخت کے جنازے کو کاندھا دے دوں جو تمہارا شوہر بننے کی حسرت دل میں لیے دنیا سے گیا۔''

''یہ کیا بے وقوفی کا خیال ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں تمہارے چچا سسر سے بات کرکے انہیں قائل کروں کہ وہ تمہیں معاف کردیں...''

''یہ ناممکن ہے۔'' وہ کانپنے لگی۔ ''سچ بتاؤ... کیوں جانا چاہتے ہو میرے گھر؟''

میں نے کہا۔ ''مس نورین... جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے اس کے بعد شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لیکن فرض کرو، کیا ایک فیصد امکان اس بات کا نہیں ہے کہ تم نے اسے قتل کرنے کے بعد... میرا مطلب ہے قتل کرنے کی کوشش کے بعد... خود ہی فرض کرلیا ہو کہ وہ مرگیا ہے جبکہ وہ مرا نہ ہو۔ ایسی صورت میں تمہارے جرم کی سنگینی کم ہوجائے گی۔ تم پر صرف اقدامِ قتل کا الزام ہوگا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے اچھی طرح اپنی تسلی کرلی تھی۔ دیکھ لیا تھا کہ اس میں زندگی کے کوئی آثار نہیں۔ اس کی سانس رکی ہوئی تھی۔ اتنا خون بہہ جانے کے بعد کوئی بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ پھر بھی تم معلوم کرنا چاہتے ہو تو جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ ٹوہ لیتے ہوئے خود پکڑے جاؤ۔''

''لاحول ولاقوۃ۔ میں کیا اس سے پوچھوں گا کہ بھائی آپ واقعی مرگئے ہیں یا ڈراما کررہے ہیں۔ باہر کا منظر ہی سب ہی کچھ بتادے گا۔ پولیس کے علاوہ بھی وہاں بہت لوگ ہوں گے۔ تعزیت کے لیے آنے والے اور کفن دفن کا انتظام کرنے والے۔ ہوسکتا ہے لاش ابھی پوسٹ مارٹم کے بعد واپس ہی نہ آئی ہو۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''دیکھو... تم نے مجھے اس مصیبت سے نکالنے کا وعدہ کیا ہے۔ تم خود بھی مصیبت میں ہو... ہم ساتھ رہ کے ایک دوسرے کی مدد کرسکتے ہیں۔ یہ نہ ہو تم نکل جاؤ اور میں تمہاری واپسی کا انتظار کرتی رہ جاؤں۔''

میں نے اس کے ہاتھ پر نرمی سے تھپکی دی۔ ''مجھ پر بھروسا رکھو نورین... بتاؤ میں کس کی قسم کھاؤں کہ تمہیں اعتبار آجائے۔ قرآن کو بیچ میں لانا ٹھیک نہیں۔ اپنے بھائی کے بے گناہ لہو کی قسم سے بڑھ کر میرے لیے کچھ نہیں۔ میں جب واپس آؤں گا تو اپنے لیے اور تمہارے لیے کپڑے لاؤں گا۔ تمہارے لیے ایک برقع بھی ضروری ہے۔ مجھے اپنا حلیہ بھی بدلنا ہوگا۔ اس کے بغیر ہم یہاں سے نکلیں گے تو ہر قدم پر پکڑے جانے کا خطرہ ساتھ ہوگا۔''

''خاور... ہم یہاں سے نکل کے کہاں جائیں گے؟''

''آسان جواب تو یہ ہے کہ جہاں تقدیر لے جائے مگر ہم سوچ سمجھ کے فیصلہ کریں گے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ آج کی رات بھی ہم اس روحوں کے مسکن میں گزاریں۔''

اس نے سہم کے کہا۔ ''نہیں خاور... خوف سے میرا دم نکلا جارہا ہے۔ میں ایک دن تو گزار لوں گی مگر رات...''

میں نے کہا۔ ''رات اور دن میں کیا فرق ہے ہمارے لیے۔ اور تمہیں اگر جن بھوت سے ڈر نہیں لگتا تو پھر... کیا میں یہ سمجھوں کہ تم مجھ سے ڈرتی ہو؟ میرے ساتھ یہاں رات بھر رہنا...''

اس نے بے اختیار میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''ایسا مت کہو خاور۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم ایسے آدمی نہیں ہو۔ مجھے پورا بھروسا ہے تم پر۔ تمہارے ساتھ میں کہیں بھی جانے کے لیے تیار ہوں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم میرے اعتماد کو دھوکا نہیں دے سکتے۔''

میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ ''یہ شاید دو تین گھنٹے کا کام ہوگا۔ لیکن کسی وجہ سے مجھے دیر ہوجائے تو گھبرانا نہیں۔ دوپہر تک میں ضرور لوٹ آؤں گا۔ بس تم اس

کمرے سے مت نکلنا... رائٹ؟''

وہ مسکرائی۔ ''اب میں کیسے یقین دلاؤں؟ کس کی قسم کھاؤں... اپنے سر کی یا تمہارے سر کی؟''

میں باہر نکلا اور ایک بار پھر اوپر کی منزل پر اس ویران گوشے میں چلا گیا جہاں سلمان خان کی لاش اس طرح پڑی تھی جیسے کنکر پتھر، کچرے کے ڈھیر، گل کے گر جانے والے یا دیمک زدہ شہتیر... سب ایک سے بے جان اور بے حس وجود۔

اس بار کسی مُردہ خانے کے نگراں یا گورکن جیسی سفاک بے حسی کے ساتھ میں سلمان کی لاش کو کھینچ کر چند فٹ دور لے گیا جہاں کچھ روشنی تھی۔ اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کے میں نے اپنی محدود عقل کی مدد سے لاش کا پوسٹ مارٹم کیا اور یہ اندازہ کرنا چاہا کہ اسے مرے ہوئے کتنی دیر ہوچکی ہے یا اس کی موت کے اسباب کیا ہیں۔ لیکن مجھے ناکامی کے سوا کچھ نہ ملا۔ سلمان کی کھلی آنکھوں کی تحریر کو پڑھنا میرے لیے ناممکن تھا۔ میں اس کے ٹھنڈے اور اکڑے ہوئے بے جان بدن کو چھو کر یہ اندازہ کرہی نہیں سکتا تھا کہ جسم سے روح کو جدا ہوئے کتنے گھنٹے ہوچکے ہیں۔ غور سے دیکھنے پر مجھے چیونٹیاں نظر آئیں جو سلمان خان کے بازو پر ٹانگوں کے کھلے حصے پر اور گردن پر رینگنے لگی تھیں۔

دہشت کی ایک سرد لہر نے مجھے مفلوج کردیا۔ سلمان کے پیکر میں مجھے آنے والے وقت کی ایک کپکپی طاری کرنے والی تصویر دکھائی دی۔ یہ میں تھا جو زندگی سے محروم ہوجانے کے بعد تہِ خاک ایسے ہی گھپ اندھیرے میں پڑا حشرات الارض کا رزق بن رہا تھا۔ ہر فانی انسانی کی طرح۔ روح کے جسم سے جدا ہونے کے بعد جو باقی رہتا ہے، ایک مشت خاک ہے۔ خواہ نام اس کا سلمان خان ہو یا چودھری فریدالدین یا خاور۔

میں گھبرا کے اٹھا۔ سلمان خان کے تنِ بے جان سے کچھ پوچھنا یا معلوم کرنا صرف وقت کا زیاں تھا۔ اس سے پہلے کہ لاش کی بُو زندہ انسانوں سے پکار پکار کر قبر کی پناہ مانگے، مجھے نورین کے ساتھ یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ وقت کا ہر لمحہ غنیمت ہے جو دستیاب ہے۔

میں پلٹا ہی تھا کہ ایک اور خیال نے میرے قدم روک لیے۔ میں نے سلمان خان کے قدوقامت کا جائزہ لیا۔ اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ میری نظر اب اس کے لباس پر تھی جس کی اب اسے کوئی خاص ضرورت نہ رہی تھی کیونکہ بہت جلد اسے دو گز لٹھے کے کفن میں حشر تک کے لیے اپنی قبر میں جا کے لیٹنا تھا۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑسکتا تھا کہ اس کی لاش بے لباس رہے یا ان کپڑوں میں جو میرے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہوسکتے تھے۔

اگر یہ گناہ ہے میرے خدا... تو معاف کرنے والا بھی تو ہی ہے کیونکہ تو نیتوں کا حال جانتا ہے۔ میں نے کپڑے اتارتے ہوئے سلمان خان کے بے جان وجود سے بھی معافی مانگی۔ میری حرکت انتہائی قابلِ مذمت سمجھی جاسکتی تھی لیکن یہ میرے لیے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ بقا اور فنا کی جنگ کا کسی ضابطۂ اخلاق سے تعلق نہ کبھی تھا اور نہ ہوگا۔ مذمت کی ساری قراردادیں وہ پاس کرتے ہیں جو اس جنگ کے فریق نہیں ہوتے۔ صرف تماشائی ہوتے ہیں یا تماشا کرانے والے۔

سلمان خان کی آدھی آستین والی ٹی شرٹ میرے جسم پر یوں فٹ آئی جیسے میرے لیے بنائی گئی تھی۔ اس پر چوڑائی کے رخ سیاہ اور سفید دھاریاں تھیں۔ پہننے سے پہلے میں نے اسے جھٹک لیا تھا۔ پھر بھی ایک چیونٹی آستین سے نکل کر میرے بازو پر رینگنے لگی تو میں نے اسے مسل کے گرادیا۔ نیلی جینز کی پتلون کو اتارنا اور پہننا بھی خاصا دشوار تھا مگر ایک خودغرضانہ ہمت کے ساتھ میں نے یہ کام بھی چند منٹ میں کرلیا۔ میری توقع کے مطابق پتلون بھی میرے سائز کی ثابت ہوئی۔ سب سے آسان کام جوتے تبدیل کرنا تھا۔

میں نے دو لباس اتارے تھے۔ ایک قیدی نمبر ون ٹو تھری کی جیل والی وردی تھی۔ دوسرا وہ ڈھیلا ڈھالا شلوار قمیص جو میں نے چوری کرکے اپنی یونیفارم پر پہنا تھا۔ میرے لیے دونوں بے مصرف ہوچکے تھے۔ سلمان کی بے لباس لاش پر ایک نظر ڈال کے میں نے چند لمحے تذبذب میں گزارے۔ پھر فیصلہ کیا کہ مجھے سلمان خان کی لاش کے بارے میں نہیں اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔

میں نے شلوار قمیص کو لاش پر ڈالا اور جیل کی وردی کو لپیٹ کر بغل میں دبالیا۔ زینے سے اتر کے میں نے حویلی کے سکوت پر غور کیا۔ نورین وعدے کے مطابق آخری کمرے سے باہر نہیں آئی تھی۔ میں تیزی سے عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ ویران باغ میں ہوا کے ساتھ اڑ کر آنے والے کئی شاپنگ بیگ جھاڑیوں میں اٹکے ہوئے تھے۔ میں نے جیل کے یونیفارم کو ایک شاپنگ بیگ میں ڈالا اور دیوار کے شگاف سے بہت دور لمبی لمبی گھاس کے درمیان

پھینک دیا۔ وہ ایک کھلے گٹر میں گم ہو گیا۔

لباس بدلنے سے میرے اعتماد میں کچھ اضافہ ہوا تھا مگر میں جانتا تھا کہ قیدی نمبر ایک دو تین کا چہرہ اب بھی وہی ہے۔ اسے بدلنے کے لیے کچھ آسان اور کچھ مضحکہ خیز طریقے سوچتا ہوا میں بازار کی طرف چل پڑا۔ مجھے چہرے پر ایک معتبر داڑھی لگانے کا خیال بھی آیا جو تلاش کرنے پر مجھے کسی ڈراما گروپ سے یا میک اپ آرٹسٹ سے مل جاتی مگر کہیں بھی چہرے کا ساتھ چھوڑ دینے والی داڑھی مجھے مشکل میں ڈال سکتی تھی۔ میں نے نقلی مونچھوں کے خیال کو بھی مسترد کر دیا لیکن یہ فیصلہ کیا کہ اب مجھے مونچھوں کی فصل اگانی چاہیے اور ممکن ہو تو داڑھی بھی۔ شاید مہینا بھر میں میری شباہت تبدیل ہو سکتی تھی۔

فوری طور پر میں نے زیرو نمبر کا ایک ریڈی میڈ سیاہ پلاسٹک کے بھاری فریم والا چشمہ منتخب کیا اور خود کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک دکان پر ٹنگے ہوئے پرانے کوٹ کا سودا کیا جو دیکھنے میں لنڈا بازار کا تحفہ نہیں لگتا تھا۔ نصف چہرے کو چھپانے کے لیے گلگت اسٹائل کی اونی ٹوپی اور مفلر بہترین تھے۔ سلمان خان سے ملنے والا سارا مال اپنی کوٹ کی جیبوں میں منتقل کرنے کے بعد میں نے خود کو گرفتاری کے خوف سے بڑی حد تک آزاد محسوس کیا۔ آخر میں میں نے نورین کے لیے ایک برقع خریدا۔

اگلے ایک گھنٹے میں میرے لیے نورین کا گھر تلاش کر لینا بھی مشکل ثابت نہ ہوا۔ اس کے چچا کا گھر پرانی آبادی میں مگر نیا بنا ہوا تھا۔ تنگ گلی میں ایک ٹینٹ لگا دیا گیا تھا جس کے نیچے کرسیوں پر پندرہ بیس افراد چہرے پر ماتمی جذبات مسلط کیے بیٹھے تھے۔ ان کی گفتگو سے چند منٹ میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ لاش کچھ دیر پہلے ہی پوسٹ مارٹم کے مراحل سے گزر کے واپس پہنچی ہے۔ لوگ اپنی اپنی رائے دینے کے لیے آزاد تھے۔ کچھ کے نزدیک غلطی مرنے والے کے باپ کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا فاترالعقل بیٹا نورین جیسی لڑکی کے لیے ناقابلِ قبول ہے لیکن اس نے زبردستی کی اور سزا بیٹے کو ملی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ لڑکی کو کنوئیں میں دھکیل دیتا۔

کچھ زیرِلب نورین کے اقدام کو جواز فراہم کر رہے تھے۔ ایک نوجوان نے دوسرے سے صاف کہا کہ نورین کی جگہ وہ ہوتا تو یہی کرتا۔ دوسرے نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے مصلحت سے کام لیتے ہوئے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ یقیناً نورین کو جانتے تھے۔ اس کے رشتے دار یا محلے دار تھے۔ چنانچہ یہ عین ممکن تھا کہ اس کے حسن بے مثال پر فریفتہ بھی ہوں۔

یہ تصدیق حاصل کر لینے کے بعد کہ نورین کے زبردستی منڈھ دیا جانے والا شوہر اب اس دنیا میں نہیں اور یہ بحث بھی لاحاصل ہو چکی ہے کہ وہ شرح اور قانون کے مطابق اس کی بیوی تھی یا نہیں... اگر وہ بیوہ تھی تو اسے بہر صورت عدت کی مدت پوری کرنی تھی۔

اس تمام صورتِ حال کو جس سے میں اتفاقیہ اور حادثاتی طور پر دوچار تھا، آسان لینا محال تھا۔ جیل سے میرے فرار ہونے کا خیال ہی مجھے اوّل اوّل ایک انجانے خوف سے دوچار کر دیتا تھا۔ میں نے بہت سنا تھا کہ جواری اپنا مال ومتاع، دولت جائداد، گھر بار یہاں تک کہ بیوی بچے تک داؤ پر لگا کے ہارتے آئے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ ابھی تک میں کسی ایسے جواری سے ملا تک نہ تھا۔ میں نے داستانوں میں اور تاریخ میں ان کا تذکرہ پڑھا ضرور تھا۔

آج کے دور میں سٹہ کھیل کے خود کو تباہ کر لینے والے بہت تھے۔ کرکٹ میچوں پر سٹہ عام تھا جس کا تذکرہ ٹی وی پر بہت سنائی دیتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ پولیس اپنی نگرانی میں جوئے کے اڈے چلاتی ہے لیکن نہ میں ان بدنام علاقوں میں گیا تھا اور نہ میں وہاں جانے والوں کو جانتا تھا۔ لاس ویگاس کے عالی شان روشنیوں سے جگمگاتے جوئے خانوں کو میں نے فلموں میں دیکھا تھا جہاں دنیا بھر کے کروڑ پتی محض ہار جیت کی سنسنی سے لطف اندوز ہونے آتے تھے اور وہاں رات بھر میں کروڑوں ڈالرز اِدھر سے اُدھر ہونا معمول تھا۔

واجبی حد تک میں جواری ضرور تھا۔ کبھی دوستوں کے ساتھ رمی کھیلتا تھا تو معاملہ ایک ڈنر تک محدود رہتا تھا۔ کچھ لوگوں کے نزدیک پرائز بونڈ بھی جوا تھے۔ کبھی کبھار میں شرط بھی لگا بیٹھتا تھا۔ مثلاً میں نے ایک دوست کے اکسانے پر شرط لگائی تھی کہ اپنی کلاس کی ایک لڑکی سے صرف ایک ماہ میں تعلق پیدا کر لوں گا۔ وہ بہت لیے دیے رہنے والی کسی حد تک مغرور اور بدتمیز سمجھی جانے والی لڑکی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ انتہائی خوبصورت تھی ورنہ سب کے لیے چیلنج کیوں بنتی۔ شرط میں نے جیت لی تھی لیکن اپنا دل ہار گیا تھا۔ دل لگی... میں شروع ہونے والی بات دل کی لگی بن گئی تھی۔ اس پہلی محبت کی ناکامی کا زخم اب مندمل ہو گیا تھا لیکن یاد کی کسک مجھے آج بھی محسوس ہوتی تھی۔

جیل سے فرار ہونا اپنی زندگی کو داؤ پر لگانے کے برابر تھا اور اتنا جان لیوا کھیل میں نے صرف گامارستم کے اکسانے پر کھیلا تھا۔ مجھے ذرا بھی یقین نہ تھا کہ میری کوشش کامیاب ہوگی اور میں جان کی بازی لگا کے جیت بھی جاؤں گا۔ میرا کم ہمت اور مایوس دل صرف ناکامی اور شکست کے تاریک پہلو کو دیکھتا تھا تو مجھے وحشت ناک خواب آتے تھے۔ میں جاگتے ہوئے بھی خیالوں کے دشت میں بھٹک جاتا تھا تو اپنی خون آلود لاش ہی دیکھتا تھا... جو محافظوں کی گولیوں سے چھلنی تھی۔ جسے ایک نامعلوم مقام پر گڑھے میں ڈال کے زمین برابر کی جا رہی تھی اور جیل کے محافظ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ فرار کی کوشش میں مارے جانے والوں کے لیے دعائے مغفرت نہیں کر رہے تھے بلکہ انہیں شرمناک گالیوں سے یاد کر رہے تھے۔

ابھی تک مجھے یقین نہ آتا تھا کہ میں نے زندگی کو داؤ پر لگا کے جوا کھیلا اور جیت گیا۔ اسی لیے آج میں جیل کی... چاردیواری میں قیدی نمبر ون ٹو تھری کی مشقت نہیں کر رہا ہوں، ان کی گالیاں نہیں کھا رہا ہوں اور کسی کوٹھری میں بند نہیں ہوں۔ ایسے بدقسمت جواری بھی تھے جو ہارے تو موت نے انہیں اچک لیا تھا اور آج وہ نہ جانے کہاں زیرِ زمین یا کسی اسپتال کے مردہ خانے میں پڑے تھے۔ مگر میں آزاد تھا، زندہ تھا اور مستقبل کے بارے میں پُرامید تھا۔

مگر جیل سے باہر آزادی کی پہلی رات ہی میں ایک آزمائش میں گرفتار ہو گیا تھا۔ جیل کے اندر میرے خیالوں پر ناامیدی غالب تھی لیکن اس میں امید کے مختصر وقفے آتے تھے تو میں سوچتا ضرور تھا کہ باہر نکل کے میں کیا کروں گا اور کیا نہیں کروں گا۔ اچانک میرے سارے پلان الٹ پلٹ ہو گئے تھے۔ ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نورین جیسی کوئی لڑکی نئی زندگی کے ایک اندھے موڑ پر یوں مجھ سے ٹکرا جائے گی کہ خود پر میرا اختیار ہی باقی نہیں رہے گا۔

نورین نے میری مرضی کے بغیر ہی مجھے یوں اسیر کر لیا تھا کہ اب اسے اس کے حال پر چھوڑ کر نکل جانے کا تصور بھی باعثِ شرم ہو گیا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اسے بھی قدرت کا انعام سمجھتا اور پرائی دلہن کے ساتھ سہاگ رات گزار کے صبح چمپت ہو جاتا۔ مگر میں نے اپنے بے گناہ بھائی کے خون کی قسم کھائی تھی اور اب اس مقدس عہد کی پاسداری میرا فرض بن گئی تھی۔ اپنے ساتھ نورین کو بہ حفاظت قانون کی گرفت سے دور لے جانا ایک ذمے داری تھی جسے پورا کرنے کے لیے میں واپس بھی جا رہا تھا۔

جیل سے باہر پہلی شب کی سحر ہونے تک جیسے سب کچھ بدل گیا تھا۔ میری منزل بدل گئی تھی، زندگی کے مقاصد بدل گئے تھے۔ پہلے مجھے صرف اپنی زندگی کو لاحق خطرات کی فکر تھی۔ اب کسی خواہش اور ارادے کے بغیر نورین کا بوجھ میرے کندھوں پر آ گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سلمان خان جیسے بے وفا عاشق کی پُراسرار موت سے اس کو کیسے آگاہ کروں؟ اسے کچھ بتاؤں یا نہ بتاؤں؟ معلوم نہیں اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟ یہ ہو سکتا تھا کہ میرے جانے کے بعد اس نے بدقسمتی سے سلمان کی لاش دریافت کر لی ہو۔ جب وہ میرے جسم پر سلمان خان کے کپڑے دیکھے گی تو اس کا... ردِعمل کیا ہوگا؟

نورین ابھی تک اس مختصر سے خستہ حال کمرے کی قبر میں بے قراری سے سرگرداں تھی۔ اس نوگرفتار طائر کی طرح جس سے قوتِ پرواز چھین کر تازہ تازہ کسی پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ میں باہر سے آیا تھا چنانچہ میری آنکھوں کے لیے تاریکی میں دیکھنا دشوار تھا۔ وہ اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی حرکت رک گئی اور اس کی نگاہ مجھ پر مرتکز ہو گئی۔ میں اس کی صورت کے تیزی سے بدلنے والے تاثرات کو نہ دیکھ سکا۔

اس کے ذہنی صدمے کا مجھے اس وقت اندازہ ہوا جب اس نے ایک دم آگے بڑھ کر میرے کوٹ کا کالر پکڑ لیا اور چلائی۔ ”یہ... یہ تو سلمان کے کپڑے ہیں۔“

میں نے نرمی سے اس کے ہاتھوں کو جھٹک کر الگ کیا۔ ”ہاں۔ اسی نے دیے تھے مجھے۔“

”پھر وہ آیا کیوں نہیں تمہارے ساتھ...“

میں نے کہا۔ ”تم بات کرنے دو گی مجھے تو بتاؤں گا۔ بیٹھو یہاں آرام سے۔“

وہ دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔ ”میں آرام سے ہوں، میری فکر مت کرو۔“

میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ”پہلے میں تمہارے گھر گیا تھا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا، تمہارا وہ نہ ہونے والا شوہر واقعی مر چکا ہے۔ اس کی لاش کو پولیس لے گئی تھی، پوسٹ مارٹم کے لیے۔ میرے سامنے ہی ڈیڈ باڈی واپس لائی گئی اور اب اس کے کفن دفن کے انتظامات ہو رہے ہیں۔“

”دفع کرواسے، میں نے اس کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔“

”لیکن تمہیں یہ بتانا میرے لیے بہت اہم تھا کہ اب تم مفرور قاتل ہو۔ تم پر نہ اقدامِ قتل کا کیس ہے اور نہ ہی

غیرارادی قتل کا۔ یقیناً پوسٹ مارٹم سے پہلے ایف آئی آر لکھی گئی ہوگی اور اس میں تمہیں قاتل نامزد کیا گیا ہوگا۔ زیر دفعہ تین سو دو تعزیرات پاکستان تم پر قتل عمد کا کیس بنا ہوگا۔ اس معاملے کی سنگینی کو اچھی طرح سمجھ لو۔"

اس نے سر ہلایا۔ "ایسا تو ہونا تھا۔"

"قتل کے بعد جائے واردات سے فرار تمہارا دوسرا جرم بن گیا۔ لیکن اس کے سوا تم کر بھی کیا سکتی تھیں۔ اگر فرار نہ ہوتیں تو اس وقت حوالات میں بند ہوتیں۔ سزا ہونے تک تم پر کیا گزرتی، اس عذاب کا تصور بھی تمہارے بس کی بات نہیں... کیونکہ تم نے تھانے دیکھے ہیں اور نہ کبھی پولیس سے تمہارا واسطہ پڑا ہے۔"

"آخر تم کیوں ڈرا رہے ہو مجھے... بلاوجہ؟"

"نورین! میں تمہیں حقائق کی سنگینی سے آگاہ کر رہا ہوں۔ میں وکیل تو نہیں ہوں لیکن خود اپنے معاملات میں وکیلوں کی باتیں سن کے اور عدالتی معاملات کے تجربے سے میں آدھا وکیل خود بھی بن گیا ہوں۔"

"ابھی مجھے تمہارے کسی قانونی مشورے کی ضرورت نہیں۔ پہلے بتاؤ سلمان نے کیا کہا... وہ کیوں نہیں آیا؟"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "اس نے کہا کہ وہ آ ہی نہیں سکتا تھا۔"

"کیا مطلب..." وہ برہمی سے بولی۔ "کیوں نہیں آسکتا تھا؟"

"ذرا سکون سے پہلے میری بات سن لو پھر خفا ہونا۔ تمہارے گھر سے میں سیدھا سلمان کے گھر چلا گیا تھا اگر ذرا دیر ہو جاتی تو اس کی اور میری ملاقات ہی نہ ہوتی کیونکہ وہ دبئی کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔"

وہ چلّانے لگی۔ "دبئی کے لیے... مجھے بتائے بغیر، سوچے بغیر کہ میں یہاں اس کا انتظار کر رہی ہوں؟"

میں نے نورین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نرمی سے تھپکی دی۔ "دیکھو نورین... دنیا میں سب کچھ ویسے ہی نہیں ہو سکتا جیسا ہم چاہیں۔ اتفاقات یا حادثات کا پہلے سے کون اندازہ کر سکتا ہے۔ خرابی دونوں طرف ہوئی۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ مل کر بزنس کر رہا ہے۔ اس کا سرمایہ ہے اور سلمان کی محنت۔ دبئی میں اس کے پارٹنر کو حادثہ پیش آیا اور وہ مر گیا۔"

"مر گیا...؟ کب؟"

"کل رات... لیکن خدا کے لیے مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ حادثہ کیسے اور کب پیش آیا۔ اس کا انتقال کب اور کہاں ہوا کیونکہ یہ سب میں نے بھی سلمان خان سے نہیں پوچھا تھا۔ میرے نزدیک یہ بالکل غیر ضروری تھا۔ سلمان خان کو اس کی اطلاع سب سے پہلے دی گئی۔ اس کا پریشان ہونا بالکل فطری تھا اور اگر اس نے فوراً دبئی جانے کا فیصلہ کیا تو ٹھیک کیا۔"

نورین نے چلّا کے کہا۔ "ذلیل... کمینہ۔ اسے میرا خیال نہیں آیا کہ میں کیا کروں گی۔"

میں نے دل ہی دل میں سلمان خان کی روح سے ہر گالی پر معذرت کی۔ "تم بلاوجہ اس پر چلّا رہی ہو۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔"

"سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ خود غرض اور مطلبی... ثابت ہو گیا۔"

میں نے بگڑ کے کہا۔ "جی نہیں... ثابت یہ ہوا کہ ساری عورتیں بلاوجہ ناقص العقل مشہور نہیں ہیں۔ ایک بات بتاؤ مجھے۔ کل جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا، زبردستی تمہارا نکاح پڑھا دیا گیا اور تمہیں ایک کمرے میں بند کر دیا گیا... یہ معلوم تھا اسے؟"

"میں... میں کیسے بتاتی۔"

میں بولتا رہا۔ "اسے کسی نے اطلاع دی تھی کہ مس نورین اپنے نہ ہونے والے شوہر کا قتل کر کے خیر و عافیت کے ساتھ نکل آئی ہیں... اور اب وعدے کے مطابق وہیں موجود ہیں جہاں سلمان خان کو آنا تھا۔"

"وہ آتا تو اسے سب معلوم ہو جاتا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ اسے تو کچھ بھی پتا نہیں تھا کہ تمہارے گھر میں کیا ڈراما چل رہا ہے۔ نہ تم نے فون کیا اور نہ کسی کے ذریعے پیغام تو اسے کیا فرشتے ہر خبر پہنچاتے؟ پہلے بھی تو ایسا ہوا ہی ہوگا کہ تم نے انتظار کیا لیکن وہ کسی وجہ سے نہیں آسکا۔ پھر کیا تم اس جگہ بیٹھی رہیں رات بھر؟ یہ سب تو میں نے بتایا اسے۔"

نورین نے ایک گہری سانس لی۔ "اس نے تمہارے بارے میں بھی پوچھا ہوگا کہ تم کون ہو... نورین کو کیسے جانتے ہو؟"

"اگر وہ نہ پوچھتا تو مجھے حیرانی ہوتی۔ وہ اتنا بے وقوف بہرحال نہیں ہے۔"

"تم نے کیا کہا؟ سب کچھ بتا دیا اپنے بارے میں سچ سچ؟"

"اگر میں جھوٹ بولتا تو وہ قائل نہ ہوتا۔ میرا جھوٹ پکڑ لیتا۔ میں نے بالکل وہی بتایا جو ہوا تھا۔ وہ سخت

پریشان تھا کہ ان حالات میں کیا کرے۔ اس کا دبئی جانا ضروری تھا اور تمہیں اپنے ساتھ لے جانا بالکل ناممکن تھا کیونکہ تمہارے پاس نہ پاسپورٹ ہے اور نہ ویزا۔ تم نہ اس کی سیکریٹری ہو نہ بیوی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میری واپسی تک تم نورین کی بھی حفاظت کرو تو تمہارا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ میں دو چار دن میں آ کے اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میں نے پوچھا کہ کہاں لے جاؤ گے تو بولا کہ فوری طور پر دبئی لے جانا تو مشکل ہوگا لیکن میں کوئی بندوبست کر لوں گا۔ میں انکار کیسے کرتا؟ مگر میں نے بتا دیا کہ میرے پاس بھی محفوظ ٹھکانا کوئی نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں اور نورین فرضی نام سے کسی ہوٹل میں روپوش رہیں۔ لیکن اس میں بھی ایک مسئلہ ہے۔ میں جہاں چاہوں چلا جاؤں مگر نورین جیسی لڑکی کسی ہوٹل میں اکیلی نہیں جا سکتی۔ الگ کمرا لے کر بھی نہیں رہ سکتی۔ ہمیں خود کو میاں بیوی ظاہر کرنا پڑے گا ورنہ کمرا نہیں ملے گا۔"

نورین کو صدمہ ہوا۔ "اور وہ مان گیا؟ اعتبار کر لیا اس نے تم پر کہ میں اور تم کسی ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں رہیں؟"

"اعتبار نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اسے اعتماد ہے تم پر... اور اس نے میری صورت سے بھی اندازہ کر لیا ہوگا کہ میں شریف آدمی ہوں۔"

"اگر اس کی جگہ تم ہوتے؟" وہ افسردگی سے بولی۔

"نورین... مفروضات پر بحث کرنے کا یہ کون سا موقع ہے؟" میں نے اسے سمجھایا۔

"اتنا بھروسا کرنا کسی اجنبی پر سراسر بے وقوفی ہے بلکہ بے غیرتی ہے۔" نورین نے افسوس سے سر ہلایا۔

"کیوں بے غیرتی ہے؟ تم اس کی مجبوری بھی تو سمجھو۔" میں نے ضبط سے کام لیا۔

"یار! تم ایک اجنبی تھے اس کے لیے۔" نورین کے لہجے میں مایوسی کی خفگی تھی۔

میں نے بھنّا کے کہا۔ "اور تمہارے لیے کیا میں اجنبی نہیں تھا؟ تم نے کیوں اعتبار کر لیا تھا مجھ پر؟"

اس نے خالص زنانہ منطق کے ساتھ دلیل دی۔ "میں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔"

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "یعنی مجنوں کرے تو غلط اور لیلیٰ کرے تو صحیح۔ دیکھو بی بی! شرافت کی سند کسی کی صورت پر لکھی نظر نہیں آتی۔ مجھ سے گفتگو کر کے اسے یقیناً اطمینان حاصل ہوا ہوگا کہ میں کوئی غلط قسم کا آدمی نہیں ہوں ورنہ تمہاری مدد کرنے کے بجائے پورا فائدہ اٹھاتا اور نکل جاتا۔ اس کو تمہاری پرابلم بتانے کے لیے آتا ہی کیوں۔ پھر بھی اس نے بڑی سماجت سے میری ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کے کہا تھا کہ نورین کو اپنی بہن جیسا سمجھنا۔ تم شریف آدمی ہو۔"

"پھر تم نے کیا کہا شریف صاحب؟"

"یار! میں کیا کہتا؟ میری نہ کوئی بہن تھی نہ ہے۔" میں نے سر کھجا کے کہا۔ "اور ویسے بھی تم خود سوچو۔ آپ کسی کو بھی ماں جیسا سمجھ سکتے ہیں مگر وہ آپ کی ماں تو نہیں ہو جاتی۔"

"اس نے تمہارے گھر اور گھر والوں کے بارے میں تو پوچھا ہوگا؟"

"میں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ میں جیل سے بھاگا ہوں۔ مجھ پر قتل کا الزام تھا۔ الزام جھوٹا سہی مگر مجھے پھانسی ضرور ہوتی کیونکہ وہ دشمن جو میرے بھائی کے قاتل تھے اور میرے خاندان کی تباہی کے ذمے دار تھے، وہ میرے پیچھے بھی لگے ہوئے تھے اور وہ بڑے طاقتور دشمن ہیں۔ اب میرے لیے تو زندگی کا واحد مقصد ایک ہی ہے کہ ان سب دشمنوں کو نیست و نابود کر دوں۔ ورنہ میری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں۔ یا میں زہریلے ناگ کا پھن کچل دوں یا وہ مجھے ڈس لے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ تم نورین کی ذمے داری مجھ پر نہ ڈالو۔"

"پھر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی... الّو کا پٹھا۔"

"وہ منت سماجت پر اتر آیا کہ جیسے تم خود کو بچاؤ گے ایسے ہی نورین کو بھی بچاؤ۔ بس چند دن کی بات ہے۔ تم جہاں بھی رہو اسے اپنے ساتھ رکھنا۔ تمہاری طرح اس کا روپوش رہنا بھی ضروری ہے، وہ اکیلی کیا کرے گی۔ مجبوراً میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔ میرے کہنے پر اس نے یہ کپڑے بھی لا کر دیے۔ تمہارے لیے ایک برقع دیا... دیکھو۔"

نورین نے شٹل کاک برقع کا معائنہ بڑی ناپسندیدگی سے کیا۔ "اپنی اماں کا پرانا برقع دے دیا ہوگا۔"

"جو بھی ہے۔ مکمل روپوشی کے لیے یہی سب سے بہتر ہے۔ میرے قد کے مطابق ملے گا نہیں ورنہ میں خود یہی طریقہ استعمال کرتا... اب چلو۔"

اس نے بے خیالی میں کہا۔ "خاور... ہم کیسے رہیں گے، ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں...؟"

"یہ بھی تو ایک ہی کمرا تھا اور پھر بھی ڈر لگتا ہے تو تم رہو یہاں... میں چلتا ہوں۔"

اس نے میرا بازو پکڑ کے کہا۔ ”تم ایسا نہیں کرسکتے۔“

”میں ایسا نہیں کرسکتا، ویسا نہیں کرسکتا... تم نے کیا تماشا بنا رکھا ہے مجھے۔“

وہ رونی شکل بنا کر بولی۔ ”میرا مطلب تھا... اگر کسی نے مخبری کردی میری یا تمہاری۔“

”کوئی بھروسا نہیں۔ نہ اگلے لمحے کا نہ آنے والے دن کا۔ میں کوئی گارنٹی کیسے دے سکتا ہوں مس نورین... اور تمہیں ڈر لگتا ہے تو خدا کے لیے مجھے جانے دو۔ بے وقوف تھا میں کہ تمہارے گھر گیا اور سلمان خان سے ملا...“

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ”آئی ایم سوری... اب تم جو کہو گے میں ویسا ہی کروں گی مگر خدا کے لیے مجھے چھوڑ کر جانے کی بات نہ کرو۔“

ہر عورت کا آخری ہتھیار اس کے آنسو ہی ہوتے ہیں جن کے سامنے طاقتور سے طاقتور مرد کی خودی، انا اور غرور کا فلک بوس مینار ایسے قدم بوسی کے لیے گر جاتا ہے جیسے ایٹم بم کے سامنے ہیروشیما ہی نہیں جاپانی قوم کے یقین اور اعتماد کا ناقابلِ تسخیر سمجھا جانے والا آسمان بھی زمیں بوس ہوگیا تھا۔

میں نے نورین کا سر اپنے کندھے پر رکھ کے اس کے آنسو پونچھے۔ ”دیکھو رونے کی ضرورت نہیں۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ میں پارسائی کا دعوے دار نہیں کیونکہ میں بہرحال ایک انسان ہوں لیکن شیطان کے مقابلے میں مجھے رحمان کی طاقت پر پورا اعتماد ہے۔ وہی میری نیت اور ایمان کا محافظ ہوگا۔ پھر بھی تمہیں مجھ سے اندیشہ ہو تو یہ اپنے پاس رکھو...“

وہ چونک کے مجھے دیکھنے لگی۔ ”یہ... یہ کیا ہے؟“

”یہ وہی چھری ہے جس سے تم نے اپنی حفاظت کی تھی۔ اس سے مجھے بھی قتل کردینا۔“

اس نے چھری میرے ہاتھ سے لے لی اور اندھیرے میں اس کی دھندلی سی چمک کو دیکھتی رہی۔ ”اسے تم نے سنبھال کے رکھ لیا تھا؟ لیکن خاور... خدا نہ کرے کبھی تم پر میرا اعتماد بھی غلط ثابت ہوا تو... تو میں تمہاری نہیں اپنی جان لوں گی اس سے۔“

میں نے اس کی کلائی پکڑلی۔ ”پھر یہ مجھے دے دو۔“

اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ ”کیوں؟ ڈر گئے...؟“

”ہاں... اب میں تمہارا محافظ ہوں۔ میں مرنے نہیں دوں گا تمہیں... چلو اب چلیں۔ برقع پہن لو آج اس کی افادیت کا احساس ہورہا ہے۔ اب تم پر دنیا کی نظر نہیں پڑسکتی۔ کوئی تمہارا یہ عروسی جوڑا نہیں دیکھ سکتا اور نہ تمہارا یہ زیور جو تم نے ہر جگہ لٹکا رکھا ہے... گردن میں، کانوں میں... ناک میں اور ہاتھوں میں۔ تمہیں الجھن محسوس نہیں ہوتی؟“

”کمال کرتے ہو۔ زیور ہی تو دلہن کا حسن ہوتا ہے۔“

میں نے طنز سے کہا۔ ”خواہ دلہن ہو کالی موٹی، چپٹی ناک اور چڑیل جیسے دانتوں والی۔ سونا لٹکا دو اس پر تو وہ تم جیسی ہوجائے گی۔ کوہ قاف کی پری بن جائے گی۔“

اس نے میرے خراجِ تحسین کا نوٹس لیا یا نہیں، اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا کیونکہ وہ برقع میں غائب ہوچکی تھی۔ ”میں تیار ہوں... چلو کہاں چلنا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”پہلے تو ہم جائیں گے بازار۔“

”بازار... تم نے ہوٹل کی بات کی تھی۔“ اس نے سامنے سے برقع اٹھا دیا۔

”پہلے میری بات سن لو اور سمجھ لو۔ اس ایک رات کی پناہ گاہ کے باہر میرے اور تمہارے لیے ہر قدم پر خطرہ ہی خطرہ ہے۔ جیسے میدانِ جنگ میں ہموار، محفوظ اور بے خطر دکھائی دینے والی زمین کے نیچے دشمن نے بارودی سرنگوں کا جال پھیلا رکھا ہو۔ کسی ترتیب کے بغیر، نہ ایک قطار میں اور نہ یکساں فاصلے پر۔ محتاط رہنے اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سارا کھیل قسمت کا ہوتا ہے۔ ایک غلط قدم سے دھماکا ہوتا ہے اور آدمی غائب ہوجاتا ہے۔“

”تم کیوں ڈرا رہے ہو مجھے...“

”میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ ہم کسی غلطی کے ارتکاب کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔“

”جانتے بوجھتے کون غلطی کرتا ہے۔“

”یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ تقدیر میں جو لکھا ہے، وہ ہوگا۔ پھر بھی احتیاط لازمی ہے۔ جیسے موت برحق ہے مگر خودکشی حرام ہے۔ یہ میرے لیے بھی بقا کی جنگ ہے اور تمہارے لیے بھی جس میں ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ تمہیں بھی حالات نے مجرم بنا دیا ہے اور مجھے بھی۔ میں بھی خود کو گناہ گار نہیں سمجھتا، تم بھی سمجھتی ہو کہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ لیکن ہمارے دشمن اور قانون کے رکھوالے ایسا نہیں سمجھتے۔“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”کتنا عجیب اور ناقابلِ یقین ہے یہ سب میرے لیے۔ صرف ایک رات میں زندگی مجھے کہاں لے آئی۔ مجھے تو سلمان خان کے ساتھ جانا تھا مگر جا رہی ہوں میں تمہارے ساتھ۔ نہ جانے کہاں؟ یہ زندہ رہنے کی خواہش ہے جس نے مجھے مجبور کیا کہ تم پر بھروسا کروں۔ آج نہ سہی کل تم مجھے میرے خوابوں کی منزل تک پہنچا دو گے۔ ابھی میں یہ سوچنا نہیں چاہتی کہ ایسا نہ ہوا تو کیا ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”اوکے... اب کچھ پریکٹیکل ٹپس... بازار ہم اس لیے جا رہے ہیں کہ ایک ساتھ رہ کے زندگی گزارنے کے لیے ابھی ہمارے پاس کچھ نہیں۔ نہ تم اس ایک عروسی جوڑے سے گزارہ کرسکتی ہو اور نہ میرے لیے اس مانگے کے جوڑے کو کافی سمجھنا ممکن ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم اپنی اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لیں گے۔ میرا مطلب ہے فوری ضرورت کی۔ کچھ پتا نہیں ہم کب تک ساتھ رہیں، کہاں رہیں۔ ابھی ہم نے خالی ہاتھ کسی ہوٹل میں جا کے کمرا مانگا تو مشکوک نظر آئیں گے۔ صرف عیاشی کرنے والے بے سروساماں ہوتے ہیں، میاں بیوی نہیں۔“

”صحیح سوچا تم نے۔ کم سے کم ایک سوٹ کیس تو ہونا چاہیے ہمارے پاس ورنہ... ایک بڑا میرا اور چھوٹا تمہارا... تاکہ ہم مسافر نظر آئیں۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”اس سے زیادہ اہم ہے ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ رویّہ۔ ایسا نہیں محسوس ہونا چاہیے کہ ہماری ابھی شادی ہوئی ہے اور ہم یہاں ہنی مون منانے آئے ہیں۔ ہنی مون کے لیے جو ملک سے باہر کہیں نہیں جاسکتے، وہ چلے جاتے ہیں مری اور سوات کی طرف۔ لیکن وہاں ابھی سخت سردی کا موسم ہے چنانچہ من چلے کراچی کا رخ کرتے ہیں یا لاہور چلے جاتے ہیں۔ سکھر تو کوئی بھی نہیں آتا۔“

اس نے مجھے تعریفی نظر سے دیکھا۔ ”بالکل ٹھیک سوچا تم نے۔“

”ہم ہر جگہ یہ ظاہر کریں گے جیسے ہماری شادی کو چار پانچ سال ہوچکے ہیں۔ اور یہ لو میرج تھی تب بھی لو تو ہے گزرے ہوئے کل کا قصہ... اب تو ہم بس بندھے ہوئے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ نکاح سے۔ جانتی ہو چار پانچ سال بعد کیا ہوتا ہے؟“

”یہ میں ابھی سے کیسے جان سکتی ہوں؟“ اس نے سادگی اور معصومیت کے ساتھ کہا۔

میں نے کہا۔ ”چلو چھوڑو۔ ایک کام میں کرلوں گا، دوسرا آسان کام تمہارا۔ میں ایک روایتی حاکمیت پسند، کسی حد تک بدمزاج اور بیزار، بیوی کی طرف سے بے پروا شوہر نظر آؤں گا سب کے سامنے۔ تم بس خاموشی سے برداشت کرتی رہنا۔ کوئی بات بُری لگے تو اکیلے میں ایک کی جگہ سو سنا دینا۔ میں خاموش رہوں گا۔ ویری سمپل۔“

میں دیکھ سکتا تھا اور محسوس کرسکتا تھا کہ نورین کی یہ خاموشی کسی سمندر کی ساکت سطح جیسی ہے جس کی گہرائی میں طوفان برپا ہوں اور اس کی مسکراہٹ بھی کسی آتش فشاں جیسی تھی جس کے اندر آگ اور لاوا ابل رہا ہو مگر اس کی سطح پر ہریالی نظر آئے۔ اندر سے وہ سخت خوف زدہ، مضطرب اور شکستہ تھی۔ خود کو کمزور نہ پڑنے دینا اور ہسٹریا سے مغلوب نہ ہونا اس کی ضرورت تھی جس کے لیے وہ اپنے آپ سے لڑ رہی تھی۔ یہ اس کی خود اعتمادی تھی اور اعصاب کی مضبوطی تھی کہ ابھی تک خود پر اس کا پورا کنٹرول تھا۔ اس کے لیے سلمان خان کا نہ آنا ایک اور زبردست ذہنی اور جسمانی شاک تھا جسے وہ سہار گئی۔ اگر وہ آجاتا تو نورین زیادہ اعتماد کے ساتھ خود کو اس کے حوالے کردیتی اور اپنے ظاہر و باطن کی خانہ جنگی کے عذاب سے نکل آتی۔

اسے میں پھر نورین کی غیر معمولی ہمت، ذہانت اور خود اعتمادی ہی کہوں گا کہ اس نے مجھے دیکھا، تھوڑا سا پرکھا اور پھر فیصلہ کرلیا کہ مجھ پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ یہ فیصلہ درست تھا۔ اپنی زندگی کے تحفظ کی ذمے داری مجھے سونپ کر نورین نے بڑی حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس معاشرے کا سیٹ اَپ کیا ہے۔ یہاں اکیلی عورت کسی جنگل کے مسافر کی طرح ہے جو تہی دست ہو اور جنگل میں ہر طرف وحشی درندوں کا راج ہو۔ وہ افلاطون یا سکندرِ اعظم بننے کی لاکھ کوشش کرے، کسی مرد کے سہارے کے بغیر اس دنیا میں ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ وہ مرد باپ یا بھائی ہو، شوہر یا بیٹا، اس کے لیے باعزت محفوظ زندگی کی ضمانت بن جاتا ہے۔ نورین ان رشتوں سے محروم تھی چنانچہ اس نے میرے جیسے اجنبی کا سہارا قبول کرلیا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ خدانخواستہ اس کا اعتبار بھی بدقسمتی کے باعث فریب عقل و نظر ثابت ہوا تو ایک بار پھر وہ آخری حد تک جا کے مقابلہ کرے گی۔ پھر جان لینے یا دینے کا مرحلہ آئے گا تو وہ بلا مقابلہ ہتھیار نہیں ڈالے گی۔

نورین کو میں نے ایک چیلنج سمجھ کے قبول کیا تھا۔ یہ چیلنج خود میرے اعتماد کے لیے تھا۔ اس غیبی طاقت نے جو میرے شب و روز کے ہر خیال، ہر پل کے ہر ارادے اور

عمل پر اختیار رکھتی تھی۔۔اچانک مجھے پابند کردیا تھا کہ تم جواب تک صرف اپنی زندگی کا بارِ امانت اٹھائے ہوئے تھے، اب اس سے بڑی ذمے داری کا بوجھ اٹھاؤ گے۔ کیا میں انکار کرسکتا تھا؟ شاید نہیں۔ میں بزدل، کم ہمت اور بے ضمیر ہوتا تب بھی نہیں۔ اب تو میں یہ بھی سوچنے پر مجبور تھا کہ شاید اس کال کوٹھری سے مجھے سلامتی کے ساتھ باہر لانے کا مقصد بھی قدرت نے یہی رکھا تھا اور رات کے اندھیرے میں ایک آسیب زدہ حویلی تک مجھے یہ حفاظت راستہ دکھانے کی مصلحت بھی یہی تھی کہ نورین کو میری مدد درکار تھی۔ سلمان خان کی منزل آرہی تھی مگر وہ راہ میں ہی جان ہار گیا تھا۔ قدرت کے فیصلے کس کی سمجھ میں آتے ہیں۔

دشتِ خیال میں میرے بھٹکنے کا یہ مختصر وقفہ بھی نورین کو بہت طویل محسوس ہوا۔ اس نے پریشانی سے کہا۔ ”اب ایسے کب تک کھڑے مجھے دیکھتے رہو گے... چلو۔“

میں نے چونک کے خفت سے کہا۔ ”آئی ایم سوری۔ یہ وقت کچھ سوچنے کا نہیں ہے۔ اتفاقات اور گردشِ حالات سب قسمت کے کھیل ہیں۔ میں باہر جاکے دیکھتا ہوں پھر تم آجانا۔ ایک ساتھ باہر نکلے اور کسی نے دیکھ لیا تو خوامخواہ شک کرے گا۔“

اس نے چہرہ چھپایا اور میرے پیچھے چل پڑی۔ دیوار کے شگاف سے باہر آکے میں نے گلی کا جائزہ لیا۔ صرف ایک سائیکل سوار تھا جو مخالف سمت میں دائیں طرف جارہا تھا۔ بائیں جانب کوئی نہیں تھا۔ میں نے اتنی اونچی آواز میں کہ دیوار کی اوٹ میں چھپی ہوئی نورین سن لے، کہا۔ ”آجاؤ...“ اور وہ باہر آگئی۔ سرتاپا لٹھے کے سفید برقع میں روپوش ایک متحرک وجود جس پر کسی کو شک ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کے اندر وہی قاتل دلہن موجود ہے جس کی بھٹکتی روح کو گزشتہ رات بھی کچھ لوگوں نے دیکھا تھا اور وہ حلفیہ یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ ان کی نظر کا دھوکا نہیں تھا۔

میں نچلے متوسط طبقے کا عام سا بے ضرر آدمی لگتا تھا۔ کوئی کیسے سوچ سکتا تھا کہ اپنی بیوی یا گھر کی کسی باپردہ خاتون کے ساتھ سر جھکا کے چلنے والا یہ شخص جیل سے فرار ہوجانے والا ایک قیدی ہے جس کے لیے سزائے موت تجویز کردی گئی تھی۔ ابھی تک میں نے لوگوں کے تبصرے ضرور سنے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ قانون کی مشینری تمام مفرور مجرموں کی گرفتاری کے لیے پوری طرح حرکت میں آچکی ہے مگر اس حرکت کے عملی ثبوت مجھے کہیں نظر نہ آتے تھے۔ لوگ اسے جیل حکام اور پولیس کی ملی بھگت قرار دے رہے تھے۔ سب ڈراما ہے جی۔ لاکھوں وصول کیے ہوں گے ڈاکوؤں سے۔ چند روز معطل رہیں گے۔ بھاگ دوڑ سے زیادہ بیان بازی کریں گے پھر بات پرانی ہوجائے گی۔ سب بھول جائیں گے۔ جس ملک میں سارے ڈاکو آزاد گھوم رہے ہوں، وہاں سو پچاس جیل سے نکلنے والے شامل ہوجائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ شہر کی جانی پہچانی سڑکوں پر سے میرے ساتھ گزرتے ہوئے نورین کی کیا جذباتی کیفیت تھی۔ برقع کے اندر سے مجھے اس کے چہرے پر جذبات کا عکس کیا دکھائی دیتا مگر میں اس کی خاموشی سے اندازہ ضرور کرسکتا تھا کہ تقدیر کے اس سنگین مذاق پر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا ہوگا۔ دلہن کے لباس اور سولہ سنگھار میں ماتھے پر جھومر، کانوں میں جھلمل کرتے آویزے، گلے میں نیکلس، بازوؤں میں کھنکتی چوڑیاں پہنے اور اپنے حسنِ بے مثال کی ساری آب و تاب کے ساتھ بھی وہ سہاگن نہ تھی۔ اس کے پُرشباب وجود میں کسی شبِ عروسی کی آسودگی کے جذبات کا نشہ نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی کے کسی نئے ہم سفر کی بانہوں میں کسی حجلۂ عروسی کے پھولوں سے مہکتے اندھیرے میں محوِ خواب نہ تھی۔

وہ دکھی اور تنہا تھی۔ ایک پُرآسیب حویلی کے بھیانک ماحول میں رات بسر کرنے والی اکیلی لڑکی جیل سے فرار ہونے والے ایک مجرم کے ساتھ اپنا چہرہ چھپا کے اس شہر کی سڑکوں پر سرگرداں تھی جہاں اس کی زندگی کے گزرے ہوئے ماہ و سال کی یادیں ہر قدم پر اسے اجنبی نظروں سے تکتی ہوں گی۔ دنیا کی نظر میں وہ بیوہ تھی۔ خود اپنے شوہر کے خون سے ہاتھ رنگ کر گھر سے بھاگی ہوئی عورت تھی۔ خود اپنی نظر میں وہ نورین کے سوا کچھ بھی نہ تھی۔ وہ نورین جس نے ایک مخبوط الحواس انسان نما جانور کو تمام عمر کے لیے اپنا مجازی خدا قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ جو کسی کی بیوی نہ تھی اور جس نے زبردستی اس سے شوہر ہونے کا حق حاصل کرنا چاہا تھا، اسے وہ قتل کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ اب وہ آزاد تھی مگر تنہا تھی۔ ایک ایسی عورت تھی جو جینا چاہتی تھی۔ اپنی زندگی پر اپنا حق تسلیم کرنا چاہتی تھی مگر اس کے لیے وہ ایک اجنبی کا ہاتھ تھامنے پر مجبور ہوگئی تھی کیونکہ اب اس کے اپنے سارے خون کے رشتے اور جذبات کے ناتے ختم ہوچکے تھے۔ دنیا کے لیے وہ ایک گناہ گار اور مجرم کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس کے ارد گرد سارے دشمن تھے جو اسے پہچان جاتے تو گھیر کر کشاں کشاں تختۂ دار تک لے جاتے۔

خود میں کیا تھا؟ بہ ظاہر ایک بہادر مرد جو نورین کا سہارا بن کر اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کا محافظ تھا اور اس کے ساتھ چلتے ہوئے مطمئن اور بے خوف نظر آنے کی پوری کوشش بھی کر رہا تھا مگر اندر سے خوف نے میرے دل میں بھی اپنے پنجے گاڑ دیے تھے۔ ایک نامعلوم سا ڈر میرے وجود میں گردش کرنے والے خون میں شامل تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے ہر نظر مجھ پر ہے۔ ہر آنکھ مجھے گھور رہی ہے۔ پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں مجرم تھا اور جرم میرے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔

میں مسلسل اپنی بے گناہی کا تاثر دیتے ہوئے تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا۔ بھاگ رہا تھا کہ کہیں اچانک کوئی مجھے پہچان نہ لے۔ ایک آواز پکار کر کہے کہ پکڑو اسے... یہ تو وہی مفرور قاتل ہے۔ پھر ہر آواز اس شور میں شامل ہو جائے۔ پکڑو... پکڑو...

اچانک نورین نے پیچھے سے میرا بازو پکڑ کے کھینچا۔ ''آہستہ چلو خاور... مجھے بھاگنا پڑ رہا ہے تمہارے ساتھ۔ میں اتنا تیز نہیں چل سکتی۔'' اس نے ہانپتے ہوئے سرگوشی کی۔

میں نے رک کر اسے شرمندگی سے دیکھا۔ ''آئی ایم سوری۔''

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ میرا کچھ خیال ہی نہیں۔ اتنی دیر سے میں کہہ رہی ہوں کہ آہستہ چلو۔ تم بھاگے جا رہے ہو۔''

اچانک لہجہ بدل کے میں نے اسے خالص شوہروں والے انداز میں ڈانٹا۔ ''اب اتنے سے فاصلے کے لیے کیا میں سواری لاتا؟ چلا نہیں جاتا تم سے تو بازار آنے کی کیا ضرورت تھی میرے ساتھ۔''

قریب سے گزرنے والے ایک شخص نے جس کے چہرے پر سفید داڑھی بزرگی کی علامت تھی، مجھے شفقت سے سمجھانا ضروری سمجھا۔ ''بیٹا، عورت کے لیے مشکل ہوتا ہے مرد کی تیز رفتاری کا ساتھ دینا۔''

اسے کوئی جواب دیے بغیر میں ایک دکان میں گھس گیا۔ اب ہم بازار میں تھے۔ دن کی دھوپ کے ساتھ تمازت بڑھ گئی تھی اور مجھے گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ دوپہر ہونے کو تھی مگر اب بھی کچھ دکان دار اپنی دکانیں کھول رہے تھے۔ اپنی صورت نہ دکھانے کا نورین کے پاس ایک ہی عذر ہو سکتا تھا کہ وہ سختی سے پردے کی پابند ہے۔ اپنی پسند اور اپنے سائز کے حساب سے کپڑوں کا انتخاب خود اس نے کیا۔ میں ایک سخت گیر یا بیزار شوہر کی طرح لاتعلق بیٹھا رہا۔ نورین نے دکان میں گھوم پھر کے چند جوڑے منتخب کیے۔ ''یہ ٹھیک ہیں... لے لوں؟''

میں نے رکھائی سے کہا۔ ''پہننے تجھے ہیں، مجھ سے کیا پوچھ رہی ہے؟''

''قیمت بہت زیادہ ہے، کہیں اور دیکھ لیں۔'' اس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

''اتنا ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔ قیمت کی بات ان سے کر لیتے ہیں۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔

دکان کے مالک نے میرا موڈ دیکھ لیا تھا۔ اس نے خود ہی قیمت کم کر دی۔ نورین نے ابھی برقع کے اندر اپنا بیگ کھولا ہی تھا کہ میں نے ایک جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور دو نوٹ الگ کر کے دکان دار کو دے دیے۔ دکان میں موجود سب لوگوں کی نظر ہی نہیں برقع کے اندر سے نورین کی نظر بھی لاکھوں کی مالیت رکھنے والے نوٹوں پر جم کے رہ گئی تھی۔ مجھے اپنی غلطی بلکہ بے وقوفی کا احساس ہوا۔ مجھے کچھ رقم پہلے سے الگ کر کے رکھ لینی چاہیے تھی۔ دکان دار نے باقی رقم واپس کرتے ہوئے مجھے ایک مخلصانہ سا مشورہ دیا کہ میں اس دولت کی یوں سرِعام نمائش نہ کروں۔ ''زمانہ خراب ہے اور آپ نے بھی سنا تو ہوگا... جیل سے جو مجرم فرار ہوئے ہیں، ان میں چور ڈاکو بھی تھے۔ وہ بھی شہر میں ہی ہوں گے ابھی۔''

''ٹھیک کہا آپ نے۔'' میں نے غلطی کا اعتراف کر لیا۔ ''میں خیال رکھوں گا۔''

دکان سے باہر آتے ہی نورین نے مجھے پکڑ لیا۔ ''اتنے پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟ تم نے تو پوری چھولے کے لیے بھی مجھ سے پیسے مانگے تھے۔''

میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''اس وقت کھلے پیسے نہیں تھے میرے پاس۔ پیسے میرے اپنے ہیں۔''

سڑک پر چلتے ہوئے اس سے زیادہ بحث یا وضاحت ممکن نہیں تھی۔ میں نے دوسری دکان سے اپنی ضرورت کے مطابق کپڑے خریدے۔ پھر ہم جوتوں کی دکان میں گئے۔ ہم نے اپنی اپنی ذاتی ضرورت کی کچھ چیزیں لیں۔ رفتہ رفتہ میرے اور نورین کے ہاتھوں میں شاپنگ بیگ اتنے زیادہ ہو گئے کہ انہیں اٹھا کے پھرنا مشکل ہو گیا۔ ویسے بھی دوپہر ڈھلنے کے قریب تھی۔ تھکن اور گرمی کے ساتھ میں بھوک بھی محسوس کر رہا تھا۔ ایک دکان سے مجھے معمولی سے استعمال شدہ سوٹ کیس مل گئے۔ یہ سعودی عرب یا دبئی جیسے ملکوں

سے ہمارے پاکستانی بھائی لاتے تھے اور امپورٹڈ کہلاتے تھے۔ ان کی کوالٹی بہتر ہوتی تھی لیکن قیمت کم۔ میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے پاس بالکل نئے چمکتے دمکتے سوٹ کیس ہوں۔ اپنے تمام شاپنگ بیگز ان سوٹ کیسوں میں ڈال کے میں نورین کے ساتھ درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں داخل ہو گیا جس کی نچلی منزل پر کشادہ ریسٹورنٹ تھا۔ یہاں ایک حصہ فیملیز کے لیے وقف تھا اور اس میں بھی پلائی ووڈ کے پارٹیشن سے کیبن بنا دیے گئے تھے۔ ویٹر نے اسی وقت خالی ہونے والے کیبن کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ دونوں سوٹ کیس وہیں کاؤنٹر کے قریب منیجر کی نگرانی میں چھوڑ دوں... ہر کیبن کے دروازے پر ایک پردہ تھا جو اندر بیٹھی ہوئی فیملی کو ہال کی پبلک کی نظروں سے تحفظ فراہم کرتا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی نورین نے سب سے پہلے برقع اتار کے ساتھ والی کرسی پر ڈالا اور سکون کا گہرا سانس لیا۔ اچھی بات یہ تھی کہ برقع کے اندر رہتے ہوئے اس نے اپنا سارا زیور اتار کے ہینڈ بیگ میں ڈال دیا تھا اور عروسی جوڑے کے گوٹے کناری والے سرخ دوپٹے کو ہٹا کے سر کو نئی خریدی ہوئی سفید چادر سے ڈھک لیا تھا۔ اس چادر نے سرخ جوڑے کے بالائی حصے کو بھی چھپا لیا تھا۔

''اور کچھ دیر اس خیمے کی قید میں رہتی تو میرا دم گھٹ جاتا۔'' اس نے میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور غٹاغٹ پی گئی۔

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''مغربی آزاد خیالی نے بگاڑ کے رکھ دیا ہے پاکستان میں دخترانِ اسلام کو۔''

''ڈرو تم بھی۔ ہمارا کیا ہے، برقع کے اندر کچھ بھی کریں، کچھ بھی پہنیں یا نہ پہنیں۔'' اس نے روانی میں کہہ دیا اور پھر خود ہی شرم سے سرخ ہو گئی۔

ویٹر ایک مینیو کارڈ کے ساتھ نمودار ہوا اور نورین سے آرڈر لے کر چلا گیا تو میں نے کہا۔ ''یہ تم نے اچھا کیا کہ اپنا دلہن کا گیٹ اپ بدل لیا۔''

''تمہارے ساتھ اس شہر کی سڑکوں پر اور بازاروں میں پھرنا مجھے بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ جب میں چھوٹی تھی تو یہ بازار بھی چھوٹے تھے۔ میں گھر والوں کے ساتھ ہر جگہ آتی جاتی رہی۔ زیادہ تر دکان داروں کو بھی میں جانتی ہوں۔ کچھ اب بھی وہی ہیں۔ شاید برقع نہ ہوتا تو وہ بھی مجھے پہچان سکتے تھے۔ مثلاً یہ دکان جہاں سے میں نے کپڑے لیے، ابا کے ساتھ میں نے یہاں سے کئی بار عید کے کپڑے لیے، اسکول یونیفارم لی۔ پہلے اس کا باپ تھا اور دکان بھی اتنی بڑی نہیں تھی۔ پھر کالج میں پہنچی تو پابندیاں عائد ہو گئیں۔ میں اکیلی کہیں نہیں جاتی تھی۔ پردہ نہیں کیا اس لیے سلمان خان سے بھی ملتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ آج تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ احساس ہی کتنا عجیب ہے۔ یہ برقع نہ ہوتا تو میں ان سب لوگوں کی نظروں میں دھول کیسے جھونک سکتی تھی۔ یہ چھوٹا شہر نہیں مگر پھر بھی چھوٹا ہے۔ یہاں ایک قتل ہو جائے تو خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہے۔''

''میں نے کسی کو بھی اس قتل پر تبصرہ کرتے نہیں سنا...''

''شاید ایک بہت بڑی واردات کی خبر نے اس کی اہمیت ختم کر دی۔ لوگ جیل توڑ کے فرار ہونے والے ڈاکوؤں کی بات کر رہے تھے۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''اگر اس دکان دار کو معلوم ہو جاتا کہ تم کون ہو اور کس کے ساتھ ہو؟''

نورین مسکرائی۔ ''شاید اسے دل کا دورہ پڑ جاتا۔ مگر تم صورت سے ڈاکو نہیں لگتے۔''

''ہم سب کے ذہن میں ڈاکو کا ایک جیسا تصور ہے۔ خوفناک شکل، خونی آنکھیں، منہ پر ڈھاٹا۔ جھاڑ جھنکاڑ داڑھی اور بڑی بڑی مونچھیں۔ بدوضع شلوار قمیص اور کندھے پر کلاشنکوف۔ اب اس تصور کے مقابلے میں تم ان...... کی صورت دیکھو جو اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے پچاس سالوں سے اس ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''میں تو تمہیں دیکھ رہی ہوں... تم پر کون شک کر سکتا ہے۔''

''میرے ساتھ تم جیسی شرافت کی سند بھی ہے۔ تمہاری حسین اور معصوم صورت دیکھ کر...''

''ہاں ہاں، چپ کیوں ہو گئے؟ کہہ دو کہ میں بھی تو صورت سے قاتل نہیں لگتی... یہی کہنا چاہتے تھے نا تم...''

کھانا لانے والے ویٹر کی بروقت مداخلت نے اچانک ناخوشگوار ہو جانے والی صورتِ حال کو مزید خراب ہونے سے بچا لیا۔ میں نے اس کے جاتے ہی کہا۔ ''آئی ایم سوری نورین... مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''غلطی میری تھی...''

''چلو کھانا کھاؤ۔ آئندہ ہم دونوں احتیاط سے کام لیں گے... ہمارا کون سا زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ یہ چند دن کی ذمے داری ہے۔ پھر ہم کہاں اور تم کہاں۔ سلمان خان کے ساتھ تم دبئی چلی جاؤ گی۔''

''میری ایک بات مانو گے؟'' اس نے اپنا ہاتھ

میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”ایک بات؟ مجھے تمہاری ہر بات ماننی پڑے گی۔ میں انکار کیسے کرسکتا ہوں۔“

”تم بھی دبئی آجاؤ۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”یعنی دبئی میں ڈاکے ڈالوں؟ یہی چاہتی ہو نا تم... مشورہ تو بے حد پریکٹیکل ہے۔ مال دار تو وہیں ہیں... خرابی یہ ہے وہاں نہ ہماری پولیس ہے اور نہ یہ نظام انصاف۔ وہ فوراً پکڑ لیتے ہیں اور ہاتھ کاٹنے میں دیر نہیں کرتے۔“

”فضول باتیں مت کرو۔“ اس نے خفگی سے کہا۔ ”میرے ساتھ جو ہوا حادثہ تھا اور اس حادثے کے بعد میری زندگی بدل جائے گی۔ میں ہنسی خوشی سلمان خان کے ساتھ باقی زندگی اپنی مرضی سے گزاروں گی۔ اپنے بچے پالوں گی، پھر ان کے بچے، نانی دادی بنوں گی اور بس۔ میری زندگی کے خواب متعین ہیں۔“

میں نے چشم تصور سے سلمان خان کی اکڑی ہوئی سرد لاش کا تصور کیا جو اب آسیب زدہ ویران حویلی کی تاریکی میں لاوارث پڑی تھی۔ ”تمہیں اتنا یقین ہے کہ تمہیں اپنے ہر خواب کی تعبیر ملے گی؟“

”کیا مطلب؟... اتنی بڑی قیمت اور کس لیے ادا کی ہے میں نے۔“

میں اس معصوم یا بے وقوف لڑکی کے خوابوں کا شیش محل وہیں ایک بے رحم حقیقت کے سنگ گراں سے ریزہ ریزہ کرسکتا تھا مگر میں ڈر گیا... نہیں... آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ، وقت گزرنے کے ساتھ اس کے تصورات کے سارے حسین رنگ از خود حالات اور حقائق کی سیاہی میں ڈوب جائیں گے۔ ابھی اسے کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے جب وہ ایک صدمے سے دوچار ہے۔ اس کے اعصاب یہ دوسرا شاک کیسے برداشت کرپائیں گے؟ وہ اندر باہر سے ٹوٹ جائے گی۔ بکھر جائے گی اور پھر مرجائے گی۔ وہ زندگی جس کے لیے اس نے اپنے ہاتھ خون سے رنگے کے قاتل بننا بھی منظور کیا تھا، اسے پہلے ہی دھوکا دے چکی تھی۔ جواری کو اگر بازی لگاتے ہی ہار کی خبر دے دی جائے تو...

نورین نے میرے خیالات کے گرداب میں پتھر پھینک دیا۔ ”ایسے کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟ کھانا کھاؤ۔“

میں چونکا۔ ”میں تمہارے سوال پر غور کررہا تھا۔ رفتہ رفتہ تمہیں میری اس عادت یا کمزوری کا اندازہ ہوجائے گا جو شاید خلل ہے دماغ کا۔ میں پتا نہیں کیا سوچنے لگ جاتا ہوں۔ میرے خیالات کی رَو بے لگام ہوجاتی ہے۔ اب دیکھو، تم نے بڑا سیدھا سا سوال کیا تھا مگر میرا ذہن چلا گیا اپنے بھائی کی طرف۔ اس کے بھی کچھ خواب تھے۔ تعبیر کی اس نے بڑی بھاری قیمت ادا کی۔ اپنی زندگی تک ہار گیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے وجود سے جذبات کے اور خون کے کئی رشتے جڑے ہوئے تھے۔ وہ سب بھی ہار گئے۔ جیسے ہنڈولا، ہنڈولا دیکھا ہے نا؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”بچپن میں بہت بیٹھی ہوں اس میں۔“

”پہلے تو ہنڈولے کے بغیر کسی کا بچپن مکمل ہی نہیں ہوتا تھا۔ گاؤں دیہات اور چھوٹے شہروں کے کسی میلے کا تصور کرو یا لندن کے اس دیوہیکل فولادی پہیے کا جو لندن آئی (EYE) کہلاتا ہے۔ کتنے لوگ اس میں سوار ہوتے ہیں۔ وہ مسرت، سنسنی اور لطف ایک ہی جذبہ ہوتا ہے جب ہنڈولا یا وہ مشینی پہیا نیچے سے اوپر جاتا ہے اور پھر اوپر سے نیچے آتا ہے۔ لوگ ہنستے بھی ہیں اور خوف سے چلاتے بھی ہیں۔ آس پاس کتنے لوگ اس نظارے میں شامل ہوتے ہیں۔ ان کے ماں باپ، دوست اور عزیز و اقارب جو جھولے میں بیٹھے ہیں اور وہ جو باری کے منتظر ہیں۔ اچانک ہنڈولا ٹوٹ جائے تو... یہ کوئی سوچتا ہے؟“

وہ مجھے تکتی رہی۔ ”تم... فلسفی نہیں، خبطی ہو۔“

”کیا خبطی ہونا بری بات ہے۔ تم بھی تو خبطی ہو... کیا چیز ہے وہ سلمان خان جس کی فکر میں تم نے ایک قتل کردیا اور گھر چھوڑ کے نکل آئیں۔“

”تم نے کبھی محبت کی ہے کسی سے... عشق کیا ہے؟“

”وہ تو سنا ہے ہوجاتا ہے۔ کرنے کی چیز نہیں... ویسے دیکھا جائے تو ہوتا رہتا ہے۔“

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”تم اتنے دل پھینک ہو... جو لڑکی نظر آئے...“

”لاحول ولاقوۃ... میں نے لڑکی کب کہا ہے۔ مجھے اپنی دادی سے پہلا عشق ہوا۔ ان کے مرنے پر میں خود مرنے کے قریب ہوگیا تھا۔ اس سے بھی پہلے ایک بلی سے عشق ہوا تھا۔ کچھ کتابوں سے عشق ہوا تو...“

وہ پہلی بار کھلکھلا کر ہنسی۔ ”سچ بتاؤ، جو کہانی تم نے اپنے بارے میں کل رات سنائی تھی، وہ جھوٹ تھی نا؟“

”نہیں... جھوٹ میں ضرور بولتا ہوں...“

”تم جیل سے فرار ہوئے تھے۔ قتل کا الزام تھا تم پر... پھانسی ہونے والی تھی... یہ جھوٹ تھا؟“

”اس میں کوئی جھوٹ نہیں تھا۔ میں تھا قیدی نمبر ون ڈو تھری۔ میری جیل کی وردی نہیں دیکھی تھی تم نے؟ نہیں دیکھی ہوگی۔ جب میں آیا تھا تو رات تھی اور اس جگہ تو دن میں بھی رات رہتی ہے۔ میں نے اس لباسِ فاخرہ کو چھپانے کے لیے چوری کیے ہوئے کپڑوں کا ایک جوڑا اوپر چڑھا رکھا تھا۔“

”تم اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہو...“ اس نے سوالیہ لہجے میں تبصرہ کیا۔

”اگر تمہاری مراد ڈگری سے ہے... تو ہاں... میں سولہ جماعت پاس یعنی ایم اے ہوں مگر یہ غیر اہم ہے۔ مجھ سے کہیں زیادہ تعلیم یافتہ بھی جیل میں ہیں... وہاں صرف ان کا جرم شمار ہوتا ہے۔“

اس نے قدرے حیرانی سے سر ہلایا۔ ”تم قاتل بھی نہیں لگتے۔“

”اگر میں اسی طرح تمہیں اپنی نظر سے دیکھوں.. تو تمہاری سادگی اور معصومیت کی قسم کھالوں۔ پھر کیا وہ کہانی سب جھوٹ تھی جو تم نے مجھے سنائی تھی؟“

وہ چپ چاپ سر جھکائے کھانا کھاتی رہی۔ پھر بولی۔ ”اتنی بڑی رقم تمہارے پاس کہاں سے آئی؟ اگر میں مان لوں کہ نہ تم نے چوری کی نہ ڈاکا ڈالا... وہ تمہارے اپنے پیسے تھے... مگر تم آدھی رات کے وقت جیل سے فرار ہوئے... رات بھر میرے ساتھ اس حویلی میں چھپے رہے۔ نہ کسی سے ملنے کہیں گئے... صبح دس پندرہ منٹ کے لیے گئے تھے تو ناشتا لے کر لوٹ آئے تھے۔ اس وقت بھی بینک تو کھلے ہوئے نہیں تھے۔ یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ اتنی بڑی رقم جیل میں تمہارے پاس ہو۔“

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اپنی دولت میں نے کہیں گاڑ رکھی تھی... باہر آکے نکال لی۔“

”پیسا کون گاڑ کے رکھتا ہے۔“

”تمہیں کیا معلوم؟ سارے چور ڈاکو رکھتے ہیں۔ خفیہ ٹھکانوں پر کیونکہ حالات کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ ضرورت کے وقت بینک نہیں جاسکتے... اور یہ صرف ان کی بات نہیں جو قانون کی نظر میں چور ڈاکو ہیں... انہیں ایسا سمجھنے والے... چور ڈاکو بنانے والے... انکم ٹیکس چور... رشوت کا مال رکھنے والے... سب کالا دھن رکھنے والے ایسا کرتے ہیں۔ ان کی تجوریاں بھری ہوئی ہوتی ہیں اور وہ تجوریوں کو خفیہ رکھتے ہیں... ملک کے اندر اور باہر فرضی ناموں سے درجنوں اکاؤنٹ، خفیہ تجوری نہیں ہیں تو کیا ہیں۔“

”چلو نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ۔“ وہ بُرا مان کے بولی۔

میں بھڑک اٹھا۔ ”آخر کیوں بتاؤں میں تمہیں؟ تم کون ہوتی ہو مجھ سے حساب مانگنے والی اور یہ پوچھنے والی کہ میرے پاس جو بھی ہے کہاں سے آیا ہے؟“

اس کا چہرہ اتر گیا۔ ”آئی ایم سوری... مجھے واقعی کوئی حق نہیں پہنچتا۔“

میں نے نرمی سے کہا۔ ”دیکھو نورین... میں نے تمہیں تحفظ فراہم کرنے کی ذمے داری قبول کی ہے۔ عارضی طور پر... کیونکہ شامتِ اعمال مجھے وہاں لے آئی تھی... اور جب تم نے مدد مانگی تو میں انکار نہیں کرسکا تھا۔ اسے بے وقوفی کہو میری یا کمزوری۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تم نے جو بھی کہا... میں نے مان لیا... کسی تصدیق تفتیش، سوال جواب اور شک وشبہ ظاہر کیے بغیر۔ تم نے بھی قابلِ اعتماد نہ سمجھا ہوتا مجھے تو کچھ نہ بتاتیں۔ یہ اعتماد ہی آئندہ بھی برقرار رہنا چاہیے۔ اس پر ہمارے تعلق کی بنیاد ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں اب تک نہیں ہوا تو بہت جلد ہوجائے گا کہ تم نے مجھ پر اعتماد کیا تو کوئی غلطی نہیں کی تھی۔“

وہ لجاجت سے بولی۔ ”چلو یہ ناراضی ختم کرو۔ اندازہ ہوگیا ہے کہ تم پر بھروسا کرکے میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ ہاں شاید عورت ہونے کے ناتے میں اس اعتماد میں اپنی حد سے آگے بڑھ گئی تھی۔“

”کچھ دن میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔“ میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔

”یہ کچھ دن کتنے دن ہوں گے خاور...“

”یہ پوچھو اپنے سلمان خان سے... میں کیا بتاؤں؟“

”تم نے دبئی آنے کی بات کو مذاق میں ٹال دیا۔ ہم سب ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ دنیا میں نہ میرا کسی سے کوئی رشتہ ہے... نہ تمہارا... اگر ہم اپنے ماضی کو یہیں چھوڑ کے چلے جائیں، کہیں دور نکل جائیں یہاں سے۔“

”ابھی... بغیر بل ادا کیے؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ناممکن...“

اس نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے برقع کو سر پر ڈالا۔ اپنی بات کے پھر مذاق میں اڑائے جانے پر اس کا منہ سوج گیا تھا۔ باہر آتے ہوئے میں نے سوچا کہ صرف چوبیس گھنٹے پہلے میں کہاں تھا، کیا کررہا تھا اور کیا کرنا چاہتا تھا...

صرف چوبیس گھنٹے پہلے نورین کہاں تھی، کیا کر رہی تھی اور کیا کرنا چاہتی تھی۔ یکلخت سب کچھ بدل گیا تھا۔ میرے مستقبل کے سارے منصوبے، شیڈول اور پلان جو میں نے بڑی محنت سے اور بڑی تفصیل سے معمولی جزئیات پر بہت غور کر کے، ہر قسم کے امکانات کو سامنے رکھ کے تیار کیے تھے، یکلخت ایک دستِ غیب نے اٹھا کے یوں ایک طرف ڈال دیے تھے جیسے کوئی پرانا تجربہ اور اختیار رکھنے والا بیورو کریٹ کسی حکومتی منصوبے کی فائل کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا ہے جس میں کسی نوجوان پُرجوش اور باصلاحیت ماتحت نے تمام تفصیلات دن رات کی عرق ریزی سے جمع کی ہوں... اب کیا ہوگا؟ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا۔

صورتِ حال نورین کے لیے بھی مختلف نہ تھی۔ بہت کچھ تھا جو ابھی اس کے علم میں نہ تھا اور میں نے اس سے چھپالیا تھا۔ اس ڈر سے کہ پوری حقیقت جان لینے کے بعد اس کا ردِعمل میرے لیے مصیبت بن جائے گا۔ لیکن جتنا وہ جانتی تھی، وہ بھی کم پریشان کن نہ تھا۔ شاید یہ عورت، مرد کی فطرت کا فرق ہوگا۔ اس نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا جو اس پر شوہر کا حقِ ملکیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ اسے وہ سہارا ابھی میسر نہ آیا تھا جس پر بھروسا کر کے وہ اکیلی اس دنیا کے جنگل میں نکل آئی تھی۔ اب وہ ایک مکمل اجنبی، جیل کے سزا یافتہ اور مفرور قیدی کے ساتھ پھر رہی تھی اور بہ ظاہر ذہنی طور پر بھی اتنی پریشان نہیں تھی جتنا میں تھا۔ لڑکیاں تو ذرا ذرا سی بات پر خوف کے ہسٹریا کا شکار ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ اتنی پُرسکون اور مطمئن کیسے تھی؟ جواب ان سارے سوالوں کا یہی ہو سکتا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی لڑکی تھی جبکہ میں نے کبھی خود کو غیر معمولی مرد نہیں سمجھا تھا۔ یا اس اطمینان کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنی ذمے داری مجھ پر ڈال دی تھی اور بے فکر ہو گئی تھی۔ دہری آزمائش تو صرف میرے لیے تھی۔ اس کے حصے کی فکریں اور پریشانیاں بھی میں اٹھا رہا تھا۔

اس کے بڑے سوٹ کیس کو میں نے اٹھالیا تھا۔ اٹھانا شاید صحیح لفظ نہیں... اس میں ایک طرف وہ ہینڈل تھا جو کھینچنے سے باہر آجاتا تھا... دوسری طرف بڑے مضبوط رولر تھے چنانچہ میں اسے اپنے پیچھے گھسیٹ رہا تھا۔ نسبتاً زیادہ آسانی سے وہ میرے چھوٹے بیگ کو کھینچتی چل رہی تھی۔ بازار میں ہمیں کوئی بھی دیکھنے والا یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ ہمارے درمیان صرف اجنبیت کا رشتہ ہے اور ہمارے تعلق کی عمر ایک دن بھی نہیں۔ مجھے ابھی تک شہر میں کہیں نہ پولیس مستعد نظر آئی تھی اور نہ کوئی ہلچل۔ میرے ساتھ نکلنے والے سب میری طرح روپوش ہو چکے تھے۔ شاید ایک میں ہی اتنا احمق اور بہادر تھا کہ صرف لباس بدل کے خود کو محفوظ سمجھ بیٹھا تھا اور ایک نئی نویلی دلہن کے ساتھ اس شہر کے بازار میں شاپنگ کرتا پھر رہا تھا۔ جب میں نے غور کیا تو مجھے ماننا پڑا کہ میری اصل ڈھال تو خود نورین تھی۔ اس بے فکری سے میں اکیلا نہیں پھر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ مجھے دیکھ کر خود جیلر صاحب بھی مجھ پر نظر ڈالے بغیر نکل جاتے۔ میں ایک عزت دار فیملی والا شریف آدمی ہو گیا تھا۔

بالآخر میرے ضبط کا حوصلہ جواب دینے لگا۔ دوپہر سے شام ہونے لگی تھی مگر نورین کا خریداری کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اپنی پوری کوشش کے باوجود میں سلمان خان کے خیال سے پیچھا چھڑانے میں ناکام تھا۔ کسی بھوت کی طرح اس کا تصور میرے سامنے آجاتا تھا۔ کیا وہ اب بھی وہیں پڑا ہوگا؟ اسی حالت میں... چیونٹیاں اس کے بدن پر دوڑنے لگی تھیں۔ انہیں پیٹ بھرنے کے لیے گوشت مل گیا تھا۔ کل تک یہ گوشت بُو دینے لگے گا... لاش خود پولیس کو اور اپنے وارثوں کو بلالے گی۔ قتل کی ایک اور واردات اس چھوٹے سے شہر کو جھنجوڑ دے گی۔ کچھ عجب نہیں اگر ان کے درمیان تعلق بھی سامنے آجائے۔ عشق کب راز رہتا ہے... صرف عشق کرنے والے خوش فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں... بالآخر وہ دو جمع دو کرنے والے اعلان کر دیں گے کہ لڑکی جو اپنے شوہر کو سہاگ رات میں قتل کر کے بھاگی تھی، وہ اسی نوجوان کے ساتھ نظر آتی تھی۔ پھر نورین اور سلمان خان کی کہانی عام ہو جائے گی۔ کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی... نہ جانے کہاں سے مہدی حسن نے پروین شاکر کا شعر مجھے گا کر سنایا۔ میں چونک پڑا۔ کیسٹ کہیں اور بج رہا تھا۔

''نورین... خدا کے لیے بس کرو۔'' میں نے... بہ آوازِ بلند ہو کے کہا۔ ''کب تک چلے گا یہ سلسلہ؟''

''تم ہی نے کہا تھا کہ ضرورت کی ہر چیز لے لو، وہی کر رہی ہوں۔''

''میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آج ہی لے لو سب... اور ضروریات کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔''

نورین نے خفگی سے کہا۔ ''تمہیں کیا معلوم کہ میری ضرورت کیا ہے... میں تو اس لیے کر رہی تھی کہ کل پھر کسی معمولی سی چیز کے لیے نہ نکلنا پڑے۔''

''کیا مطلب... ہم کہیں قلعہ بند ہو کے بیٹھ گئے تو پھر باہر نہیں آئیں گے...؟''

''اچھا اچھا... چلو... کہاں جانا ہے۔''

سکھر میں ہوٹل بہت تھے لیکن اکثریت میرے نزدیک ایسے ہوٹلوں کی تھی جہاں عام لوگ عارضی قیام کرتے ہیں۔ کچھ دوسرے قصبوں یا دیہات سے کسی کام کے لیے آتے تھے۔ کبھی کچہری میں پیشی پر تو بعض اوقات ڈسٹرکٹ اسپتال میں کسی عزیز کی وجہ سے۔ کچھ یقیناً ایسے بھی ہوں گے جہاں عیاشی کو ضرورت سمجھنے والے کسی مجبور کے جسم سے ایک رات کا رشتہ قائم کرتے ہوں گے تو اسے بھی دنیا سے یوں ہی چھپاتے ہوں گے کہ ہوٹل کے رجسٹر میں میری طرح فرضی نام سے اندراج کرائیں۔ مجھے ایسے بدنام ٹھکانوں کا بھی علم نہ تھا تاہم اتنا اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ مفرور مجرموں کو تلاش کرنے والے ایسے ہی ٹھکانوں کا رخ کریں گے۔ جیل سے فرار ہونے والا عام مجرم کسی فور فائیو اسٹار ہوٹل میں داخل نہیں ہو سکتا۔ نہ خود اس میں صفِ مجرماں سے نکل کر معاشرے کے اعلیٰ عزت داروں میں شامل ہونے کا حوصلہ ہوتا ہے اور نہ وہ حلیے سے اتنا معزز اور بااعتماد لگتا ہے۔ اس سے بھی بڑا مسئلہ بڑے ہوٹلوں کے بڑے کرائے کا ہوتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے والے مفلس اور قلاش ہوتے ہیں۔ ان میں خود میں بھی شامل تھا لیکن اب نہیں... دونوں جیبوں میں بھرے ہوئے دس لاکھ کے نوٹوں نے بھی مجھے پُراعتماد بنا دیا تھا۔

پرانے کوٹ یا چشمے سے میری شخصیت کا تاثر خراب نہیں ہوتا تھا۔ کوٹ پرانا نہیں لگتا تھا اور چشمہ دیکھنے میں بیش قیمت ضرور نظر آتا تھا۔ اس کے زیرو نمبر والے شیشوں سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ یہ کوئی شوقین مزاج صرف فیشن کے لیے استعمال کرتا ہوگا یا پھر اسٹیج ٹی وی میں ڈرامے کے کسی کردار نے فرضی ضرورت کے لیے یہ چشمہ استعمال کیا ہوگا۔ مرحوم سلمان خان لباس کے معاملے میں خوش ذوق ہوگا۔ اس کی ٹی شرٹ بھی مہنگی تھی اور جینز بھی۔ مجھے اس کے تقریباً نئے جاگرز بھی فٹ آگئے تھے۔ اپنے سر سے گلگتی ٹوپی ہٹا کے میں دیکھنے میں معزز حلیہ اختیار کر سکتا تھا۔ ہم معاشرتی طور پر لباس اور حلیے سے انسانوں کو عزت و تکریم دینے کے عادی ہیں۔ اگر وقت ہوتا تو سوٹ پہن کے اور ٹائی لگا کے میں مزید محترم بن جاتا اور اپر کلاس ہوٹلوں میں قیام کے لیے اپر کلاس کا نظر آنا ہی شکوک سے بچاتا ہے۔

مسئلہ صرف نورین کا تھا جس کے ساتھ میں اپر کلاس کا نظر نہیں آسکتا تھا۔ صرف اس کے قدیم وضع کے برقع کی وجہ سے۔ اور برقع بہرحال اس کو شناخت سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ میں سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ سکھر کا واحد فائیو اسٹار ہوٹل شہر سے کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے واقع تھا۔ دریا پر بنے ہوئے تفریحی پارک لبِ مہران کے بعد...

میرے ساتھ چلتے ہوئے نورین نے میری خاموشی کا مطلب کچھ اور لیا۔ ''کیا بات ہے... ابھی تک غصے میں ہو؟''

میں نے کہا۔ ''غصہ کس بات کا...؟''

''پھر اتنی دیر سے چپ کیوں ہو... میں سمجھی میری زیادہ شاپنگ سے موڈ خراب ہو گیا تمہارا۔''

''شاپنگ کرنا خواتین کا حق ہے اور شاپنگ کرانا مردوں کا فرض... لیکن میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ چلو کہیں بیٹھ کے بات کرتے ہیں... چائے پیتے ہیں کہیں۔''

''شام کے وقت مجھے بھی عادت ہے...'' وہ بولی۔

ایک تانگے نے ہمیں دریا کنارے واقع لبِ مہران کے سامنے اتار دیا۔ ریسٹورنٹ دروازے کے نزدیک ہی تھا۔ لوگ اس کی چھت پر لگی کرسیوں پر بیٹھنے کو ترجیح دیتے تھے جہاں سے دریا کا منظر بہتر نظر آئے چنانچہ اوپر ویسے ہی جگہ نہ تھی۔ نیچے والے ہال میں بھی دریا کے رخ پر کھلنے والی کھڑکیوں کے ساتھ لگی میزوں پر بھی لوگ قابض تھے۔ ہم مخالف سمت میں نسبتاً کم روشن گوشے کی میز پر بیٹھ گئے تو چائے پیتے ہوئے میں نے نورین کو اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ اس نے میری بات غور سے سنی۔

''یہ ہوٹل تو بہت مہنگا ہے۔'' اس نے سوچ کے کہا۔

''جان بچانا زیادہ ضروری ہے اس وقت یا پیسے بچانا... یہاں معزز لوگ قیام کرتے ہیں جن پر پولیس بھی ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتی ہے۔ نہ ادھر کسی کا دھیان جاتا ہے اور نہ کوئی تفتیش تصدیق کے لیے یہاں آتا ہے۔ بہت ہوا تو فون پر منیجر سے پوچھ لیا اور یہاں جو منیجر ہوتے ہیں، وہ بھی بڑے پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ خدانخواستہ قتل بھی ہو جائے یہاں تو ہوٹل کی نیک نامی پر حرف نہیں آنے دیتے۔ پولیس اور اخبار والوں کے ساتھ باہر ہی باہر معاملات طے کر لیتے ہیں۔ استاد گامار ستم نے ایک بار کسی عورت کے بارے میں بتایا تھا جو اس سے ملنے یہاں آگئی تھی۔ وہ تھی کسی وڈیرے کی چوتھی پانچویں بیوی۔ عمر میں اس کی سب سے چھوٹی بیٹی سے بھی کم۔ اس کی عیاشی اور ہوس کی انتہا کوئی نہ تھی... گھر کے اندر پورا حرم آباد کر رکھا تھا۔ کہتا تھا کہ اسلام میں کنیز رکھنے کی اجازت ہے۔ اس کا اسلام یہیں تک محدود تھا۔ وہ دبئی اور لندن جاتا تھا تو محض عیاشی کرنے... تو اب اسے

آخری بیوی کی بغاوت سمجھو یا ناآسودگی۔ شوہر گیا دبئی تو وہ کسی بہانے استاد گاما سے ملنے ہوٹل پہنچ گئی۔ وہ تھا بڑا جی دار بندہ۔ لیکن خود کہتا تھا کہ اس عورت کا کچھ پتا نہیں... پہلے کیا کرتی رہی تھی... اس راز کا انکشاف بھی تو ہونا تھا۔ جب غیرت مند شوہر کو پتا چلا تو وہ دبئی کا کہہ کے گیا اور ہوٹل پہنچ گیا... استاد گاما تو بچ کے نکل آیا۔ بدکار بیوی کے وڈیرے نے وہیں ٹکڑے ٹکڑے کردیے مگر ہوٹل والوں نے کانوں کان کسی کو خبر نہ ہونے دی۔ وڈیرے کے جانے کے بعد انہوں نے لاش کے ٹکڑے دریا میں پھنکوا دیے اور چند گھنٹوں میں کمرا دھو دھلا کے ہر چیز بدل دی۔ اگلی رات وہاں قیام کرنے والے کو شک بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ گزشتہ رات کیا ہوا تھا۔ خیر... تمہیں بتانے کا مطلب صرف یہ تھا کہ آج رات بھی ہوٹلوں پر چھاپے پڑیں گے اور مفرور ملزموں کی تلاش کا ڈراما جاری رہے گا۔ وہ دوسرے تیسرے درجے کے ہوٹل ہوں گے۔ ہم وہاں جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اور اس معزز لوگوں کے ٹھکانے پر پہنچنے کے لیے ہمارا معزز دکھائی دینا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔"

"اس میں پرابلم کیا ہے...؟"

"پرابلم؟... یہ ہے خاتون... کہ اس وقت یعنی ابھی... صرف میں معزز نظر آتا ہوں... بُرا ماننے کی بات نہیں۔ لوگوں کی سوچ غلط ہے جنہوں نے اس برقع کو غریب، ان پڑھ دقیانوسی سوچ رکھنے والوں سے منسوب کرلیا ہے۔ تمہیں اس سے نجات حاصل کرنی ہوگی۔"

وہ ڈر کر بولی۔ "تم چاہتے ہو... میں بے پردہ ماڈرن وائف بن کے گٹ پٹ کرتی تمہارے ساتھ جاؤں؟"

"میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ تم گرفتار ہوجاؤ... اب یہاں سے اگر تم اکیلی واپس باہر چلی جاؤ... وہاں سے اپنے لیے کوئی بہت اچھا فیشن ایبل قسم کا برقع خرید لو۔"

"تم کیوں نہیں جاسکتے میرے ساتھ؟"

"تمہارے واپس آنے تک میں پھر اسی جگہ آجاؤں گا۔ آدھا گھنٹا... زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ کی بات ہے مگر مجھے بھی کمروں کی بکنگ کے لیے اکیلے جانا ہے... تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا؟"

"اس برقع کے اندر خطرے کی کوئی بات ہی نہیں... مگر دیکھو..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

میں نے سر ہلا کے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ ڈر تمہیں اس بات کا ہے کہ واپسی پر میں نہ ملا تو کیا ہوگا؟"

"خود کو میری جگہ رکھ کے سوچو خاور..."

"نورین... میں ہر قسم کھا چکا ہوں۔ یہ سب نہ کرنا ہوتا تمہارے لیے تو میں تمہیں ساتھ ساتھ لے کر کیوں پھرتا؟ بہت پہلے ہی جا چکا ہوتا... بھروسا رکھو مجھ پر... ابھی تم جانتی نہیں ہو مجھے۔ ذمے داریوں سے، خطرات اور چیلنج سے منہ موڑ کے بھاگنا میری فطرت ہی نہیں۔ بی اے گڈ گرل... خدا نے چاہا تو ہم اس مشکل وقت سے نکل جائیں گے۔"

میری باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ نورین ریسٹورنٹ سے باہر آ کے ایک رکشا میں بیٹھ گئی۔ میں اس کی صورت پر خوف، تذبذب اور بے یقینی کے جذبات دیکھ نہیں سکتا تھا مگر وہ میری ماننے پر مجبور تھی۔ رکشا کے دور جانے تک میں وہیں کھڑا رہا۔ پھر میں نے دونوں سوٹ کیس دوسرے رکشا میں رکھے اور ہوٹل کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر اتر گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ گیٹ کیپر مجھے رکشا سے اترتا دیکھے۔ ٹوپی اتار کے میں نے سوٹ کیس میں رکھ لی تھی۔ باقی معاملہ میری پُراعتماد اداکاری کا تھا۔ اپنی شخصیت کے متاثر کن ہونے کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ اس کا مشاہدہ زندگی میں بارہا ہوا تھا۔ خود استاد گاما رستم کہتا تھا کہ جیل کے بجائے فلموں میں جاتا تو ہیرو ہوتا بیٹا... اس بارے میں مجھے کبھی کوئی کمپلیکس نہیں تھا۔ ڈر تھا تو میرے دل کے اندر لیکن اعتماد یہ بھی تھا کہ صبح کے کسی اخبار میں میری یا مفرور مجرموں میں سے کسی کی تصویر شائع نہیں ہوئی تھی۔ جب یہ واردات ہوئی تو اخباروں کی آخری کاپی پریس میں تھی۔ آج پولیس اور وزارتِ داخلہ کے حکام سر جوڑ کے بیٹھے ہوں گے۔ کوئی پریس کانفرنس بھی کی ہوگی کہ فرار ہونے والوں کو پکڑنے کے لیے کیا حکمتِ عملی مرتب کی جارہی ہے۔ جیل کے ریکارڈ سے نکال کے مجرموں کی تصاویر بھی اخبارات کو جاری کی جائیں گی اور پولیس کی طرف سے اعلان بھی ہوگا کہ جو گرفتاری میں مدد دے گا، اسے کتنی نقد رقم دی جائے گی۔ یہ وعدہ بھی ہوگا کہ اطلاع دینے والے کا نام صیغۂ راز میں رکھا جائے گا اور اسے پورا تحفظ فراہم ہوگا، وغیرہ وغیرہ... ایسا نہ آج تک کہیں ہوا تھا اور نہ ہوسکتا تھا۔

گیٹ کیپر نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ میں رک گیا۔ "سلمان صاحب تو نہیں پہنچے، مجھے پوچھتے ہوئے... میں ان کا پرسنل اسسٹنٹ ہوں۔"

چوکیدار بوکھلا گیا۔ ”کون سلمان صاحب...؟“

”سلمان فاروقی... ڈائریکٹر جنرل فار سیلف پروموشن۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”آپ ان سے معلوم کریں صاحب... مجھے تو پتا نہیں۔“ وہ بولا۔

میں سیدھا بے پروائی سے اندر گیا اور کاؤنٹر پر جا کھڑا ہوا... ایک لڑکی جو عمر میں جوانی کی حد پر تھی، بہت زیادہ میک اپ اور فیشن ایبل لباس میں سراپا استقبال بنی کھڑی تھی۔ اس نے اپنی مسکراہٹ کا سارا جادو چلاتے ہوئے بدیسی لہجے میں انگریزی کا رس گھول دیا۔ ”یس سر... واٹ کین آئی ڈو فار یو...“

میں نے اسے رکھائی سے نظر انداز کیا۔ ”میں نے فون کیا تھا... سلمان صاحب کے لیے ایک کمرا۔ ایک میرے لیے وِد فیملی۔ میں اسلام آباد سے آیا ہوں۔“

اس نے فوراً ریکارڈ چیک کیا۔ ”کب فون کیا تھا سر؟“

”آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ کیا ریزرویشن نہیں ہوئی؟“ میں بگڑ گیا۔

”ریزرویشن از نو پرابلم سر... ابھی کر دیتی ہوں میں۔“ اس نے رجسٹر کھولا۔ ”پورا نام بتائیے پلیز۔“

میں نے ناگواری سے کہا۔ ”سلمان خان، ڈی جی... ڈائریکٹر جنرل سوشل سیکیورٹی... وہ اکیلے ہیں... میں ان کے ساتھ ہی ہوں... خاور لطیف... ان کا اسسٹنٹ... میرے ساتھ وائف...“

”آپ کا الگ ڈبل روم۔“

”ظاہر ہے...“ میں نے غرا کے کہا۔ ”ہم تینوں کیا ایک کمرے میں سو سکتے ہیں؟ کچھ عقل سے کام لو۔“

وہ میرا جارحانہ پن دیکھ کر اتنی نروس ہو گئی تھی کہ اس نے دیگر تفصیلات لکھنے کے بعد رجسٹرڈ کا رخ میری طرف پھیر دیا۔ میں نے پورے نام کے بعد ایڈریس اور پھر شناختی کارڈ کا نمبر لکھا۔ ظاہر ہے یہ سب فرضی اور بوگس تھا۔ اس کے باوجود ایک چھوٹی غلطی جو میں نے ہوٹل میں داخل ہوتے وقت کی تھی، بعد میں بڑی بن گئی۔ مجھے چوکیدار سے سلمان صاحب پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں کوئی بھی نام لے سکتا تھا۔ چوکیدار کے سامنے تو بلا ارادہ ہونے والی غلطی کی اہمیت نہیں تھی اور میں نے سلمان خان کو سلمان فاروقی کہہ دیا مگر اندر جب میں نے سلمان خان کہا تو یہ ایک لاشعوری حرکت تھی۔ ریزرویشن کرنے والی لڑکی نے سلمان خان لکھ دیا تو اس سے یہ بحث مزید خرابی کا باعث بنتی کہ میں نے سلمان فاروقی کہا تھا۔ تم نے سلمان خان کیوں لکھا... پتا اور شناختی کارڈ بدلنے سے فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ خرابی نام کی تھی جو ہو چکی تھی۔ روم نمبر تھرٹین مسٹر سلمان خان ڈی جی سوشل ویلفیئر اسلام آباد کے لیے ریزرو ہو چکا تھا۔ روم نمبر فورٹین مسٹر اینڈ مسز خاور لطیف کو ملا تھا۔

میں نے خود کو تسلی دی کہ اوّل تو یہاں تصدیق کرنے کون آئے گا اور سلمان خان کے نام کے ساتھ ڈی جی سوشل ویلفیئر اسلام آباد کا حوالہ ہوگا تو دوسری طرف کس کا ذہن جائے گا۔ تاہم ایک خلش سی دل میں رہی کہ ساری احتیاط، سوچ بچار اور افلاطونیت کے باوجود ایک ٹھوکر لگ ہی گئی۔ بیل بوائے نے سامان میرے کمرے میں پہنچایا تو میں نے اسے ٹپ میں سو کا نوٹ دیا۔ ”آپ کچھ لیں گے سر...“ وہ بولا۔

”ابھی نہیں۔ میں پہلے بڑے چھوٹے باس کو ریسیو کرلوں۔ بڑا باس ہے میری بیوی، چھوٹا ڈی جی صاحب۔“ میں نے خوش دلی سے کہا اور باہر نکل گیا۔ ریسپشن پر میں نے پھر یہی بات دہرائی۔

آدھ گھنٹے بعد میں پھر پارک کے گیٹ پر تھا۔ نورین تقریباً پندرہ منٹ بعد نمودار ہوئی۔ ”مجھے دیر ہو گئی۔ ڈھنگ کا برقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ کب سے کھڑے ہو یہاں؟“

”جب سے تم گئی تھیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہیں کھڑا ہوں دیکھ لو۔“ میں نے اس کے نئے برقع کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔

”میں سخت ڈری ہوئی تھی اور اپ سیٹ... یہ سوچ کر کہ تم نہ ملے تو کیا ہوگا؟“ وہ بولی

”افوہ... کس قدر بے اعتباری ہے۔ کسی قسم کا بھی اعتبار نہیں۔ مرد اتنے جھوٹے بھی نہیں ہوتے۔“

وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ ”ہوتے ہیں... سلمان کو دیکھ لو۔“

”کیا ساری دنیا میں مثال کے لیے ایک سلمان خان ہے؟“ میں نے چڑ کے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ وہ پہلے ہی جھوٹ بولتا رہا ہوگا۔ اب بتاؤ کہاں چلیں؟ میں نے ہوٹل میں دو کمرے لے لیے ہیں۔“

”دو کمرے؟“ اس کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا۔

”ہاں دو کمرے... ایک تمہارے لیے... دوسرا میرے لیے... ایک مسٹر اور مسز خاور کے نام سے بک ہوا ہے، دوسرا ایک فرضی نام سے... ایسے مت دیکھو مجھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم مجھ پر پوری طرح اعتماد کرتی ہو... اور ایک خطرناک خونی چھری بھی ہے تمہارے پاس... لیکن میں کسی قسم کا کوئی چانس یا رسک لینا نہیں چاہتا۔ مجھے خود پر اعتماد ہے لیکن اس سے پہلے آزمائش کا کوئی ایسا موقع بھی تو نہیں آیا... یہ تو ذمے داری کے ایک طویل سفر کا آغاز ہے میرے لیے... میرا مطلب ہے، میرے لیے دو چار دن کی آزمائش بھی بہت سخت اور طویل ہے یا مجھے محسوس ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھی ایسی بات ہو کہ تمام عمر میں خود سے نظر نہ ملا سکوں...“

وہ مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے میری بات سمجھنا اسے دشوار ہو رہا ہے۔ ”اگر... تم ضروری سمجھتے ہو تو...“

میں نے کہا۔ ”رات تک ہم ساتھ نظر آئیں گے اور ساتھ ہوں گے۔ لیکن سونے کے لیے تم اپنے کمرے میں چلی جاؤ گی تو کسی کو معلوم بھی نہیں ہوگا۔ اب کچھ دیر میں ہم پہنچ جائیں گے ہوٹل۔ یہاں میرا وہ بازاری رویّہ نہیں ہوگا۔ یعنی بازاروالا۔ یہاں میں ڈائریکٹر جنرل سوشل ویلفیئر کے ساتھ آیا ہوں اسلام آباد سے اور خود بھی اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوں۔ اسلام آباد کا نام سب کو مرعوب کرتا ہے۔ رہی سہی کسر میں نے اپنی افسرانہ رعونت سے پوری کر دی ہے۔ اس چھوٹے سے شہر کے لوگ اسلام آباد کے ہر افسر کو اپنا حکمراں سمجھ کے ڈر جاتے ہیں۔“

”کسی نے تصدیق مانگ لی... پھر؟“

”ابھی تک ہمت نہیں پڑی تو اب کون پوچھے گا۔ تمہارا واسطہ شاید نہ پڑا ہو ان سے... بیوروکریسی کے چھوٹے چھوٹے پرزے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ اتنے بڑے کہ کسی بھی نظام کو چلنے سے روک دیں۔ عام طور پر بڑے افسر اپنی سیکریٹری کو ساتھ لے جاتے ہیں۔ چھوٹے افسروں کی سیکریٹری نہیں ہوتی مگر وہ پھر بھی بیوی کو ساتھ نہیں رکھتے۔ اب تم پوچھو گی کہ کیوں ساتھ نہیں رکھتے؟“

”میں نہیں پوچھوں گی... تم ویسے ہی بتا دو۔“

”کچھ تو وہ پیسے بچاتے ہیں۔ سفری خرچ میں ڈبل کمرے کا کرایہ نکال لیں تو پھر کھانے کا خرچ اور سب سے بڑھ کر ان کی شاپنگ۔ وہ جس نئے شہر میں جائیں، انہیں ہر نیا نظر آ جاتا ہے جو اچانک ضروری بھی بن جاتا ہے۔“

وہ ہنسنے لگی۔ ”تم کو تو لگتا ہے خاصا تجربہ ہے۔“

”یہ مشاہدہ ہے... میں نہ اسلام آباد کا افسر، نہ بیوی والا... اب تم فرق دیکھو کہ میں تمہیں ساتھ لایا ہوں تو اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ یہی کہ ہماری نئی نئی شادی ہے چنانچہ میں نے سرکاری دورے کو ہی ہنی مون کا نام دے دیا ہے۔ اگر ہوٹل میں قیام کے دوران میں نئے شادی شدہ شوہر کی طرح بی ہیو کروں تو غلط مت سمجھنا اور بُرا مت ماننا... دو چار دن بعد سلمان خان ملنے آئے تو اس سے میری شکایت بھی مت کرنا۔“

وہ پھر ہنسی۔ ”وہ یہاں آئے گا؟“

”اور کہاں جائے گا... وہیں آئے گا جہاں تم ملو گی... چلو اب شادی کے فوراً بعد کا سین شروع... ہم گیٹ پر پہنچ گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

استقبالیہ پر موجود لڑکی یا خاتون نے نورین کو دلچسپی سے دیکھا اور مسکرائی۔ میں اس کے سامنے رک گیا۔ ”ڈی جی صاحب کی فلائٹ مس ہو گئی... نہیں... میں ان کی بکنگ کینسل کرنے کا نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ بتا رہا ہوں کہ اب وہ شاید کل آئیں گے۔ آنا انہیں میری مسز کے ساتھ ہی تھا۔“

”کل کون سی فلائٹ ہے سر؟“ وہ بولی۔

سوال سے میں نے اندازہ کرلیا کہ آج فلائٹ تھی۔

”وہ کراچی سے بائی روڈ ہی آئیں گے۔ آج کی کسی فلائٹ میں جگہ نہیں تھی۔ ظاہر ہے کل روانہ ہوں گے۔“

”اگر کل بھی سوتا نہ رہ گیا۔ تمہارا یہ باس کیا دفتر میں بھی سوتا رہتا ہے۔ لاوزی (Louzy)۔“ نورین نے اتنی روانی سے کہا کہ میں حیران رہ گیا۔

میں نے اس کے شانے کے گرد ہاتھ لپٹا کر کہا۔ ”لیٹس اِس گو... وہ لاوزی باس وہیں سوتا رہے اچھا ہے ہمارے لیے بھی۔“

نورین نے کمرے میں آکے برقع اتارا اور کچھ دیر حیرانی سے اس کی آرائش کو دیکھتی رہی۔ اب رات ہو گئی تھی۔ میں نے تمام لائٹس آن کر دیں اور جوتے اتار دیے۔ اچانک جیل سے فرار کے بعد پہلی بار مجھے وقتی طور پر ہی سہی مگر ایک احساسِ تحفظ کا سکون حاصل ہوا۔ آج کی رات یا جب تک میں اس کمرے کے اندر تھا، میں تمام خطرات سے محفوظ تھا۔ میں نے نورین کو دیکھا جس کا میں کل تک تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ میرے سامنے مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں کے درمیان دبائے اپنے سامنے دیکھ رہی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ گزشتہ رات سے اب تک میں فرار کی حالت میں تھا۔ خوف، ناکامی اور موت سے مسلسل فرار۔ موت سے بھاگ کے کوئی کہاں جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود مجھ سے

پہلے ہر جگہ تاریخ کے ہر دور میں فرار ہی انسان کی زندگی کے لیے جدوجہد کا حصہ رہا ہے۔ لوگ ہر قید خانے سے ناممکن حالات میں فرار ہوئے اور موت جسے وہ اپنا مقدر سمجھ بیٹھے تھے... ٹل گئی... کیونکہ اس کو ٹلنا ہی تھا... اس کے لیے مقرر لمحہ جو نہیں آیا تھا۔

ایسی ہی جدوجہد نورین نے کی تھی... اس کی سزا مختلف تھی اور وہ قید خانہ بھی کوئی سرکاری جیل نہیں تھا۔ وہ اس کے اپنے ہی گھر کا ایک حجلۂ عروسی تھا۔ یہ کیسی عجیب بات تھی کہ نورین نے ایسا سمجھا۔ اس رات بیاہی جانے والی ہزاروں لاکھوں دلہنوں نے وہ رات بڑی جاں فزا، روح پرور اور سنسنی خیز مسرت کے ساتھ بسر کی ہوگی۔ انہیں حجلۂ عروسی کوئی زنداں نہیں لگا ہوگا۔ اپنی عمر رفتہ کے سارے خوابوں کی تعبیر کے عین مطابق محسوس ہوا ہوگا۔ صرف نورین اس زنداں سے فرار ہوئی تھی۔ اس نے اپنے پیروں میں پڑی ہوئی زنجیر ایک چھری سے کاٹ دی تھی۔ یہ زنجیر اس کے سہاگ کی علامت تھی۔ اس کا شوہر... مجازی خدا اور تمام عمر کے سفر کا شریک تھا... یا سمجھا گیا تھا۔ محبت تو بڑا لطیف جذبہ ہے مگر اسی نے نورین کے ہاتھوں میں ایک چھری بن کے اپنے شوہر کی گردن کاٹ دی تھی۔ اتنی بے حسی اور سفاکی کے ساتھ جیسے قسائی کے ہاتھوں میں چھری کسی بکرے کی شہ رگ کاٹتی ہے... اور تب سے اب تک وہ بھی فرار ہی تھی۔

ہم دونوں بالکل مختلف حالات اور مقامات سے اپنی اپنی مجبوریوں کی زنجیر کاٹ کے نکلے تھے۔ ایک ہی رات کے اندھیرے میں انجانے طور پر ہم ایک ہی سمت میں بڑھتے چلے گئے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کوئی غیبی طاقت تھی جس نے ہمیں اس آسیب زدہ حویلی کی تاریکی میں دھکیل دیا تھا۔ اس وقت یہ کتنا عجیب اور ناقابلِ یقین لگتا تھا کہ ہم ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ڈبل بیڈ لگژری روم میں ایک دوسرے سے صرف دو فٹ کے فاصلے پر خاموش بیٹھے تھے۔ نورین پھر اسی سرخ عروسی لباس میں نظر آرہی تھی۔ صرف میں تھا جس نے قیدی نمبر ون نو تھری کی وردی اتار پھینکی تھی۔ مگر اب میرے جسم پر جو لباس تھا، وہ ایک مقتول شخص کا تھا۔ ابھی تک پولیس کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ قتل ہو چکا ہے... نورین کو بھی معلوم نہیں تھا...

میں نے آہستہ سے کہا۔ ”کیا سوچ رہی ہو...“

وہ بُری طرح چونکی۔ ”کچھ... کچھ نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”دیکھو... واش روم میں جا کے فریش ہو جاؤ۔ دل چاہے تو نہالو۔ کپڑے بدل لو۔“

اس نے صرف اقرار میں سر ہلایا مگر اپنی جگہ بیٹھی ہونٹ کاٹتی رہی۔ کسی بھی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر انسان کو بھی جانور کی طرح اس کا جسم اضافی توانائی فراہم کرتا ہے۔ خطرہ ٹل جانے کے بعد خوف کا ردِعمل بھی اتنی ہی شدت سے مغلوب کرتا ہے۔ خود میں ایسی ہی ذہنی اور جذباتی کیفیت سے دوچار تھا۔ کمزور اعصاب کی مالک سمجھی جانے والی عورت بہت جلد خوف کے ہسٹریا کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ بھی اب میری ذمے داری بن گیا تھا کہ میں نورین کو اس ہسٹریا سے بچانے کی کوشش کروں۔ میرے ایک دوست نے جو ماہر امراضِ قلب تھے، ایک بار بڑی دلچسپ حقیقت بیان کی تھی۔ سوال یہ تھا کہ عورتوں کے لیے دل کے دورے کے امکانات کم کیوں ہوتے ہیں؟ اس نے کہا کہ بھائی، یہ مرد کے نصیب میں جو لکھ دیا گیا ہے۔ کسی جنگل کا تصور کرو۔ مرد عورت ساتھ ساتھ جا رہے ہوں اور اچانک سامنے سے آجائے آدم خور شیر... خاتون کے لیے بڑی آسانی ہے کہ چیخ ماریں اور بے ہوش ہو جائیں۔ مرد مارا گیا ہر طرف سے۔ خود کو بچائے یا عورت کو۔ شیر کا مقابلہ کرنے کے لیے اِدھر اُدھر دوڑے۔ ڈنڈا لے یا پتھر۔ مقابلہ کرے یا عورت سمیت فرار کا سوچے۔ ساری پریشانی مرد کے لیے۔ دل کا دورہ بھی اسے ہی پڑے گا۔ خاتون کو ہوش میں بھی وہی لائے گا اور وہ آنکھ کھول کے اٹھتے ہی کہیں گی۔ بھاگ گیا شیر... اللہ کا شکر ہے۔ اب چلو آگے یا کھڑے رہو گے دوسرے شیر کے انتظار میں۔

خوف کے شیر کو بھگانے کے لیے میں خود انگڑائی لے کر مسکراتا ہوا اٹھا۔ ”چلو پہلے میں نہا لیتا ہوں... تم ذرا روم سروس کو چائے کا آرڈر دو۔ میں یوں گیا اور یوں آیا۔“ میں نے چٹکی بجائی۔

لیکن دس منٹ بعد میں واش روم سے نکل کے آیا تو وہ اسی طرح بت بنی بیڈ پر بیٹھی تھی اور کیفیت وہی تھی۔ تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز۔ اس کی آنکھوں میں رکے ہوئے اشکوں کا سیلاب صبر وضبط کے سارے بند توڑ کر اسے بہالے جانے کے لیے تیار تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس جذباتی بحران کا مقابلہ نرمی سے کروں یا سختی سے... یا کچھ نہ کروں... سیلاب آئے گا اور گزر جائے گا۔ میں تماشا دیکھتا رہوں... اچھا ہے دل کا سارا غبار نکل جائے تو اسے بھی سکون حاصل ہو ورنہ یہ آنسوؤں کا بوجھ وہ کب تک اٹھائے پھرے گی۔

”تم نے چائے نہیں منگوائی اب تک... اچھا میں منگواتا ہوں۔“ میں نے فون اٹھالیا۔

”کچھ مت کرو میرے لیے... چھوڑ دو مجھے میرے حال پر۔“ اس نے رونا شروع کر دیا۔

”نورین... یہ کیا کر رہی ہو تم... کیوں تماشا بنانا چاہتی ہو اپنا یہاں؟“

وہ منہ چھپائے رونے لگی۔ ”تماشا تو ایک دن دنیا دیکھے گی۔ جب پولیس میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالے گی اور ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ قاتل ہے یہ لڑکی۔“

”کسی کو کچھ نہیں معلوم ہو سکتا مگر تم نے خود کو کنٹرول نہ کیا تو ایسا ضرور ہوگا۔ تمہاری ساری جدوجہد رائگاں جائے گی۔ پھر میں کیا کر سکوں گا تمہارے لیے۔ اب تک تم نے اتنے ضبط اور حوصلے سے کام لیا اور اپنی محبت کے لیے اتنی بڑی قربانی دی۔ ایسی بے مثل جرأت کا مظاہرہ کیا۔ اپنی محبت کے لیے، مستقبل کے لیے... سلمان خان جب واپس آئے گا تمہیں لینے تو تمہاری محبت ہوگی اور نہ کوئی مستقبل۔ پھر کیا کرے گا وہ؟ میں تو نکل جاؤں گا پہلے ہی۔ افسوس ہوگا کہ بلاوجہ تمہاری خاطر رکا۔ اپنا وقت ضائع کیا۔ خوامخواہ تمہاری ذمے داری قبول کی۔“

اس نے آنسوؤں کی بہتی شفاف چادر کے پیچھے سے مجھے دیکھا۔ ”تم چھوڑ جاؤ گے مجھے؟“

”میں خوامخواہ کیوں پکڑا جاؤں اس چکر میں۔ دماغ خراب تھا میرا جو میں تمہارے لیے رکا۔ میری منزل تو کچھ اور تھی۔ جیل سے جان ہتھیلی پر رکھ کے میں اس لیے تو نہیں نکلا تھا کہ پھر وہیں پہنچ جاؤں۔ خدا حافظ... تمہارا جو دل چاہے کرو۔ کل تک کا کرایہ دے چکا ہوں میں۔ آگے تم جانو اور تمہارا کام۔“ میں کھڑکی کی طرف یوں بڑھا جیسے ابھی اس طرف سے کود کے فرار ہو جاؤں گا... ”ویٹر کسی وقت بھی چائے لے کر آجائے گا۔“

یہ دھمکی بڑی مؤثر رہی۔ وہ چلّائی۔ ”خاور... تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ اس نے ایک دم اٹھ کے میرا بازو سختی سے اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ ”تم مجھے اکیلا یہاں نہیں چھوڑ سکتے۔“

”چھوڑو مجھے جانے دو... تم جو چاہو کرو۔ جہنم میں جاؤ میری طرف سے۔“ میں نے اسے دھکیلا۔

وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ ”خدا کے لیے مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔ آئی ایم سوری۔ تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کروں گی۔“

میں ایک آزمائش سے دوچار ہو گیا۔ وہ خوشبو جس نے گزشتہ رات مجھے محصور کیا تھا، اب میرے وجود کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ اس کا دہکتا کانپتا ریشمی لباسِ عروسی میں لپٹا ہوا جسم مجھ سے چپکا ہوا تھا اور میرا فرض بنتا تھا کہ میں اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا کے تھپکوں۔ اس کے سر کو پیار سے سہلاؤں۔ اسے حوصلہ اور تسلی دوں۔ میرا غصہ مصنوعی تھا لیکن اس کے دہکتے بدن سے میرے جسم میں منتقل ہونے والی آگ حقیقی تھی۔

ایک بار پھر میں نے اپنے جذبات کے سامنے بے حسی کی دیوار کھڑی کر دی۔ میں نے اسے شانوں سے پکڑ کے جھنجوڑا۔ ”پاگل مت بنو نورین... ہوش میں آؤ۔“

اسی وقت دروازے پر ناک ہوئی۔ ”چائے سر...“

میں نے تیزی سے نورین کو باتھ روم کے اندر دھکیلا۔ پھر دوڑ کے دروازے تک گیا اور چائے لے لی۔ ٹرے کو میں نے میز پر رکھ دیا اور ایک گہری سانس لے کر پھر بیٹھ گیا۔ خلافِ امید نورین سنبھل گئی تھی۔ کوئی تجربہ نہ رکھنے کے باوجود میں نے اس کے ہسٹریا کے طوفان کو کنٹرول کر لیا تھا۔ اب مجھے خیال آیا کہ مجھ پر تھکن کس بری طرح سے غالب ہے۔ گزشتہ رات نورین کے لیے بھی شدید ہیجان اور اعصابی دباؤ کی رات تھی اور میری طرح وہ بھی ایک منٹ کے لیے نہیں سوئی تھی۔ خوف کے سائے تلے ہم نے ایک پورا دن گزار دیا تھا اور ہم اس محفوظ جگہ پر تو شام کے بعد پہنچے تھے۔ اس سے پہلے ہم بازار میں چلتے رہے تھے۔ ہم دونوں کو سکون کے ساتھ نیند اور آرام کی اشد ضرورت تھی۔ ایک رات کی پُرسکون نیند ہمیں اگلے دن کے لیے تازہ دم کر سکتی تھی۔

جب نورین ہاتھ منہ دھو کے نکلی تو ایک لمحے کے لیے میں اسے پہچان نہ سکا۔ اس نے منہ دھونے کے بعد اپنا سرخ دلہنوں والا لباس اتار دیا تھا اور ایک نیا سادہ سوتی جوڑا پہن لیا تھا۔ قمیص کے زرد رنگ میں نیلے پھول جگمگا رہے تھے۔ اس کے ساتھ شلوار سادہ اور سفید تھی۔ سفید دوپٹے کو اس نے چہرے کے گرد چاند کے ہالے کی طرح لپیٹ لیا تھا۔ دلہن بننے کے لیے اس نے جو میک اپ کروایا تھا، وہ دن بھر میں غارت ہو چکا تھا۔ منہ دھونے کے بعد اس کے حسین کتابی چہرے کی بے داغ اجلی جلد کا سنہرا رنگ نکھر آیا تھا۔ آنسوؤں سے اور پھر پانی سے دھل جانے والی آنکھوں میں ستاروں کی جوت سی جاگ اٹھی تھی اور اداسی کا عکس اس کی صورت پر مظلومیت اور معصومیت کا دلنشیں انداز بن کے

ٹھہر گیا تھا۔
وہ بیڈ سے کچھ فاصلے پر لگے ہوئے کارنر صوفہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ”آئی ایم سوری...“
میں نے مسکرا کے کہا۔ ”فارگیٹ اٹ۔ چائے بناؤ میرے لیے۔“
اس نے چائے کا کپ میری طرف بڑھا دیا۔ ”میں بہت تھک گئی ہوں خاور۔“
”مجھے معلوم ہے کیونکہ خود میرا حال خراب ہے۔ یہ ذہنی سے زیادہ جسمانی تھکن ہے۔ ایک رات سونے کے بعد صبح اٹھیں گے تو ٹھیک ہو جائے گا سب۔“
اس نے چائے کی پیالی اٹھا کے صوفے کی بیک کا سہارا لیا ”مجھے نیند نہیں آئے گی۔ مجھے معلوم ہے۔“
”آجائے گی۔ چائے پی لو۔ پھر کھانا جلدی کھا لیں گے۔“
”بھوک مجھے بالکل نہیں ہے۔ ڈر بہت لگ رہا ہے۔ پتا نہیں کل کیا ہوگا... اور کل کے بعد... سلمان نے مجھے ایک بار بھی فون تک نہیں کیا۔“
”وہ تمہیں فون کہاں کرتا؟ فون تم کر سکتی تھیں اگر اس کے آفس کا نمبر ہوتا... اب تک تو وہ دبئی پہنچ گیا ہوگا۔ مجھ سے بھی بڑی بے وقوفی ہوئی کہ اس سے نمبر نہیں لیا۔ اسے جلدی بھی اور میں کچھ نروس تھا۔“
”خاور... سلمان نہ آیا... پھر؟“ وہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔
میں بھونچکا رہ گیا۔ ”یہ... یہ کیا کہہ رہی ہو تم... اگر اس پر اعتماد نہیں تھا تمہیں تو تم نے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھایا؟“
اس کی نظر جھک گئی۔ ”وہ... اعتماد تو ہے... لیکن ڈر مجھے ہر طرف سے گھیر رہا ہے۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ بھی جو ناممکن لگتا ہے۔ کل سے پہلے میں سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ میں قتل کر سکتی ہوں۔ لیکن میں نے کر دیا۔ سب ختم ہو گیا اچانک۔ یہ مجھے خواب کی طرح لگتا ہے سب... تم... اور یہ جگہ...“
کھانے کی خواہش مجھے بھی نہیں تھی۔ جب ویٹر چائے کے برتن اٹھانے کے لیے آیا تو میں نے اس سے دروازے پر بات کی۔ ”دیکھو... مجھے ایک دوا چاہیے۔ ہوٹل میں کوئی فارمیسی ہے۔“
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایک کیمسٹ کی دکان ہے قریب ہی۔ کیا چاہیے آپ کو؟“
میں نے اسے ایک کاغذ پر جو دوا لکھ کر دی، وہ سکون آور تھی۔ ”یہ ہر قیمت پر چاہیے مجھے۔“ میں نے اسے پانچ سو کا نوٹ تھما کے کہا۔ ”باقی خود اپنا انعام سمجھ لینا۔“
تجربہ کار لیکن مہذب ویٹر نے کاغذ کے پرزے کو دیکھا اور کسی ردِ عمل کا اظہار کیے بغیر نوٹ کو مٹھی میں دبا لیا۔ وہ آدھ گھنٹے بعد نمودار ہوا اور خاموشی سے دو گولیاں میرے ہاتھ میں دے کر چلا گیا۔ اس وقت تک میں نورین سے اس کی اور سلمان کی داستانِ محبت سنتا رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں میری دلچسپی بہت کم تھی۔ یہ ایک عام سی کہانی تھی۔ حالات کے ظلم کا شکار لڑکی اور ایک عام سے بے روزگار نوجوان کی داستانِ محبت جو محبت کے سوا کوئی کام کرتا نہیں تھا... یا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے نورین کے لیے جذبات کی شدت اور خلوص کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔
محبت جس ذمے داری کا تقاضا کرتی ہے، اس سے سلمان عاری لگتا تھا۔ زندگی صرف پیار کے جذبات اور سنہری خوابوں کا نام تو نہیں۔ یہ خواب بھی تعبیر کے لیے قیمت کا تقاضا کرتے ہیں۔ مادی ضروریات کو پیار کی کسی خوبصورت تصویر، کسی حسین مستقبل کے تصور... اور کسی خیالی جنت کے سامنے کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ سلمان اپنی محبت میں جذبات کو حقائق پر کیوں ترجیح دیتا تھا؟ وہ کام کیوں نہیں کرتا تھا؟ اور اگر کام نہیں کرتا تھا تو پھر اچانک اس کے پاس دس لاکھ کہاں سے آگئے تھے؟ کیا وہ انہی دس لاکھ کی وجہ سے مارا گیا تھا؟ اس نے کسی کو دھوکا دیا تھا؟ کہیں ڈاکا ڈالا تھا... یا نورین کو اس نے جو بتایا سب جھوٹ تھا؟ جو میں نے نورین کو بتایا وہ بھی جھوٹ ہی تھا۔ وہ دبئی نہیں گیا تھا۔ اس حویلی میں مرا پڑا تھا... یا شاید اب کسی سرکاری اسپتال کے مردہ خانے کی پتھریلی سلیب پر بہت سے لاوارث اجنبی مُردوں کے درمیان پوسٹ مارٹم کے لیے اپنی باری کے انتظار میں تھا۔
میری عدم دلچسپی کب تک نورین کے نوٹس میں نہ آتی... اپنی پوری کوشش کے باوجود بار بار میری توجہ نورین سے ہٹ کر سلمان خان سے جڑے سوالوں کی طرف ہو جاتی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے خیالات کے مرکز و محور پر میرا اپنا ماضی، حال یا مستقبل نہیں رہا تھا۔ نورین سے نہ ملتا تو صورتِ حال بالکل مختلف ہوتی... میں نہ جانے کہاں ہوتا اور کیا کرتا۔ بہت جلد نورین نے مجھے پکڑ لیا۔ ”تم میری بات نہیں سن رہے ہو۔“
میں چونکا۔ ”نہیں... سب سن رہا ہوں۔“
”جھوٹ... میں اپنی کہے جا رہی ہوں... تمہارا

دماغ پتا نہیں کہاں ہے۔“
میں نے اپنے جھوٹ کی وکالت ترک کر دینا بہتر سمجھا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ میرا دماغ کام ہی نہیں کر رہا ہے۔ مجھے نیند کی اشد ضرورت ہے۔ سو کے اٹھوں گا تو ذہن پوری طرح مستعد ہوگا۔“
”ٹھیک ہے... پھر تم سو جاؤ۔“
”اور تم جاگتی رہو گی؟“ میں نے کہا۔
”جب نیند آئے گی تو سو جاؤں گی۔“
میں نے کہا۔ ”کوئی انسان فولادی مشین نہیں ہوتا کہ کھائے پیے اور آرام کیے بغیر رہ سکے۔ مشین کو بھی ریسٹ دینا پڑتا ہے... یہ لو... یہ گولی کھاؤ۔“
اس نے مزاحمت آمیز خوف کے ساتھ میری ہتھیلی پر رکھی گولی کو دیکھا۔ ”یہ کیا ہے؟“
”اگر میں کہوں کہ زہر ہے پھر؟“
اس نے ایک بڑی عجیب اور غیر متوقع حرکت کی۔ اس نے گولی اٹھا کے منہ میں رکھی اور پانی کے گلاس سے ایک گھونٹ لے کر حلق سے اتار لی۔ ”اور کچھ؟ میں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے تم پر اعتماد ہے۔ تم سچ مچ زہر دو گے تب بھی میں کھا لوں گی۔“
”کیوں کھا لو گی؟ زندگی کو یوں داؤ پر لگا دینے والے جواری ہار بھی جاتے ہیں۔ اتنی کم قیمت بھی نہیں ہوتی زندگی خاتون... اعتماد بھی کرو تو سوچ سمجھ کے۔“
”سوچ سمجھ کے ہی اعتماد کیا ہے تم پر...“
میں کہنا تو چاہتا تھا کہ کاش سلمان خان پر اعتماد کرتے ہوئے بھی تم نے دل کے بجائے دماغ سے کام لیا ہوتا... لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ وہ سوال کرتی کہ یہ نتیجہ میں نے کیسے اخذ کیا آخر... اور جواب دینا اس وقت کسی طرح بھی حالات کی بہتری میں معاون نہ ہوتا۔ چنانچہ میں نے کہا۔ ”تھینک یو... چلو اب تم اٹھو... اگر یہاں سونا چاہتی ہو تو میں دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔“
وہ تذبذب کا شکار ہو گئی۔ ”وہ بھی اتنا ہی بڑا کمرا ہے۔“
”ہاں... سب ایک جیسے کمرے ہیں۔“
”اکیلے میں مجھے ڈر لگے گا...“ وہ نیچے فرش کو دیکھتے ہوئے بولی۔
”ڈر کی کون سی بات ہے۔ اندر سے دروازے کو لاک کرو اور سو جاؤ۔ رات کو کسی کے لیے بھی دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں۔ اور تمہیں ڈسٹرب کرنے آئے گا کون؟ جن بھوت ان فائیو اسٹار ہوٹلوں میں قیام نہیں کرتے۔“
”میں جن بھوت کی بات نہیں کر رہی تھی... اگر... میں صوفے پر سو جاؤں۔“
”صوفے پر سونا ہی ہوتا تو میں سو جاتا لیکن دوسرے کمرے میں ایک بیڈ ہے... اور نورین... بات نہ بیڈ کی ہے اور نہ صوفے کی۔ ہم ایک بیڈ پر بھی سو سکتے ہیں لیکن میں ایسا کروں گا نہیں۔ اب تم لیٹ کر آنکھیں بند کرو اور جو کچھ کل رات سے اب تک ہوا ہے، اسے بھولنے کی کوشش کرو... نیند آجائے گی۔ چاہو تو لائٹس آف کر دینا۔ یہ نائٹ لیمپ جلتا رہے گا... او کے... شب بخیر... اندر سے لاک کرو دروازہ۔“ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ پلٹ کے اسے دیکھا۔ ”چلو اٹھو۔“
وہ ہپناٹائز کیے ہوئے شخص کی طرح اٹھ کے دروازے تک آئی۔ دروازہ لاک ہونے کی آواز سنائی دینے تک میں باہر کھڑا رہا... کوریڈور میں لائٹس روشن تھیں۔ آخری کمرے کا دروازہ کھول کے کسی نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر کھانے کے برتن باہر رکھ دیے۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس نے مجھے دیکھا اور پھر دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ وہ نائٹ گاؤن میں خاصا معزز نظر آتا تھا۔ اپنے کمرے کا لاک کھول کے میں اندر گیا اور پھر دروازے کو اندر سے مقفل کر لیا۔ تمام کمرے ہر لحاظ سے ایک جیسے تھے۔ کھڑکیاں دروازے، ان کے پردے، فرنیچر کی سیٹنگ یہاں تک کہ بیڈ کور کا ڈیزائن بھی اسی کمرے جیسا تھا جس میں اب نورین اکیلی تھی۔ دو افراد اکٹھے ہوں تو ہوٹل والے اس کمرے کا کرایہ ڈبل بیڈ کے ریٹ پر چارج کر لیتے تھے۔ بس ہمارے لیے ممکن نہیں تھا کہ دو سنگل بیڈ بک کرائیں۔ تمام لائٹس آف کر کے میں نے بیڈ سائڈ کے نائٹ لیمپ کو آن کیا اور سونے کی نیت سے لیٹ گیا۔ کچھ لوگ اپنی مرضی سے چند منٹ میں آنکھیں بند کر کے سچ مچ سو جانے پر قادر ہوتے ہیں۔ جیسے ان کے دماغ میں آن آف کرنے کا کوئی سوئچ ہے۔ کچھ تھوڑی دیر کوئی کتاب رسالہ پڑھ کے دماغ کی رَو کو زندگی کے معمولات اور تفکرات سے ہٹا دیتے ہیں اور نیند دبے پاؤں سکون کی جگہ لے لیتی ہے۔ کبھی میرا شمار بھی انہی میں کیا جا سکتا تھا لیکن اب عرصہ ہوا مجھے نیند کو منا کے بلانے کے لیے بہت جتن کرنے پڑتے تھے۔ اندیشے اور تفکرات، گزر جانے والے کل کا خیال اور آنے والے کل کا تصور... امکانات... توقعات... کیا ہو سکتا ہے... کیا نہیں اور کیا

ہوگا۔خیالوں کا ایک بے قابو ہجوم ہر طرف سے یلغار کرتا تھا تو مجھے جان چھڑانا مشکل ہوتا تھا۔

ایسا ہی آج بھی تھا۔ مجھے سکون آور گولی کھانے کے بعد ایک موہوم سی امید ضرور تھی کہ اس سے میرے ذہن اور اعصاب پر خیالات کا دباؤ کچھ کم ہوجائے گا تو میں سو سکوں گا مگر ایسا فوراً نہیں ہوسکتا تھا۔ دوا کو بھی نظامِ خون میں شامل ہوکے اثر کرنے کے لیے کچھ وقت بہرحال درکار ہوتا ہے۔ میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے چھت کو دیکھ رہا تھا جہاں دیکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا اور ایک انجانی خلش سے دوچار تھا جس کا تعلق نہ میرے ماضیِ قریب کے حالات سے تھا اور نہ نورین سے۔ یہ بات کچھ اور تھی جو واضح نہیں ہورہی تھی۔

جب یہ الجھن ذہن کے کسی الہامی خیال سے دور ہوئی تو میں ایک دم اٹھ کے بیٹھ گیا۔ اس کا تعلق ایک چہرے سے تھا۔ چند منٹ پہلے میں نے اس کی ایک جھلک بھی دیکھی تھی۔ اس نے اپنے کمرے سے باہر آکے استعمال شدہ کھانے کے برتن کوریڈور میں رکھے تھے کہ ویٹر ناک کیے بغیر باہر ہی سے اٹھا کے لے جائے اور فوراً ہی دروازے کے پیچھے غائب ہوگیا تھا۔ صرف ایک سیکنڈ کے لیے ہماری نظر ملی تھی۔ اب مجھے فلم اسٹار نرالا یاد آرہا تھا تو بہ ظاہر اس خیال کی نہ کوئی وجہ بنتی تھی اور میرے حالات میں کوئی جگہ... لیکن ایسا نہیں تھا۔

میرے جیل خانے کے ساتھیوں میں ایک ایسا شخص تھا جسے دوسرے قیدی ازراہِ تمسخر پروفیسر کہتے تھے کیونکہ وہ بات بے بات لیکچر دینے لگتا تھا۔ غیر سنجیدہ بات بھی بہت سنجیدگی سے کرتا تھا اور بلاضرورت بولتا تھا۔ وہ کسی کو بھی بن مانگے مشورہ دیے بغیر اور مشورے کی ضرورت، افادیت اور اہمیت سمجھائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ خبطی اور جھکی تھا اور اس کی صورت مزاحیہ اداکار مرحوم نرالا سے بہت ملتی تھی۔ اس نے شعوری یا غیر شعوری طور پر بات کرنے کا انداز بھی کامیڈین نرالا جیسا اپنا لیا تھا۔ اپنے آخری کمرے کے دروازے سے کھانے کے برتن باہر رکھنے والے کی صورت میں بھی کامیڈین نرالا کے چہرے کی جھلک تھی۔ قدوقامت میں بھی وہ نرالا ہی تھا۔ کیا یہ اتفاق تھا؟ اس کے جسم پر جیل کی وردی نہیں تھی۔ اس وردی کو تو میں نے بھی اتار پھینکا تھا۔ پھر کیا وہ پروفیسر ہی تھا؟ کیا وہ بھی موقع سے فائدہ اٹھا کے فرار ہونے والوں میں شامل تھا؟ اس کے لباسِ شب خوابی پر خاصا متاثر کرنے والا نائٹ گاؤن تھا۔ مگر خود میرے جسم پر بہت شاندار ٹی شرٹ اور پتلون تھی۔ اگر میں حسنِ اتفاق اور اپنی عقل کی راہنمائی سے اس فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام پذیر ہوں جہاں معزز لوگ اور شرفا ٹھہرتے ہیں تو پروفیسر کیوں نہیں آسکتا؟

میں کچھ دیر خلا میں دیکھتے ہوئے سوچتا رہا کہ یہ میرا وہم ہے یا حقیقت؟ اگر وہم ہے تو اس کی تصدیق کیسے ہو؟ مجھے تصدیق کے پھڈے میں پڑنا چاہیے یا نہیں؟ وہ پروفیسر ہوگا تو یقیناً اسے بھی میری صورت دیکھ کے شبہ ہوا ہوگا کہ کیا اس نے فرید کو دیکھا تھا؟ وہ فرید جسے قتل کے کیس میں سزائے موت سنادی گئی تھی؟ خود پروفیسر اس الزام میں پہلے سے عمر قید کاٹ رہا تھا۔ فکرمند وہ بھی ہوگا... شاید وہ خود ہی تصدیق کے لیے آجائے۔ پروفیسر کا ہم شکل کوئی اور ہوگا تو اب تک سوچ چکا ہوگا۔ کیا مجھے پتا کرنا چاہیے کہ یہاں وہ کس نام سے ٹھہرا ہوا ہے؟ میں نے بھی اپنا نام خاور لطیف لکھوایا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ بیوی میرے ساتھ ہے۔ کیا پروفیسر اکیلا ہے؟

اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میں اچھل پڑا۔ ہو نہ ہو یہ پروفیسر آیا ہوگا۔ مجھے دیکھ کے نیند اس کی بھی حرام ہوگئی ہوگی لیکن اسے مجھ سے ملنے کسی صورت نہیں آنا چاہیے تھا۔ اپنے ساتھ مجھے بھی مروائے گا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ دروازہ کھولوں یا اندر سے ہی اسے کہہ دوں کہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرے کہ دستک پھر ہوئی۔ میں خفگی میں دروازے تک گیا اور آہستہ سے سرگوشی میں اسے ڈانٹا... ''کیا مسئلہ ہے... کیا چاہیے تمہیں مجھ سے آخر؟''

جواب میں نورین کی ڈری اور سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''خاور... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ پلیز، دروازہ کھولو۔''

مجھے خفت بھی ہوئی اور ہنسی بھی آئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ ایک دم اندر آگئی جیسے اس کے پیچھے کوئی لگا ہوا ہو۔ اس کا رنگ فق ہورہا تھا۔ آنکھوں میں وحشت تھی اور بال پریشان تھے۔ وہ دوپٹا بھی اپنے کمرے میں ہی چھوڑ آئی تھی۔ بند دروازے سے ٹیک لگا کے وہ مجھے شرمندگی سے دیکھتی رہی۔ ''مجھے اکیلے میں ڈر لگ رہا تھا۔''

میں نے مسکرا کے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ ''کیا کمرے میں کوئی جن بھوت ہے؟ ڈر کس چیز سے لگ رہا تھا آخر... خیر... چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ اور جب تک تم سو نہیں جاؤ گی، میں وہیں بیٹھا رہوں گا۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ پلٹ کر دروازہ کھولا اور اپنے کمرے میں واپس آگئی۔ میں اس کے ساتھ رہا۔ اس نے بیڈ پر بیٹھ کر کہا۔ ''نیند نہیں آرہی ہے مجھے۔''

''آجائے گی... تم کوشش کرو۔'' میں صوفے پر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''بہت کوشش کی میں نے... تم باتیں کرو نا مجھ سے... نیند تو تمہیں بھی نہیں آئی۔ تمہاری آنکھیں بتاتی ہیں... کیا حرج ہے اگر ہم کھانا کھالیں۔ اب مجھے بھوک لگی ہے کچھ۔''

''اوکے۔ فون اٹھاؤ اور آرڈر دے دو۔ جو کھانا ہے منگوالو۔''

ابھی وہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہ تھی کہ باہر سے کسی نے چیخ کے کچھ کہا۔ اس کے ساتھ ہی کسی دروازے پر ٹھکے لاتیں مارنے کا شور سنائی دیا۔ کسی نے گرج کے کہا۔ ''توڑ دو دروازہ۔'' اس کے ساتھ ہی دھماکے سنائی دیے۔ گرجنے دھاڑنے کا یہ انداز میرا جانا پہچانا تھا۔ ہر حکم کے ساتھ جو گالیاں ازخود برآمد ہوئی تھیں، وہ صرف پولیس والے ہی اس روانی اور فصاحت سے دے سکتے تھے۔ ٹھکے لاتیں مارنے کے بعد اب وہ دروازے پر رائفلوں کے بٹ مار رہے تھے۔

نورین کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ''خاور... یہ کیا ہورہا ہے خاور؟''

اپنی تشویش پر مصنوعی اطمینان کا پردہ ڈال کے میں نے کہا۔ ''کچھ شور ہورہا ہے۔''

وہ اٹھ کے میرے قریب آئی۔ ''دیکھو تو سہی۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے اٹھانا چاہا۔

میں نے اسے کھینچ کے اپنے پاس بٹھا دیا۔ ''جب یہاں کچھ نہیں ہورہا ہے تو تمہیں پریشانی کیوں ہے؟ مجھے کیا ضرورت ہے دخل در معقولات کی۔''

میری بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ پہلا فائر ہوا۔ یہ تھری ناٹ تھری رائفل کا دھماکا تھا جس سے ہمارے کمرے کی کھڑکی کے شیشے بھی بج اٹھے۔ پھر برآمدے میں بھاری جوتوں کے ساتھ بھاگنے والے قدموں کی صدا گونجی۔ اب یہ چھٹی حس کی بات نہیں رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آخری کمرے کے باہر جو چہرہ مجھے پل بھر کے لیے نظر آیا تھا، پروفیسر ہی کا تھا اور یہ سارا ہنگامہ اس کو گرفتار کرنے کے لیے ہورہا تھا۔ اندر سے خوف نے میرے دل کو جکڑ رکھا تھا کہ پولیس میرے اندازوں کو غلط ثابت کرتے ہوئے ایک مفرور مجرم کو تلاش کرنے اس فائیو اسٹار ہوٹل کے اندر پہنچ گئی تھی... تو میرا یہاں قیام کسی صورت محفوظ نہیں رہا تھا۔ یقیناً دھاوا ہونے سے پہلے پولیس نے اچھی طرح یہ تصدیق حاصل کرلی ہوگی کہ ان کا مطلوبہ مجرم اسی ہوٹل میں قیام پذیر ہے۔

پروفیسر نے بھی اپنی دانست میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا انتخاب کرکے بڑی عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے بھی اپنا نام کچھ اور لکھوایا ہوگا لیکن اس کی حکمتِ عملی ناکام رہی تھی۔ پولیس کے پاس یقیناً تمام فرار ہونے والوں کی تصاویر ہوں گی اور ہوٹل کی انتظامیہ نے پروفیسر کو شناخت کرکے بتادیا ہوگا کہ وہ کس کمرے میں کس نام سے مقیم ہے۔ اس خیال میں میرے لیے ایک اطمینان کا پہلو بھی نکلتا تھا کہ مجرموں کی تلاش کرنے والوں کے پاس صرف ایک پروفیسر کی تصویر ہی نہیں ہوگی۔ انہوں نے منیجر کو تمام تصاویر دکھائی ہوں گی۔ منیجر نے شناخت صرف ایک کو کیا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ وہ مجھے پہچاننے سے قاصر رہا تھا ورنہ اب تک پولیس نے اس کمرے میں داخل ہوکے مجھے بھی پکڑ لیا ہوتا۔

نورین مجھ سے لگی بیٹھی تھی۔ اس کو احساسِ تحفظ دینے کے لیے میں نے ایک بازو سے اس کے شانے کو محصور کرلیا تھا۔ اس کے باوجود میں نورین کے نازک بدن کی پُرخوف کپکپی کو محسوس کررہا تھا۔ برآمدے کا شور ہوٹل کے باہر منتقل ہوچکا تھا۔ یکے بعد دیگرے کئی فائر ہوئے۔ ان میں پستول کے فائر بھی تھے۔ رات کے سرد سناٹے میں ایک دل دوز چیخ سنائی دی پھر جیسے ہمارے کمرے کی بند کھڑکی سے کوئی توپ کا گولا ٹکرایا۔

نورین نے ایک چیخ ماری۔ میں نے ہاتھ سے اس کا منہ دبا دیا اور لائٹ آف کردی۔ کھڑکی کا شیشہ بکھر گیا تھا۔ اس کے اندر والی چٹخنی کھول کے کوئی اندر گرا۔ ''کون ہے؟'' میں نے چلا کے کہا۔

کسی نے بڑی پُراذیت آواز میں کہا۔ ''فرید... فرید... میں پروفیسر ہوں۔''

میں نے نورین کو الگ کیا اور پھر لائٹ جلائی۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر پڑا تھا۔ اس کے جسم سے ابلنے والا خون کارپٹ کو داغ دار کررہا تھا۔ خون اس کے منہ سے بھی ابل رہا تھا اور گردن کے زخم سے بھی جہاں گولی لگی تھی۔ وہ موت کے کرب میں سر کو اِدھر اُدھر پٹخ رہا تھا۔ ہاتھ چلا رہا تھا اور پیروں کو رگڑ رہا تھا۔ اس کی امداد طلب فریادی نظریں میری طرف تھیں لیکن میں پتھر کا بت بنا کھڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ آخری چند سانسیں لے رہا ہے اور میں چاہوں بھی تو اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا، اب اس اعترافِ جرم میں کوئی

حرج بھی نہیں کہ اس وقت انتہائی سفاکی سے میں اجنبی بن گیا تھا۔ اگر میں اسے بچانے کے لیے کچھ کرسکتا تب بھی نہ کرتا۔ میں اسے پہچاننے سے بھی انکار کردیتا یا شاید اس سے خطرہ محسوس کرتا تو خود اسے ماردیتا۔ اچھا ہوا کہ وہ خود ہی مرگیا۔

پولیس کا ایک سب انسپکٹر ہاتھ میں ریوالور لیے کچھ دیر بعد کود کے اندر آیا... اس نے ایک نظر مجھے اور نورین کو دیکھا جو کمرے کے آخری کنارے پر تھے اور پھر اپنے ریوالور کا رخ فرش پر پڑے آدمی کی طرف کرکے ایک اور گولی اس کے سر میں ماری جس کی قطعی کوئی ضرورت نہ تھی مگر پولیس والے جب کسی کو مارتے ہیں تو بالکل ماردیتے ہیں۔

برآمدے کی طرف سے پھر بھاری جوتوں کی آواز آئی۔

"دروازہ کھولو..." سب انسپکٹر نے مجھے حکم دیا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ایک ساتھ تین افراد پولیس کی وردی میں دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ ان میں سے ایک انسپکٹر کے رینک کا تھا۔

شناخت کا خطرہ ہوتے ہی مجھ پر لازم ہوگیا کہ میں ایک امن پسند شہری سے زیادہ اسلام آباد سے آنے والے افسر کا روپ دھارلوں۔ "واٹ از آل دس۔" میں نے غصے سے کہا۔ "انسپکٹر... یہ کیا تماشا ہے؟"

انسپکٹر رک گیا۔ "سوری سر... یہ کوئی تماشا نہیں ہے... یہ ایک خطرناک مفرور مجرم تھا۔" اس نے ریوالور سے قالین پر پڑے پروفیسر کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم اسے گرفتار کرنے آئے تھے۔"

"او مائی لارڈ... کیا یہاں فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بھی مفرور مجرم قیام کرتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "تم دیکھ سکتے ہو کہ میری وائف کے اعصاب پر اس کا کتنا برا اثر پڑا ہے... منیجر کہاں ہے؟"

انسپکٹر نے کہا۔ "خاور لطیف صاحب... پلیز آپ ساتھ والے کمرے میں شفٹ ہوجائیں۔ آپ کے ڈی جی صاحب تو ابھی آئے نہیں ہیں... ہمیں یہاں کچھ قانونی کارروائی کرنی ہے۔"

میں نے سر ہلایا... "اوکے... کم آن ڈارلنگ۔" میں نے دہشت سے بے ہوش ہونے کے قریب تھرتھر کانپتی نورین کو اپنے بازو کے حلقے میں لیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے دوسرے کمرے میں چھوڑ کے میں فوراً ہی واپس آیا اور اپنے سوٹ کیس اٹھا کے لے گیا۔ اس وقت میں نے منیجر کو بھی دیکھا جو خاصا پُرسکون تھا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے اخلاقاً اس نے مجھ سے اس تمام زحمت کی معذرت کی۔

میں نے دروازے کو اندر سے لاک کرکے نورین کو دیکھا۔ "خدا نے بچالیا آج..."

"وہ کسے فرید کہہ رہا تھا... تمہیں؟"

میں نے کہا۔ "میں تو خاور ہوں... اسے نہ جانے کس کا دھوکا ہوا..."

"کیا وہ... تمہارے ساتھ فرار نہیں ہوا تھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے کچھ اندازہ نہیں... میں صرف دو چار ہی کو جانتا تھا جو میرے ساتھ تھے۔ جیل ٹوٹنے کے بعد تو نہ جانے کتنے نکل بھاگے ہوں گے۔"

"جو لوگ فرار ہوئے تھے... پولیس کے پاس سب کی تصویریں تو ضرور ہوں گی؟"

"ظاہر ہے... تصویر دکھا کے ہی پولیس نے اس کا پتا چلایا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"انہوں نے تمہاری تصویر بھی دکھائی ہوگی۔" نورین کی آواز کانپنے لگی۔

"اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آج خدا نے بچایا۔ ہوٹل کے عملے میں سے کوئی بھی کہہ دیتا کہ یہ شخص ایک عورت کے ساتھ کمرا نمبر تیرہ میں مقیم ہے جسے وہ اپنی بیوی کہتا ہے تو میرے ساتھ تم بھی گرفتار ہوجاتیں۔ ابھی خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ پولیس مجھے اس مجرم کی گرفتاری کے کیس میں چشم دید گواہ بنالے... خود کو پولیس مقابلے کے الزام سے بچانے کے لیے۔ پروفیسر نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔"

"پروفیسر کون...؟"

میں نے کہا۔ "یہ جو پولیس کے ہاتھوں مارا گیا۔ نام تو معلوم نہیں کیا تھا اس کا... مگر وہ پروفیسر کہلاتا تھا۔ یہ مجھے ابھی پولیس نے بتایا ہے۔"

"دیکھو، تم کسی گواہی کے چکر میں نہیں پڑسکتے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی تمہیں بھی شناخت کرلے۔ تم پکڑے گئے تو میرا کیا ہوگا؟ جتنی جلدی ہو ہمیں اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہیے۔" نورین نے کہا۔

میں نے اس کے ہاتھ کو تھپکا۔ "ہم ایسا ہی کریں گے... لیکن ابھی پولیس موجود ہے۔ ہوٹل میں ہم ان کے سامنے گئے تو وہ شک میں پڑسکتے ہیں۔"

وہ چلّانے لگی۔ "میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ اس میں شک کی کون سی بات ہے؟ مسافر جب چاہیں کسی بھی ہوٹل میں آسکتے ہیں یا ہوٹل سے جاسکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اچھا... اچھا، میں کوشش کرتا ہوں... اس انسپکٹر کو بتادوں۔"

میں لوٹ کر تیرہ نمبر کمرے میں گیا تو انسپکٹر کسی کو فون کررہا تھا۔ سب انسپکٹر جائے واردات کا نقشہ بنا کے ضابطے کی کاغذی کارروائی کرنے میں مصروف تھا۔ لاش اسی حالت میں پڑی تھی اور ہوٹل کا منیجر بڑی بے چینی سے پولیس کی ایمبولینس کا انتظار کررہا تھا کہ وہ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اٹھالے جائے تو وہ صبح ہونے سے پہلے کمرے کی صفائی کرکے اسے پھر استعمال کے قابل بنادے۔ ہوٹل میں ایک مفرور مجرم کی ہلاکت نے کافی سنسنی پھیلائی تھی۔ بیشتر لوگ جاگ رہے تھے مگر انہوں نے کمروں سے نکلنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ہوسکتا ہے باقی لوگوں سے منیجر نے خود معذرت کرلی ہو اور انہیں مطمئن کردیا ہو کہ تشویش یا پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

مجھے دیکھ کے منیجر میری طرف آیا۔ "سر... میں ابھی کمرے کو صاف کرادیتا ہوں۔ یہ قالین بھی بدل جائے گا..."

میں نے ناگواری سے کہا۔ "رہنے دیں منیجر صاحب۔ میری وائف کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا ہے۔ وہ ایک منٹ کے لیے یہاں رکنے کو تیار نہیں۔"

"کوئی اور کمرا خالی ہوتا تو میں آپ کو شفٹ کردیتا۔ لیکن آج رات تو آپ چودہ نمبر میں ہی ٹھہر سکتے ہیں۔ آپ کے ڈی جی صاحب تو صبح ہی آئیں گے۔"

"آپ کیسی بات کررہے ہیں؟ میری بیوی کے سامنے ایک مرڈر ہوا ہے۔ پولیس کے لیے وہ مجرم ہوگا۔ میری وائف کے لیے وہ ایک انسان تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی خون نہیں دیکھا۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "کسی اور ہوٹل میں جانے سے پہلے تو مجھے اس کو لے کر اسپتال جانا پڑے گا۔ ہوسکتا ہے ایک دو دن اسے اسپتال میں رہنا پڑے۔"

اب انسپکٹر نے مجھے متوجہ کیا۔ "مسٹر خاور لطیف! آپ کی حیثیت ایک چشم دید گواہ کی ہے اور آپ کی وائف بھی یہاں موجود تھیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا میری گواہی کافی نہیں ہے؟ آپ میری وائف کو تو معاف ہی رکھیں۔ سمجھ لیں وہ یہاں تھی ہی نہیں تھی۔"

منیجر نے میری طرف دیکھا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں انسپکٹر کو کوئی پیغام دیا۔ "وہ ہوجائے گا سر... انسپکٹر صاحب کے اختیار میں ہے۔ آپ بیٹھیے... میں نے چائے منگوائی ہے۔"

معاملہ فہم منیجر نے صرف پانچ ہزار میں نورین کو گواہی سے مستثنیٰ کرالیا۔ میرا نام پتا اور دیگر تمام تفصیلات ہوٹل کے ریکارڈ میں موجود تھیں۔ انسپکٹر نے اس واقعے کی رپورٹ کو حقائق تک محدود رکھا۔ تاہم اس نے اپنے کارنامے کو بہادری کا رنگ دینے کے لیے اس میں یہ اضافہ ضرور کیا کہ ملزم نے پولیس پر جوابی فائرنگ کی تھی اور ریوالور خالی ہونے تک مقابلہ جاری رکھا تھا۔ پروفیسر کے پاس سے ایک ریوالور کی برآمدگی بھی ظاہر کردی گئی تھی۔ میں نے اس پر دستخط کیے۔ انسپکٹر نے مجھے مطلع کیا کہ ویسے تو تفتیش کے لیے کچھ بھی نہیں لیکن ضرورت پڑی تو مجھے اسلام آباد میں اپنے آفس ایڈریس پر مطلع کرکے طلب کرلیا جائے گا۔ جیل توڑ کے فرار ہونے کے واقعے کی تفتیش کے لیے ایک خصوصی کمیشن بنادیا گیا تھا جس کی سربراہی شاید ہائی کورٹ کے کسی جج کے سپرد کی جائے گی۔

کنارے

ایک لڑکی نے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔ بہت دن بعد ایک روز اس نے روتے ہوئے اپنی ماں کو بتایا کہ اس کا شوہر شراب کا عادی ہے۔ ماں بولی۔

"پھر تم نے اس سے شادی کیوں کی تھی؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "ممی! مجھے علم ہی کب تھا کہ وہ شراب پیتے ہیں۔ مجھے تو اس وقت پتا چلا جب ایک رات وہ پیے بغیر گھر میں آئے۔"

☆☆☆

ہوائی جہاز میں ایک خوب صورت ایئر ہوسٹس نے ایک نئی ایئر ہوسٹس کو بتایا۔

"پائلٹوں کے کیبن میں کھانے پینے کی چیزیں لے کر جاؤ تو چوکس رہنا۔ انہوں نے جہاز کو آٹومیٹک مشینی پائلٹ پر چھوڑ رکھا ہے۔"

(ڈیرہ اسمٰعیل خان سے طیب اسد کا انتخاب)

جب میں واپس نورین کے پاس پہنچا تو وہ کمرے کے وسط میں کسی مجسمے کی طرح بے حس وحرکت اور منجمد کھڑی تھی۔ میرے اندر آنے اور دروازہ بند کرنے پر بھی وہ اسی طرح کھڑی اپنے مقابل کی دیوار کو گھورتی رہی۔ میں نے آہستہ سے اسے آواز دی "نورین" تو اس نے خالی خالی نظروں سے یوں مجھے دیکھا جیسے میں کوئی اجنبی ہوں اور وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کررہی ہے۔

"تم نے بتادیا کہ ہم یہاں سے جارہے ہیں؟" اس نے لڑکھڑائی آواز میں کہا۔

میں سمجھ گیا کہ اس پر ہسٹریا کا غلبہ ہے اور اگر میں نے صورت حال کو احتیاط سے نہ سنبھالا تو وہ بے قابو ہو کے چیخنے چلّانے لگے گی۔ میں نے کہا۔ "ہاں... لیکن وہ کہتے ہیں کہ اس وقت کوئی سواری نہیں ملے گی۔"

"نہ ملے سواری... ہم پیدل چلے جائیں گے... بڑا سوٹ کیس تم کھینچ سکتے ہو، چھوٹا میں۔" اس نے ضدی لہجے میں کہا۔ "ہم یہاں کیسے رہ سکتے ہیں خاور... جہاں پر کمرے میں لاش پڑی ہے۔"

میں نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "بالکل ٹھیک کہتی ہو تم... ہم صبح ہوتے ہی چلے جائیں گے۔ تم کچھ دیر آرام کرلو... تمہیں نیند کی ضرورت ہے۔"

وہ ایک ہی جگہ کھڑی آہستہ آہستہ جھوم رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی غالب تھی لیکن اس کا بدن ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ میں نے اسے نرمی سے بیڈ کی طرف کھینچا تو اس نے مزاحمت کی۔ "نہیں... نہیں... میں سو نہیں سکتی... فائرنگ پھر شروع ہوجائے گی۔ یہ کھڑکی بند ہے نا... اسے کھول دو تاکہ وہ اندر آجائے... پروفیسر... ورنہ اسے گولی لگ جائے گی..."

اچانک اس کے جسم نے جھٹکا سا لیا۔ پھر وہ میرے قدموں میں ڈھیر ہوگئی۔ اسے سنبھالنے اور گرنے سے بچانے کی وہ کوشش رائگاں گئی... میں نے اسے بیڈ پر سیدھا لٹا کے اس پر کمبل ڈال دیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ایسے ہی سوجائے مگر وہ کراہ کے میرا نام لینے لگی اور بے چینی سے سر کو تکیے پر دائیں بائیں پٹخنے لگی۔ "خاور... خاور... تم کہاں ہو؟"

میں نے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ کے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ "کیا ہوا ہے نورین... میں یہیں ہوں تمہارے پاس... طبیعت ٹھیک ہے تمہاری..."

"مجھے... مجھے کچھ ہورہا ہے خاور... کیا میں مرجاؤں گی... مجھے مرجانا چاہیے... پانی... پانی۔"

میں نے ایک گلاس میں پانی ڈال کے اسے سہارے سے اٹھایا۔ "یہ لو... پانی پیو... اور خود کو سنبھالو..."

اس نے وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور پانی پینے کی کوشش کی۔ پانی اس کے ہونٹوں کے کنارے سے بہہ گیا اور اسے پھندا سا لگ گیا۔ وہ بُری طرح ہانپنے لگی۔ کئی بار اس نے الٹی کرنے کی کوشش بھی کی جیسے اسے شدید متلی محسوس ہورہی ہو۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ یہ مسلسل شاک کی کیفیت کے علاوہ بے آرامی کی دوسری رات کا نتیجہ ہے۔ میں نے اسے ایک خواب آور گولی دی تھی مگر وہ بے اثر رہی تھی۔ اگر وہ ایک رات سکون سے سوسکتی تو صبح نارمل ہوتی۔ کچھ دیر پہلے اس نے کہا تھا کہ نیند تو نہیں آرہی مگر بھوک لگ رہی ہے۔ وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھی۔ مجھے کھانا منگوانے کی مہلت ملتی اور اسے باتیں کرکے دل کا غبار نکالنے کا موقع ملتا تو شاید وہ بہتر محسوس کرتی اور سو سکتی مگر بدقسمتی سے اس وقت پولیس کا خونی ڈراما شروع ہوگیا جس میں نورین نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک جیتے جاگتے شخص کو گولی کا نشانہ بن کے دم توڑتے اور خود اپنے بہتے لہو میں تڑپ تڑپ کر جان دیتے دیکھا تو اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔

اب مجھے اس کی طرف سے تشویش ہو چلی تھی کیونکہ نورین نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا تھا۔ اس کے اندر کی باہمت بننے والی عورت ہسٹریا سے شکست ہوگئی تھی۔ میری پوری توجہ اور کوشش کے باوجود وہ ایک کمزور تنکے کی طرح ہسٹریا کے بھنور میں پھنس گئی۔ ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان اس کا جسم اینٹھنے، بل کھانے اور جھٹکے لینے لگا۔ میری اس کو سنبھالنے اور تسلی و تشفی دینے کی ساری کوشش بے مصرف ثابت ہوئی۔ وہ نیم دیوانگی کی کیفیت میں چلّانے لگی۔ "میں نے کسی کو نہیں مارا... خدا کی قسم... تم سے جھوٹ بولا تھا میں نے... میں بے قصور ہوں... میں قاتل نہیں ہوں... پھر وہ کیسے مرگیا... تم کہتے ہو اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوا تھا... جھوٹ تم بولتے ہو... وہ میرا شوہر ہی نہیں تھا۔ مجھے کیا ضرورت تھی اس پاگل کو مارنے کی؟ کیا میں ایسا کرسکتی ہوں... میں نے تو ایک مرغی ذبح نہیں کی کبھی... میں اسے چھری سے ذبح کرسکتی تھی؟"

آہستہ آہستہ اس کی آواز بلند ہونے لگی تھی اور اس کے اطوار میں جنون کے آثار نمایاں ہورہے تھے۔ اگر فوری طور پر میں اسے کنٹرول نہ کرتا تو وہ چیخنے لگتی۔ وہ

دیوانگی میں بے قابو ہوجاتی... اس کی آواز باہر سنی جاتی تو میرے لیے نئی پریشانی کھڑی ہوجاتی۔ میں نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔ "نورین... ہوش میں آؤ..." مگر اس نے خود کو چھڑانے کے لیے زور لگایا... مجبوراً مجھے اس کا منہ دبانا پڑا اور بالآخر اسے بستر پر گرا کے اپنے ہاتھوں کی پوری قوت سے بے بس کرنا پڑا۔ اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں مجھ پر نفرت کے شعلے برسا رہی تھیں اور وہ بُری طرح مچل رہی تھی مگر میں نے نہ اسے آواز نکالنے دی اور نہ اپنے قابو سے باہر ہونے دیا۔ یہ ایک نرم و نازک سی لڑکی کے ساتھ بڑا وحشیانہ سلوک تھا لیکن میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

چند منٹ میں اس کی مزاحمت ختم ہوگئی۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور اس نے آنکھیں بند کرکے گردن ڈال دی۔ میں نے دباؤ کو آہستہ آہستہ کم کیا اور اس کے شدید تر ردعمل کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد اور چوکس رہا مگر وہ بے سدھ پڑی رہی۔ میں نے سکون کا ایک گہرا سانس لے کر فون اٹھالیا۔ کسی نے زنانہ آواز میں کہا۔ "یس سر۔"

میں نے کہا۔ "مجھے فوری طور پر ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

"ڈاکٹر... اس وقت؟"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا جس میں گھڑی کی سوئیوں نے تاریخ بدل دی تھی۔ "کیا اس ہوٹل میں رات کے وقت کسی کو بیمار ہونے کی اجازت نہیں؟" میں نے غرا کے کہا۔ "میری بیوی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔ اگر اسے کچھ ہوا..."

"ایک منٹ سر... میں دیکھتی ہوں۔" وہ گھبرا گئی "مجھے ڈاکٹر کو کال کرنا ہوگا۔ کوئی تشویش کی بات تو نہیں ہے؟"

میں نے برہم ہو کے بولا۔ "وہاٹ نان سنس۔ تشویش کی بات نہیں تو کیا میں تفریح کے لیے ڈاکٹر کو بلوا رہا ہوں؟"

"میرا مطلب تھا سر... اسے آنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ اگر ایمرجنسی ہو تو میں ایمبولینس کو طلب کروں؟"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں... اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ ابھی جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد کسی بھی عورت کے اعصاب جواب دے سکتے ہیں، سوائے شاید تمہارے۔ تم عادی معلوم ہوتی ہو اس قسم کے واقعات کی۔" میں نے ریسیور پٹخ دیا۔

چند منٹ بعد منیجر نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ میں نے دروازے کو تھوڑا سا کھولا۔ "کیا ہوا؟ کوئی ڈاکٹر آرہا ہے یا نہیں؟"

"میری ڈاکٹر سے بات ہوچکی ہے اور وہ گھر سے روانہ ہوگئے ہیں۔ بہت اچھے میڈیکل اسپیشلسٹ ہیں اور میں نے ان کو بتا بھی دیا ہے... آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں نے پولیس سے بھی بات کرلی ہے۔"

"تھینک یو۔" میں نے بے رخی سے کہا اور دروازہ بند کردیا۔ تقریباً بیس منٹ تک میں بند کمرے کی چار دیواروں کے درمیان نوگرفتار جنگلی جانور کی طرح سرگرداں رہا۔ میرے ذہن پر ہراساں کرنے والے خیالات کی ایسی یلغار تھی کہ اس بوجھ تلے میری سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت مفلوج ہو کے رہ گئی تھی۔ جیسے اپنی ہمت اور قوت سے کئی گنا زیادہ بوجھ اٹھا لینے والا قلی خود اس بوجھ تلے دب کے رہ جائے۔ اب فوری اہمیت نورین کی ذہنی اور جسمانی حالت کی ہوگئی تھی۔ اس ہوٹل سے نکلنا بھی تب ہی ممکن تھا جب نورین اس قابل ہو۔ ابھی نہ مجھے یہ سوچنے کی کوئی ضرورت تھی اور نہ فرصت کہ یہاں سے نکلے تو ہم جائیں گے کہاں؟

ڈاکٹر نے بیس منٹ بعد دستک دی اور میرے "یس" کہتے ہی اندر آگیا۔ وہ میری توقع کے عین مطابق پچاس سے ساٹھ سال کی عمر کا خوش لباس اور خوش مزاج آدمی تھا۔ اتنی رات کو بھی وہ گھر سے سوٹ پہن کے اور میچ کرتی ٹائی لگا کے نکلا تھا۔ شاید وہ اسی لباس میں کہیں تھا اور سیدھا ہوٹل چلا آیا تھا۔ اس نے ایک حوصلہ افزا مسکراہٹ کے ساتھ اپنا تعارف کرایا۔ "میں ڈاکٹر غلام شبیر ہوں... اور آپ اس حسین خاتون کے شوہر۔ آپ کی نروس نیس بتاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہاں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ یہ برداشت نہیں کرسکی۔"

"میں نے ابھی کچھ سنا ہے۔ ویسے کیا ہوا تھا؟" اس نے بیگ سے اسٹیتھ اسکوپ نکال کے نورین کا چیک اپ شروع کیا۔ جب وہ نبض کی رفتار اور بلڈ پریشر دیکھ رہا تھا تو میں نے اسے مختصراً پروفیسر کے ہلاک ہونے کا واقعہ سنا دیا۔ وہ صرف سر ہلاتا رہا جیسے میں روزمرہ کا کوئی عام سا واقعہ سنا رہا ہوں۔

"میں تو یہاں ڈیوٹی پر آیا تھا۔ اس کو اپنے ساتھ لایا تھا کہ اس کا دل بہل جائے گا۔ یہ پہلے ہی بہت ٹینشن میں مبتلا تھی۔ ایک مرڈر کی وجہ سے۔"

"کس کا مرڈر؟" ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں کے

پپوٹے اٹھا کے دیکھے۔

"وہ... مرڈر تو میرے چھوٹے بھائی نے کیا تھا۔ اس کی منگیتر نے شادی سے انکار کیا۔ وہ کسی اور کے چکر میں تھی۔ اس نے غیرت اور جوشِ جوانی میں لڑکی کو مار دیا۔ بدقسمتی یہ کہ وہ میری بیوی کی سہیلی تھی اور ہماری شادی بھی اس کی وجہ سے طے پائی تھی۔ گھر کے اندر سب موجود تھے... اسے سہیلی کے مرنے کا بہت رنج تھا۔"

ڈاکٹر نے میری بات کچھ سنی اور کچھ نہیں سنی۔ "میں ابھی ایک انجکشن لگا دوں گا، سکون آور... اس سے یہ صبح تک سوتی رہیں گی۔ صبح ناشتے کے بعد ایک گولی اور دوسری رات کو... اگر ضرورت محسوس کریں۔" اس نے ایک پیڈ نکال کے نسخہ لکھنا شروع کیا۔

"تشویش کی کوئی بات تو نہیں؟" میں نے ایسے ہی سوال کر لیا۔

"فکریں تو آدمی خود مول لیتا ہے شادی کر کے۔ جہیز میں بیوی کے ساتھ آتی ہیں... وہ کیا کہا ہے اپنے چچا غالب نے... ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا... آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا... لڑکا ہوگا یا لڑکی۔"

مجھے یوں لگا جیسے آخری دو الفاظ دو فائر تھے جو میرے کانوں پر ریوالور رکھ کر کیے گئے ہوں۔ میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "جی... یہ کیا مذاق ہے۔"

"برخوردار... انسان کی زندگی میں تقدیر کا سب سے بڑا مذاق شادی ہے... مگر تم اتنے اداس اور فکرمند کیوں ہو گئے؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہاری پروموشن ہو گئی۔"

میں نے کہا۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے؟"

"بھئی اب تم باپ بننے والے ہو... مبارک ہو۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "آپ کی شادی کو تین ماہ سے زائد تو ہو گئے... میں شریک نہیں ہو سکا تھا اس میں۔"

"آپ... میری شادی میں..." میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

"ہاں... معلوم نہیں کیا وجہ تھی... ہوگی کوئی ایسی بات... اسی لیے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ یہ انہی کی صاحبزادی ہیں نا... شفقت محمود علی کی... میرے اچھے دوست ہیں... ان کے چچا ہیں ڈاکٹر عظمت محمود... میں لندن گیا تو ملے تھے۔"

میں نے سنبھل کے کہا۔ "ضرور آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

وہ خوش دلی سے ہنسا۔ "دولہا میاں... یہ بچی تھی تب سے میرے پاس آرہی ہے... نام بھی جانتا ہوں مگر اس وقت ذہن میں نہیں آرہا ہے۔"

سردی کے باوجود مجھے پسینا آگیا۔ خوف کے کانٹوں کی چبھن مجھے اپنے دل میں محسوس ہو رہی تھی۔ شامتِ اعمال مجھے نہ جانے کس دلدل میں اتار چکی تھی۔ قید خانے کے عذاب سے نکل کے میں نے رہائی نہیں پائی تھی۔ میں اس سے بھی زیادہ جان لیوا عذاب کا شکار ہو گیا تھا۔ آسمان سے گر کر کھجور میں نہیں، میں کسی ہائی ٹینشن الیکٹرک تاروں کے پول پر اٹک گیا تھا۔

ڈاکٹر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "اچھا... میں چلتا ہوں۔"

میں نے اخلاقاً پوچھا۔ "آپ کی فیس ڈاکٹر صاحب؟"

"میں تم سے فیس لوں گا؟ تم میرے داماد کی طرح ہو۔ سمجھو یہ تمہاری شادی کا تحفہ ہے میری طرف سے... اگر میں شریک ہوتا تو ایک ہزار سے کم کا کیا تحفہ ہوتا۔ اور میری رات کو وزٹ کی یہی فیس ہے۔" وہ ہنسا۔

اچانک پاسبانِ عقل نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ بے وقوف، کیوں اعترافِ جرم کی دلدل میں اترتا جا رہا ہے۔ ابھی وقت ہے حقائق کو جھٹلانے کے لیے... سچ کو جھوٹ بنا دے... حقیقت سے مکر جا۔ میں ایک دم سنبھل گیا۔ اپنے ہونٹوں پر ایک پُراعتماد مسکراہٹ سجا کے میں نے کہا۔ "کمال ہے ڈاکٹر صاحب... بڑی مہربانی ہے آپ کی جو مجھے اپنے داماد جیسا سمجھا۔ لیکن اس غلط فہمی کی بنا پر میں آپ کا حق نہیں مار سکتا، لیجیے۔" میں نے ہزار کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

اس نے نوٹ پکڑ لیا۔ "غلط فہمی؟"

میں نے کہا۔ "صورتوں میں مشابہت اتنی ہو سکتی ہے... خود مجھے ایک بار بڑی خفت اٹھانا پڑی۔ میرے ایک دوست ہیں اکنامک افیئرز ڈویژن میں... وسیم الطاف۔ میں اپنے والد کے ساتھ شفا انٹرنیشنل گیا تو وہاں کارڈیالوجی میں ڈاکٹر نسیم الطاف تھے۔ انہیں میں اپنے دوست کا جڑواں سمجھ بیٹھا۔ نام بھی دونوں کے ایسے ہی تھے۔ وسیم الطاف بھی میرے ساتھ تھا۔ وہ بہت ہنسا۔ کہنے لگا کہ میرا تو کوئی بھائی ہی نہیں۔ ہو جاتا ہے کبھی کبھی... اتفاق۔"

ڈاکٹر کنفیوز نظر آنے لگا۔ "فلمی اتفاق؟ یہ لڑکی وہ نہیں ہے... شفقت محمود کی بیٹی..."

میں نے خوش دلی سے پوچھا۔ "کہاں رہتے ہیں وہ؟ کیا کرتے ہیں؟"

"میاں شاہی بازار میں کیمسٹ ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو پہلی بار اسلام آباد سے باہر نکلی ہے۔ اگلے مہینے پی ایم صاحب آئیں گی لاڑکانہ... چار اپریل کو گڑھی خدا بخش جائیں گی۔ مجھے کچھ انتظامات کے سلسلے میں بھیجا گیا تھا۔ میں اسے بھی ساتھ لے آیا کہ اس کا دل بہل جائے گا۔ آپ نے اسے کہاں سے پہچان لیا؟"

ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ "کمال ہے... صورت کی اتنی مشابہت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی... پھر... جب آپ اسلام آباد واپس جائیں تو کسی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کر لیں۔ کسی گائنی اسپیشلسٹ سے۔ یہ بہت کمزور ہیں۔" نورین کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے اس نے ہزار کے نوٹ کو بے پروائی سے جیب میں رکھا اور مجھ سے ہاتھ ملا کے باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے بھی وہ میرے دل میں ایک خلش چھوڑ گیا۔ شاید یہ میرے دل کا چور تھا جس نے مجھے شکوک کے آزار میں مبتلا کیا۔ اپنی دانست میں میری اداکاری بہت پُراعتماد تھی اور میں نے ثابت کر دیا تھا کہ میں واقعی اسلام آباد کا ایک بیوروکریٹ ہوں اور میری بیوی آج سے پہلے کبھی سکھر نہیں آئی لیکن وہ بھی جہاندیدہ اور زمانہ شناس شخص تھا۔ اس نے جس نورین کی نبض دیکھی تھی، تو اس کے بائیں ہاتھ میں ایک انگوٹھی کو بھی بڑے غور سے دیکھا تھا۔ یا مجھے یوں لگا تھا کہ وہ انگوٹھی کو دیکھ رہا ہے۔ نورین نے اپنا سارا زیور اتار کے بیگ میں ڈال دیا تھا مگر یہ انگوٹھی رہ گئی تھی جو انگلی میں پھنسی ہوئی تھی۔

یہ شک مجھے وحشت اور پریشانی میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھا کہ میں ڈاکٹر کو دھوکا دینے میں ناکام رہا۔ میرے جھوٹ نے ڈاکٹر کو قائل نہیں کیا ہوگا۔ ہر ڈاکٹر انسانی جسم کی تفصیلی شناخت کا علم رکھتا ہے۔ دس سال بعد وہ کسی قبر سے کھود کر نکالے جانے والے ڈھانچے کی جنس اور عمر ہی نہیں، یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس کی موت کا کیا سبب تھا۔ بال اور ناخن دیکھ کے وہ فیصلہ صادر کر دیتا ہے کہ اسے سنکھیا کی قسم کا زہر دیا گیا تھا۔ نورین کو اس نے بچپن سے دیکھا تھا۔ میں نے صرف چوبیس گھنٹے پہلے۔ کیا پتا اس کی عقابی نظر نے شناخت کی کوئی ایسی علامت بھی دیکھ لی ہو جو ہنوز میری نگاہ

سے اوجھل تھی۔ رخسار یا گردن پر کوئی تل۔ کسی پرانے مندمل ہوجانے والے زخم کا نشان۔ جو ایک حقیقی شوہر کی نظر اپنی بیوی کے جسم پر دیکھتی ہے، وہ میں نے کہاں دیکھا تھا۔

جب ڈاکٹر چلا گیا تو وقتی طور پر حاصل ہونے والا تحفظ کا احساس بھی چلا گیا۔ کچھ دیر پہلے میں خدا کا شکر ادا کررہا تھا کہ پروفیسر کی طرح کسی کی نظر نے مجھے نہیں پہچانا ورنہ شاید اس کے ساتھ میرا بے جان جسم بھی کسی مُردہ خانے کی ٹھنڈی پتھریلی بینچ پر اکڑا ہوا پڑا ہوتا۔ اس افتاد سے خدا خدا کرکے بچا تھا کہ نورین کے ہسٹریا نے اس سے بڑی مصیبت کو بلالیا۔ ہم صبح ہوتے ہی نکل جانے کا فیصلہ تو کرچکے تھے مگر اس ڈاکٹر نے نورین کو پہچان کے مجھے بدحواس کردیا تھا۔ میں نے بڑے بھونڈے پن سے جھوٹ بولا تھا اور اس نے میرا جھوٹ پکڑلیا تھا تو یہ نتیجہ بھی اخذ کرلیا ہوگا کہ میں ہرگز وہ نہیں جو میں خود کو ظاہر کررہا ہوں۔ پھر اس کے ذہن میں یہ سوال بھی آئے گا کہ آخر سکھر کی رہنے والی ایک لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ ہوٹل میں کیوں قیام پذیر ہے؟ پھر وہ بہت کچھ فرض کرے گا۔ مقصد یہ کہ میں اسے اغوا کرلایا ہوں۔ نورین اگر شادی شدہ ہے تو اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہوئی ہے۔ ہم آج رات ہوٹل میں ہیں۔ صبح اس شہر سے نکل جائیں گے۔ اس کے شک نے یقین کی شکل اختیار کرلی تو وہ صبح ہونے کا بھی انتظار نہیں کرے گا۔ وہ ابھی اپنے دوست کو فون گھما کے پوچھے گا کہ تم نے اپنی بیٹی کی شادی کس سے کی تھی؟ وہ اس وقت کہاں ہے؟ ذرا معلوم کرو...

یہ غیرت اور ناموس کی قبائلی سوچ رکھنے والے معاشرے میں سنگین اخلاقی جرم بھی تھا اور قانونی بھی۔ ڈاکٹر کو تھانے فون کرکے اپنے شک کا اظہار کرنے سے بھی کون روک سکتا ہے۔ اگر اس کا شک بے بنیاد ثابت ہو، تب بھی اس کو فرق نہیں پڑتا۔ وہ اس شہر میں معزز شمار ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی تھانے دار سے کہہ سکتا ہے کہ ذرا فلاں ہوٹل میں جاکے فلاں کمرے میں دیکھو۔ وہ لڑکی کون ہے اور اس کے ساتھ جو کریکٹر ایکٹر ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟

یا میرے خدا... میں نے اپنے سر کو تھام کے سوچا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ کمرے کے اندر چڑیا گھر کے لگڑبگڑ کی طرح چلتے چلتے میری ٹانگوں میں درد ہونے لگا تھا۔ ”یہ کیا مسائل اور مشکلات کی خطرناک گھڑی ہے جو تُو نے مجھ ناتواں کے سر پر رکھ دی ہے؟“ میں نے سکون سے سوتی ہوئی نورین کی طرف دیکھ کے سوچا۔ جیل سے فرار ہوکے میں نے ایک جرم کیا تھا۔ اس سے پہلے کے جرائم بھی زبردستی میرے نامۂ اعمال میں لکھے گئے تھے۔ آزادی ایسی ملی کہ اس میں ایک اور سنگین جرم کا اضافہ ہوگیا۔ ایک آزمائش سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا... یہ دوسری اس سے بڑی آگئی۔

میں اپنی کم عقلی اور کوتاہ اندیشی پر بھی سخت جھنجلایا ہوا تھا حالانکہ مسلسل مصائب و آلام سے کسی بھی افلاطون کی عقل اس کے ٹخنوں میں آسکتی ہے۔ اب مجھے یہ خیال آرہا تھا کہ اس ڈاکٹر کے سامنے انکار سے مجھے کیا ملا؟ اس سے کہیں بہتر یہ تھا کہ میں اقرار کرلیتا۔ سعادت مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا کہ انکل آپ سے شادی میں ملاقات نہ ہوسکی، اسے بھی ملاقات نہ سمجھیے۔ جب ہم برخوردار کی رسم عقیقہ کریں گے تو آپ ضرور تشریف لائیں گے۔ وہ مطمئن اور خوش ہو کے چلا جاتا اور گھر جا کے سکون سے سوجاتا۔ پھر بھی اس کے باپ یا چچا سے ملاقات ہوتی تو ذکر کرتا۔ لیکن اب اس نے فوراً اس کے باپ کو یا پولیس کو فون نہ کیا تب بھی صبح کے اخباروں سے اس پر چودہ طبق روشن ہوجائیں گے کہ اس کے دوست شفقت محمود کی بیٹی تو اپنے شوہر کو شبِ عروسی میں قتل کرکے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔

یہ میرے لیے ایک اور چونکا دینے والا خیال تھا۔ نورین کی شادی کے بارے میں ڈاکٹر کا خیال تھا کہ چند ماہ قبل ہوئی تھی۔ نورین کی کہانی میں یہ واقعہ گزشتہ رات پیش آیا تھا۔ ظاہر ہے یہ سراسر جھوٹ تھا کیونکہ ڈاکٹر نے مجھے اس کے امید سے ہونے کی خبر بھی سنادی تھی۔ اگر اپنے جسم کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہی اس دلہن نے اپنے دولہا کو قتل کردیا تھا تو پھر یہ امید کیسی؟ سچ یہی تھا کہ اس کی شادی بہت پہلے ہوئی تھی۔ اور اگر شادی گزشتہ روز کا حادثہ تھا تو پھر یہ امید والا کارنامہ مرحوم سلمان خان کا تھا۔ محبت کا یہ چکر عرصہ دراز سے چل رہا تھا اور ظاہر ہے اتنا پاکیزہ بھی نہیں تھا جتنا نورین نے ظاہر کیا تھا۔ اب وہ زمانہ کہاں کہ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے عشق پر فلم بن جاتی تھی مگر کسی فلم میں کوئی ڈاکٹر کسی کو امید سے ہونے پر مبارکباد پیش نہیں کرتا تھا۔

میرے اندر غصے کا ایک شرارہ بڑھ کے چولہے کی آگ سے تنور بن چکا تھا جس میں میرا دل کسی جلی ہوئی روٹی کی طرح دھواں دے رہا تھا۔ میرے غصے کے... آتش فشاں تھے جو لاوا اگل رہے تھے۔ ایک کی زد میں نورین تھی جس نے مجھ سے جھوٹ بولنے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ مجھے جی بھر کے بے وقوف بنایا تھا اور استعمال کیا تھا۔ اس جیسی لڑکی سے کچھ بعید نہ تھا کہ مجھے کہیں بھی مروادے۔ کیا

پتا سلمان خان کو خود اس نے مروایا ہو۔ لیکن ایسا ہوتا تو وہ اس آسیب زدہ حویلی میں بیٹھی نہ رہتی۔ اسے یقیناً علم ہی نہیں تھا کہ اس کھنڈر میں اوپر ایک لاش پڑی ہے جس کی جیب میں دس لاکھ روپے ہیں۔ آخر یہ سب کیا شیطانی چکر تھا؟ کیا یہ محض اتفاق ہوسکتا ہے کہ اس نے کسی چاہنے والے کا نام سلمان خان بتایا اور جو اوپر مرا پڑا تھا، وہ سلمان خان تھا؟ نہیں... یہ اتفاق نہیں... ایک ناممکن بات تھی۔ اس نے تو مجھے سلمان خان کے گھر بھیجا تھا۔ اس کا پتا بھی بتایا تھا۔

پریشان خیالات کے اس الجھاؤ میں جب میرا دماغ ماؤف ہوکے خراب ہوگیا تھا، مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میں نورین کو سوتا چھوڑدوں اور کھڑکی سے کود کے فرار ہوجاؤں۔ اس کے قریب جاکے میں نے نورین کا چہرہ دیکھا جس پر معصومیت، تقدس اور بے گناہی کا عکس اتنا گہرا تھا کہ اس کی شرافت اور پاکیزگی کی قسم کھائی جاسکتی تھی۔ کون مکمل عقل و ہوش میں مان سکتا تھا کہ وہ قاتل ہے اور بدکار ہے۔ الو کی پٹھی... دھوکے باز... فریب کار... میں ہی ملا تھا تجھے اپنے تریا چلتر کا نشانہ بنانے کے لیے۔ سچ تو میں جان کے ہی رہوں گا۔ سچ جاننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ میں نے خود اپنے پیروں میں ایک قسم کی زنجیر ڈال لی ہے۔ کم ازکم بعد میں مجھے یہ خلش پریشان نہ کرے کہ حقائق کی تصدیق حاصل کیے بغیر میں بھاگ لیا۔

آہستہ آہستہ میرا دماغ ٹھکانے آرہا تھا۔ نورین کو چھوڑ کے بھاگ جانا بہت آسان تھا۔ دس لاکھ میری جیب میں تھے اور اسے میرا اصل نام تک معلوم نہ تھا۔ لیکن اس سے بہتر تھا کہ میں سچ کا اعتراف خود نورین کی زبانی کراؤں اور پھر اسے بتا کے جاؤں۔ ٹھوکر مار کے... ذلیل کرکے جاؤں... میں ہی ملا تھا تجھے الو بنانے کے لیے۔ تو نے تو پورا پلان بنا رکھا ہوگا کہ میرا جذباتی استحصال کرے اور میں تجھ سے شادی کرکے سلمان خان کے بچے کا باپ بن جاؤں۔ ڈاکٹر کی طرف سے خطرہ برقرار تھا اور مجھے یقین تھا کہ ابھی اس نے کچھ نہ کیا تو صبح اخبار دیکھنے کے بعد وہ چشم دید گواہ بن کے ہر جگہ فون کرے گا۔ وہ لڑکی تو فلاں ہوٹل کے ایک کمرے میں خاور نام کے ایک جعلساز کے ساتھ مقیم ہے۔ جو خود کو اسلام آباد کا افسر بتاتا ہے... میں مارا جاؤں گا شرافت اور جذبات کی کمزوری میں۔ کاش میں ایک عام مجرم کی طرح رات اس کے ساتھ گزار کے نکل جاتا۔ وہ کون سی عفت مآب شریف النفس تھی۔ امید کا ذریعہ ایرا غیرا نتھو خیرا ہو یا ان کا مشترکہ کارنامہ۔

میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو ملاحظہ کیا۔ کئی دن کی بڑھی ہوئی شیو میرے چہرے پر داڑھی کی فصل بن کے نظر آنے لگی تھی۔ میری آنکھیں لال اور سوجی ہوئی لگتی تھیں لیکن اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ تھی کہ میں خود اپنی نظر میں دنیا کا سب سے بڑا احمق نظر آتا تھا... سامنے آگئی تھی ایک بے حد حسین صورت اور اس نے مجھ پر آزمایا تھا دنیا کا سب سے خطرناک ہتھیار... اپنے آنسو... میری جگہ کوئی بھی مرد ہوتا تو اس کی عقل غبار بن کے اڑجاتی۔ خیر... جو ہوا سو ہوا۔ جو نہیں ہوا، ابھی تک وہ نہیں ہونا چاہیے۔

میں نے دروازہ کھول کے باہر جھانکا... کوریڈور خالی پڑا تھا... ہوٹل کے منیجر کی ٹیم نے بڑی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ پروفیسر کی لاش کو بھی ٹھکانے لگادیا تھا۔ تھانے دار کو بھی چلتا کردیا تھا اور اس کمرے کو اس طرح صاف ستھرا کردیا تھا جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ حالات

سازگار تھے اور میرے حق میں یہی بہتر تھا کہ صبح ہونے سے پہلے ہی نکل جاؤں۔۔۔ مسئلہ پھر نورین کا تھا۔ وہ میرے پاؤں کی بیڑی بن گئی تھی جسے میں کھول کے اکیلا نہیں فرار ہوسکتا تھا۔

اسے سکون سے سوتا دیکھ کے مجھے مزید طیش آیا۔ میں نے ایک دم اسے جھنجوڑا۔۔۔ "نورین۔۔۔ اے نورین۔۔۔ اٹھ جاؤ فوراً ورنہ میں جارہا ہوں۔"

وہ کسمسائی۔ "جارہے ہو۔۔۔ کہاں۔۔۔ دبئی جارہے ہو سلمان مجھے چھوڑ کے؟"

"ایسی کی تیسی سلمان خان کی۔" مجھے یوں لگا جیسے نورین نے مجھے گالی دے دی ہو۔ "میں خاور ہوں۔۔۔ اٹھو فوراً۔۔۔ ہمیں ابھی اور اسی وقت جانا ہے۔۔۔ ہم صبح تک انتظار نہیں کرسکتے۔"

"میں۔۔۔ مجھے۔۔۔ نیند آرہی ہے۔۔۔ سونے دو۔۔۔" وہ منمنائی۔

"اگر ہم ابھی نہ نکلے تو پکڑے جائیں گے نورین۔" میں نے اس کا شانہ پکڑ کے ہلایا اور اس کے منہ پر طمانچے مارے تاکہ وہ ہوش میں آجائے مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ نیم بے ہوشی میں نہ جانے کیا کچھ کہتی رہی۔ وہ میری آواز سن رہی تھی لیکن انجکشن کے اثر سے اس کا دماغ سویا ہوا تھا۔

میں نے تھک ہار کے کمرے میں دو چکر لگائے اور پھر صوفے پر ٹک گیا۔ کسی کو سلانا تو بہت آسان ہے۔ ایک گولی یا ایک انجکشن کافی ہوتا ہے مگر جگانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے سوچنا شروع کیا۔ اس کے کان میں چلانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ اسے ٹھنڈے پانی میں غوطہ دیا جاتا تو اس کی ساری نیند کافور ہوجاتی۔۔۔ یس۔۔۔ فریج میں ٹھنڈے پانی کی بوتل تھی۔ میں نے بوتل اس کے چہرے پر انڈیلی۔ "نورین۔۔۔ اٹھ جاؤ۔۔۔ چلو۔"

اس نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "مجھے۔۔۔ سردی لگ رہی ہے۔۔۔ بارش میں کہاں لے جارہے ہو مجھے۔"

میں نے چلا کے کہا۔ "خدا کے لیے اٹھو۔ یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔" میں نے اس پر مزید پانی ڈالا۔

وہ کانپنے لگی۔۔۔ اس کا جسم سردی سے لرزنے لگا۔ "خاور۔۔۔ خاور۔۔۔ یہ پانی کہاں سے آگیا؟ دیکھو میرے کپڑے بھیگ گئے۔۔۔" وہ بے ربط الفاظ میں بولتی تھی اور پھر کروٹ لے کر سوجاتی تھی۔ اس کے کپڑے ہی نہیں، بیڈ تک گیلا ہوگیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اسے کس طرح ہوش میں لاؤں۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میں ہوٹل والوں کے ذریعے کسی دوسرے ڈاکٹر کو طلب کروں اور اسے کہوں کہ نورین کو جگانے اور ہوش میں لانے کا انجکشن دے۔۔۔ اس خیال کو میں نے فوراً مسترد کردیا۔

اب ایک آخری صورت یہ تھی کہ میں نورین کو بلیک کافی پلادوں۔ یہ کام بھی آسان نہیں تھا۔ اور کسی سوتے ہوئے شخص کے حلق سے کافی نیچے اتارنے کے لیے وہی طریقہ استعمال کیا جاسکتا تھا جو گائے بیل کو تیل پلانے کے لیے استعمال ہوتا تھا کہ نلکی میں ڈال کے پھونک ماری جائے۔ لیکن یہ سب عملی طور پر ممکن نہیں تھا۔ رات کے دو بجے ہوٹل کا کچن بھی بند ملتا اور اگر میں ایمرجنسی بتا کے کافی بنواتا تو شاید ہوٹل کی انتظامیہ اسے ایمرجنسی نہ تسلیم کرتی اور معذرت کرلیتی۔ مایوسی کی اس کیفیت میں مسئلے کا حل ایک غیبی خیال بن کے اترا۔ یہ ایک تیر سے دو شکار کرنے والا حل تھا۔

میں سیدھا استقبالیہ کاؤنٹر پر گیا جہاں رات کو ڈیوٹی دینے والی ایک ڈبل ڈیکر قسم کی خاتون کرسی کی پشت سے سر لگائے باقاعدہ سو رہی تھی۔ قصور اس کا نہیں تھا۔ نصف شب کے بعد یہاں اس کی ڈیوٹی محض کسی مسافر کا لاحاصل انتظار ہوگی۔ شاید سال میں ایک آدھ بار کوئی آ بھی جاتا ہو ورنہ بے کار مباش کچھ کیا کر۔۔۔ پر عمل کرتے ہوئے سونا بہرحال کام تھا۔ لاؤنج خالی پڑا تھا اور شیشے کے بند دروازوں کے باہر گزرتی رات کے سرد سناٹے کو چند گارڈن لیمپ بلاوجہ روشنی دے رہے تھے۔ ایک باوردی گارڈ بھی کرسی پر اپنی رائفل کو دونوں ٹانگوں کے درمیان دبائے اونگھ رہا تھا۔

میں نے خاتون کے سامنے کاؤنٹر کی سطح پر زور زور سے ہاتھ مارا تو وہ چونک کے اٹھی۔ "یس سر!"

میں نے کہا۔ "مجھے ایک ایمبولینس چاہیے فوراً۔"

"خیریت تو ہے سر۔۔۔"

"ہاں۔ بس میں نے آج تک ایمبولینس میں آدھی رات کو دریائے سندھ عبور کرکے نہیں دیکھا تھا۔۔۔ یہ آخر کس قسم کا احمقانہ سوال ہے۔۔۔ خیریت میں کوئی ایمبولینس منگواتا ہے؟" میں نے دہاڑ کے کہا۔

اس کا رنگ فق ہوگیا۔ "آئی ایم سوری۔۔۔ میں ابھی فون کرتی ہوں۔"

"کچھ دیر پہلے روم فورٹین کے لیے ڈاکٹر کس نے بلوایا تھا؟" میں نے کہا۔ "کون تھا یہاں ڈیوٹی پر؟"

"میں سر۔۔۔ میں نے ہی فون کیا تھا۔ آپ کی

وائف۔۔۔ آپ کہاں لے جانا چاہتے ہیں انہیں؟"

"کسی بھی اچھے اسپتال۔ وہ نالائق ڈاکٹر کچھ نہیں کرپایا۔ اس کی حالت بگڑ گئی ہے۔ صبح تک وہ مرگئی تو میں اس ہوٹل کی جگہ پاگل خانہ بنوادوں گا۔ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے ایک مفرور مجرم پکڑا گیا۔ پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ اسی سے میری وائف کی یہ حالت ہوئی۔"

عورت نے کال ملنے پر سکون کا سانس لیا اور مجھے مطلع کیا کہ ایمبولینس دس منٹ میں پہنچ جائے گی۔ میں نے واپس آکے کمرے میں بکھرا ہوا سب سامان بڑے سوٹ کیس میں ٹھونس لیا۔ نورین کو کمبل میں لپیٹتے ہوئے مجھے اس کے گیلے کپڑوں کا خیال آیا۔ کہیں اسے سردی سے نمونیہ نہ ہوجائے۔ اسپتال والے سوال ضرور کریں گے کہ اس کے کپڑے گیلے کیوں ہیں؟ سوچنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے میں نے اس کے خریدے ہوئے نئے کپڑوں کا ایک جوڑا نکالا اور کسی تذبذب کے بغیر گیلے کپڑے اتار کے اس کے جسم پر چڑھا دیا۔ اگر وہ ہوش میں ہوتی تو یہ ناممکن تھا۔ بعد میں وہ کیا کہے گی، یہ سوچنے کی نہ مہلت تھی اور نہ ضرورت۔ میں نے اس کے دمکتے ہوئے متناسب اور خوبصورت جوان جسم کو اسی نظر سے دیکھا اور ہاتھ لگایا جیسے آپریشن ٹیبل پر ڈاکٹر دیکھتا اور ہاتھ لگاتا ہے۔ ابھی میں اسے لپیٹ ہی رہا تھا کہ مجھے ایمبولینس کے آجانے کی اطلاع ملی۔ میں نے نورین کو ایمبولینس کے پچھلے حصے میں اسٹریچر پر لٹایا اور لوٹ کے کمرے میں جاتے ہوئے کاؤنٹر پر بیٹھی خاتون سے چلا کے کہا کہ وہ میرا بل بنادے۔

وہ کچھ بدحواس ہوئی۔ اس نے اپنے کیریئر میں کبھی آدھی رات کے بعد یہ کام نہیں کیا ہوگا۔ تاہم میرے سوٹ کیس لے کر آنے تک اس نے کسی سے ہدایات لے کر اپنا کام کرلیا تھا۔ ظاہر ہے اس کے لیے بھی مجھے روکنا ممکن نہیں تھا۔ آخری وقت میں ایک چھوٹا سا مسئلہ پیدا ہوا جب میں نے کہا کہ میں اپنے زیر استعمال کمبل کو ساتھ لے جارہا ہوں اور اس کے سامنے پانچ ہزار روپے ڈال دیے۔ "کمبل کی قیمت اس سے کم ہی ہوگی۔ جو باقی بچ جائیں وہ تم رکھ سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ساری رقم بھی رکھ سکتی تھی۔ اسے صرف اتنا ہی کہنا تھا کہ رات کو جانے والا اپنے ساتھ کمبل بھی لے گیا، مجھے بتائے بغیر۔ شاید پریشانی میں بھول گیا۔ تھا تو شریف آدمی۔

ایمبولینس پر کسی اسپتال کا نام نہیں تھا۔ ڈرائیور نے پوچھا۔ "کہاں جانا ہے سر؟"

ہم جانتے ہیں

ایک سیاسی لیڈر نے ایک رسالے کے ایڈیٹر کو فون کیا۔

"مجھے کسی نے بتایا ہے کہ آپ نے اپنے رسالے میں مجھے احمق اور جاہل لکھا ہے۔"

ایڈیٹر! "نہیں سر۔۔۔۔۔۔ کسی اور رسالے والے نے لکھا ہوگا ہم اپنے رسالے میں ایسی باتیں ہرگز نہیں شائع کرتے جو قارئین پہلے سے جانتے ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تم کس اسپتال سے آئے تھے؟"

"یہ پرائیویٹ سروس ہے سر۔"

"اوکے۔۔۔ مجھے شہر کے سب سے بڑے اور اچھے اسپتال پہنچادو۔" میں نے کہا۔

تقریباً دس بارہ منٹ میں ایمبولینس ایک اسپتال کے وسیع کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔ اسپتال دومنزلہ تھا اور اس کے گرد وسیع باغ اور لان تھے۔ اس کے باہر بہت سی کاریں کھڑی تھیں اور ایمرجنسی کے گیٹ تک جانے والے راستے پر دورویہ روشنیاں تھیں۔ روشنی باغ اور لان پر بھی تھی اور عمارت کے چاروں طرف بھی۔ شیشے کے خودکار گیٹ سے لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ نورین کو ایمبولینس کے آتے ہی دو مستعد نرسنگ آرڈرلی اتارنے آگئے۔ میں نے ایمبولینس ڈرائیور کو فراخ دلی سے پانچ سو کا نوٹ دیا تو اس نے چار سو نہ ہونے کا عذر پیش کیا۔ میں نے کہا۔ "باقی رکھو، اپنا انعام۔"

میرے اندر پہنچنے سے قبل ہی نورین کو معائنے کے لیے ایک ٹیبل پر لٹادیا گیا تھا۔ ایک آر ایم او کی مدد کوئی نرس کررہی تھی جو بلڈ پریشر دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا۔ "کیا ہوا ہے انہیں سر؟"

میں نے کہا۔ "کچھ نہیں۔ ان کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا۔۔۔ گھر میں ایک حادثاتی ڈیتھ ہونے کے بعد۔ ایک ڈاکٹر نے ان کو سکون آور انجکشن دیا تھا۔ تقریباً سولہ گھنٹے ہوگئے۔ ظاہر ہے یہ تشویش کی بات تھی میرے لیے۔ دوا کا

اثر اتنی دیر تک تو نہیں رہنا چاہیے۔ میں یہاں لے آیا ہوں... آپ دیکھیں کوئی تشویش کی بات تو نہیں ہے۔"

وہ آہستہ سے مسکرایا۔ "معلوم ہوتا ہے نئی شادی ہوئی ہے آپ کی۔ مجھے کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی۔ سب کچھ نارمل ہے۔ پھر بھی آپ کی تسلی کے لیے ہم رات بھر آبزرویشن پر رکھیں گے۔ آپ کاؤنٹر پر داخلے کی کارروائی پوری کرلیں۔"

کاؤنٹر پر مجھے جنرل وارڈ، سیمی پرائیویٹ، پرائیویٹ اور وی آئی پی روم کا چوائس دیا گیا تو میں نے وی آئی پی کا انتخاب کیا اور پانچ ہزار پانچ سو دے کے وی آئی پی بن گیا۔ اس سے آسانی یہ ہوئی کہ میں نے جو کہا، کسی ثبوت کے بغیر مان لیا گیا۔ میں نے اپنا نام مخدوم نصیر اللہ چانڈیو لکھوایا اور پرس کھول کے سلمان خان کے شناختی کارڈ کا نمبر دیا تو کسی اعتراض کے بغیر لکھ لیا گیا۔ میں ہوٹل سے آیا تھا لیکن میں نے لاہور ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کا ایڈریس دیا تو قبول کرلیا گیا۔ دس منٹ بعد نورین ایک وسیع شاندار طور پر آراستہ ایئر کنڈیشنڈ روم کے بیڈ پر تھی اور بہ دستور سو رہی تھی۔ ظاہر ہے صرف تین گھنٹے پہلے دیے جانے والے انجکشن کا اثر چھ آٹھ گھنٹے سے پہلے ختم نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے یہاں خود کو زیادہ محفوظ اور پُرسکون محسوس کیا۔ کمرے میں مریض کے ساتھ آنے والے کے لیے دوسرا بیڈ لگا ہوا تھا۔ کچھ دیر بیٹھے رہنے کے بعد مجھے چکر سے آنے لگے۔ یہ بیک وقت تھکن، نیند کی کمی اور اعصابی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ لیٹ جاؤں لیکن تکیے پر سر رکھتے ہی میں جیسے بے ہوش ہوگیا۔ زندگی میں پہلے کبھی نیند نے اتنی سرعت سے مجھ پر غلبہ نہیں پایا تھا۔ یہ بالکل بے خواب اور مکمل نیند تھی۔

جب میں جاگا تو عادت کے مطابق میں نے کلائی کو سامنے لا کے گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے ساڑھے سات بجے تھے۔ میری نیند کا دورانیہ تقریباً تین گھنٹے کا تھا لیکن اس نے بھی حیرت انگیز طور پر کام کیا تھا۔ میں اتنا مستعد اور تازہ دم تھا جیسے پوری رات میں آٹھ گھنٹے کی مکمل اور مسلسل نیند لی ہو۔ میں نے نورین کی طرف دیکھا اور اٹھ بیٹھا۔ وہ آنکھیں کھولے سکون سے بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا کہ اس اسپتال میں وہ کیسے آئی۔ ظاہر ہے میرے سوا اس کی فکر کرنے والا اور کون تھا۔ میرا غصہ بھی اب کنٹرول میں تھا اور گزشتہ رات کے تمام انکشافات پر اپنے ردِعمل کے اظہار کو میں نے وقتی طور پر التوا میں رکھا اور اس سے پوچھا۔ "کیسی ہے اب طبیعت؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلا کے بہتر ہونے کا اعتراف کیا۔ چند سیکنڈ مجھے دیکھتی رہی اور پھر آہستہ سے بولی۔ "مجھے معاف کردو... میری وجہ سے..."

میں نے سختی سے کہا۔ "یہ رسمی باتیں مت کرو..."

دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ ایک ڈاکٹر اندر آگیا۔ اس کے ساتھ معاون نرس بھی تھی جس نے روٹین کے مطابق ٹمپریچر اور بلڈ پریشر وغیرہ چیک کیا۔ یہ نوجوان ڈاکٹر تھا جس نے نورین کے بجائے مجھے مخاطب کیا۔ "کیسی ہیں آپ کی وائف چانڈیو صاحب!" اس نے فائل دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے خوش دلی سے کہا۔ "آپ دیکھ کر بتائیے۔ میں تو ڈاکٹر نہیں انجینئر ہوں۔"

اس نے رسمی سا معائنہ کر کے اطمینان ظاہر کیا۔ "اگر آپ چاہیں تو ہم آج انہیں آبزرویشن پر رکھیں اور سارے ٹیسٹ کرلیں۔" اس نے اسپتال کے کاروباری مفاد کی پالیسی کے مطابق کہا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ اچھا مشورہ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ آج ریسٹ کریں... صرف ریسٹ۔ کھائیں پئیں، آپ کو بیماری کوئی نہیں بظاہر۔" وہ نرس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی پھر دستک ہوئی اور ایک ملازم پُرتکلف ناشتے سے بھری ہوئی ٹرالی چھوڑ گیا۔ نورین آہستہ سے اٹھی اور واش روم چلی گئی۔ اس کے بعد میں نے بھی صرف ہاتھ منہ دھونے پر اکتفا کیا۔ ناشتا ہم نے مکمل خاموشی میں کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے نظر نہیں ملا رہی ہے۔ ناشتے کے بعد اس نے آہستہ سے سوال کیا۔ "میرے یہ کپڑے... کس نے بدلے تھے؟"

میں نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ "آپ کی والدہ محترمہ کو بلا لیا تھا میں نے۔"

اس کو شاید مجھ سے ایسے جواب کی امید نہیں تھی۔ "جو کہنا ہے مجھے کہو... میری ماں کو مرے تو دس سال ہوگئے۔"

میرا غصہ بڑھنے لگا۔ "کیسے مان لوں میں یہ بات بھی... اب تک جھوٹ کے سوا کچھ نہیں بولا تم نے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم... ایسا کون سا جھوٹ بولا ہے میں نے؟"

"یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو؟ آخر کیا بُرا کیا تھا میں نے تمہارے ساتھ نورین۔"

وہ سہم کر بولی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تم... ایسا کیا کردیا

میں نے..."

میں نے غصے سے میز پر مگ پٹخا۔ "یہ پوچھو کہ کیا نہیں کیا ہے تم نے... میرا منہ مت کھلواؤ۔"

"کل رات جو کچھ میں نے کیا... اس کی میں معافی مانگ سکتی ہوں... معلوم نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا۔ لیکن... تم اس لہجے میں کیوں بات کررہے ہو؟"

"اس لیے کہ کل رات سے اب تک مجھے سب معلوم ہوگیا ہے۔ تم ایک نمبر کی جھوٹی... عیار، مکار اور بدچلن عورت ہو... گناہوں کی سیاہی تمہاری معصوم صورت پر دکھائی نہیں دیتی۔"

وہ چلّا کے بولی۔ "یہ کیا بکواس ہے... تم گالیاں دے رہے ہو مجھے؟"

"میں ایک جھانپڑ دوں گا اگر بک بک کی۔ کس طرح تم نے میری آنکھوں میں دھول جھونکی... بے وقوف بنایا مجھے اور میری لاعلمی سے فائدہ اٹھایا۔ میں ہوتا شادی شدہ یا میری جگہ کوئی عورت ہوتی تو تمہارے لیے اسے دھوکا دینا ممکن نہ ہوتا۔"

اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "یا میرے خدا... تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔"

"بس بہت ہوچکی اداکاری۔ اگر تمہیں بھروسا تھا مجھ پر تو آدھا سچ چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟ میں تمہاری مدد کررہا تھا۔ اس غلطی پر بھی کیا کہتا۔ یہی کہ ایسا بھی ہوجاتا ہے۔ غلطی سے ناتجربہ کاری سے یا مجبوری میں... بھگتنا عورت کو ہی پڑتا ہے۔ مرد تو عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ سوچتی ہے گھر بسانے کی۔"

نورین کی صورت پر الجھن اور جھنجلاہٹ کے ساتھ غصہ تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ایک تو اسے موقع نہیں مل رہا تھا اور شاید زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی اور اعترافِ جرم یا تردید اور وضاحت کے لیے اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے... "خاور... خدا کے لیے چپ ہوجاؤ... مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "اوکے... میں کوئی فارسی نہیں بول رہا تھا مگر تمہاری آسانی کے لیے سادہ سلیس اردو میں بتاتا ہوں... جب تم بے ہوش پڑی تھیں تو ہوٹل میں ایک ڈاکٹر آیا تھا۔ مجھے مجبوراً بلانا پڑا تھا۔ یہ دیکھو اس کا لکھا ہوا نسخہ... اس کے اپنے لیٹر ہیڈ پر... تم جانتی ہو اسے... وہ تو جانتا تھا تمہارے والد اور چچا کو۔"

نورین نے نام دیکھ کے نفی میں سر ہلایا۔ "سکھر میں تو سیکڑوں ڈاکٹر ہیں۔"

"مگر اس نے پہچان لیا تھا تمہیں... اس نے مجھے سب بتادیا... وہی جو تم نے جانتے بوجھتے چھپایا تھا۔"

نورین نے نظر جھکا کے کہا۔ "آئی ایم سوری... یہ ٹھیک ہے کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ یا یوں سمجھو کہ پورا سچ نہیں بتایا تھا تمہیں... لیکن اس کا مقصد تمہیں دھوکا دینا نہیں تھا... مجھے ہمت نہیں پڑی... میں مناسب وقت پر تمہیں سب بتادیتی۔"

میں نے تلخی سے کہا۔ "مناسب وقت... کب آتا وہ مناسب وقت... میرے ساتھ تم نے ہوٹل کے ایک کمرے میں رہنا منظور کرلیا۔ مناسب وقت پھر بھی نہیں آیا... سلمان خان کے بارے میں ہر بات بتائی مجھے... اس کے گھر بھیجا مجھے... مجھے تو اندازہ ہوگیا تھا کہ محبت کا یہ طوفان یک طرفہ ہے۔ صرف تم پاگل ہورہی ہو اس کے لیے۔"

"بالکل غلط تھا تمہارا اندازہ... اگر وہ کسی مجبوری کی وجہ سے آنہیں سکا..."

میں نے چلّا کے کہا۔ "وہ آئے گا بھی نہیں بی بی... لکھ لو میری بات... مطلب نکل جانے کے بعد وہ بھاگ گیا اور اب تم بھگتو اس محبت کو... لے کے پھرو سارے زمانے میں اپنے داغِ رسوائی کو... آخر کب تک چھپاؤ گی اپنے گناہ کو۔"

اس نے ایک وحشت زدہ چیخ ماری... "خاور... کمینے... میں قتل کردوں گی تمہیں۔"

"ہاں... ایک کے بعد دوسرا قتل تو آسان ہوگا تمہارے لیے۔ مگر کیا اس سے تم پر بن بیاہی ماں کہلانے کا الزام نہیں رہے گا؟ ایک نہیں تم دس خون کردو۔"

اس نے ناشتے کے ساتھ آنے والی مکھن کی چھری اٹھا کے مجھ پر حملہ کیا۔ "ذلیل آدمی... بن بیاہی ماں کی اولاد ہوگے تم خود... تمہاری بہن نے کیے ہوں گے ایسے کام... تم مجھ پر یہ الزام لگاتے ہو۔"

میں نے ایک جھانپڑ رسید کرکے اسے پیچھے گرادیا۔ "ایسی بکواس سے حقیقت نہیں بدل سکتی اور نہ الزام غلط ثابت ہوسکتا ہے۔ اس ڈاکٹر نے تمہارا معائنہ کرنے کے بعد خود مجھے مبارکباد پیش کی کہ آپ اب باپ بننے والے ہیں۔ مجھے بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟ مجھ سے تم نے کہا کہ چچازاد کو تم نے ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ تم اسے شوہر ہی تسلیم نہیں کرتیں۔ پھر یہ کیا ہے؟ کون ذمے دار ہے اس کا سلمان خان کے

سوا؟ اس ڈاکٹر نے کہا کہ تمہاری شادی میں وہ شریک نہیں ہوسکا تھا۔ وہ کس شادی کی بات کررہا تھا؟"

نورین بیڈ پر ایک ہی پوز میں ساکت مجھے خون آشام زہریلی نظروں سے دیکھتی رہی۔ "بس یا اور کچھ باقی ہے کہنے کے لیے؟ ایسی کی تیسی تمہاری اور تمہارے اس ڈاکٹر کی۔ ڈاکٹر نہیں، وہ ہوگا کوئی عطائی۔ اس کاغذ پر لکھی ہوئی ساری ڈگریاں جعلی ہیں۔"

"اب اور کیا کہہ سکتی ہو تم..."

"بلاؤ اس ڈاکٹر کو یہاں میرے سامنے۔ الّو کا پٹھا... میں پوچھتی ہوں اس سے کہ وہ کیا جانتا ہے... کوئی بھی ڈاکٹر ایسی بات کر ہی نہیں سکتا۔ کسی شریف لڑکی پر یوں تہمت لگانا..."

"تہمت! تمہارا یہ ڈھونگ اب نہیں چلے گا نورین... اس نے کہا تھا کہ لیڈی ڈاکٹر کو دکھائیں۔ آپ کی وائف کمزور ہیں۔ دورانِ حمل کمزوری ہوجاتی ہے... تم مان کیوں نہیں لیتی ہو اپنی غلطی... اگر وہ سلمان خان تھا..."

وہ چلّانے لگی۔ "خدا کے لیے ایسا مت کہو۔"

"تم جو ہسٹریا سے ڈرا رہی ہو مجھے... مگر... یہ اسپتال ہے... کون جھوٹا ہے کون سچا... یہ معلوم ہوجائے گا دومنٹ میں... تمہارے چیخنے چلّانے سے اب میں نہیں ڈرتا... اور نہ تمہاری بے گناہی کا یقین کرسکتا ہوں۔"

وہ چیخ کے بولی۔ "مت کرو یقین... بھاڑ میں جاؤ... لیکن جب تمہارے سامنے سچ آئے تو مجھے اجازت دینا کہ تمہارے منہ پر یہ جوتا مار سکوں... اور اس وقت بلالینا ان ڈاکٹر صاحب کو بھی... بکواس کی اس نے کسی ثبوت کے بغیر اور تم اتنے عقل سے پیدل ہو کہ اس پر فوراً یقین کرلیا... مرض کو سمجھنے میں غلطی کوئی بھی ڈاکٹر کرسکتا ہے مگر یہ تو انتہا ہے... اس نے ایک نظر ڈالی مجھ پر... میری نبض دیکھی، بلڈ پریشر دیکھا اور بتادیا کہ میں... ماں بننے والی ہوں... ایسی بے وقوفی کی بات تو ایک لیڈی ڈاکٹر بھی نہیں کرسکتی... پریگننسی کا پتا کیا صورت دیکھ کے چل جاتا ہے... اس کے ٹیسٹ ہوتے ہیں۔"

صورتِ حال ایک دم پلٹ گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "شاید... تم ٹھیک کہہ رہی ہو..."

"گدھے پر کتابوں کا بوجھ لادنے سے وہ افلاطون نہیں بن جاتا... ایسے ہی گدھے تم بھی ہو... جعلی ڈگری ہوگی ایم اے کی تمہارے پاس... اور مسٹر خاور... یہ فرمایئے کہ کیا میں نے آپ کی کسی بات پر شک کیا؟ آپ کو جھوٹا کہا؟ میں نے تمہاری ہر بات مان لی... اعتماد کیا تم پر... تمہاری شرافت پر... اس کے بدلے میں تم نے کیسا بے ہودہ الزام لگایا مجھ پر... کیا میں تمہیں کوئی بدچلن، بدکردار لڑکی نظر آتی ہوں... جو تمہارے ساتھ رات گزارنے ہوٹل میں آگئی تھی؟"

میں نے ندامت سے کہا۔ "آئی ایم سوری نورین... یہ واقعی میری غلطی تھی..."

اس نے ایک دم کال بٹن دبادیا۔ "نہیں خاور... الزام تم نے لگادیا... اب اپنی بے گناہی میں ثابت کروں گی۔"

ایک نرس نے دستک دے کر اندر جھانکا... "آپ نے بلایا ہے میڈم؟"

"ہاں... میں چاہتی ہوں کہ تم میرا بلڈ سیمپل لے لو۔"

"آج آپ کے سارے ٹیسٹ ہوں گے... لیبارٹری اسسٹنٹ انتظار کررہا تھا کہ آپ ناشتے سے فارغ ہوجائیں... کیا میں اسے بھیج دوں؟" اس نے غور سے نورین کے اداس چہرے کو دیکھا۔

"ہاں... اس سے کہنا کہ جو ٹیسٹ ہوتے ہیں... ان میں پریگننسی بھی کنفرم کردے۔"

نرس اس بے تکلفی بلکہ بے شرمی پر کچھ حیران ہوئی مگر کچھ بولے بغیر پلٹ گئی۔ میں سخت نادم تھا اور مجرم بنا اس کے سامنے خاموش بیٹھا تھا۔ غلطی یقیناً اس ڈاکٹر کی تھی مگر اس سے زیادہ میری کہ سوچے سمجھے بغیر اس کی بات پر یقین کرلیا۔ نورین سخت دکھی اور ناراض تھی اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کو کیسے راضی کروں۔ ایک میڈ ناشتے کے برتنوں والی ٹرے واپس لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی لیبارٹری سے ایک اسسٹنٹ خون کے سیمپل لینے آگیا۔

فراغت کے بعد خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ پھر نورین کو منانے کے لیے میں نے ایک ڈراما کیا۔ میں نے اس کا جوتا اٹھایا اور گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "یہ تم ایڈوانس مارلو... رپورٹ آنے سے پہلے ہی۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر ہنس پڑی۔ میرے ہاتھ سے جوتا لے کر اس نے پیچھے ڈالا اور مجھے اپنے ساتھ کھینچ کر بٹھالیا۔ "بڑے ڈرامے باز ہوتے ہیں سارے مرد۔ محبت میں بھی ڈراما... نفرت میں بھی ڈراما۔ پھر ناقص العقل کہتے ہیں عورتوں کو جو اعتبار کرلیتی ہیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "وہ ڈاکٹر یقیناً تمہیں جانتا تھا۔ اس نے تمہارے ہاتھ کی اس انگوٹھی کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔"

"یہ تو نشانی ہے میری ماں کی۔"

"تمہارے والد کا نام اس نے شفقت محمود بتایا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ ان کی شاہی بازار میں کیسٹ کی دکان ہے۔"

"دکان تھی... دس بارہ سال پہلے... لیکن اسے یقیناً غلط فہمی ہوئی... تین مہینے پہلے شادی ہوئی تھی میرے چچا کی بیٹی کی... انہوں نے کارڈ دیا ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ میری کزن ہے اور ہماری صورت بہت ملتی ہے۔ دراصل میرے والد اور میرے چچا جڑواں تھے۔ ہم شکل بھی تھے IDENTICAL TWINS۔"

"چلو یہ غلط فہمی تو دور ہوگئی۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا... پورا سچ بتانے کے لیے تمہیں مناسب وقت کا انتظار تھا؟"

"وہ تو میں بتادوں گی مگر پہلے تم بتاؤ کہ تمہیں اتنا بڑا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم میرے گھر نہیں گئے تھے۔ خوامخواہ ایک اسٹوری سنادی مجھے کہ وہاں کیا ہورہا تھا۔ لاش آئی تھی، پوسٹ مارٹم کے بعد۔"

"اس میں جھوٹ کہاں تھا... میں نے جو دیکھا وہی بتایا۔"

"پھر جھوٹ... تم کیوں چاہتے ہو کہ میں اسے سچ مان لوں؟ نہیں گئے تھے میرے گھر تو نہ سہی۔ کہاں سے آگئی لاش... پورا سین سنادیا مجھے تدفین سے پہلے کا۔"

"تمہاری قسم نورین۔ اس میں بالکل جھوٹ نہیں تھا۔ میں نے جو دیکھا وہی بتایا۔ اور میں تمہیں ابھی لے جاسکتا ہوں تمہارے گھر... کسی سے پتا معلوم کیے بغیر۔"

"خاور... خاور... جھوٹ میں نے بولا تھا کہ میں نے اپنے چچازاد کو قتل کردیا تھا۔ چھری سے ذبح کردیا تھا اور بھاگ آئی تھی... ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ ایسے دیدے گھما کے مت دیکھو مجھے۔ تم سچ جاننا چاہتے تھے تو سنو... اتنی ہمت والی لڑکی نہیں ہوں میں... ایک بار بچپن میں بکرا ذبح ہوتے دیکھا تھا تو بے ہوش ہوگئی تھی۔ چچا اپنے ہونہار سپوت کی مجھ سے زبردستی شادی کرانا چاہتے تھے اور خیر سے وہ سپوت ذہنی عدم توازن کا شکار بھی تھا۔ مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ جو میرا ہے، وہ ان کا ہوجائے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ شاہی بازار میں جو کیسٹ شاپ تھی، وہ میرے ابا کی تھی۔ بعد میں وہ بیچ دی گئی یا ابھی تک چچا اس پر قابض ہے، یہ مجھے نہیں معلوم۔ وہ دکان ہوگی تو اب تک بہت پھیل چکی ہوگی اور اس کی آمدنی بھی اچھی خاصی ہوگی۔ گزشتہ دس برس کی آمدنی کا حساب کیا جائے تو لاکھوں کی رقم ہوگی۔ میرے ابا کے اکاؤنٹ میں کیا تھا، میں نہیں جانتی... چچا نے کہا کہ ان کی ڈیتھ کے بعد بینک اکاؤنٹ منجمد کردیا گیا تھا اور میں بالغ ہونے کے بعد وراثت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلوں گی تو رقم مجھے مل جائے گی اور کوئی اس بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات نہیں لے سکتا۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے جو میرے ساتھ ہوا۔ ممکن ہے چچا نے جعلی دستخطوں سے سب رقم نکلوائی ہو۔ چچا کو میرے والد نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ بزنس میں بھی اور گھر میں بھی۔ وہ کہنے کو جڑواں اور ہم شکل بھائی تھے مگر دونوں کی فطرت اور مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یہ گھر بھی بہت بڑا تھا جس میں دونوں خاندان اوپر نیچے رہتے تھے۔ ملکیت کے کاغذات تو میں نے دیکھے نہیں۔ چچا پہلے کہتا تھا کہ مشترکہ ملکیت تھی۔ پھر کہنے لگا کہ میں نے پورا خرید لیا تھا۔ تم خود اندازہ کرسکتے ہو کہ اپنے بیٹے سے میری شادی میرے چچا کی کتنی بڑی مجبوری تھی۔ اسے معلوم ہوگیا تھا اور میں نے بھی صاف بتادیا تھا کہ میں یہ شادی نہیں کروں گی اور میرے ساتھ زبردستی کی گئی تو میں خودکشی کرلوں گی، پنکھے سے لٹک کے... چچا کو میرے سلمان خان سے تعلق کا بھی علم ہوگیا تھا اور آخری دنوں میں اس نے جس طرح مجھے قید کیا، وہ میں بتاچکی ہوں... مگر اس کے بعد وہ نہیں ہوا تھا جو میں نے تمہیں بتایا۔ مجھے معلوم تھا کہ نکاح کے وقت انکار میرے لیے ناممکن ہوگا۔ میں لاکھ انکار کروں، میری کوئی نہیں سنے گا۔ یہ لوگ مجھے زبردستی مارکوٹ کے اور دھکیل کر حجلۂ عروسی میں اس دولہا کے ساتھ بند کردیں گے جو کھا کھا کے سانڈ ہورہا تھا اور کرتا کچھ نہیں تھا... میں خود کو اس سے بچا نہیں سکوں گی۔ اب ہوا یوں کہ گھر میں مجھے دلہن کے کپڑے پہنا کے اور بنا سجا کے نکاح کے لیے بٹھادیا گیا۔ میں نے آخر میں رضامندی کا ڈراما شروع کردیا تھا تاکہ مجھ پر سختی اور نگرانی کچھ کم ہوجائے۔ ان کی ڈھیل سے فائدہ اٹھا کے میں نے فرار کے انتظامات کرلیے تھے۔"

"انہیں شک نہیں ہوا کہ تم مکاری کررہی ہو؟" میں نے پوچھا

"میں نے بھی کم محنت نہیں کی تھی انہیں قائل کرنے کے لیے۔ میں نے ایک دن صبح چچی سے رو رو کے اپنی نافرمانی پر معافی مانگی۔ وہ ایک دم کیسے یقین کرلیتی۔ اس

نے اپنے شوہر کو بلالیا۔ پھر میں نے بتایا کہ گزشتہ رات میں نے اماں ابا کو خواب میں دیکھا۔ دونوں بہت دکھی تھے۔ ابا نے کہا کہ نورین... میں نے تمام عمر اپنے بھائی کا خیال رکھا کیونکہ وہ دنیاوی معاملات میں ذرا کمزور تھا۔ اصل بات تو یہ تھی خاور صاحب کہ بیٹے کی طرح چچا بھی ذہنی طور پر کمزور تھے مگر بیٹا کمزوری سے بڑھ کر معذوری پر پہنچ گیا تھا۔ اثرات موروثی تھے۔ خیر... میں نے چچا سے کہا کہ ابا ناراض بھی ہوئے کہ تمہاری وجہ سے میری روح کو قبر میں بھی سکون نصیب نہیں۔ مانا وہ لڑکا جو تمہارا فرسٹ کزن ہے، ذہنی طور پر تمہارے جیسا ذہین نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اسے ٹھکرادو۔ اپنوں کا سہارا اپنے ہی بنتے ہیں... وغیرہ وغیرہ... بہت کچھ میں نے اپنے والدین سے منسوب کردیا۔ اللہ مجھے معاف کرے... مگر اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے یہ ضروری تھا۔ چچا کوئی بہت ذہین آدمی ہوتا تو میری مکاری کو سمجھ لیتا... وہ فوراً میری باتوں میں آگیا اور اس کی بیوی... اس کی تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ کہنے لگی کہ میں نے چادر چڑھائی تھی پیر معصوم شاہؒ کے مزار پر اور منت مانی تھی کہ یہ شادی ہوگئی تو دیگ بانٹوں گی۔ اس نے اگلے ہی دن دیگ تقسیم کی... میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کے فرار کی تیاری مکمل کی۔ ایک تو کھڑکی تھی جسے مستقل بند کردیا گیا تھا۔ ہر چٹخنی میں ایلفی ڈال دی گئی تھی... میں نے رات کو پیچ کش سے سارے اسکرو ڈھیلے کردیے مگر لگے چھوڑ دیے۔ پھر میں نے بیڈ کے نیچے چادروں کو پھاڑ کے اور جوڑ کے ایک مضبوط رسی بنائی۔ بازار سے اتنی لمبی نئی رسی میں کہاں سے لاتی... وہ کمرا تھا اوپر کی منزل پر اور کھڑکی زمین سے پندرہ فٹ اوپر تھی... رسی کی مضبوطی میں نے خود لٹک کر چیک بھی کرلی تھی... جب برات آئی...‘‘

’’برات آئی کا کیا مطلب... دولہا تو وہیں موجود تھا...‘‘

’’دراصل اماں کو شوق تھا اپنے سپوت کو سہرا باندھ کے گھوڑے پر بٹھانے اور زمانے کو دکھانے کا۔ اس کا ایک دوست رہتا ہے دوسرے محلے میں۔ ایک دو فرلانگ کا فاصلہ ہوگا... اس کو وہاں سے لایا گیا، آگے تھا بینڈ اور خوب آتش بازی ہورہی تھی... پٹاخے اور بم چھوڑے جارہے تھے... جب برات دروازے پر پہنچی تو میری سہیلیاں جن کو میرے ساتھ بٹھایا گیا تھا، اٹھ کے باہر کی طرف دوڑیں... سامنے والے حصے میں ایک چھجا ہے... ٹیرس جیسا۔ بس وہی وقت تھا جب میں نے بڑی پھرتی سے رسی نکالی... ایک ایک کرکے چٹخنی کے پیچ کھولے... دروازے کو میں نے اندر سے کنڈی ضرور لگادی تھی مگر مجھے کافی وقت مل گیا۔ کوئی آیا ہوگا تو بعد میں دروازہ توڑا گیا ہوگا۔ میں نے تو رسی کو باندھا بیڈ سے اور باہر لٹکا کے خود بھی لٹک گئی... چچی کا خیمہ ٹائپ برقع میری بغل میں تھا... رات کا وقت تھا اس لیے کسی نے دیکھا نہیں... رسی ٹوٹ جاتی یا ہاتھ سے چھوٹ جاتی تو میں گرتی گلی میں مگر سب خیریت رہی... میں گلی میں اتری اور بھاگ لی... میں نے تو سامنے آکے اپنی برات کے دولہا کو بھی دیکھا جو کاٹھ کا الو لگ رہا تھا... کوئی مجھ پر کیسے شک کرسکتا تھا... جب اندر ہڑبونگ مچی تو میں نے سوچا کہ اب چلنا چاہیے... مزہ تو بہت آرہا تھا... ہر شخص اِدھر سے اُدھر بھاگا پھر رہا تھا... لڑکیاں چلارہی تھیں... دلہن بھاگ گئی... دلہن بھاگ گئی... میں بھاگتی ہوئی نہیں... اطمینان سے چلتی ہوئی اس حویلی تک آئی تھی... جہاں تم نے مجھے دیکھا تھا۔‘‘

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں وہ مجھے دیکھتی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا... پھر میں نے کہا۔ ’’کیا چیز ہو تم بخدا... دل تو چاہتا ہے کہ تمہاری ایسی پھینٹی لگاؤں...‘‘

وہ چراغ پا ہو کے بولی۔ ’’کس بات پر...‘‘

’’تم لڑکی نہیں... جھوٹ بولنے کی مشین ہو... اس روانی سے اور اتنے اعتماد کے ساتھ نئی سے نئی کہانی سنا سکتی ہو... ایک سے بڑھ کر ایک... خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے تم مجھے جھوٹا بنارہی ہو... میں خود سب دیکھ کے آیا ہوں... میرے سامنے ایمبولینس سے اس کی لاش اتاری گئی... وہاں جو لوگ بیٹھے تھے، وہ بھی یہ باتیں کررہے تھے کہ تمہارے چچا نے غلطی کی تھی... زبردستی کی اس شادی کا انجام یہی ہوسکتا تھا۔‘‘

’’جھوٹ کہتے ہو تم...‘‘ وہ ناگن کی طرح بل کھا کے اٹھی۔

میں نے اس کے منہ پر دائیں ہاتھ کا بھرپور طمانچہ رسید کیا... ایک چیخ مار کے وہ پیچھے بیڈ پر جا گری۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی... میں نے دروازے تک جا کے پوچھا۔ ’’کون ہے؟‘‘

’’پولیس...‘‘ جواب میں کسی نے کہا۔

رگوں میں میرا خون منجمد ہونے لگا۔

ہر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

انگوٹھی

سلیم انور

مغرب کی شوخ و شنگ تتلیاں ہوں یا مشرق کی پریاں... انگوٹھی کا رومان پرور تصور دونوں کے لیے یکساں اہمیت کا حامل ہے... ہر لڑکی رشتۂ ازدواج میں بندھنے سے پہلے اپنی انگلی کو رِنگ سے آراستہ کرنا پسند کرتی ہے... ایک ایسی ہی پری کا قصہ جو منگنی کی انگوٹھی پہن کے واپس نہیں کرنا چاہتی تھی...

عشق کے دلفریب... پرکیف و پرفریب لمحات جس میں اچانک ہی جرم کی گرہ پڑگئی...

’’تمہیں میری انگوٹھی واپس کرنا ہوگی۔‘‘ ونسٹن نے اپنی کرسی سے اچھل کر کھڑے ہوتے ہوئے پُرزور لہجے میں کہا۔ ’’یہ میری نانی کی انگوٹھی ہے۔‘‘ وہ مینڈی کے اپارٹمنٹ میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔

’’چونکہ تم میرے ساتھ منگنی توڑ رہے ہو، اس لیے میں یہ انگوٹھی اپنے پاس رکھ رہی ہوں۔‘‘ مینڈی نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ وہ بدستور فرش پر بچھے ہوئے جاپانی روئی دار گدے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

’’لیکن کیوں؟ تمہارے لیے اس کی کوئی جذباتی اہمیت نہیں ہے۔ اگر تم منگنی ٹوٹنے پر اتنی ہی جذباتی ہورہی ہو تو میرے خیال میں تمہیں چاہیے کہ یہ انگوٹھی میرے منہ پر دے مارو۔‘‘ ونسٹن نے اسے مشورہ دیا۔

’’اس کے بجائے میں تمہارے منہ پر بیلن نہ کھینچ ماروں؟‘‘ مینڈی نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

’’لیکن کیوں؟‘‘

’’تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو ونسٹن؟ میں یہ انگوٹھی اس لیے اپنے پاس رکھ رہی ہوں کہ مجھے تم پر شدید غصہ آرہا ہے اور میں یہ انگوٹھی تمہیں کبھی واپس نہیں کروں گی... کبھی نہیں۔‘‘

’’دیکھو مینڈی! میں تمہیں اس کی قیمت ادا کردوں گا۔ اس کی مالیت لگ بھگ تیس ہزار ڈالرز ہے۔‘‘ یہ کہہ کر ونسٹن اس کے نزدیک چلا گیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ’’پلیز مینڈی!‘‘

ونسٹن کو معلوم تھا کہ اس کی ماں یہ سن کر اشتعال میں آجائے گی۔ وہ اس بات پر بے حد غصہ کرے گی کہ اس نے مینڈی کے ساتھ اپنی منگنی کیوں توڑ دی۔ اس لیے کہ وہ مینڈی کو پسند کرتی تھی۔ وہ دونوں ہی ایک جیسی طبیعت اور ایک جیسے

مزاج کی تھیں۔
گستاخ، تیز طرار اور ہر وقت مطالبے کرنے والی!
ونسٹن کو اس بات کا احساس اس وقت نہیں ہوا تھا جب اس نے پہلے پہل مینڈی کے ساتھ میل جول بڑھایا تھا لیکن اب اس کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔
یہ سن کر مینڈی اس پر ہنس دی۔ اس کے پتلے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔
''نہیں۔'' اس نے ڈھیٹ لہجے میں کہا۔ ''انگوٹھی مجھے چاہیے۔ تم اسے واپس لینے کے لیے چاہے کتنی ہی رقم دو، وہ ناکافی ہوگی۔''
یہ سن کر ونسٹن کے پیٹ میں مروڑ سا اٹھنے لگا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسے مینڈی سے تعلقات منقطع کرنا ہوں گے... ہمیشہ کے لیے۔
لیکن تعلقات ختم کرنے سے پہلے وہ انگوٹھی واپس لینا چاہتا تھا۔ اس وقت بھی یہ انگوٹھی مینڈی کی انگلی میں موجود تھی اور اس میں جڑا ہوا ہیرا یوں جگمگا رہا تھا جیسے ونسٹن کا مذاق اڑا رہا ہو۔
ونسٹن نے اپنے دونوں ہاتھ آپس میں جکڑ لیے تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ جھنجلاہٹ میں مینڈی پر جھپٹ پڑے اور اس کی انگلی سے وہ انگوٹھی زبردستی اتارنے پر مجبور ہو جائے۔
جب اس نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ اپنی اس کیفیت پر قابو پاچکا ہے تو وہ ایک بار پھر مینڈی سے ملتجی لہجے میں بولا۔ ''کیا تم اس بارے میں دوبارہ غور نہیں کر سکتیں؟''
''دوبارہ غور نہیں کر سکتیں؟'' مینڈی نے اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ ''بس یہاں سے چلے جاؤ ونسٹن۔ تم نے میرا دل توڑ دیا ہے۔''
'میں نہیں سمجھتا کہ تمہارے پاس دل بھی ہے،' ونسٹن نے اپنے دل میں سوچتے ہوئے کہا پھر وہ جھکے ہوئے شانوں کے ساتھ اور تھکے تھکے قدموں سے مینڈی کے اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔
اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیوں نہ اسی جیسی ایک اور انگوٹھی بنوالی جائے لیکن آج کل کے دور میں ہیرے کی تراش اس انداز سے نہیں ہوتی جیسی کہ اس کی نانی کی انگوٹھی کے ہیرے کی تراش تھی۔ اس کی ماں انگوٹھی کا فرق فوراً پہچان لے گی۔ اس لیے کہ اس انگوٹھی کو مینڈی کو دینے کے لیے ونسٹن کے حوالے کرنے سے قبل وہ برسوں تک خود اسے پہنے رہی تھی۔
ونسٹن کو اس انگوٹھی میں ایسی کوئی خاص بات بھی نظر نہیں آئی تھی جس کی بنا پر یہ اس کی ماں کو اتنی عزیز تھی۔ بس ایک اکلوتا ہیرا تھا جو قدیم ڈیزائن میں اس میں جڑا ہوا تھا۔
لیکن کچھ بھی تھا، اسے یہ انگوٹھی مینڈی سے واپس لینا ہوگی اور اس کا ایک ہی طریقہ تھا جو اس کے ذہن میں آرہا تھا۔ وہ یہ کہ وہ مینڈی کے اپارٹمنٹ میں چوری چھپے داخل ہو کر انگوٹھی چرالے۔
خوش قسمتی سے مینڈی کی اپارٹمنٹ کی چابی اب بھی اس کے پاس موجود تھی۔
اس رات ونسٹن مینڈی کے اپارٹمنٹ کمپلیکس جا پہنچا۔ وہ چوری چھپے اندر داخل ہو گیا کیونکہ مین گیٹ پر تالا لگا ہوا نہیں تھا۔ اوپر پہنچ کر اس نے اپنے کان مینڈی کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر لگا لیے اور سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر سے کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔
اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں مینڈی نے دروازے کا تالا تبدیل نہ کر دیا ہو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی چابی جیب سے نکالی اور تالے کے سوراخ میں داخل کر دی۔
چابی گھمانے پر جب تالا کھل گیا تو ونسٹن نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ دروازہ کھول کر دبے پاؤں اندر داخل ہو گیا پھر وہ ایک لمحے کے لیے رک گیا تاکہ اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو جائیں۔ چند لمحوں بعد وہ پنجوں کے بل آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا بیڈروم کی جانب چل دیا... اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی آواز پیدا نہ ہونے پائے۔
جب وہ مینڈی کے بیڈ کے نزدیک پہنچا تو مینڈی کی پُرسکون سانسوں کی آواز نے اس کا اعتماد بحال کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ بعض اوقات مینڈی انگوٹھی پہنے پہنے سوجاتی ہے لیکن اکثر وہ سونے سے پیشتر انگوٹھی اتار کر بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیتی ہے۔
اس وقت مینڈی کا بایاں ہاتھ چادر کے اندر چھپا ہوا تھا۔ ونسٹن نے بیڈ سائڈ ٹیبل کو چیک کیا۔ انگوٹھی وہاں پر موجود نہیں تھی۔
ونسٹن تذبذب میں پڑ گیا۔ اگر اس نے مینڈی کا ہاتھ چادر سے باہر نکالنے کی کوشش کی تو وہ بیدار بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اسے رسک لینا ہوگا۔ اسے وہ انگوٹھی ہر حال میں چاہیے تھی۔
ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ مینڈی اچانک کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک ریوالور نکال لیا اور اس کی نال کا رخ ونسٹن کی ناف کی جانب کر دیا۔
''مجھے پتا تھا کہ تم اس قسم کی کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کرو گے، بکے آدمی۔'' وہ کسی زخمی ناگن کی طرح پھنکارتے ہوئے بولی۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں کپکپا رہا تھا۔ ''یہاں سے

نکل جاؤ۔"
ونسٹن نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی۔
"میں نے کہا گیٹ آؤٹ۔" وہ ایک بار پھر پھنکاری۔
ونسٹن ایک شاک کی سی کیفیت میں بس اسے گھورے جارہا تھا۔
مینڈی کے ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور بدستور تھرتھرا رہا تھا۔ ریوالور کی نال کا سوراخ اسے مہیب دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے آزمائشی طور پر ایک قدم بیڈ کی جانب بڑھایا۔
مینڈی چیخ پڑی۔ "وہیں رک جاؤ۔"
گو مینڈی کا لہجہ تنبیہی تھا لیکن وہ بھی اتنی ہی خوف زدہ دکھائی دے رہی تھی جیسا کہ وہ خود محسوس کررہا تھا۔
ونسٹن نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اب وہ بیڈ کے اتنے نزدیک پہنچ چکا تھا کہ مینڈی کو چھو سکتا تھا۔ 'کیا وہ پاگل ہوگیا ہے؟' وہ سوچنے لگا۔ اسے تو پلٹ کر یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔
لیکن مینڈی کے کانپتے ہاتھوں میں موجود انگوٹھی کا جگمگاتا ہیرا اسے للچا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسے آنکھیں مار کر اشتیاق دلا رہا ہو۔ تب اسے اپنی ماں یاد آگئی۔
مینڈی تیزی کے ساتھ بیڈ کے آخری سرے پر پہنچ گئی۔ وہ اب بھی تذبذب کے عالم میں ریوالور کو لہرا رہی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کے لیے انہیں کنٹرول میں رکھنا چاہ رہی تھی لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں ہورہی تھی۔
"انگوٹھی مجھے دے دو، مینڈی!"
"کبھی نہیں دوں گی۔"
تب ونسٹن نے اچانک مینڈی کے ہاتھ پر جھپٹا مار دیا۔ ریوالور سے فائر ہوا لیکن ونسٹن کو کسی قسم کی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ اس نے ریوالور مینڈی کے ہاتھ سے چھین لیا اور اس کی نال کا رخ مینڈی کے سینے کی جانب کردیا۔
پھر ایک اور فائر ہوا اور مینڈی بیڈ پر چت ڈھیر ہوگئی۔
ونسٹن کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور پورا بدن پسینے میں شرابور ہورہا تھا۔ اس نے ریوالور جیکٹ کی جیب میں ٹھونس لیا اور وہ انگوٹھی مینڈی کی انگلی سے گھسیٹ کر اتار لی۔
پھر جب وہ دوڑتا ہوا کمرے سے نکل رہا تھا تو اس کی نگاہ اس گولی پر پڑی جس کی زد میں آنے سے وہ بال بال بچا تھا۔ اس گولی نے کمرے کے دروازے کی لکڑی کے پرخچے اڑا دیے تھے۔
وہ دوڑتا ہوا باہر اپنی کار تک پہنچا اور تیزی سے اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔
اپنے اپارٹمنٹ پہنچ کر اس نے احتیاط کے ساتھ وہ انگوٹھی اور ریوالور اپنی نائٹ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیا اور اپنے بیڈ پر ڈھیر ہوگیا۔ چونکہ وہ بے حد تھک چکا تھا اس لیے فوراً ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔
اگلے روز صبح اپنی ڈیوٹی پر جاتے ہوئے وہ راستے میں اپنی ماں کے گھر رک گیا جیسا کہ اس کا روز کا معمول تھا۔
جب وہ کافی پینے کے لیے کچن کی میز پر بیٹھ گئے تو ونسٹن نے جیکٹ کی جیب میں سے وہ انگوٹھی نکالی اور اس تہ پوشی پر رکھ دی جو اس کی ماں کے سامنے میز پر موجود تھی۔
"یہ کیا ہے؟" اس کی ماں نے پوچھا۔
"انگوٹھی!" ونسٹن نے جواب دیا۔ "مینڈی اور میں نے گزشتہ شب منگنی توڑ دی ہے۔"
"اور اس نے یہ تمہیں لوٹا دی؟ مجھے حیرت ہے۔"
"وہ اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔" ونسٹن نے بتایا۔ "لیکن میں نے واپس لے لی۔"
"ویل، یہ اچھا کیا۔ لیکن میں اس بات پر بے حد اپ سیٹ ہوں کہ تم نے اس سے منگنی توڑ دی۔ میرا خیال ہے کہ منگنی توڑنے کا آئیڈیا اسی کا ہوگا؟"
"نہیں، یہ میرا آئیڈیا تھا۔" ونسٹن نے صاف صاف بتا دیا۔
یہ سن کر اس کی ماں ششدر رہ گئی۔ "میں تو یہ سمجھی تھی کہ یہ آئیڈیا اس کا ہوگا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک بار یہ انگوٹھی اس لڑکی کی تحویل میں چلی جائے گی تو وہ اسے کبھی بھی واپس نہیں کرے گی۔ اسی لیے میں نے اس کی ایک نقل بنوالی تھی تاکہ وہ تم اسے دے سکو۔ اس میں ہیرے کی جگہ کیوبک زرقون جڑا ہوا تھا۔ البتہ میرا خیال تھا کہ تمہاری شادی کے بعد میں اسے اصلی ہیرے والی انگوٹھی سے بدل دوں گی۔ میں جانتی تھی کہ تم اصلی اور نقلی انگوٹھی کے درمیان فرق کو پہچان نہیں پاؤ گے کیونکہ اس کی تراش تمہاری نانی کی اصلی انگوٹھی کی طرح ماڈرن ٹائپ کے برعکس اینٹیک ٹائپ کی تھی۔" وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی پھر ونسٹن کو تیز نظروں سے گھورنے لگی۔
"کیا ہوا ونسٹن؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ تم پر یہ مردنی سی کیوں چھا رہی ہے؟ ٹھہرو، میں تمہارے لیے اسپرین لے کر آتی ہوں۔"
"دو گولیاں لانا ماں۔" ونسٹن نے آواز دی۔ جب اس کی ماں اسپرین لانے کے لیے کمرے سے نکل گئی تو ونسٹن نے اپنی جیکٹ کی جیب میں سے ریوالور نکال لیا اور...

میری دعا

کاشف زبیر

انسان کو جتنی محبت اور تشویش اپنی اولاد کے لیے ہوتی ہے... اتنی اپنے ماں اور باپ کے لیے نہیں ہوتی... محبت اور ذمے داری کا یہ بہاؤ آگے کی طرف ہی بہتا ہے... ایک ایسے ہی باپ کی اپنی اولاد سے بے غرضی... وابستگی... ایثار اور بے لوث محبت کے ہمہ جہت پہلوؤں کو اجاگر کرتی کہانی... اچانک ہی امتحان کی گھڑیوں نے اس کے جذبۂ محبت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا...

سچائی اور انصاف کے تقاضوں کو تہ و بالا کردینے والے عوامل کی فتنہ انگیزیاں...

افتخار احمد کی آنکھ کھلی تو کچن سے بچوں کی آواز آرہی تھی۔ ان آوازوں میں ایک سرخوشی اور چہچہاہٹ تھی۔ جیسے پرندے رات ختم ہونے پر صبح کی آمد کے ساتھ خوشی سے چہچہانے لگتے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں آواز دعا کی تھی۔ دعا، افتخار احمد کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ بہت پیاری اور بالکل باربی ڈول جیسی۔ افتخار ہائی کورٹ کا نامور وکیل تھا۔ وہ جو کیس لیتا فریق ثانی اس میں پہلے ہی شکست مان لیتا تھا۔ جب وہ عدالت کے سامنے آتا تو جج سنبھل جاتے کیونکہ

اس کے دلائل اعلیٰ قانونی پیچیدگیوں سے آراستہ اور پُرمعنی ہوتے تھے۔ بعض بے تکلف دوست اسے ہائی کورٹ کا جن بھی کہتے تھے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس جن کی جان اس کی ننھی سی بیٹی میں تھی۔ وہ دنیا میں کسی سے سب سے زیادہ محبت کرتا تھا تو وہ دعا تھی۔ کسی سے ہار نہ ماننے والا افتخار احمد ننھی دعا کی ضد اس کے لبوں پر آتے ہی مان جاتا تھا۔

افتخار احمد کے چار بچے تھے۔ سب سے بڑا انصار چودہ برس کا تھا۔ اس سے چھوٹا معمار بارہ برس کا تھا پھر نو سال کا ابصار اور سب سے چھوٹی چھ سال کی دعا تھی۔ اسے ایک سال پہلے ہی اسکول میں داخل کرایا تھا۔ افتخار احمد اس کے لیے تیار نہیں تھا لیکن مدیحہ نے اصرار کیا۔ مدیحہ شادی کے وقت اسکول ٹیچر تھی اور اچھی طرح سمجھتی تھی کہ ایک بچے کے لیے اسکول کتنا اہم ہوتا ہے۔ اسکول کی اہمیت تو افتخار بھی سمجھتا تھا مگر وہ دعا کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے کچھ عرصے بعد اسکول میں داخل کرایا جائے تو بہتر رہے گا مگر مدیحہ کا خیال مختلف تھا۔ اس نے افتخار سے کہا۔ ''اگر ہم نے اسے اسکول دیر سے داخل کرایا تو یہ اپنی عمر کی بچیوں سے پیچھے رہ جائے گی اور پھر اس کے لیے ایڈجسٹمنٹ کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ جیسے جیسے وقت گزرے گا، یہ مشکل بڑھتی جائے گی۔''

افتخار کا دل نہیں مان رہا تھا لیکن مدیحہ کے زور دینے اور پھر ساری ذمّے داری لینے پر وہ راضی ہو گیا۔ انہوں نے دعا کے لیے ایک بہت اچھے اسکول کا انتخاب کیا۔ گھر سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ افتخار کی رہائش کے سی ایچ ایس میں تھی جبکہ اسکول پی سی ایچ ایس میں تھا۔ افتخار نے پہلے خود اسکول جا کر اپنا اطمینان کیا۔ وہ انتظامیہ اور ٹیچرز سے ملا اور انہیں دعا کے بارے میں بتایا۔ ٹیچرز نے اسے یقین دلایا کہ وہ دعا کو ہینڈل کر لیں گی۔ یوں دعا اسکول جانے لگی۔ صبح مدیحہ خود دعا کے ساتھ اسکول جاتی۔ شروع میں وہ بہت ڈسٹرب ہوئی اور بہت روئی تھی۔ جب مدیحہ شام کو بتاتی تو افتخار سے سنا نہیں جاتا تھا۔ اس نے مدیحہ کو منع کر دیا کہ وہ اسے نہ بتایا کرے۔ وہ دعا کا روتا دیکھنا تو ایک طرف رہا سن بھی نہیں سکتا تھا۔ کئی بار اس کی مدیحہ سے بحث ہوئی اور اس نے دعا کو اسکول سے اٹھانے کو کہا لیکن مدیحہ ڈٹی رہی کہ دعا اسکول ضرور جائے گی۔

''دیکھیں عام بچے بھی اسکول جاتے ہوئے شروع میں تنگ کرتے ہیں اور دعا تو پھر عام بچوں سے ذرا مختلف ہے۔ مجھے یقین ہے وہ ایڈجسٹ ہو جائے گی۔''

مدیحہ کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور دعا رفتہ رفتہ سنبھل گئی اور اسکول میں اس کا دل لگ گیا۔ ایک مہینے بعد مدیحہ نے اس کے ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا۔ اس موقع پر دعا پھر بکھری لیکن اسکول ٹیچرز نے بہت ہوشیاری سے دعا کو سنبھال لیا۔ مدیحہ کی ثابت قدمی نے کام دکھایا اور اب افتخار اس کا شکر گزار تھا کہ اس نے درست فیصلہ کیا۔ دعا میں اسکول جانے کے بعد سے بہت بہتری آئی تھی۔ اگر مدیحہ ہار مان لیتی تو ان کی بچی اس بہتری سے محروم رہ جاتی۔

افتخار آنکھیں بند کیے ان آوازوں سے محظوظ ہو رہا تھا کہ اچانک اسے یاد آیا۔ آج اس کے لیے ایک اہم دن تھا۔ آج علی بھائی کیس میں اہم پیشی تھی۔ علی بھائی ایک فارماسیوٹیکل کمپنی کا مالک تھا۔ چند مہینے پہلے اس کی کمپنی کی ایک دوا کے استعمال سے اچانک ہی مریضوں میں اموات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جانچ پڑتال کے بعد پتا چلا کہ دوا میں ایک جز واصل مقدار سے کئی گنا زیادہ شامل ہو گیا تھا اور یہی موت کی وجہ تھی۔ علی بھائی کا سرکار میں اثر و رسوخ تھا۔ ایف آئی اے نے دکھاوے کی کارروائی کی اور کمپنی کے چند درمیانے درجے کے ملازمین کو گرفتار کر لیا۔ سارا الزام ان پر عائد کر دیا گیا اور عدالت میں پیش کر دیا۔ لیکن میڈیا نے اصل بات نکال لی۔ اصل ذمّے دار علی بھائی اور اس کی کمپنی کے ڈائریکٹرز تھے۔ کمپنی کے ایک کیمیکل انجینئر نے اس غلطی کی نشان دہی کی تھی کہ دوا کے کمپاؤنڈ میں غلطی آرہی ہے اور اسے دوا سازی کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ لیکن کمپاؤنڈ اتنی بڑی مقدار میں بن چکا تھا کہ اسے ضائع کیا جاتا تو کمپنی کو کروڑوں کا نقصان ہوتا۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ دوا بنا کر مارکیٹ میں بھیج دیں اور جب کچھ ہو گا تو دیکھا جائے گا۔

دوا کے استعمال سے درجنوں افراد جاں بحق ہو گئے اور جن کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا، ان کی تعداد الگ تھی۔ میڈیا میں آنے کے بعد ہائی کورٹ نے معاملے کا ازخود نوٹس لیا اور کیس کی نئے سرے سے تحقیقات شروع ہوئیں۔ تفتیشی افسر نے جو رپورٹ تیار کی، عدالت اس سے مطمئن نہیں تھی۔ اس میں علی بھائی اور اس کے ساتھیوں کو واضح رعایت دی گئی تھی۔ اس لیے عدالت نے یہ رپورٹ مسترد کرتے ہوئے دوسرا تفتیشی افسر مقرر کیا اور اس نے عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے کیس کی نئے سرے سے جانچ پڑتال کی۔ درمیان میں اوپر سے دباؤ آنے کی وجہ سے اسے کام سے روکا گیا لیکن عدالت نے تفتیشی افسر کو دوبارہ کام کی اجازت دے دی۔ یوں کئی مہینے بعد جا کر اس نے تحقیقات مکمل کیں اور عدالت میں رپورٹ پیش کر دی۔ اس رپورٹ کی رو سے اصل ذمّے دار علی بھائی اور کمپنی کے اعلیٰ عہدیدار قرار پائے۔ عدالت نے انہیں گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ حکومت اس معاملے میں لیت و لعل سے کام لینے لگی۔ مگر جب عدالت نے سختی سے حکم دیا اور ملزمان کے ناقابلِ ضمانت وارنٹ جاری کر دیے تو مجبوراً انتظامیہ کو حرکت میں آنا پڑا اور علی بھائی کو چند دوسرے افراد کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔

علی بھائی کے پاس پیسے کی طاقت تھی۔ اس نے بہترین وکیل کیا جس کی معاونت کے لیے وکیلوں کا پورا پینل موجود تھا۔ اس نے انتظامیہ کو اپنے حق میں کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ جہاں لاکھ روپے خرچ کرنے سے کام چل سکتا تھا وہاں دو لاکھ لگا دیے۔ نتیجے میں حالات رفتہ رفتہ اس کے حق میں بہتر ہونے لگے۔ جیل میں وہ بہترین سہولتوں سے آراستہ سیل میں رہتا تھا۔ اس کے لیے گھر سے تازہ کھانا آتا اور اس کے پاس موبائل اور انٹرنیٹ کی سہولت تھی جس سے وہ اپنے ملازموں سے مستقل رابطے میں رہتا تھا۔ اوپر کے دباؤ کی وجہ سے سرکاری وکیل بے دلی سے کیس کی پیروی کر رہا تھا اور اس کے انداز سے نہیں لگتا تھا کہ وہ علی بھائی کو سزا دلوانے کا خواہش مند ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ عدالت جلد علی بھائی کو ضمانت پر رہا کر دے گی۔ افواہ تھی کہ وہ رہا ہوتے ہی ملک سے غائب ہو جائے گا۔ اگرچہ اس کا نام ای سی ایل میں تھا لیکن بہت سارے ایسے لوگ جن کا نام ای سی ایل میں تھا یا ان کے خلاف عدالت میں کیس چل رہا تھا، اچانک غائب ہو گئے اور بالآخر بیرونِ ملک پائے گئے۔

اب تک سب ٹھیک تھا لیکن اچانک ایک رکاوٹ کھڑی ہو گئی۔ جن کے پیارے دوا کے استعمال سے ہلاک ہوئے تھے انہوں نے سرکاری وکیل پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے افتخار احمد کو اپنا وکیل مقرر کر دیا۔ عدالت سرکاری وکیل کی کارکردگی سے پہلے ہی نالاں تھی۔ اس لیے افتخار احمد کو کیس کی پیروی کی اجازت مل گئی اور اس کے آتے ہی کیس کی پوزیشن بدلنے لگی اور وہ کیس جو پہلے علی بھائی کے حق میں جا رہا تھا اچانک اس کے خلاف پلٹنے لگا۔ آج علی بھائی کی ضمانت کی درخواست پر فیصلہ ہونا تھا۔ مگر افتخار احمد کو پورا یقین تھا کہ عدالت درخواست مسترد کر دے گی۔ اس نے آج کے دن کے لیے کچھ خاص نقاط بچا کر رکھے تھے۔ جب وہ انہیں عدالت کے سامنے پیش کرتا تو جج علی بھائی کی ضمانت کی درخواست مسترد کر دیتا۔ ایک بار وہ جیل پہنچ جاتا تو اس کے خلاف جلد فیصلہ آنے کی توقع تھی۔ اس کے برخلاف اس کی ضمانت ہو جاتی تو وہ غائب ہو جاتا اور اس کے بعد کیس غیر معینہ مدت کے لیے لٹک جاتا۔

شروع میں میڈیا نے اس کیس کی بہت زیادہ کوریج کی اور یہ ہیڈ لائنز میں شامل ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ معاملہ پرانا ہوتا گیا اور میڈیا کی دلچسپی ختم ہوتی چلی گئی۔ اب پیشی کے موقع پر چند ایک رپورٹرز ہوتے تھے اور وہ بھی بے دلی سے رپورٹنگ کرتے تھے کیونکہ ان کی رپورٹ اخبارات کے کونے کھدروں میں شائع ہوتی تھی۔ ٹی وی میڈیا کو سرے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ یہی علی بھائی اور اس کے وکیل کی خواہش تھی کہ کیس کی سماعت عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل کی جائے اور اندرونِ خانہ معاملات طے کر کے علی بھائی کو بالآخر ضمانت پر رہا کرا لیا جائے۔ مگر افتخار احمد اب ان کی راہ کی رکاوٹ بن گیا تھا۔ اس نے یہ کیس انسانی بنیادوں پر لیا تھا کیونکہ اسے اس کیس کے لیے معمولی فیس ملی تھی۔ مرنے والوں کے لواحقین نے مل جل کر کچھ رقم جمع کی تھی۔ ہر پیشی کے موقع پر کوئی ایک شخص نمائندہ بن کر آتا تھا۔

افتخار احمد منتظر تھا کہ کب دعا آ کر اسے اٹھاتی ہے۔ یہ روز کا معمول تھا۔ اس کی صبح دعا سے ہوتی تھی اور دعا کی رات اس وقت ہوتی تھی جب باپ اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا تھا تب اسے نیند آتی تھی۔ توقع کے عین مطابق کچھ دیر میں دعا کمرے میں آئی اور بستر پر چڑھ کر اسے اٹھانے لگی۔ افتخار کچھ دیر سونے کی اداکاری کرتا رہا پھر اچانک اٹھ کر اس نے دعا کو دبوچ لیا۔ دعا نے شوخی بھری چیخ ماری اور پھر ہنسنے لگی۔ اس نے ناشتے کی اطلاع دی اور باپ سے جلدی ناشتے کی میز پر آنے کا کہہ کر واپس چلی گئی۔ افتخار مسکراتے ہوئے واش روم کی طرف گیا۔ مدیحہ نے اس کی تمام چیزیں تیار کر دی تھیں۔ وہ تیار ہو کر نیچے آیا تو بڑے بچے اسکول جانے والے تھے۔ ان کا اسکول جلد شروع ہوتا تھا اور دعا کا ذرا تاخیر سے شروع ہوتا تھا اس لیے اسے لینے والی وین بھی ذرا دیر سے آتی تھی۔ انصار، معمار اور ابصار اس سے مل کر چلے گئے اور افتخار دعا کے برابر میں بیٹھ کر ناشتا کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اس سے باتیں کر رہا تھا بلکہ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ دعا

اپنے مخصوص لہجے میں بتا رہی تھی کہ آج اسے اسکول میں.... کیا پڑھنا اور کیا کرنا تھا۔ اس کا ایک ٹیسٹ بھی تھا۔ افتخار نے اس سے کہا۔

''آپ نے فرسٹ آنا ہے۔''

دعا نے سر ہلایا کر وعدہ کیا کہ وہ فرسٹ آئے گی۔ اس کی وین کا ہارن سنائی دیا تو مدیحہ جلدی سے اس کا بیگ، پانی کی بوتل اور لنچ بکس لے کر آگئی اور پھر اسے چھوڑنے باہر گئی..... افتخار احمد نے ٹی وی آن کیا تو اتفاق سے اسی کیس کے بارے میں خبر آرہی تھی۔ رپورٹر کا کہنا تھا کہ علی بھائی اور اس کے ہمنوا پوری کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اس کی ضمانت منظور ہو جائے اور ایک بار وہ جیل کی سلاخوں سے باہر آجائے۔ یہ طے تھا کہ علی بھائی اور کمپنی کے دوسرے ذمّے دار اس کیس میں بری طرح پھنس گئے تھے۔ ان پر مجرمانہ غفلت کے بجائے سنگین جرم کے تحت مقدمہ چل رہا تھا جو تقریباً دہشت گردی کے زمرے میں آتا تھا اور امکان تھا اگر وہ مجرم قرار دیئے گئے تو انہیں سزائے موت بھی ہو سکتی تھی۔ افتخار نے شکر ادا کیا کہ آج میڈیا کو بھی اس کیس کا خیال آگیا۔ مدیحہ واپس آئی۔ اس نے افتخار سے کہا۔ ''آپ نے دیکھا دعا نے کتنی پروگریس کی ہے اب وہ کلاس میں بھی نمایاں ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو اور اب وہ خوشی سے اسکول جاتی ہے۔'' افتخار نے رپورٹر کی بات سنتے ہوئے کہا۔ مدیحہ نے غور کیا۔

''یہ تو آپ کے کیس کے بارے میں بتا رہا ہے۔''

''آج اہم دن ہے۔ علی بھائی اور اس کے ساتھیوں کی ضمانت کی درخواست پر فیصلہ ہونا ہے۔''

''اللہ کرے ضمانت نہ ہو ایسے لوگوں کو تو سرِعام پھانسی ہونی چاہیے۔''

''ہمارے ہاں تو سزائے موت ختم ہونے کی بات ہو رہی ہے۔'' افتخار نے کہا۔ ''کم سے کم ایسے مجرموں کو سزا ہونی چاہیے ورنہ اس معاشرے میں سدھار کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔''

''آپ کب تک آئیں گے؟''

''شاید دیر ہو جائے۔'' افتخار نے چائے کا آخری سپ لیا اور کپ رکھ کر ٹشو سے منہ صاف کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ ''کوئی خاص بات؟''

''دعا کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔ اس کا ماہانہ چیک اپ ہے۔''

''میں سات بجے تک آسکوں گا۔''

''نہیں اپائنٹ منٹ چھ بجے کا ہے۔ اچھا میں انصار کے ساتھ ٹیکسی میں چلی جاؤں گی۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' افتخار کہہ کر بیڈ روم میں آیا۔ اس نے بریف کیس سے کیس کی فائل نکالی اور اس کے کچھ نقاط دیکھنے لگا۔ وہ ذہن تازہ کر رہا تھا۔ امید تھی کہ گیارہ بجے تک پیشی ہو جائے گی۔ اس سے پہلے ایک کیس اور تھا لیکن اس کی نوعیت عام سی تھی۔ افتخار آدھے گھنٹے میں اس پیشی کو نمٹا دیتا۔ اس کی ساری توجہ علی بھائی والے کیس پر تھی۔ نو بجے وہ گھر سے نکلا۔ صبح کے وقت شہر میں بہت زیادہ رش ہو جاتا تھا۔ کورٹ سے ذرا پہلے ایک سگنل پر اس نے کار روکی۔ گاڑیاں رکتے ہی بھکاریوں اور صفائی کرنے والے بچوں کی یلغار ہوئی تھی جو اصل میں بھکاریوں کا ہی ایک روپ تھے۔ ایک فقیر نے کار کا شیشہ بجایا۔ افتخار نے اس کی طرف دیکھا اور اشارے سے منع کیا مگر فقیر استقامت سے شیشہ بجاتا رہا پھر اس نے ہاتھ آگے کیا تو افتخار کو جھٹکا لگا اس کی ہتھیلی پر دعا لکھا ہوا تھا۔ ہتھیلی دکھانے کے بعد فقیر نے ایک موبائل سامنے کیا۔ یہ عام سا بلیک کیسنگ والا موبائل تھا اور صورت سے اچھا خاصا چلا ہوا لگ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی افتخار نے بے ساختہ شیشہ نیچے کیا۔ فقیر نے موبائل اس کی گود میں ڈالا اور تیزی سے پیچھے ہٹا اور لمحوں میں وہاں موجود بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

افتخار اسے آوازیں دیتا رہ گیا تھا مگر وہ رکا نہیں۔ شیشہ نیچا کرنے کی وجہ موبائل کیسنگ پر سفید رنگ سے لکھا ہوا لفظ دعا تھا۔ وہ پریشان تھا اور اس کا ذہن چکرا رہا تھا۔ یہ کیا چکر تھا؟ ایک فقیر پہلے ہتھیلی پر اور پھر موبائل پر اس کی بیٹی کا نام لکھا دکھاتا ہے اور جیسے ہی اس نے شیشہ نیچے کیا، وہ موبائل اس کی گود میں پھینک کر بھاگ جاتا ہے۔ اس نے موبائل اٹھایا اور اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ سگنل کھل گیا ہے اور گاڑیاں آگے بڑھ رہی ہیں لیکن جو اس کے پیچھے تھیں انہوں نے ہارن بجانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے چونک کر جلدی سے گاڑی آگے بڑھائی۔ چند منٹ بعد وہ کورٹ کی پارکنگ میں تھا۔ اس کا دماغ ابھی تک اس گتھی میں الجھا ہوا تھا۔ کار روک کر اس نے دوبارہ موبائل اٹھا کر اس کا معائنہ کیا۔ موبائل سادہ اور بلیک اینڈ وائٹ اسکرین کا تھا۔ کیسنگ بہت زیادہ استعمال سے گھس گئی تھی لیکن یہ ایک مشہور کمپنی کے ان موبائلز میں سے تھا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بہت دیرپا اور مضبوط ہوتے ہیں۔ موبائل

آن تھا۔ ابھی افتخار اسے چیک کرنے والا تھا کہ موبائل کی بیل بجی اور وہ اچھل پڑا۔ بیل غیر متوقع تھی اور اس کے اعصاب ویسے ہی منتشر تھے۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال ریسیو کی۔

''افتخار احمد ایڈووکیٹ۔'' دوسری طرف سے کسی نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔ بولنے والا لہجے سے پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔

''بات کر رہا ہوں۔'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''یہ کس قسم کا مذاق ہے۔''

''یہ مذاق نہیں، حقیقت ہے۔'' آدمی نے زور دے کر کہا۔ ''تمہارے لیے ایک سنگین حقیقت ہے۔''

افتخار کو غصہ آنے لگا۔ ''یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔ موبائل پر میری بیٹی کا نام لکھا ہے۔ جس فقیر نے یہ موبائل دیا اس کی ہتھیلی پر بھی میری بیٹی کا نام لکھا ہے۔''

''کیونکہ تمہاری بیٹی ہمارے پاس ہے۔'' اس آدمی نے کہا تو افتخار کو شدید ترین جھٹکا لگا۔ ایک لمحے کو اس کے اعصاب سُن ہو گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس آدمی نے کیا کہا ہے پھر اس کی سمجھ میں آیا تو وہ چیخ اٹھا۔

''تمہارا دماغ درست ہے۔ میری بیٹی اسکول گئی ہے۔''

''وہ اسکول کے لیے نکلی ضرور تھی لیکن اسکول پہنچی نہیں۔''

افتخار کا لہجہ کانپنے لگا۔ ''تم جھوٹ کہہ رہے ہو؟''

''تمہارے ایسا کہنے یا سمجھنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔'' آدمی بولا۔ ''ہم نے اسے اسکول کے گیٹ کے سامنے سے اتنی صفائی سے اٹھا لیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔''

وہ خود پر قابو پانے کی جدوجہد کر رہا تھا لیکن شاک بہت زیادہ تھا۔ ''میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو اگر وہ تمہارے پاس ہے تو اس سے میری بات کراؤ۔''

''ضرور کرو۔'' آدمی نے کہا اور کسی سے بولا۔ ''لو اپنے پاپا سے بات کرو۔''

''دعا۔'' افتخار تڑپ گیا۔ ''میری دعا...''

''پاپا مجھے بچائیں... یہ مجھے لے آئے ہیں... مجھے آپ کے پاس آنا ہے۔'' بچی بری طرح سسک رہی تھی۔ افتخار کا دل رک سا گیا لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کہتا دعا سے موبائل لے لیا گیا اور اسی آدمی نے کہا۔

کچھ کھٹا میٹھا

بیوی۔ ''آج کوئی ایسی بات کہو کہ میں خوش بھی ہو جاؤں اور جل بھی جاؤں۔''

خاوند۔ ''تم میری زندگی ہو اور......''

بیوی۔ ''اور......اور کیا؟''

خاوند۔ ''اور لعنت ہے ایسی زندگی پر۔''

☆☆☆

ویٹر۔ ''دس روپے ٹپ تو میری انسلٹ ہے۔''

پٹھان۔ ''تو پھر......؟''

ویٹر۔ ''بیس روپے تو دیں۔''

پٹھان۔ ''نہیں یار ہم تمہارا ڈبل انسلٹ نہیں کر سکتا۔''

☆☆☆

شیخ لڑکا۔ ''بارش کی بوندوں میں تیری یاد آتی ہے
ساون کے موسم میں تیری یاد آتی ہے''

لڑکی۔ ''ڈراما نہ کر، مجھے یاد ہے تیری چھتری واپس کرنی ہے۔''

''میرا خیال ہے تمہاری تسلی ہو گئی ہے۔''

افتخار نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔

''تم کیا چاہتے ہو؟''

آدمی ہنسا۔ ''تم مانتے ہو تمہاری بچی ہمارے قبضے میں ہے؟''

''ہاں...''

''اور یہ بھی سمجھتے ہو کہ ہم اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اسے اذیت دے سکتے ہیں۔ اسے مار سکتے ہیں۔''

''ہاں... ہاں... آگے بولو تم کیا چاہتے ہو؟'' افتخار کی آواز تیز ہو گئی۔ ''کام کی بات کرو۔''

''کام کی بات یہ ہے وکیل صاحب کہ آپ علی بھائی

کی ضمانت ہونے میں رکاوٹ نہیں ڈالو گے۔"

افتخار کو ایک جھٹکا اور لگا۔ "علی بھائی... تم علی بھائی کے آدمی ہو؟"

"تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو... میں چاہتا ہوں کہ آج وہ ضمانت پر رہا ہو جائے۔"

"اگر ایسا نہ ہو سکا تو...؟"

"تو تمہاری بچی کے حق میں بہت بُرا ہوگا۔" آدمی کے لہجے میں سفاکی آگئی۔ "میں نے جتنا بتایا ہے اس سے بھی برا ہو سکتا ہے۔ اس کے ٹکڑے کر کے تمہارے گھر بھیجے جا سکتے ہیں۔"

"دیکھو معاملہ عدالت میں ہے۔ جج علی بھائی کے خلاف ہے۔ میں کوشش نہ بھی کروں تب بھی اس کی ضمانت ہونا بہت مشکل ہے۔"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔" اس آدمی نے کہا۔ "اگر علی بھائی کی ضمانت نہیں ہوئی تو تم پھر کبھی اپنی بچی کو نہیں دیکھ سکو گے۔"

"خدا کے لیے میری بات سنو۔" افتخار گڑگڑایا۔ "یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ اگر میں عدالت میں چپ رہوں دلائل نہ دوں یا بیکار دلائل دوں تب بھی عدالت اپنا ذہن بنا چکی ہے۔"

"تم اس کی فکر مت کرو... علی بھائی کا وکیل اپنا کام کرے گا۔ وہ عدالت کو قائل کر لے گا کہ علی بھائی کی ضمانت منظور کر لی جائے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اس میں بالکل مداخلت نہ کرو بلکہ ضمانت کو سپورٹ کرو۔ اگر تم سپورٹ کرو گے تو جج بھی مخالفت نہیں کرے گا۔"

ایسا لگ رہا تھا کہ آدمی عدالتی معاملات سے اچھی طرح واقف ہے۔ اسے معلوم تھا کہ عدالت پر کس طرح اثر انداز ہوا جاتا ہے۔ مگر افتخار نے مزاحمت جاری رکھی۔ "جیسا تم بتا رہے ہو یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ میں علی بھائی کے وکیل پر اعتراض نہ کروں یا سوالات نہ اٹھاؤں یا دلائل نہ دوں تو میں خود مشکوک ہو جاؤں گا۔ جج کھٹک جائے گا کہ مجھ پر دباؤ ہے اور اس صورت میں علی بھائی کی ضمانت کا امکان پہلے سے بھی کم ہو جائے گا۔ میں یہ بات پوری ایمان داری سے کہہ رہا ہوں۔ میری طرف سے ذرا سی بھی چھوٹ جج کو مشکوک کر دے گی۔"

آدمی سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ "او کے میں تم سے کچھ دیر بعد بات کرتا ہوں لیکن خیال رہے تم پوری طرح ہماری نظر میں ہو، اگر تم نے کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو..."

"میں کسی سے رابطہ نہیں کروں گا۔" افتخار نے اسے یقین دلایا۔ "مجھے اپنی بچی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی عزیز نہیں ہے۔"

"تم کوئی کال بھی ریسیو نہیں کرو گے۔" آدمی نے اسے خبردار کیا اور کال کاٹ دی۔ افتخار کا موبائل سامنے پڑا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا اتفاق سے وہ ایسی جگہ تھا جہاں اس کی نگرانی کرنا بہت آسان تھا۔ پارکنگ میں بیشمار لوگ تھے۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ نزدیک سڑک کے پار کئی عمارتیں تھیں وہاں سے بھی اس کی نگرانی کی جا سکتی تھی۔ افتخار نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ دس بجے اس کے پہلے کیس کی پیشی تھی۔ اس کا مؤکل آ گیا تھا اور اس کا انتظار کر رہا تھا کیونکہ اس نے چند منٹ بعد ہی افتخار کو کال کی۔ بیل بج رہی تھی لیکن افتخار نے موبائل نہیں اٹھایا۔ بیل بج کر بند ہو گئی۔ ایک بار بج کر بند ہوئی اور فوراً ہی دوبارہ بجنے لگی۔ اس بار بھی افتخار نے کال ریسیو نہیں کی۔ وہ حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا اس لیے صبر کر کے بیٹھا رہا۔ تقریباً دس منٹ بعد فقیر کے دیئے ہوئے موبائل کی بیل بجی، اس نے کال ریسیو کی۔ آدمی نے بلا تمہید کہا۔

"تم سے جو کہا گیا ہے تمہیں... وہی کرنا ہے۔"

"میں ایسا ہی کروں گا لیکن اس کے باوجود علی بھائی کی ضمانت منظور نہ ہوئی تو اس میں..."

"افتخار احمد۔" آدمی کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "علی بھائی کی ضمانت بہر صورت منظور ہونی چاہیے۔ اسی صورت میں تمہاری بچی بچ سکتی ہے۔ اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے۔"

"لیکن..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تمہیں یہ کام کرنا ہے۔" آدمی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "ہاں تم اپنا موبائل استعمال نہیں کرو گے اور اس موبائل کو استعمال کرنے کی کوشش مت کرنا اس میں بیلنس نہیں ہے۔"

"سنو میرے ایک مؤکل کی مسلسل کال آرہی ہے دس بجے پیشی ہے۔"

"اسے بھول جاؤ۔ ابھی تم ساری توجہ علی بھائی کیس پر رکھو۔ تم گاڑی سے نکلو گے تو اسی عدالت میں جاؤ گے۔ میں ایک بار پھر تمہیں خبردار کر دوں اگر تم نے کسی سے رابطے کی کوشش کی یا اشارہ بھی دیا تو اس کی سزا تمہاری بچی کو ملے گی۔"

"پلیز بار بار دھمکی مت دو، میں وہی کروں گا جو تم کہو گے۔"

"جب تک میں نہ کہوں تم گاڑی سے نہیں نکلو گے۔"

"میں نہیں نکلوں گا لیکن تم میری بات پر بھی غور کرو، سب کچھ میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

"تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم ایسا ہی سمجھو کہ سب تمہارے ہاتھ میں ہے۔" آدمی نے مشورہ دیا اور کال کاٹ دی۔ افتخار نے جھنجلا کر موبائل برابر والی سیٹ پر پٹخ دیا۔ ان لوگوں نے نہایت چالاکی سے کام لیا تھا اور انداز بتا رہا تھا کہ یہ کام کرنے والے پیشہ ور مجرم تھے۔ انہوں نے ہر پہلو کا خیال رکھا تھا اور ایسا منصوبہ بنایا تھا کہ خود کہیں بھی سامنے نہیں آئے تھے۔ موبائل تک ایک فقیر کی مدد سے اس تک پہنچایا تھا اور اسے یقین تھا کہ اب وہ اس فقیر کو تلاش کرے گا تو وہ اسے نہیں ملے گا۔ اسکول سے دعا کو اغوا کرنے والا بھی کسی کی نظر میں نہیں آیا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اسے کال کرنے والا اور دعا کو اپنے قبضے میں کرنے والا کہاں تھا۔ یہاں سیکڑوں لوگ تھے ان میں سے کوئی بھی ایک دو یا زیادہ افراد مجرموں کے ساتھی ہو سکتے تھے۔ وہ وکیلوں کے حلیے میں بھی ہو سکتے تھے یا عام افراد کے حلیے میں بھی۔ وہ عدالت میں بھی ہوتے اور علی بھائی کے وکیل بھی انہی کا آدمی تھا۔ گویا وہ کہیں بھی ان لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ نہیں تھا۔ اس صورت میں بہتر یہی تھا کہ وہ اس آدمی کے کہے پر عمل کرے۔

افتخار کو لگ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے ہیں اور پانی میں دھکا دے کر کہا جا رہا ہے کہ اب تیرو۔ مگر وہ مجرم تھے ان کے نزدیک اس کی مجبوری سے زیادہ اپنا مفاد اہم تھا۔ یہ کیس بہت اہم تھا اس لیے عدالت نے ملزمان کی سخت نگرانی کا حکم دے رکھا تھا۔ پچھلی پیشی میں جج نے واضح کر دیا تھا کہ اگر ملزمان پولیس کی تحویل سے فرار ہوئے تو پولیس پر غفلت کا نہیں، اعانت مجرمانہ کا کیس بنے گا۔ اس لیے پولیس بہت محتاط تھی۔ دو بکتر بند گاڑیوں میں ملزموں کو لایا جاتا تھا اور ان پر ایک وقت میں دس مسلح اہلکار نگران ہوتے تھے۔ ممکن ہے علی بھائی کے حمایتیوں نے پہلے اسے فرار کرانے کا سوچا ہو لیکن ناکامی کے بعد اب وہ اسے اس طرح سے آزاد کرانا چاہتے ہوں۔ ان کے خیال میں یہ آخری موقع ہو سکتا تھا کیونکہ اس کے بعد علی بھائی اور اس کے ساتھیوں کو جیل کسٹڈی میں دے دیا جاتا اور جس رفتار سے مقدمے کی سماعت جاری تھی، لگ رہا تھا کہ آنے والے ایک ڈیڑھ مہینے میں فیصلہ سنا دیا جائے گا۔

یہ سارے خیالات اور سوچیں افتخار کے ذہن میں آ رہی تھیں۔ کیونکہ اس کے پاس کرنے کے لیے اور کچھ نہیں تھا ساتھ ساتھ وہ اس مشکل سے نکلنے کی تدبیر بھی سوچ رہا تھا مگر فی الحال کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ وکالت جیسے مشکل اور بدنام پیشے میں بھی راست بازی کا قائل تھا۔ اس کی سوچ یہ تھی کہ دنیا بے شک غلط کام کر رہی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غلط بات درست مان لی جائے۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ اپنے اصولوں کے منافی کوئی کام کرنے جا رہا تھا۔ دس بج گئے تھے اور دوسرے مؤکل نے مسلسل ناکامی کے بعد کال کرنا بند کر دی تھی شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ آج وکیل صاحب دستیاب نہیں ہوں گے اور پیشی ضائع جائے گی۔ افتخار اسے کیا بتاتا کہ اس کی تو زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ انجن اور اے سی بند ہونے کے بعد کار میں رفتہ رفتہ اچھی خاصی گرمی ہو گئی تھی۔ وہ شیشے نہیں اتارنا چاہتا تھا اس لیے اس نے انجن اسٹارٹ کر کے اے سی چلا دیا اور برابر میں رکھے بریف کیس سے کیس کی فائل نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ علی بھائی کا وکیل ضمانت کے حق میں کیا دلائل دے سکتا ہے؟

سب سے مضبوط دلیل تو علی بھائی کی حیثیت تھی۔ وہ جدی پشتی کاروباری تھا۔ علی بھائی نے آبائی دولت میں خاصا اضافہ کیا تھا۔ صرف فارماسیوٹیکل کا بزنس نہیں تھا، اس کے علاوہ بھی درجن بھر بزنس تھے اور صرف پاکستان میں نہیں بلکہ بیرونِ ملک بھی کئی کمپنیاں اس کی ملکیت تھیں۔ معاشرے میں اس کا ایک مقام تھا۔ اس کی کمپنیاں کروڑوں کا ٹیکس ادا کرتی تھیں۔ اس سے پہلے مختلف کیسز میں عدالت میں پیش ہوتا رہا تھا، ان میں سے کئی کیس اس نے خود کیے تھے لیکن یہ پہلا موقع تھا جب اس پر ملزم کی حیثیت سے مقدمہ چل رہا تھا۔ وہ کئی فلاحی اور خیراتی اداروں کا مالک تھا جن کے تحت عام لوگوں کی فلاح کے لیے بہت کچھ کیا جاتا تھا۔ اس کی ضمانت لینے والوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ خود بڑی سے بڑی رقم کی ضمانت دے سکتا تھا۔ پھر یہ دلیل بھی دی جا سکتی تھی کہ اس کا نام ای سی ایل میں ہے اس لیے اگر وہ چاہے بھی تو ملک سے فرار نہیں ہو سکتا۔

انتظامیہ اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو علی بھائی سے مال مل رہا تھا۔ اس لیے وہ اس کی ضمانت میں روڑے اٹکانے سے گریز کر رہے تھے۔ دوسری طرف اسے طاقتور ایلیٹ کلاس کی حمایت بھی حاصل تھی۔ افتخار نہیں

جانتا تھا کہ اس واقعے کے پیچھے اصل میں کس کا ہاتھ تھا لیکن یقینی طور پر یہ ان لوگوں میں سے تھے جو علی بھائی کو سزا سے بچانا چاہتے تھے۔ وقت گزر رہا تھا۔ ساڑھے دس بجے کے بعد پھر موبائل کی بیل بجی' اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف موجود آدمی نے کہا۔ ''اب تم عدالت کی طرف جاؤ گے لیکن کسی سے ملنے یا بات کرنے سے گریز کرو گے۔ بہتر ہے ملنے جلنے والوں سے دور رہو۔''

''اگر کوئی خود مجھ سے ملنے آجائے؟''

''تو بس سلام دعا کی حد تک رہنا اور جلدی کا بہانہ کرنا۔ یاد رکھنا ہمارے آدمی تمہارے آس پاس ہوں گے اگر تم نے کسی کو اشارہ کیا یا کوئی بات بتائی تو ہمیں فوراً پتا چل جائے گا۔''

''میں کسی کو اشارہ نہیں کروں گا۔'' افتخار احمد نے کہا۔

''کیا اب میں کار سے اتر سکتا ہوں؟''

''ہاں اور موبائل یہیں چھوڑ دو۔''

''اپنا موبائل یا دونوں موبائل؟''

''اپنا موبائل... یہ والا ساتھ رکھو اور اب اسے وائبریٹ پر کرلو اور ایسی جگہ رکھنا کہ کال آنے کی صورت میں تمہیں فوراً پتا چل جائے۔''

افتخار نے اسے خبردار کیا۔ ''عدالت میں موبائل استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' آدمی نے جواب دیا۔ ''اب تم کار سے اترو اور کورٹ کی طرف روانہ ہوجاؤ۔''

افتخار نے فائل دوبارہ بریف کیس میں رکھی۔ فقیر والا موبائل وائبریٹ پر کرکے پتلون کی جیب میں رکھا۔ یہاں وائبریشن آسانی سے محسوس کی جاسکتی تھی۔ اپنا موبائل کار میں پڑا رہنے دیا اور انجن بند کرکے نیچے اتر آیا۔ اب کورٹ میں ہجوم بڑھ گیا تھا۔ افتخار احمد نے غیر ارادی طور پر پھر جاننے کی کوشش کی کہ اس کی نگرانی کون کر رہا ہے لیکن وہ کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھ سکا۔ اندر جاتے ہوئے وہ ایسی جگہوں سے گزر رہا تھا جہاں بھیڑ کم تھی اور اگر اسے کوئی شناسا دکھائی دیتا تو وہ راستہ بدل لیتا تھا۔ پونے گیارہ بجے وہ عدالت کے کمرے کے سامنے تھا۔ علی بھائی کا وکیل آ گیا تھا اور فوراً ہی علی بھائی بھی پولیس والوں کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ وہ ستر برس کی عمر میں بھی پوری صحت مند اور چاق و چوبند تھا۔ اس نے آتے ہی اپنے وکیل کا رخ کیا اور سرگوشی میں اس سے کچھ کہنے لگا۔ اسے ساتھ لانے والی پولیس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ معاملہ پہلے ہی سیٹ ہو گیا تھا۔ علی بھائی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی لیکن زنجیر کھول دی گئی تھی اور یہ رول کے خلاف تھا۔ جب تک ملزم عدالت میں نہیں پہنچ جاتا اس کی زنجیر نہیں کھولی جاتی تھی۔

اپنے وکیل سے بات کرتے ہوئے علی بھائی نے افتخار احمد کی طرف دیکھا اور مسکرایا تو اسے لگا جیسے وہ واقف حال ہو۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی اتنا بڑا کام اس کی مرضی کے خلاف کیسے ہوسکتا تھا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوجاتی اور بات کھل جاتی۔ شاید اس کا نقصان افتخار کو بھی ہوتا لیکن علی بھائی کا کیس انتہائی خراب ہوجاتا۔ اس کے لیے یہ بہت بڑا اسکینڈل بن جاتا جو اس کے بزنس کی ساکھ برباد کردیتا اس لیے پورا امکان تھا کہ جو ہوا ہے وہ علی بھائی کی مرضی اور شاید اس کے مشورے سے ہوا ہے۔ افتخار اسے دیکھ کر خون کے گھونٹ پی رہا تھا۔ وہ سب عدالت میں آ گئے کیونکہ جج کے آنے کا وقت ہوگیا تھا۔ افتخار اپنی نشست پر بیٹھا تھا اور کیس کی فائل دیکھ رہا تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے جج اپنے چیمبر سے کمرے میں آیا تو سب احتراماً کھڑے ہوگئے۔ جج کے بیٹھتے ہی علی بھائی کے وکیل نے کھڑے ہوکر کہا۔

''یور آنر میں علی بھائی کی ضمانت کی درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

''آج کیس میں ملزم کی حیثیت کا تعین ہوگا۔'' جج نے جواب دیا۔ ''ضمانت کی درخواست قبل از وقت ہے۔''

''یور آنر یہ کام بھی ہاتھ کے ہاتھ کیا جاسکتا ہے میرا موکل ایک ستر سالہ عمر رسیدہ اور معاشرے کا معزز فرد ہے۔'' وکیلِ صفائی نے اصرار کیا۔ ''اسے ضمانت کی سہولت ملنی چاہیے۔ اس درخواست پر وکیلِ استغاثہ کو بھی اعتراض نہیں ہے۔''

اس پر عدالت میں ایک لمحے کے لیے لوگوں کی حیرت بھری آوازیں ابھریں لیکن فوراً ہی خاموشی چھا گئی۔ میڈیا کے چند نمائندے تھے ان کے پین فوراً نوٹ بک پر چلنے لگے۔ جج نے افتخار احمد کی طرف دیکھا۔ ''مسٹر افتخار آپ کو اس درخواست پر کوئی اعتراض ہے؟''

افتخار ہچکچاتے ہوئے کھڑا ہوا اور کھنکھار کر کہا۔ ''نہیں یور آنر... انسانی بنیادوں پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

چند لمحے جج کی آنکھوں میں بھی حیرت نظر آئی پھر اس نے علی بھائی کے وکیل سے کہا۔ ''آپ درخواست دے دیں۔''

استغاثہ دائر کرنے والوں کا ایک نمائندہ آج بھی عدالت میں موجود تھا۔ اس نے سرگوشی میں افتخار احمد سے

کہا۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں اس کی ضمانت کی حمایت کیوں کی؟''

''آپ فکر نہ کریں یہ صرف عدالتی پروسیس ہے۔ اس کا اصل کیس سے تعلق نہیں ہے۔'' افتخار نے جوابی سرگوشی کی۔

''کیوں نہیں ہے، یہ ضمانت پر رہا ہوتے ہی غائب ہوجائے گا۔'' نمائندے نے اصرار کیا۔ ''آپ ضمانت پر اعتراض کریں ورنہ جج ضمانت منظور کرلے گا۔''

''میں نے کہا نا آپ فکر نہ کریں اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔'' افتخار کسی قدر جھنجلاہٹ کے ساتھ بولا اور کھڑا ہوگیا۔ درخواست لگتے ہی وکیلِ صفائی میں ایک جوش آگیا اور وہ کیس میں علی بھائی کی حیثیت کے تعین کے معاملے سے قطع نظر اس کی ضمانت کی منظوری کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا اور دلائل دیئے جا رہا تھا۔ جج نے تنگ آکر اسے یاد دلایا کہ اسے کس معاملے میں دلائل دینے ہیں۔ ابھی اس نے ضمانت کے معاملے کی سماعت نہیں کی ہے۔ یہ حیثیت کے تعین کے بعد ہوگی۔ اس پر وکیلِ صفائی نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''دونوں معاملے ایک ہیں یور آنر۔''

''آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟'' جج نے افتخار کی طرف دیکھا۔ اس بار اس نے ہچکچا کو جواب دیا۔

''میرا خیال ہے وکیلِ صفائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''یہ ٹھیک کیسے کہہ رہے ہیں؟'' جج نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ''دونوں معاملات بالکل الگ ہیں۔ آپ دونوں ملزم کی کیس میں حیثیت کا تعین کریں۔''

بادلِ ناخواستہ وکیلِ صفائی نے علی بھائی کی حیثیت کے بارے میں دلائل دینا شروع کیے۔ اس کا موقف تھا کہ کیس میں اصل ذمے داری علی بھائی پر نہیں آتی ہے کیونکہ نچلے درجے کے کچھ ملازمین اس بے قاعدگی میں ملوث پائے گئے ہیں اور انہوں نے اپنی غلطی چھپانے کے لیے دوا تیار کرکے مارکیٹ میں بھیج دی۔ اس پر جج نے یاد دلایا کہ یہ ملازمین پہلے ہی صحتِ جرم سے انکار کرچکے ہیں اور دوسرے دوا سازی کی تمام ڈاکومنٹس پر ملزمان کے دستخط موجود ہیں۔ اس پر وکیلِ صفائی نے اسے ملازمین کی سازش قرار دیا۔ افتخار خاموشی سے وکیلِ صفائی کے دلائل سن رہا تھا۔ جج سمیت تمام افراد اس کے رویے پر حیران تھے۔ اس نے بحث میں حصہ نہیں لیا اور نہ ہی کسی بات پر اعتراض کیا۔ وکیلِ صفائی کے دلائل کے بعد جج نے اس معاملے پر فیصلہ محفوظ کرلیا اور اس کے فوراً بعد وکیلِ صفائی نے دوبارہ ضمانت کی درخواست پر بات شروع کردی۔ جج نے ایک بار پھر افتخار سے کنفرم کیا۔

''آپ کو اس درخواست پر اعتراض نہیں ہے؟''

''نہیں یور آنر... ملزم کی عمر اور بعض دوسری باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں اعتراض نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس سلسلے میں کچھ نقاط بھی ہیں، وہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ پیش کرسکتے ہیں۔'' جج نے اجازت دی تو افتخار نے کیس کی فائل کھول کر اس کے سامنے رکھی۔ ''یور آنر ان نقاط کو دیکھ کر یقیناً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ملزم کی ضمانت پر رہائی سے اس کیس پر فرق نہیں پڑے گا۔''

جج نے ایک نظر افتخار کو دیکھا اور پھر فائل دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ سپاٹ رہا تھا صرف افتخار ہی نہیں بلکہ وکیلِ صفائی اور عدالت میں بیٹھے کچھ اور افراد بھی جج کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ بالآخر جج نے سر ہلایا۔ ''آپ کے نقاط قابلِ غور ہیں۔ عدالت، ضمانت کی درخواست کو ان کی روشنی میں بھی دیکھے گی۔''

افتخار سمیت سب نے سکون کا سانس لیا تھا صرف استغاثہ کا نمائندہ بے چین تھا اور لگ رہا تھا کہ اسے افتخار کی وکالت بالکل پسند نہیں آرہی ہے۔ جبکہ کٹہرے میں کھڑا علی بھائی مسکرا رہا تھا۔ وکیلِ صفائی ضمانت پر دلائل دے رہا تھا اور افتخار نے اس بار بھی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا بلکہ جب کوئی بات قابلِ اعتراض محسوس ہوتی اور جج افتخار سے پوچھتا تو کہتا کہ اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ معاملہ اسی سمت بڑھ رہا تھا جیسا کہ علی بھائی اینڈ کمپنی چاہتے تھے۔ بارہ بجے جج نے عدالت عارضی طور پر برخاست کی اور اپنے چیمبر میں چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی استغاثے کے نمائندے نے افتخار سے پوچھا۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں، کیا آپ ان لوگوں کے ساتھ مل گئے ہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' افتخار نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اگر علی بھائی ضمانت پر رہا ہو بھی گیا تو وہ سزا سے نہیں بچ سکے گا۔''

''سزا تو اسے اس وقت ملے گی جب وہ یہاں ہوگا۔'' نمائندے نے تلخی سے کہا۔ ''یہ رہا ہوتے ہی غائب ہوجائے گا۔ سب جانتے ہیں یہ بات اور آپ معصوم بن رہے ہیں۔''

افتخار خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''پلیز میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

"اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو آگے کی تاریخ لے لیتے اس طرح کیس کا بیڑا غرق کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کو فیس کس بات کی دی جارہی ہے۔"

افتخار نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔ "دیکھیں اگر میں علی بھائی کو سزا نہ دلوا سکا تو آپ لوگوں کی فیس واپس کردوں گا۔"

افتخار اور نمائندہ ایک کونے میں بات کر رہے تھے جبکہ دوسرے کونے میں علی بھائی اور اس کا وکیل آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میڈیا والے کیس کی ابتدائی رپورٹ ارسال کرنے کے لیے باہر چلے گئے تھے۔ استغاثے کا نمائندہ افتخار سے مطالبہ کر رہا تھا کہ وہ ضمانت پر اعتراض کرے اور کسی صورت اسے منظور نہ ہونے دے۔ افتخار اسے سمجھا نہیں سکتا تھا کہ وہ اعتراض کر ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک بچی کی زندگی کا معاملہ تھا۔ اسے کچھ ہو جائے یہ افتخار کو کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ دس منٹ بعد جج واپس عدالت میں آیا اور اس کے نشست سنبھالتے ہی آگے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ وکیلِ صفائی نے ضمانت کی درخواست دہرائی اور پیش کش کی اس سلسلے میں عدالت جو چاہے ضمانت طلب کر لے۔ جج نے سر ہلایا۔ "عدالت وکیلِ استغاثہ کی جانب سے اعتراض نہ کرنے پر ضمانت کی درخواست منظور کرتی ہے اور پچاس کروڑ روپے کی ذاتی ضمانت منظور کرتی ہے۔"

علی بھائی اور وکیل صفائی کے چہروں پر ضمانت کی منظوری کے الفاظ سن کر جو خوشی نمودار ہوئی تھی، وہ زرِ ضمانت کا سنتے ہی معدوم ہو گئی۔ وکیلِ صفائی نے جلدی سے کہا۔ "یور آنر یہ رقم بہت زیادہ ہے۔"

"بالکل بھی زیادہ نہیں ہے۔ عدالت میں علی بھائی کے جو اثاثے ظاہر کیے گئے ہیں، ان کی مالیت دس ارب روپے سے زیادہ ہے اس صورت میں پچاس کروڑ روپے زرِ ضمانت بالکل مناسب ہے۔"

"جناب یہ بہت بڑی رقم ہے۔" وکیلِ صفائی نے بے بسی سے کہا۔ "اس میں وقت لگے گا۔"

"اس صورت میں ضمانت پر رہائی اگلی پیشی کے لیے ملتوی کی جاسکتی ہے۔"

"نہیں یور آنر۔" وکیلِ صفائی نے اس بار زیادہ تیزی سے کہا۔ "زرِ ضمانت کا بندوبست چند گھنٹوں میں ہو جائے گا۔"

"جب تک زرِ ضمانت جمع نہیں ہو جاتا، ملزم علی بھائی پولیس کی تحویل میں رہے گا۔ زرِ ضمانت جمع ہونے پر تصدیق کے بعد ملزم کو رہا کیا جائے گا۔"

جج فیصلہ سنا کر چلا گیا اور علی بھائی پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے وکیل کو بلایا اور اس سے کچھ کہا۔ پھر اس سے موبائل لے کر کسی کو کال کرنے لگا۔ میڈیا والے یہ بریکنگ نیوز اپنے چینلز تک پہنچانے کے لیے بھاگے تھے۔ استغاثہ کا نمائندہ ایک بار پھر افتخار سے بحث کرنے پر آمادہ تھا۔ افتخار نے اس سے کہا۔ "پلیز آپ مجھ سے بار بار ایک ہی بات نہ کریں ممکن ہے اگلی پیشی تک آپ کو نیا وکیل کرنا پڑے۔"

"وہ تو لگ رہا ہے۔" نمائندے نے تلخ لہجے میں کہا۔ "مگر آپ جانے سے پہلے کیس کا بیڑا غرق کر رہے ہیں۔"

"آپ میری مجبوری نہیں جانتے۔" افتخار نے سرد آہ بھری۔ "لیکن شاید جلد جان جائیں۔"

نمائندہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ پولیس والے علی بھائی اور اس کے وکیل کو راز و نیاز کرنے کا پورا موقع فراہم کر رہے تھے۔ افتخار ان کی طرف آیا اور اس نے آہستہ سے کہا۔ "علی بھائی مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"کرو۔" اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"آپ کا کام ہو گیا ہے پلیز اب میری بچی کو چھوڑ دو۔" افتخار نے لجاجت سے کہا۔ علی بھائی نے حیرت سے اپنے وکیل کی طرف دیکھا۔

"وکیل صاحب کیا کہہ رہے ہیں، کس بچی کی بات کر رہے ہیں؟"

"پتا نہیں شاید آج ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وکیل نے بھی مذاق اڑایا۔

"علی بھائی۔" افتخار ضبط کرتا ہوا بولا۔ "آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں، میں کیا کہہ رہا ہوں۔ آپ کی ضمانت ہو گئی ہے اس لیے اپنے آدمیوں سے کہیں میری بچی کو چھوڑ دیں۔ مجھے مجبور نہ کریں کہ میں معاملہ کسی اور کے پاس لے جاؤں۔"

"آرام سے وکیل صاحب آرام سے۔" علی بھائی نے جلدی سے پینترا بدلا۔ "اتنی جلدی کیوں کرتے ہو ضمانت تو ہونے دو۔"

"میں صبر نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی چھٹی کا وقت قریب ہے اور وہ گھر نہیں پہنچے گی تو میری بیوی مجھے اور پھر اسکول فون کرے گی جب اسے پتا چلے گا کہ دعا اسکول آئی ہی نہیں تو وہ مجھے کال کرے گی اور میرا موبائل کار میں پڑا ہے۔

ناکامی کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرلے گی، آپ میری بات سمجھ رہے ہو؟"

علی بھائی سوچ میں پڑ گیا، وہ شاطر آدمی تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک بار یہ معاملہ کھل گیا تو وہ مشکل میں پڑ سکتا ہے۔ اس کی ضمانت منسوخ ہو سکتی ہے اور پولیس اسے دوبارہ گرفتار بھی کر سکتی ہے۔ پونے ایک بج رہا تھا اور دعا چھٹی کے بعد ایک بجے تک گھر پہنچ جاتی تھی۔ علی بھائی نے آہستہ سے کہا۔ "اپنی بیوی کو فون کر کے کہو کہ وہ صبر سے بیٹھے بچی آجائے گی۔"

افتخار نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ صبر نہیں کرے گی اور اپنے بھائی کو کال کر دے گی۔ ڈی ایس پی صفدر خان اینٹی ٹیررسٹ اسکواڈ میں کام کرتا ہے۔ آپ نے اس کا نام سنا ہو گا۔ اصل بات یہ ہے مجھ پر ایک ایک لمحہ بھاری ہے۔ اگر میں نے صبر کا دامن چھوڑ دیا تو ابھی آپ کی ہونے والی ضمانت منسوخ ہو جائے گی۔"

یہ سن کر علی بھائی اور اس کا وکیل کسی قدر پریشان نظر آنے لگے۔ انہوں نے افتخار سے ذرا دور ہٹ کر تبادلۂ خیال کیا اور واپس آئے۔ علی بھائی نے کہا۔ "ٹھیک ہے... ایک بجتے ہی بچی کو گھر کے دروازے پر چھوڑ دیا جائے گا۔"

"ابھی ضمانت کی رقم آنے میں ایک گھنٹا ہے۔" وکیل نے دبی زبان میں کہا۔ علی بھائی نے سر ہلایا۔

"اب فرق نہیں پڑتا۔"

افتخار نے فقیر کا دیا ہوا موبائل نکال کر علی بھائی کو تھمایا اور بولا۔ "یہ تمہاری امانت ہے۔ میں نے اپنا کام کر دیا اب مجھے اجازت دو۔"

علی بھائی نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو لیکن ایک بجے تک۔"

یہ ایک اہم کیس تھا مگر میڈیا اور عام لوگوں کو اس سے دور رکھنے کے لیے علی بھائی کے آدمی وہاں آجاتے تھے۔ اس وقت بھی عدالت میں زیادہ تر علی بھائی کے آدمی موجود تھے۔ ایک بجتے ہی افتخار باہر کی طرف لپکا اور اپنی گاڑی تک آیا۔ اس نے کار میں بیٹھ کر موبائل اٹھایا اور مدیحہ کو کال کی۔ مدیحہ کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ اسی لمحے ایک سادہ لباس شخص نزدیک آیا اور اس نے کار کے شیشے پر تاک کی۔ افتخار نے شیشہ نیچے کیا تو اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "بچی واپس آگئی؟"

"گھر کال کر رہا ہوں، کال ریسیو نہیں ہو رہی ہے۔" افتخار نے کہا۔

کھٹی باتیں

☆ مشین بار بار خراب ہو جائے تو اس کا مال بدل دیں۔

☆ میری صحت کا راز سگریٹ نوشی جو میں نہیں کرتا۔

☆ نوادرات ایک نسل خریدتی ہے دوسری فروخت کرتی ہے تیسری پھر خرید لیتی ہے۔

☆ اگر تصویر دیوار پر ٹنگی ہو تو مصوری کا نمونہ اور اگر اس کے گرد گھوما جا سکے تو مجسمہ۔

☆ تمام لوگ بے وقوف نہیں ہوتے کچھ غیر شادی شدہ بھی ہوتے ہیں۔

☆ سالوں، بہنوئیوں اور بے وقوف سے بحث کرنی نہیں چاہیے۔

☆ احترام مانگا یا چھینا نہیں جاتا، احترام کروایا جاتا ہے اور عزت حاصل کی جاتی ہے۔

"ٹھیک ہے جیسے ہی بچی کے آنے کی اطلاع ملے آپ کار سے نکل کر دو بار اس کی چھت پر ہاتھ ماریے گا۔" سادہ لباس شخص نے کہا اور تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد افتخار نے دوبارہ کال کی اور اس بار مدیحہ نے کال ریسیو کرلی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"کہاں تھیں اتنی دیر سے۔" افتخار برس پڑا۔ اس کے اعصاب سخت کشیدہ تھے۔ "دعا آگئی؟"

"ہاں آگئی ہے لیکن افتخار ایک عجیب واقعہ ہوا ہے۔"

"دوسری بچی کہاں ہے؟"

مدیحہ دنگ رہ گئی۔ "آپ جانتے ہیں؟"

"ہاں تم اسے اندر لے آئی ہو؟"

"وہ بے چاری باہر کھڑی رو رہی تھی تو میں اور کیا کرتی۔"

"تم نے ٹھیک کیا۔ اب دروازے اندر سے بند کرلو

اور سوائے بچوں کے کسی کے لیے دروازہ مت کھولنا۔ اسکول کال کرکے بچی کے بارے میں اطلاع کردو۔ مگر جب تک میں نہ آؤں کوئی بھی بچی لینے آئے بچی اس کے حوالے مت کرنا۔"

"افتخار کیا بات ہے، کوئی خطرہ ہے۔" مدیحہ پریشان ہوگئی۔

"جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔" افتخار نے کہا۔ "گھر آکر سب بتاؤں گا۔"

بات کرکے وہ سکون کے احساس کے ساتھ کار سے نکلا اور اس کی چھت پر دو بار ہاتھ مارا۔ پھر وہ عدالت کی طرف روانہ ہوگیا۔ رجسٹرار کے دفتر میں ضمانت کی کارروائی جاری تھی۔ زرِ ضمانت آنے والا تھا۔ افتخار راہداری میں موجود رہا۔ چند منٹ بعد اچانک چند سادہ لباس والوں نے علی بھائی کو گھیر لیا۔ اس کا وکیل بدحواس ہوگیا۔ "کون ہو تم لوگ... علی بھائی کی ضمانت ہوگئی ہے۔"

"ضمانت ہوگئی تھی لیکن ضمانت لینے والے جج نے ہی اسے منسوخ کرتے ہوئے ملزم کو ابھی عدالت میں طلب کر لیا ہے۔"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟" وکیلِ صفائی نے اعتراض کیا۔

"یہ سوچتے رہو اور چاہو تو عدالت آجانا۔" ایک سادہ لباس والے نے طنزیہ انداز میں کہا اور پولیس والوں کے ہمراہ علی بھائی کو لے کر کمرائے عدالت کی طرف روانہ ہوگئے۔ وکیلِ صفائی ان کے پیچھے لپکا وہ پولیس والوں اور سادہ لباس والوں کو سمجھانے کی کوشش کررہا تھا کہ عدالت نے علی بھائی کی ضمانت منظور کی ہے وہ اب اسے منسوخ نہیں کرسکتی۔ دوسری طرف علی بھائی کی حالت ایسی ہورہی تھی جیسے کسی مریض کو دل کی بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد کینسر ہونے کی اطلاع دی گئی ہو۔

وہ عدالت میں داخل ہوئے تو جج وہاں پہلے سے موجود تھا اُس نے افتخار احمد کی طرف دیکھا۔ "آپ کی بچی گھر پہنچ گئی ہے؟"

"جی یور آنر۔" افتخار نے جواب دیا۔ "لیکن اغوا ہونے والی بچی میری نہیں تھی اگرچہ اس کا نام بھی دعا ہے۔"

جج چونکا۔ "لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ وہ آپ کی بچی ہے؟"

"یور آنر... جب مجھے معلوم ہوا کہ میری دعا کو اغوا کرلیا گیا ہے اور وہ بے رحم مجرموں کے قبضے میں ہے جن کا مطالبہ ہے کہ علی بھائی کی ضمانت میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالوں تو آپ اندازہ نہیں کرسکتے میری کیا حالت ہوئی تھی۔ اگر کوئی میرے دل میں خنجر اتار دیتا تب بھی مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ پھر ان لوگوں نے میرے مطالبے پر بچی سے میری بات کرائی تب مجھے پتا چلا کہ وہ دعا نہیں ہے۔ یور آنر میری دعا کسی قدر منگولین بچی ہے اور اسپیچ تھراپی کے بعد وہ کسی قدر بولنا سیکھ گئی ہے لیکن ٹھیک سے بات نہیں کرسکتی اس لیے جب اس بچی نے بالکل صاف لہجے میں بات کی تو میں سمجھ گیا ان لوگوں نے غلط بچی کو اغوا کرلیا ہے۔ اس کے باوجود میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا کہ میں اسے اپنی کامیابی کی بھینٹ چڑھا دوں۔ دوسری طرف میری وجہ سے ایک اہم ترین کیس کا ملزم چھوٹ جاتا مجھے یہ بھی گوارا نہیں تھا۔"

"بچی کو کن لوگوں نے اغوا کیا تھا؟" جج نے پوچھا۔

"علی بھائی کے آدمیوں نے۔"

"کیا آپ نے انہیں دیکھا تھا؟"

"نہیں یور آنر کورٹ کے پاس آتے ہوئے سگنل پر ایک فقیر نے مجھے روکا اور ایک موبائل دیا۔ بچی کو اغوا کرنے والوں نے اسی پر مجھ سے رابطہ کیا تھا۔"

"تب آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ علی بھائی کے آدمی تھے؟"

"کیونکہ انہوں نے علی بھائی کی ضمانت میں خلل ڈالنے سے منع کیا تھا اور مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر علی بھائی کی ضمانت نہ ہوسکی تو میری بچی کو مار دیا جائے گا۔"

"یہ جھوٹ ہے علی بھائی کے خلاف سازش ہے۔" وکیلِ صفائی چیخ اٹھا۔ جج نے اس کی طرف ناگواری سے دیکھا۔

"آپ خاموش رہیں ابھی آپ سے بھی سوال کیا جائے گا۔"

"یہ سچ ہے اور اس کا ثبوت ہے کہ وہ بچی میرے گھر میں موجود ہے کیونکہ مجرم علی بھائی کی ضمانت منظور ہونے کے بعد اسے میرے گھر کے سامنے چھوڑ گئے، میری دعا سمجھتے ہوئے۔"

"یور آنر یہ جھوٹ ہے، سازش ہے۔" وکیلِ صفائی نے پھر مداخلت کی۔

"آرڈر آرڈر..." جج نے اس بار خفگی سے کہا۔ "آپ اپنی باری پر بولیں۔"

"یور آنر اس کیس میں ملزم کی ضمانت کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ یہ درجنوں افراد کی جانوں کا قاتل ہے اس

لیے اس کے ساتھیوں نے یہ منصوبہ تیار کیا اور میری بچی دعا کو اغوا کرنے کی سازش کی مگر اغوا کرنے والے غلطی سے دعا نام کی ایک اور بچی کو اغوا کرکے لے گئے۔"

"جب وہ آپ کی بچی نہیں تھی تو پھر آپ نے مجرموں کی بات کیوں مانی؟"

"یور آنر وہ میری دعا نہیں تھی لیکن کسی نہ کسی کی دعا تو تھی اور وہ بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہوگا جتنی میں اپنی دعا سے کرتا ہوں۔ میں نے آپ سے مدد بھی بہت ہمت کرکے مانگی اور اگر اس بچی کو کچھ ہوجاتا تو شاید میں ساری زندگی خود سے نظریں نہ ملا پاتا۔ مگر اللہ نے کرم کیا کہ وہ بچی بھی اب میرے گھر محفوظ ہے۔"

وکیلِ صفائی نے اب خود پر قابو پا لیا تھا۔ اس نے کہا۔ "یور آنر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ سب علی بھائی نے کرایا ہے۔"

"ثبوت ہے یور آنر... علی بھائی کی جیب میں وہ موبائل موجود ہے جس سے مجرم مجھے کال کرتے رہے اور مجھے وہ نمبر بھی یاد ہے جس سے وہ کال کرتے تھے۔ نمبر ابھی چیک کیا جاسکتا ہے۔ مجھے کال کرنے والا ہاتھ آئے گا تو وہ خود ساری کہانی سنائے گا۔"

یہ سن کر علی بھائی کا چہرہ سفید پڑ گیا اور اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنی جیب کی طرف گیا لیکن اس سے پہلے وہ موبائل نکالتا ایف آئی اے کے اہلکاروں نے اسے قابو کرکے اس کی جیب سے موبائل نکال کر جج کے سامنے پیش کردیا اور اس نے خود ملاحظہ کیا کہ اس میں مذکورہ نمبر سے کال آئی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سارا معاملہ خود کھل گیا۔ اس نے غصے سے کہا۔ "تم ایک شریف اور معزز آدمی کے بھیس میں مجرم ذہن کے شخص ہو اور اس قابل ہو کہ تمہیں سخت سزا دی جائے۔ اب میں دیکھتا ہوں تم کیسے سزا سے بچتے ہو۔"

افتخار نے کیس کی فائل میں چند الفاظ میں صورتِ حال لکھ کر اسے جج کے سامنے پیش کیا اور سمجھدار جج نے اسی وقت ایکشن لیا۔ اس نے علی بھائی کی ضمانت منظور کرلی لیکن ساتھ ہی زرِ ضمانت اتنا بھاری مانگ لیا جس کے بندوبست میں وقت لگے۔ افتخار نے کوشش کی اور علی بھائی نے اپنے آدمیوں کو بچی چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ اگرچہ اس کا وکیل متفق نہیں تھا مگر علی بھائی کے خیال میں اس کی ضمانت ہوگئی تھی اور بچی کو چھوڑ دینا ہی مناسب تھا اگر اس میں تاخیر سے معاملہ خراب ہوتا تو اس کی ضمانت منسوخ بھی ہوسکتی تھی۔ وکیلِ صفائی مطمئن نہیں تھا مگر وہ علی بھائی کا فیصلہ نہیں بدلوا سکتا تھا۔ بچی کے رہا ہوتے ہی جج کی طرف سے بلوائے گئے ایف آئی اے کے آدمیوں نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک ٹیم افتخار کے گھر پہنچ گئی تھی اور مدیحہ نے افتخار سے بات کرنے کے بعد انہیں گھر میں آنے کی اجازت دی۔ انہوں نے بچی کو اپنی تحویل میں لیا اسی اثنا میں اسکول والے بچی کے والدین کے ساتھ افتخار کے گھر پہنچ گئے اور ایف آئی اے کے اہلکاروں نے بچی ان کے حوالے کردی۔

یہ ساری اطلاعات عدالت ... پہنچ رہی تھیں۔ جج کے حکم پر مذکورہ علاقے کے پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او نے اسی وقت ایف آئی آر کاٹی اور اس میں علی بھائی اور اس کے ساتھیوں کو ملزم نامزد کیا۔ اس کی ضمانت صرف ڈراما تھی اب اس کے خلاف مزید ایک کیس اور ہوگیا تھا۔ جج نے عدالت سے اسے جیل بھیج دیا۔ عدالت کا یہ سیشن خلافِ معمول کئی گھنٹے جاری رہا مگر اس نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیا تھا۔ میڈیا کو اطلاع مل گئی تھی اور کمرے کے باہر اس وقت میڈیا کے بے شمار نمائندے آچکے تھے اور وہ سب اندر ہونے والی کارروائی جاننے کے لیے بے تاب تھے۔ لیکن انہیں فی الحال عدالت کے کمرے میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ علی بھائی اور اس کے آدمی خونخوار نظروں سے افتخار کو دیکھ رہے تھے اور ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے قتل کردیں۔ افتخار نے اسی دوران میں جج سے کہا۔

"یور آنر... میں نے ہمت کرکے اپنا فرض پورا کیا ہے لیکن مجھے خطرہ ہے کہ علی بھائی جیسے بااثر شخص کے وفادار مجھے یا میرے اہلِ خانہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے اگر مجھے یا میرے اہلِ خانہ کو کوئی نقصان ہوا تو اس کی تمام تر ذمے داری علی بھائی پر ہوگی۔"

"آپ فکر نہ کریں آپ کی پوری حفاظت کی جائے گی۔" جج نے اسے تسلی دی۔ اس نے جس طرح سے یہ اضافی سماعت کی تھی اور خود کوشش کرکے حقیقت تک پہنچا تھا، اس سے یہ واضح تھا کہ اب انصاف کی راہ میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور علی بھائی اور اس کے ساتھی اپنے انجام تک پہنچیں گے۔"

مطمئن اور شاداں افتخار احمد باہر آیا تو میڈیا اس کا منتظر تھا اور جب وہ درجنوں چینلز پر لائیو بتا رہا تھا کہ آج اس کے ساتھ کیا ہوا اور اس نے کیسے اس مشکل کا مقابلہ کیا تو لاکھوں افراد کے ساتھ ننھی دعا بھی اپنے باپ کو ٹی وی اسکرین پر دیکھ کر خوش ہورہی تھی۔

اسماقادری

قسط 49

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ شہریار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہریار اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا

ہے۔ ادھر ماریا کی ماں سنتھیا جوزف ورما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ شہریار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ اس کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہریار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں۔ شہریار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ شہریار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے طے ہوتا ہے کہ اس کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلائی جائے گی۔ شہریار، ماہ بانو اور اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ شہریار انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیویارک پہنچ جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہو جاتی ہے۔ ادھر شہریار کے کہنے پر ذیشان سی ایف پی کے نوجوان کو خواجہ سراؤں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے بھیجتا ہے۔ جاوید علی نامی سی ایف پی کا نوجوان خواجہ سراؤں میں شامل ہو کر کراچی نوازش علی نامی شخص کی کوٹھی میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں تمام ملازم خواجہ سرا تھے۔ وہاں جاوید علی کو پتا چلتا ہے کہ شائنی کسی چکر میں ملوث ہے۔ ادھر جاوید علی شازمین سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ نوازش علی کی کوٹھی پر آپریشن کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہاں موجود انتہا پسند کوٹھی کو بارودی مواد سے اڑا دیتے ہیں۔ جاوید علی شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جاتا ہے جبکہ نوازش علی زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں البتہ شازمین اور اس کی دونوں والدہ محفوظ رہتی ہیں۔ ادھر شہریار، ورما کے ٹھکانے پر پہنچ کر اسے قابو کرلیتا ہے۔ شازمین دارالامان پہنچ جاتی ہے۔ وہ جاوید علی سے ملنے کے لیے اسپتال جاتی ہے۔ راوالے شازمین کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں اور اسپتال سے واپسی میں اسے اغوا کرلیتے ہیں۔ سنتھیا، شازمین سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور کسی واضح صورت حال سے آگاہ نہ کرنے پر اس پر جنسی تشدد کا حربہ آزماتی ہے۔ پھر اس کو ..... مردہ سمجھ کر سنسان جگہ پھنکوا دیا جاتا ہے تاہم شازمین بچ جاتی ہے اور اسپتال میں طبی امداد کے بعد اس کی حالت بہتر ہو جاتی ہے مگر شازمین وہاں خودکشی کرلیتی ہے۔ مراد شاہ، کشور اور آفتاب کو کھانے پر گھر بلاتا ہے۔ وہاں اچانک واپسی پر اس کا کشور سے سامنا ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے پاگل ہو جاتا ہے مگر مراد شاہ، کشور کو چودھری سے بچاتا ہے۔ چودھری کشور اور آفتاب کو ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے آدمیوں کا سہارا لیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتے ہیں اور انہیں مارنے کی نیت سے آنے والے لوگ پکڑے جاتے ہیں۔ شہریار کو بھارت ایک اہم مشن پر بھیجنے کا فیصلہ ہوتا ہے جہاں سے اسے ڈاکٹر فرحان نامی شخص کو رہا کرانے کا مشن سونپا جاتا ہے۔ سلو کو سی ایف پی والے جیل سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ سلو کو شہریار کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ اسمگلروں کے ایک قافلے کے ساتھ غیر قانونی سرحد عبور کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ سلو اور شہریار دہلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ان کے مددگار ان کے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرتے ہیں۔ انہیں اب اپنی دستاویزات بنوانی تھیں۔ جاوید علی، رائے چند نامی ہندو کے خلاف کارروائی کرتا ہے جو سیمیرا کا ایجنٹ ہوتا ہے۔ ادھر سلو اور شہریار ایک ہوٹل میں کھانا کھانے جاتے ہیں۔ وہاں ایک لڑکی کی عزت بچانے میں ان کا جھگڑا اندر نامی بدمعاش سے ہو جاتا ہے۔ وہ وہاں سے نکل کر اپنے مددگاروں کے ذریعے ایک سرائے میں ٹھہر جاتے ہیں۔ جاوید علی، رائے چند سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ایک مساج سینٹر میں پہنچتا ہے۔ وہاں اسے عالیہ نامی عورت ملتی ہے جو سیمیرا کی ایجنٹ ہوتی ہے۔ جاوید علی کے ساتھی وہاں آپریشن کرتے ہیں اور اس عورت کو اٹھا لاتے ہیں۔ ادھر سلو اور شہریار کو گرفتار کرلیا جاتا ہے اور انہیں را کے ایک ٹھکانے پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ تاہم جب پوچھ گچھ کا وقت آتا ہے تو سلو اور شہریار اندر اور اس کے اہلکاروں پر قابو پالیتے ہیں اور انہیں مار کر وہاں سے نکلتے ہیں۔ وہاں متعدد افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ را کے ٹھکانے کو تباہ کر دیتے ہیں۔ شہریار اور سلو اپنے حلیے میں تبدیلی کرلیتے ہیں اور کلام نامی ایجنٹ سے ملاقات کرنے جاتے ہیں اور وہاں ایک مشکوک بندے کو پیچھا کرنے پر پکڑ کر تمیجی کے ایک علاقے میں واقع خالی گھر میں لے آتے ہیں۔ وہ شخص پولیس کا مخبر ہوتا ہے۔ اس لیے اسے ختم کر دیا جاتا ہے۔ کلام لاش ٹھکانے لگانے کے لیے انتظامات کرنے جاتا ہے مگر تھوڑی دیر میں وہاں پولیس پہنچ جاتی ہے۔ پولیس انڈر ورلڈ کے عبدالرحمٰن کی تلاش میں آتی ہے۔ تاہم وہ پولیس کے سامنے مشکوک ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔ پھر شہریار اور سلو پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالتے ہیں اور اسے اغوا کرلیتے ہیں لیکن ان کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے اور انہیں پریم ناتھ کو گاڑی میں چھوڑنا پڑ جاتا ہے اور وہ فرار ہو جاتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو چیک اپ کے لیے اسپتال جاتی ہے مگر واپس گھر نہیں پہنچتی۔ اسلم اپنے طور پر ماہ بانو کی تلاش کا کام کرتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ ماہ بانو اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ گئی ہے۔ ادھر شہریار، سلو کو بھائی جی کے آدمی گھیر لیتے ہیں تاہم عبدل سے واقفیت کی بنا پر انہیں رعایت دی جاتی ہے اور انہیں بھائی جی کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ بھائی جی ان کی مدد کرنے کا وعدہ کرتا ہے تاہم وہ چاہتا ہے کہ وہ لوگ اشوک کو قتل کر دیں۔ اسلم، ماہ بانو کا سراغ لگاتے لگاتے اس بات کا پتا لگا لیتا ہے کہ ماہ بانو کو جنگل میں کہیں رکھا گیا ہے۔ وہ جنگل میں نکل پڑتا ہے۔ تاریکی میں قدم اٹھاتے اٹھاتے وہ دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ وہاں اس کی مدد کرنے والا کوئی نہیں ہوتا اور دلدل اسے نگلنے والی ہوتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اس کی زندگی کے بہت سے ماہ و سال جنگل میں بیتے تھے۔ اسے جنگل سے کبھی خوف نہیں آیا تھا بلکہ وہ تو ایک طرح سے اس کا دوست تھا جس نے زندگی کے بدترین دور میں اسے پناہ دی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر جنگل کی زندگی نے ہی اسے ماہ بانو جیسی نعمت عطا کی تھی لیکن آئرلینڈ کا یہ جنگل ذرا مختلف تھا۔ سورج کی روشنی تک کو رسائی نہ دینے والی یہ زمین کسی انسان کے قدموں کو اپنے اوپر کیونکر برداشت کرسکتی تھی؟ وہ اسلم کو اس کی اس جرأت کی سزا دینے پر تل گئی تھی اور اس کے وجود کو نگل لینا چاہتی تھی۔ وہ جوں جوں اپنے پاؤں اس کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کررہا تھا، مزید دھنستا جارہا تھا لیکن وہ اس بات کے لیے قطعی آمادہ نہیں تھا کہ اس کا وجود اس دلدلی زمین میں گم ہو جائے اور اس کی ماہ بانو بے یارومددگار کسی ظالم تجربے کی بھینٹ چڑھ جائے۔ اسے اپنی ماہ بانو کو بچانا تھا تو زندہ رہنا تھا اور آخری لمحے تک زندگی کے لیے جدوجہد کرنی تھی۔

آدمی میں جدوجہد کا حوصلہ ہو تو عمل کی راہیں بھی نکل

جاتی ہیں۔ اس کے ہاتھ بھی امید کا ایک سرا آ گیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ، گھنے درخت کی بے حد جھکی ہوئی شاخ تھی جو عین اس کے سر پر لہرا رہی تھی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس نے اس نازک سی شاخ کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی چنچل دوشیزہ کی طرح کنی کاٹ گئی اور اس کے ہاتھ آئے بغیر ہوا کے جھونکے سے دور ہٹ گئی۔ وہ اتنے نازک لمحات سے گزر رہا تھا کہ اس کی اس ادا پر جھنجلا گیا لیکن اپنی نظر اس شاخ پر سے ہٹنے نہیں دی۔ شاخ بھی گویا اس سے اٹکھیلیاں کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ لہراتی ہوئی قریب آتی اور پھر ایک جھٹکے سے دور ہٹ جاتی۔ آخر کئی بار کی کوشش کے بعد اسلم اسے پکڑنے میں کامیاب ہو ہی گیا اور اس کے سہارے آہستہ آہستہ اپنے بدن کو دلدل کی گرفت سے آزاد کروا کر اوپر اٹھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے جوتوں میں مقید پیر آزاد ہو کر ہوا میں لہرانے لگے۔ اسی لمحے اسے شاخ کے ٹوٹنے کا احساس ہوا۔ اس نے خودکار ردِعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک نزدیکی شاخ کو پکڑ لیا اور یہی وہ لمحہ تھا جب پہلے والی شاخ ٹوٹ کر دلدل میں جا گری۔ اسلم کانپ کر رہ گیا اور دل کی گہرائی سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ بروقت اس شاخ کو چھوڑ چکا تھا ورنہ خود بھی اس کے ساتھ اسی دلدل میں جا گرتا۔

خوف اور شکرگزاری کے ان لمحات سے گزرنے کے بعد اس نے آگے کے سفر کا آغاز کیا اور ہاتھ میں تھمی شاخ کے سہارے اوپر اٹھنے لگا۔ لہراتی ہوئی اس شاخ کو پکڑ کر آگے کھسکتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ یہ بہت عجیب و غریب شاخ ہے جس میں نہ تو پھول پتے ہیں اور نہ ہی مزید ذیلی شاخیں، بس ایک گول اور کسی قدر پھسلواں ٹہنی ہے جس کے سہارے اوپر کھسکنے میں اسے خاصی جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے۔ ٹہنی کی نرماہٹ بھی اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ جنگل میں ایک عمر گزارنے کے باوجود اس نے کوئی ایسا درخت نہیں دیکھا تھا جس کی ساخت اتنی عجیب ہو۔ بس وہ یہی سوچ سکا کہ آئرلینڈ کے اس جنگل کے درخت، اس کے وطن کے درختوں سے مختلف ہیں اس لیے عجیب محسوس ہو رہا ہے۔ دن کا وقت ہونے کے باوجود وہاں روشنی اتنی کم تھی کہ اس کے لیے اس شاخ کا ڈھنگ سے جائزہ لینا ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ یہاں کے درختوں پر ریسرچ کرنے تو آیا نہیں تھا جو زیادہ غوروخوض کرتا بس جان بچا کر شاخ کے ذریعے موٹے تنے تک پہنچ گیا اور سکون کا سانس لیتے ہوئے ذرا دیر کے لیے آنکھیں موند لیں۔ اسی پل اسے اپنے نزدیک سرسراہٹ محسوس ہوئی تو پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ جس شاخ کو پکڑ کر وہ تنے تک پہنچا تھا، وہ سرسراتی ہوئی اوپر کی طرف سفر کررہی ہے۔ یکدم ہی اس پر انکشاف ہوا کہ وہ جسے شاخ سمجھ کر بڑے اطمینان سے اوپر چڑھنے کے لیے استعمال کرتا رہا تھا، وہ درحقیقت کوئی شاخ نہیں بلکہ جیتا جاگتا صحت مند اور طویل اژدہا تھا جو اپنی لمبی دم لٹکائے اس درخت پر محوِ استراحت تھا۔ اللہ کے اس کرشمے نے اسے گنگ کردیا۔ اژدہا جس کی دہشت ایسی ہوتی ہے کہ عام انسان اس کے قریب جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا، اس وقت اس کی زندگی کی ضمانت بن گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر تہِ دل سے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس یقین کے ساتھ دوبارہ ماہ بانو کی تلاش کے لیے کمربستہ ہو گیا کہ اللہ اس کام میں اس کی مدد کررہا ہے ورنہ خطرناک دلدل اور موذی جانور سے وہ کیونکر اتنی آسانی سے بچ نکلتا۔

☆☆☆

''کیا آپ نے اشوک کو قتل کرنے کے لیے اپنے ذہن کو آمادہ کرلیا ہے؟'' کلام کے اس سوال پر کمپیوٹر پر مصروف شہریار نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ بھائی جی کے ایک محفوظ ٹھکانے پر موجود تھے جہاں انہیں ہر طرح کی سہولت اور آرام میسر تھا اور عملاً وہ وہاں فارغ بیٹھے مکھیاں مار رہے تھے۔

''سچ پوچھو تو نہیں۔ میرے لیے انسانی جان کو ختم کرنا کبھی بھی آسان کام نہیں رہا ہے۔ وطن دشمنوں سے نمٹنا اور انہیں ان کے انجام تک پہنچانا الگ بات ہے لیکن جس طرح بھائی جی نے مجھ سے مطالبہ کیا ہے، مجھے خود پر کسی کرائے کے قاتل کا گمان ہو رہا ہے۔'' کچھ دیر خاموشی سے کلام کا چہرہ دیکھنے کے بعد اس نے اپنے احساسات کا اظہار کیا۔

''میں خود بھی ایسا ہی کچھ محسوس کررہا ہوں لیکن ہمارے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔ ہم عملاً مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ بھائی جی کو ناراض کرکے اس ٹھکانے سے نہیں نکل سکتے اور نکل گئے تو پولیس اور خفیہ ایجنسیاں ہمیں نہیں چھوڑیں گی۔'' کلام نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''جب تم لوگ جانتے ہو کہ ہمارے پاس بھائی جی کی شرط ماننے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے تو اس بحث کی کیا تُک ہے؟ اشوک کون سا کوئی نیک اور عوام دوست آدمی ہے جو اس کی جان لینے پر آدمی شرمندگی محسوس کرے۔ وہ مرے گا تو اللہ کی مخلوق کو تھوڑا سکھ ہی محسوس ہوگا کہ زمین پر سے ایک شیطان کا وجود کم ہوا۔ تم دونوں کچھ مت کرنا، میں اس کا کام

تمام کردوں گا۔ چھٹانک بھر کی گولی دل میں اتار کر آدمی کی سانسیں بند کرنے میں محنت ہی کیا لگتی ہے۔ خاص طور پر اشوک جیسے بدذات کو تو میں بڑے شوق سے اوپر پہنچاؤں گا۔'' ان دونوں سے ذرا فاصلے پر نرم و دبیز قالین پر تکیوں کے سہارے نیم دراز سلو نے اپنے موبائل پر کوئی گیم کھیلتے ہوئے اچانک ہی ان کی گفتگو میں مداخلت کی اور مسئلہ ہی ختم کردیا۔

اس کے اسس انداز پر شہر یار اور کلام اسے دیکھتے ہی رہ گئے لیکن اب وہ ان سے بے نیاز ایک بار پھر پورے انہماک سے گیم کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اس کے اس انداز پر بے ساختہ ہی شہر یار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بظاہر لاابالی نظر آنے والا یہ نوجوان ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے دل میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات بڑھاتا جارہا تھا کیونکہ اتنے دن کے ساتھ نے اس پر واضح کردیا تھا کہ وہ اتنا بے نیاز ہے نہیں جتنا خود کو ظاہر کرتا ہے۔ حقیقتاً وہ ایک ذہین، چابک دست اور حساس شخص تھا جس نے اپنے آپ پر بے نیازی کا خول چڑھا رکھا تھا۔ اس خول کے نیچے سے جھانکتی اس کی نرم اور حساس فطرت شہر یار کو بہت پیاری لگتی تھی اور اس نے سوچ لیا تھا کہ ان بکھیڑوں سے نمٹنے کے بعد جب وہ وطن واپس جائیں گے تو وہ اس کے لیے اچھی زندگی کے انتظام کے لیے بھرپور کوشش کرے گا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ سی ایف پی میں اس کی شمولیت کے لیے سفارش کردیتا۔ بہرحال، ابھی وہ وقت دور تھا اور انہیں حال کے مسائل سے نمٹنا تھا۔

''کھانا تیار ہے جناب... آپ لوگ ڈائننگ روم میں آجائیں۔ وہاں عبدل بھائی کھانے پر آپ کا انتظار کررہے ہیں۔'' وہ جانے کتنی دیر تک سلو کے بارے میں سوچتا کہ ملازم کی مداخلت نے اسے واپس کمرے کے ماحول میں کھینچ لیا۔

''ٹھیک ہے، تم چلو ہم آرہے ہیں۔'' اس نے ملازم کو جواب دیا اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔ سلو اور کلام نے بھی اس کی تقلید کی۔ کچھ دیر میں ہی وہ تینوں ڈائننگ روم میں موجود تھے جہاں عبدالرحمان ان کا منتظر تھا۔

''پہلے کھانا کھالیتے ہیں پھر کام کی بات کریں گے۔'' رسمی علیک سلیک کے بعد عبدالرحمان نے ان سے کہا تو وہ لوگ کھانے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ کھانا بڑے طریقے کا تھا۔ چکن کڑھائی، آلو مٹر کی بھجیا، ارہر کی دال، بگھارے چاول اور گرما گرم روٹیوں کے علاوہ سلاد، اچار اور رائتے کا بھی اہتمام تھا۔ ایسے متنوع دستر خوان سے ہر مزاج کا بندہ اپنا پیٹ بھر سکتا تھا۔ ان تینوں نے بھی اپنی اپنی پسند کے مطابق پلیٹوں میں کھانا نکالا اور کھانے میں مصروف ہوگئے۔ تمکین کے بعد میٹھے کا دور چلا اور پھر عبدالرحمان ملازم کو چائے پہنچانے کا حکم دیتا ہوا ان تینوں کو لے کر واپس اسی کمرے میں آگیا جہاں وہ کھانے سے قبل بیٹھے ہوئے تھے۔

''بڑے کام کی خبر لایا ہوں تم لوگوں کے لیے۔ دل خوش ہوجائے گا تمہارا۔'' کمرے میں داخل ہوکر اس نے بڑے شوق سے انہیں بتایا۔

''کام کی خبر ہے تو بتانے میں دیر کیسی... فوراً سنا ڈالو۔'' اس کی بات کا شہر یار نے جواب دیا۔

''سنانے سے زیادہ خبر دکھانے کی ہے۔'' وہ کمپیوٹر کے ساتھ جا بیٹھا اور اپنے بائیں ہاتھ میں موجود چمڑے کے بڑے سے پرس سے ایک سی ڈی باہر نکال کر لگانے لگا۔ وہ تینوں اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ چند لمحوں بعد مانیٹر کی اسکرین پر متحرک تصویریں نظر آنے لگیں۔ ان تصویروں میں اشوک کا چہرہ ان کے لیے آشنا تھا لیکن ایک چہرے کے گرد بنے سرکل نے انہیں بتادیا کہ عبدالرحمان انہیں کس کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ تیزی سے بدلتے مناظر میں ہر بار اسی چہرے کے گرد موجود سرکل نے مزید تصدیق کردی کہ اصل اہمیت اسی کی ہے۔

یہ مختلف مواقع پر تیار کی گئی ویڈیوز تھیں جنہیں خاص طور پر اسی مقصد کے لیے یکجا کردیا گیا تھا۔ یہ ویڈیو صرف متحرک تصویروں پر مشتمل تھی۔ اس میں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور مانیٹر کی اسکرین پر متحرک مناظر میں وہ اس آدمی کو مختلف مواقع پر اشوک کے ساتھ دیکھ سکتے تھے۔ کہیں وہ اشوک سے ہاتھ ملا رہا تھا، کہیں اس کے ساتھ کسی دفتر نما کمرے میں بیٹھا تھا۔ کسی جگہ اوپن ائر ریسٹورنٹ میں بیٹھے وہ دونوں شراب نوشی سے لطف اٹھا رہے تھے۔ دو تین جگہ انہوں نے پریم ناتھ کو بھی اس کے ساتھ دیکھا۔ اس ویڈیو میں اس کا انداز نشست و برخاست بالکل ویسا ہی محسوس ہوا جیسا کسی بادشاہ کے دربار میں خوشامد سے اپنا کام نکالنے والے مصاحب کا ہوتا ہے۔

''یہ ارجن اگروال ہے۔ را کا ایک سینئر افسر لیکن ظاہر میں دنیا اس کو ایک بڑے بزنس مین کی حیثیت سے جانتی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس بات سے واقف ہیں کہ بزنس تو محض ایک آڑ ہے ورنہ یہ بندہ را کے مقاصد کے حصول کے لیے کام کرتا ہے۔ آئے دن اس کی سیکریٹریز بدلتی رہتی ہیں اور ہر دوسری سے بڑھ کر خوب صورت اور طرح دار ہوتی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان حسین عورتوں کی مدد سے ارجن بڑے بڑے بزنس مینوں اور سرکاری افسران کی جاسوسی کا کام لیتا ہے اور کئی افراد کو حاصل ہونے والی معلومات کے بل پر را کی طرف سے بلیک میل کیا جاتا ہے۔'' وہ تینوں غور سے ویڈیو دیکھ رہے تھے اور عبدالرحمان انہیں بتاتا جارہا تھا۔

''ارجن کے بارے میں ہمارے پاس جو معلومات موجود ہیں ان کے مطابق یہ بے حد سوشل آدمی ہے جس کے کاروباری حلقے سے لے کر سیاست دانوں، سرکاری افسران، فلم نگری کے ستاروں اور یہاں تک کے جرم کی دنیا میں بھی گہرے روابط ہیں۔ ثبوت تم لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی رہے ہو۔ خاص بات یہ ہے کہ ہم نے یہ ساری معلومات پریم ناتھ کی زندگی کو کھنگالتے ہوئے حاصل کی ہیں ورنہ ہم براہِ راست اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے۔ پریم ناتھ اور ارجن اگروال دونوں کا تعلق ایک ہی جگہ سے ہے۔ دونوں نے ہی ابتدائی تعلیم ایک ہی اسکول سے حاصل کی ہے لیکن ارجن، پریم ناتھ کے مقابلے میں بے حد ذہین اور ہوشیار طالبِ علم تھا۔ قسمت کی مہربانی سے اس کا پتا بہتر روزگار کے چکر میں اپنے گاؤں سے ممبئی پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر سے اپنی ذہانت اور چالاکی کو استعمال کرنے کا خوب موقع ملا۔ بہت سے مراحل طے کرکے یہ نہ صرف را میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوگیا بلکہ ممبئی کے ایک بڑے بزنس مین کی اکلوتی بیٹی کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر اس سے شادی بھی رچا ڈالی۔ بیاہ کے وقت چاہے لڑکی کا باپ خوش نہ ہو لیکن بعد میں جوائی نے ایسی ہوشیاری سے ایک اور ایک گیارہ بنائے کہ سسر بھی دنگ رہ گیا اور تسلیم کرلیا کہ ارجن ہی اس کا اکلوتا جوائی بننے کا صحیح حق دار تھا۔ اب سسر تو زندہ نہیں ہے لیکن یہ اس کی دولت پر راج کرتا پھر رہا ہے۔ جن دنوں پاکستان سے ڈاکٹر فرحان جمیل آیا اور اپنے رشتے داروں کی سازش کی وجہ سے پریم ناتھ کے ہتھے چڑھا، ان ہی دنوں ارجن بھی اپنی اکلوتی ماسی کے کریا کرم میں شریک ہونے اپنے آبائی گاؤں پہنچا ہوا تھا۔ پرانی دوستی اور تعلق کی بنیاد پر پریم ناتھ نے بھی اس سے ملاقات کی۔

''اس ملاقات کے بعد ہم اندازے ہی لگا سکتے ہیں کہ پریم ناتھ نے پرانی دوستی کی وجہ سے یا پھر ارجن کی اونچی حیثیت دیکھ کر اپنے آپ کو بھی اونچا ظاہر کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کا معاملہ اس کے سامنے بیان کردیا اور اس کے بعد سارے معاملات پریم ناتھ کے ہاتھ سے نکل کر اس کے ہاتھ میں چلے گئے۔ ڈاکٹر فرحان کو را کی کسٹڈی میں پہنچانے کے ساتھ ہی اس نے پرانے دوست پر بھی مہربانی کی اور.... ترقی دلوا کر ایک چھوٹے سے گاؤں سے ممبئی میں لا بٹھایا۔ پریم ناتھ کے اشوک سے تعلقات دیکھتے ہوئے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ارجن نے دوست پر جو احسان کیا، اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس کے نئے لیکن ہم پلہ دوست اشوک کو پولیس کی بھرپور مدد مل جائے اور حالات بتاتے ہیں کہ واقعی پریم ناتھ اشوک کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔''

عبدالرحمان نے اپنی بات ختم کی تو وہ تینوں یہ جان چکے تھے کہ وہ پریم ناتھ کو اغوا کرکے اس کے ذریعے را کے جس افسر تک پہنچنا چاہتے تھے، اس تک بھائی جی نے اپنے وعدے کے مطابق بیٹھے بیٹھے ہی انہیں پہنچا دیا تھا۔

''کیا تمہارے لیے اس خبر کی اہمیت نہیں ہے؟'' اپنی بات ختم کرکے عبدالرحمان نے کچھ دیر شہر یار کے تبصرے کا انتظار کیا لیکن اس کی طرف سے مکمل خاموشی پاکر آخر کار خود ہی پوچھ بیٹھا۔

''اہمیت کیوں نہیں ہے؟ تم نے ہمارا ایک بہت بڑا کام کر ڈالا ہے لیکن اب یہ بتاؤ کہ اس تک رسائی کیسے ممکن ہوگی؟ ہم ارجن تک پہنچیں گے تب ہی تو ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کوئی سن گن ملے گی۔'' وہ جیسے کسی گہرے خیال سے باہر نکل کر بولا۔

''اس کی سیکیورٹی بہت سخت ہے۔ اس نے نجی گارڈ بھی رکھے ہوئے ہیں اور ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سب نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ ہیں۔ تمہیں ارجن تک پہنچنے کے لیے بڑی نفری کے ساتھ پہلے اس کے گارڈز سے نمٹنا ہوگا۔ میں نے اپنے آدمیوں میں سے ایسے افراد کی لسٹ بنالی ہے جو ہمارے گروپ سے تعلق رکھنے کی شہرت نہیں رکھتے۔ تم جب بھی ارجن سے نمٹنے جاؤ گے ہمارے آدمی تمہاری مدد کے لیے جدید اسلحے کے ساتھ تیار ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں نکلے گا جو تمہیں چھوڑ کر بھاگنے کا سوچ سکے۔'' ان کے پاس آنے سے پہلے وہ اپنا سارا ہوم ورک کرکے آیا تھا۔

''تھینک یو عبدالرحمان... ہمیں صرف اسلحے اور سواری کی ضرورت ہے۔ میں اپنے ساتھ زیادہ بھیڑ بھاڑ لے جاکر دشمن کو ہوشیار نہیں کرنا چاہتا۔''

''ٹھیک ہے، تمہیں جو چاہیے اس کی لسٹ بنا دو۔ تمہیں وقت پر سب مل جائے گا۔ آدمی بھی اسٹینڈ بائی رہیں گے۔ اگر تم چاہو تو ان میں سے کسی کا اپنی مدد کے لیے انتخاب

کر سکتے ہو۔'' اس نے اپنی پیش کش پر زیادہ اصرار نہیں کیا اور جانے کے ارادے سے جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اسے پہچانتے ہو عبدالرحمان؟ ذرا اس کے بارے میں معلوم کرو کہ یہ اشوک کے ساتھ کیوں نظر آرہا ہے؟'' اسے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کرکے شہریار نے ختم ہو جانے والی سی ڈی کو پھر پلے کیا اور اشوک کے ساتھ اس کے دائیں جانب کھڑے ایک صحت مند اور ادھیڑ عمر آدمی کو پوائنٹ آؤٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، اپن کو یہ کوئی باہر کا آدمی معلوم پڑتا ہے لیکن آپ کہتے ہو تو اس کا پورا بایو ڈیٹا معلوم کر لیتے ہیں۔'' عبدل نے پہلے نفی میں گردن ہلائی پھر ساتھ ہی پیشکش بھی کر ڈالی۔

''تم صرف یہ معلوم کرو کہ اشوک کے ساتھ کیوں نظر آرہا ہے؟'' شہریار نے مانیٹر کی اسکرین پر نظر جمائے ہوئے اسے جواب دیا۔ اس کے ساتھ موجود سلو اور کلام نے بھی اس تصویر کو غور سے دیکھا تھا لیکن تمام تر کوشش کے باوجود وہ اس شخص کو پہچان نہیں سکے تھے۔

☆☆☆

''چائے۔'' جاوید علی اپنے بستر پر نیم دراز کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز ابھری اور اس کی طرف سے اجازت ملنے پر عالیہ ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے تھامے اندر داخل ہوئی۔ ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے ہوئے تھے جن میں ایک اس نے جاوید علی کو پیش کیا اور خود اپنا کپ لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تھینک یو... میرا اس وقت چائے پینے کا بہت دل چاہ رہا تھا لیکن خود اٹھ کر بنانے کا موڈ نہیں تھا اور امی کو بے آرام کرنا مناسب نہیں لگا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے عالیہ سے کہا اور کپ لبوں سے لگا کر ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔

''زبردست، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی اچھی چائے بنا لیتی ہوگی۔'' پہلے گھونٹ پر اس نے بے ساختہ تعریف کی۔

''شاید اسی خطرے کی وجہ سے تم نے مجھ سے چائے کی فرمائش نہیں کی تھی ورنہ یہ چھوٹا سا کام تو میں بھی کر سکتی تھی۔'' عالیہ کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔ جاوید علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آسمانی رنگ کے شلوار قمیص پر گلابی اور آسمانی رنگ کے امتزاج کا دوپٹا اوڑھے وہ پہلے کے مقابلے میں بہت نکھری ہوئی لگ رہی تھی اور کھوجنے پر بھی اس کے چہرے پر وہ تیزی اور مکاری نظر نہیں آتی تھی جو دیا مساج سینٹر میں اس سے پہلی ملاقات کے موقع پر نظر آئی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ سی ایف پی کے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر ہی تبدیل ہونا شروع ہو گئی تھی لیکن یہاں آکر تو اس کی کایا پلٹ گئی تھی۔ جاوید علی نے کل اسے امی کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ دن بھر وہ زیادہ تر ان کے ساتھ ہی لگی رہتی تھی اور اسے دیکھ کر صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ یہاں آکر بہت خوش ہے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' عالیہ نے اسے ٹوکا تو وہ اپنے خیالات سے باہر آیا۔

''کچھ نہیں، بس غور کر رہا تھا کہ تم نے اتنی معمولی سی بات کو کس انداز میں لے لیا۔ میں نے تو صرف اس لیے تمہیں چائے کے لیے نہیں کہا تھا کہ تم دن بھر امی کے ساتھ لگی رہی تھیں، کہیں تھک نہ گئی ہو۔ ویسے بھی میں خود اتنی بری چائے بناتا ہوں کہ میرے ساتھی کہتے ہیں کہ جو جاوید کے ہاتھ کی چائے پی سکتا ہے وہ دنیا میں کسی کے بھی ہاتھ کی چائے پی سکتا ہے۔'' اپنے عمل کی وضاحت دیتے ہوئے وہ آخر میں نیم مزاحیہ لہجے میں بولا تو وہ ہنس دی اور سادگی سے استفسار کیا۔

''کیا سچ مچ تم اتنی بری چائے بناتے ہو؟''

''کہو تو کسی دن تمہیں بنا کر پلا دوں گا۔'' اس نے یوں جواب دیا جیسے چائے پلانے کی پیشکش نہ کر رہا ہو، کوئی دھمکی دے رہا ہو۔

''نہ بابا... میں ایسا خطرہ مول لینے کے بجائے ہر بار خود ہی چائے بنانا پسند کروں گی۔'' وہ خوش گوار موڈ میں تھی چنانچہ ہنس کر جواب دیا۔ ہنستے ہوئے اس کے دائیں رخسار پر ڈمپل پڑتا تھا جس نے جاوید علی کو شازمین کی یاد دلا دی حالانکہ اس ڈمپل کے علاوہ عالیہ میں کوئی ایک بات بھی شازمین والی نہیں تھی۔ شازمین تو کسی نوخیز کلی کی طرح اتنی حسین تھی کہ نظر اس پر پڑ کر ہٹنا بھول جائے جبکہ عالیہ اس کے مقابلے میں پختہ عمر کی ایک ایسی لڑکی تھی جس نے اپنے آپ کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا ورنہ وہ اتنی خوب صورت نہیں تھی۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس گھر کو اپنا سمجھا اور خود کو یہاں ایسے ایڈجسٹ کر لیا جیسے ہمیشہ سے ہی یہاں رہتی آئی ہو۔'' اپنے ذہن میں ابھرنے والے خیال کو جھٹکتا ہوا وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ تو کچھ نہیں ہے۔ تم دیکھنا کہ بہت جلد میں آنٹی سے سب کچھ سیکھ لوں گی اور جب تم کبھی فرصت ملنے پر یہاں آؤ گے تو میں تمہیں بریانی، نرگسی کوفتے، نہاری سب پکا کر کھلاؤں گی۔'' اس نے جاوید علی کی پسندیدہ ڈشز کے نام گنواتے ہوئے دعویٰ کیا۔

''ضرور، یہ تو اچھی بات ہے کہ تم اچھی لڑکیوں کی طرح

امورِ خانہ داری کی تربیت حاصل کرو لیکن میرا تمہیں مشورہ ہے کہ صرف ان کاموں میں ہی کھپ کر نہ رہ جاؤ۔ تم ذہین اور باصلاحیت ہو۔ کوشش کرو کہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر سکو۔ مزید تعلیم سے لے کر کسی بھی قسم کے کورسز تک میں ہر معاملے میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔ بس ایک بار تم میرے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر دینا۔'' جاوید علی نے خلوصِ دل سے اسے پیشکش کی۔

''تھینک یو، میں تمہاری اس آفر کو یاد رکھوں گی لیکن فی الحال میں کچھ عرصہ ایسے ہی گزارنا چاہتی ہوں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے ایک عام عورت کی طرح وقت گزارنے کا موقع ملا ہے اور یقین کرو مجھے بہت مزہ آرہا ہے۔'' اس کے چہرے پر داخلی خوشی کے رنگ تھے۔

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔'' جاوید علی نے بحث نہیں کی اور خالی کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک بار پھر تعریف کی۔ ''چائے سچ مچ بہت مزے کی تھی اور میں امید کر سکتا ہوں کہ جب تم کھانا پکانا سیکھ لوگی تو وہ بھی ایسا ہی مزے دار ہوگا۔''

''انشاء اللہ۔'' عالیہ نے مسکراتے ہوئے بے ساختہ کہا اور پھر خالی کپوں کو ٹرے میں رکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے جاتا دیکھ کر جاوید علی نے ایک بار پھر زیرِ مطالعہ کتاب ہاتھ میں لے لی جس پر عالیہ نے اسے ٹوکا۔

''تمہیں آرام کے لیے چھٹیاں دی گئی ہیں لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تم آرام بالکل نہیں کر رہے۔ رات کو بھی دیر تک تمہارے کمرے کی لائٹ آن رہتی ہے۔''

''میں بالکل فٹ ہوں یار اور اب مجھے مزید آرام کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ سلمان کی طرف سے اشارہ ملتے ہی واپس اپنی ڈیوٹی پر چلا جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔ مجھے معلوم ہے کہ کوئی کچھ بھی کہے، تم وہی کرو گے جو تمہارا دل چاہے گا۔'' کچھ خفگی سے کہتی ہوئی وہ کمرے سے باہر نکل گئی تو جاوید علی مسکرانے لگا اور پھر دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اسے ایک طرف رکھ کر سائڈ ٹیبل پر رکھا اپنا سیل فون اٹھا لیا۔ اس کی ذہنی رو یکدم ہی بدل گئی تھی اور اب وہ سلمان سے رابطہ کرکے موجودہ صورتِ حال جاننے کا خواہش مند تھا۔ را سے تعلق رکھنے والے موہن نے جس بنگلے کی نشان دہی کی تھی، اس کی مسلسل نگرانی کی جارہی تھی جس کے نتیجے میں وہ لوگ اس بات پر پُریقین ہو چکے تھے کہ اس بنگلے میں واقعی کچھ مشکوک افراد رہائش پذیر ہیں تاہم ٹھوس ثبوت کے بغیر وہ لوگ کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہ رہے تھے اور مناسب وقت کے انتظار میں تھے۔

''ہاں جاوید، اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' سلمان کا نمبر ملانے پر اس کی طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی اور اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔

''میں بالکل فرسٹ کلاس فٹ ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ آج کی کیا خبریں ہیں... آج پورا دن تم نے مجھے کال ہی نہیں کی؟'' اسے اپنی خیریت سے آگاہ کرنے کے ساتھ اس نے شکوہ بھی کیا۔

''سوری یار، آج مصروفیت ذرا زیادہ ہی رہی۔ میں نے سوچا کہ پہلے سارے کام نمٹا لوں پھر تمہیں فون کرکے کوئی اچھی خبر سناؤں گا۔'' سلمان کے انداز میں دبا دبا جوش تھا جس نے جاوید علی کو چونکا دیا۔

''کیا مطلب، کوئی خاص بات؟''

''ہاں یار، بہت خاص بات ہے۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ ہم اس بنگلے کی بیرونی نگرانی کرنے کے ساتھ ساتھ اندر کے حالات جاننے کے لیے بھی کوششوں میں لگے ہوئے تھے لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے کیونکہ ٹیلی فون پر وہ لوگ کھل کر کوئی بات کرتے ہی نہیں تھے اور ہم انہیں نگرانی کا احساس نہ ہونے دینے کے لیے بہت محتاط تھے۔ یہاں تک کہ نگرانی کرنے والے بھی بنگلے سے بہت دور رہ کر ٹیلی اسکوپ کے ذریعے نگرانی کر رہے ہیں۔ ایسے میں کسی ایسی ڈیوائس کو جس کے ذریعے اندر کے حالات معلوم ہو سکیں، بنگلے کے اندر پہنچانا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ پھر شفیع کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس کے پاس چھوٹی نسل کا ایک بہت خوب صورت کتا ہے جو خاصا ذہین بھی ہے۔ ہم نے اس کتے کے گلے میں ڈلے پٹے میں ایک بہت چھوٹی سی ڈیوائس اٹیچ کرکے اسے بنگلے کی طرف بھیج دیا۔ وہ کتا اتنا خوب صورت ہے کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی اسے نقصان پہنچانے کا سوچے۔

''بنگلے کے گارڈز نے بھی اسے اندر جانے سے نہیں روکا اور ہماری خوش قسمتی کہ وہاں موجود افراد کو وہ کتا اتنا پسند آیا کہ انہوں نے اسے اس کے مالک تک پہنچانے کی کوشش کرنے کے بجائے وہیں روک لیا۔ اب وہ وہاں بنگلے میں موجود ہے اور ہمیں اندر کے حالات کی سن گن مل رہی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ آج رات اس بنگلے میں کوئی اہم میٹنگ ہونے والی ہے اور اس میٹنگ میں بڑے اہم لوگ شرکت کریں گے۔'' سلمان نے

تفصیل کے ساتھ اسے ساری بات بتائی تو وہ بھی جوش میں بھر گیا۔

”یہ تو ہمیں بڑا گولڈن چانس ملا ہے۔ اگر آج رات ہم وہاں بھرپور کارروائی کریں تو بڑی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ میں تمہارے پاس پہنچتا ہوں پھر ساتھ بیٹھ کر کارروائی کے لیے پلاننگ کرتے ہیں۔ اس دوران میں تم اپنے طور پر جو انتظامات کرنا چاہو کرتے رہو۔“

”لیکن یار تم زخمی ہو۔ تمہیں چاہیے کہ آرام کرو۔ ہم لوگ انشاء اللہ سب سنبھال لیں گے۔“ سلمان نے اسے روکنا چاہا۔

”نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ زخم بھر چکے ہیں اور میں کسی بھی کارروائی کے لیے خود کو بالکل فٹ محسوس کر رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے آجاؤ۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے جیسا ضدی آدمی میرے روکنے سے رکے گا تھوڑی۔“ اس کا جواب سن کر سلمان نے ہتھیار ڈالنے والے انداز میں کہا تو وہ سلسلہ منقطع کر کے روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ گھر سے روانہ ہو چکا تھا۔ اپنی روانگی کی اطلاع دینے کے لیے اس نے ایک کاغذ پر پیغام لکھ کر ٹیبل کلاک کے نیچے رکھ دیا تھا۔ یہ اس کا ہمیشہ کا معمول تھا کہ جب کبھی ایمرجنسی میں روانہ ہونا پڑتا، ماں کے آرام میں خلل نہیں ڈالتا اور اسی طرح خاموشی سے پیغام لکھ کر روانہ ہو جاتا۔ بعد میں فون پر ان سے رابطہ کر کے انہیں تسلی بھی دے دیتا کہ بخیر و عافیت اپنی منزل پر پہنچ چکا ہے۔ شروع شروع میں تو وہ اس کے اس طرز عمل پر ناراض ہوتی تھیں لیکن اب انہوں نے صبر کر لیا تھا اور سمجھ گئی تھیں کہ بیٹے کی رگوں میں دوڑتا شہید باپ کا لہو اسے وطن کی محبت سے زیادہ کسی محبت میں مبتلا نہیں ہونے دے گا اور جب وطن کو اس کی ضرورت ہوگی، وہ یونہی سب کچھ بھلا کر دوڑا جائے گا۔

☆☆☆

”پتا نہیں بے چاری ماہ بانو کہاں ہوگی؟ پولیس تو اس معاملے میں انٹرسٹ ہی نہیں لے رہی اور وہ سارجنٹ مورس الٹا یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے کسی آشنا کے ساتھ گئی ہے۔ کم از کم میرے لیے تو یہ ایک بالکل ناقابلِ یقین بات ہے۔ وہ ایسی لڑکی ہے ہی نہیں اور اب تو ماں بھی بننے والی ہے۔ دنیا کی ہر ماں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اپنی اولاد کے بارے میں سوچتی ہے تو ماہ بانو جیسی لڑکی کیسے نہیں سوچے گی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ جہاں بھی گئی ہے، اپنی مرضی سے نہیں گئی اور کسی مشکل کا شکار ہے۔“ چمچے کی مدد سے امید کو دلیا کھلاتی کشور نے افسردہ لہجے میں آفتاب کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ دونوں میاں بیوی مصطفیٰ خان کی واپسی کے بعد اپنے گھر لوٹ آئے تھے اور کسی نہ کسی طرح اپنے روزانہ کے معمولات کا آغاز کر دیا تھا لیکن دل و دماغ پیش آنے والے حادثے کے اثر سے متاثر تھے۔

”اس بات پر تو ہم سب متفق ہیں کہ ماہ بانو اپنی مرضی سے کہیں نہیں گئی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پولیس کے عدم تعاون کے بعد ہم کس سے مدد کی توقع رکھیں۔ میں اس معاملے پر کافی سوچ بچار کرتا رہا ہوں اور میرے ذہن میں بس یہی ایک ترکیب آئی ہے کہ میں نیویارک کے جس اخبار کے لیے کالم لکھ رہا ہوں وہاں کی انتظامیہ سے بات کروں۔ جب الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے پولیس پر تنقید کی جائے گی اور ان کی کارکردگی پر سوالات اٹھائے جائیں گے تو پولیس کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ دوسری امید مجھے مصطفیٰ خان سے ہے۔ وہ ایک باحیثیت آدمی ہے جس کے تعلقات بھی خاصے وسیع ہیں۔ وہ اگر بھرپور طریقے سے کوشش کرے تو کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جائے گا۔“

”کوشش تو وہ ضرور کریں گے۔ اس سلسلے میں تو ان پر بلقیس بھابی کا بھی خاصا دباؤ رہے گا۔ وہ ماہ بانو کے غائب ہونے پر بہت شرمندہ ہیں اور ہر وقت اس بات پر پچھتاتی رہتی ہیں کہ اس روز وہ اسے کلینک پر چھوڑ کر شاپنگ کے لیے گئی ہی کیوں؟“ اس نے امید کے منہ میں دلیے کا ایک اور چمچہ ڈالا اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”ان کا پچھتاوا اپنی جگہ لیکن مجھے سب سے زیادہ فکر اسلم کی ہے۔ اس کی ذہنی حالت بالکل بھی نارمل نہیں ہے اور جوش میں وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ کشور نے اس سے اتفاق کیا۔ ”وہ جنون کی حد تک ماہ بانو سے محبت کرتا ہے اور اس کے بغیر جی نہیں سکتا۔ میرے دل میں تو کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ کہیں جنون میں وہ خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے۔ اس طرح کے حالات میں تو بہت زیادہ حساس لوگ ذہنی توازن بھی کھو بیٹھتے ہیں اور جان لینے اور دینے پر تل جاتے ہیں۔“

”نہیں خیر، وہ ایسی کوئی حماقت نہیں کرے گا کیونکہ اسے اس بات پر پختہ یقین ہے کہ اس کی بیوی اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتی۔“ آفتاب نے اس سے اختلاف کیا اور

ہاتھ بڑھا کر پھرتی سے دلیے کا پیالا امید کی پہنچ سے دور کر دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو امید ہاتھ مار کر پیالے کو الٹ دیتی۔ اب وہ ایسی ہی چھوٹی موٹی شرارتیں کرنے لگی تھی جن کے باعث کشور کے کام میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اگرچہ کشور ماتھے پر شکن لائے بغیر خندہ پیشانی سے تمام گھریلو امور انجام دیا کرتی تھی پھر بھی اسے اس بات کا احساس رہتا تھا کہ نازو نعم میں پلی اس کی بیوی کو اس کے ساتھ رہ کر بڑی سخت زندگی گزارنی پڑ رہی ہے۔

”بچی بہت شریر ہوتی جا رہی ہے۔ کھانے پینے میں بھی تنگ کرنے لگی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا کہ زبردستی دلیا کھلانے کی کوشش میں میڈم کا منہ کتنا گندا ہو گیا ہے۔“ بچی کے گال پر پیار سے ہلکی سی چٹکی نوچتے ہوئے کشور نے آفتاب کو بتایا۔ اس کے بعد دونوں میاں بیوی کے درمیان موضوع گفتگو خود ہی تبدیل ہو گیا اور وہ اسلم اور ماہ بانو کو چھوڑ کر اپنی بچی کی چھوٹی چھوٹی باتیں اور شرارتیں آپس میں ڈسکس کرنے لگے۔ اس دوران میں کشور نے اسے دلیا کھلانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ شیشے کے چھوٹے سے باؤل میں موجود دلیا ختم ہو گیا تو وہ اسے اٹھا کر منہ دھلانے لے گئی۔ منہ دھلانے کے بعد وہ تولیے سے بچی کا منہ خشک کر رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے پلٹ کر کمرے کی طرف دیکھا تو آفتاب لکھنے میں مصروف ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ عام لکھنے والوں کی طرح نازک مزاج نہیں تھا اور لکھنے کے دوران پیدا ہونے والے کسی خلل کی وجہ سے ناراضی کا اظہار نہیں کرتا تھا، اس کے باوجود کشور کی کوشش ہوتی تھی کہ کام کے دوران وہ ڈسٹرب نہ ہو کیونکہ بہرحال اسے اپنے کام کے لیے ذہنی یکسوئی درکار تھی اور ڈسٹرب ہونے کی صورت میں کام کی رفتار میں فرق پڑتا تھا۔ اس وقت بھی وہ آفتاب کا خیال کرتی ہوئی جلدی سے تولیا واپس اسٹینڈ پر لٹکا کر بچی کو گود میں لیے ہوئے فون کی طرف لپکی اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

”کیسی ہو کشور؟“ اپنی ”ہیلو“ کے جواب میں سنائی دینے والی آواز نے اس کے پورے جسم کو سن کر دیا اور وہ اس قابل بھی نہیں رہی کہ زبان ہلا کر کیے جانے والے سوال کا جواب دے سکے۔

”کیا بات ہے گڑیا! تم نے اپنے بھائی کی آواز پہچانی نہیں یا گھبرا گئی ہو؟“ وہ سو فیصد مراد شاہ تھا اور اسے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے کسی تصدیق یا ثبوت کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ اپنے فون پر اس کی آواز سن کر خوف زدہ ہو گئی تھی۔ نیویارک سے آئرلینڈ منتقل ہوتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر مراد شاہ کو کچھ نہیں بتایا تھا کیونکہ وہ خوف زدہ تھی۔ اسے نیویارک کے فلیٹ میں بیتی اپنی زندگی کی وہ رات کبھی نہیں بھول سکتی تھی جب اس کے سگے باپ کے بھیجے کرائے کے قاتلوں نے ان کے فلیٹ میں زہریلی گیس چھوڑ دی تھی۔ اس رات اگر ان کی پڑوسن لارا انہیں اس خطرے سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی مدد نہیں کرتی تو وہ دونوں میاں بیوی بچی سمیت اگلے دن کا سورج دیکھنے سے محروم رہ جاتے۔ اس واقعے کے بعد جہاں انہوں نے آئرلینڈ منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا، وہیں یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اپنے نئے ٹھکانے سے کسی کو آگاہ نہیں کریں گے لیکن ان کی اس احتیاط کے باوجود مراد شاہ نے ان تک رسائی حاصل کر لی تھی جو ایک تشویش ناک بات تھی۔

”کیا بات ہے کشور... تمہیں سانپ کیوں سونگھ گیا ہے؟ کیا میری آواز سن کر تمہیں بُرا لگا ہے؟“ اس کی مسلسل خاموشی پر مراد شاہ نے ایک بار پھر اسے پکارا۔ اس بار کشور نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جذبات سے بھرپور تلخ لہجے میں بولی۔

”آپ میری کیفیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں لالہ! میں بہت مشکلوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہوں اور چاہتی ہوں کہ مجھے اپنے شوہر اور بچی کے ساتھ سکون سے جینے دیا جائے۔ مجھے نہ تو خاندانی نام و نسب سے کچھ لینا دینا ہے اور نہ ہی میں باپ کی بے تحاشا جائداد میں سے اپنا حصہ چاہتی ہوں تو پھر آپ لوگ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ بھول جائیں کہ چودھری افتخار عالم شاہ کی حویلی میں کبھی کسی کشور نامی لڑکی نے جنم لیا تھا۔ مردہ تصور کر لیں مجھے اور میرے خیال تک کو کسی قبر میں دفن کر دیں۔“

”تم جذباتی ہو رہی ہو کشور اور اپنے جذبات میں یہ تک نہیں سمجھ پا رہیں کہ تمہارا رویّہ میرے لیے تکلیف کا باعث بن رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ اباجی نے بہت زیادتی کی ہے لیکن یقین کرو کہ میرا ان کے کسی عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم مجھے بنا بتائے نیویارک سے غائب ہو گئیں تو مجھے بہت صدمہ ہوا اور میں ہر طرف تمہیں ڈھونڈتا رہا کہ کسی طرح تم سے رابطہ کر کے تمہیں یہی یقین دلا سکوں کہ میں بے قصور ہوں۔ کتنی مشکل سے میں نے ایک اخبار کے دفتر سے تم لوگوں کا فون نمبر حاصل کیا ہے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں اور ایسا میں نے اس لیے نہیں کیا کہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں صرف اس محبت کی وجہ سے تمہیں ڈھونڈتا رہا ہوں جو ایک بھائی کی حیثیت سے میرے

دل میں تمہارے لیے ہے۔ تاجور اور صنوبر یہاں سے دور پاکستان میں ہیں لیکن فون اور نیٹ کے ذریعے میرا مستقل ان سے رابطہ رہتا ہے۔ وہ اپنے دکھ سکھ کہتی ہیں۔ میں ان کو اپنے حالات سے آگاہ کرتا ہوں لیکن تم... تم یہاں رہ کر بھی مجھ سے دور ہو۔" مراد شاہ کی آواز میں دکھ تھا۔

"میں مجبور ہوں لالہ! عورت باپ اور بھائی کے رشتوں سے جو تحفظ اور اطمینان محسوس کرتی ہے، میرا دل اس سے خالی ہے اور میں ہر وقت اس خوف سے لرزتی رہتی ہوں کہ کہیں یہ رشتے مجھ سے میری چھوٹی سی جنت نہ چھین لیں۔" وہ فون پر ہی سسک پڑی۔ اسے اس طرح روتے دیکھ کر اس کی گود میں موجود امید نے بے چینی محسوس کی اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے رخسار پر پھسلتے آنسوؤں کو چھونے لگی۔ وہ ننھی سی بچی ابھی عمر کے اس حصے میں نہیں پہنچی تھی کہ آنسوؤں کی زبان سمجھ سکتی اور انہیں چننے کی کوشش کرتی لیکن اس کی معصومیت میں کی جانے والی حرکات نے کشور کے دل کو عجیب سی ڈھارس دی تھی اور اسے لگا تھا کہ اس کا درد کم ہونے لگا ہے۔

"تم ابھی میری بات سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ میں پھر کبھی تم سے رابطہ کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے دل سے میرے لیے کدورت ایک نہ ایک دن نکل ہی جائے گی۔ بس تم اتنا یاد رکھنا کہ چودھری افتخار عالم شاہ اور مراد شاہ میں بہت فرق ہے۔ اباجی کے لیے دولت سب سے زیادہ اہم ہے اور میں اسے بہت کم اہمیت دیتا ہوں۔ میرے لیے میرے اپنوں کی محبت اور سلامتی ہر شے سے بڑھ کر ہے۔ میں اگر اباجی کے مزاج کا آدمی ہوتا تو پیر آباد میں رہ کر خوشی سے اباجی کی گدی سنبھال رہا ہوتا لیکن میں ان سب چیزوں کو سخت ناپسند کرتا ہوں جو اباجی کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ ایک بیٹے کی حیثیت سے میں ان سے کوئی گستاخی نہیں کر سکتا اس لیے یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ خود کو ان کے طرزِ زندگی سے دور رکھوں۔" اس نے اپنی صفائی میں تھوڑی سی وضاحت دی اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر "اللہ حافظ" کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

کشور نے بھی بے جان ہاتھوں سے ریسیور واپس کریڈل پر رکھا اور خود ایک قریبی کاؤچ پر بیٹھ کر امید کو برابر میں بٹھانے کے بعد اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ خون کی کشش اس کے دل کو بھائی کی طرف کھینچ رہی تھی تو اپنے حالات کی سختی دور رہنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟ کون تھا فون پر جس سے بات کر کے آپ کی یہ حالت ہو گئی ہے؟" اسے علم بھی نہیں ہوا کہ کب آفتاب اس کے برابر میں آ بیٹھا ہے۔ اس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے دریافت کیا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور پھر یکدم ہی اس کے سینے سے لگ کر بے تحاشا رونے لگی۔ وہ دھیرے دھیرے اس کی پشت سہلاتا ہوا اسے حوصلہ دیتا رہا۔ چند منٹ گزرنے کے بعد وہ کسی قدر خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکی۔ آفتاب نے اسے پانی پلایا اور ایک بار پھر اس سے اس کے رونے کی وجہ دریافت کی۔ جواب میں اس نے آزردہ لہجے میں اسے مراد شاہ کی کال کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کر دیا جنہیں سن کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموشی سے سوچ میں ڈوب گیا پھر بولا۔

"حقیقت یہ ہے کشور کہ میں نے کبھی مراد بھائی کو غلط نہیں سمجھا لیکن ہمارے حالات ہی ایسے ہیں کہ ہم کسی شخص پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ اب بھی اگر دیکھا جائے تو انہوں نے ایک طرح سے اپنے قابلِ بھروسا ہونے کا ثبوت دیا ہے ورنہ وہ چاہتے تو ہم سے رابطہ کرنے کے بجائے ڈائریکٹ کوئی کارروائی کر سکتے تھے۔ اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو آپ اطمینان رکھیں کہ آئندہ بھی نہیں ہوگا۔"

"دل تو میرا ابھی نہیں مانتا کہ لالہ مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں لیکن حالات نے ڈرا دیا ہے۔ زندگی میں چند دن سکون کے ملتے ہیں پھر جان بچانے کے لیے بھاگنا پڑتا ہے۔ جب ہم کسی کو کچھ نہیں کہتے تو دوسرے بھی ہمیں ہمارے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ میں سب کے بغیر بس آپ کے اور اپنی بچی کے ساتھ خوش ہوں۔ کوئی آ کر میری اس جنت میں دخل اندازی کیوں کرتا ہے؟" وہ اب تک پوری طرح نہیں سنبھلی تھی اور بولتے ہوئے ایک بار پھر آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپ میرے ساتھ بہت خوش ہیں لیکن خونی رشتوں کی کشش سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جن دنوں نیویارک میں ہماری مراد بھائی سے ملاقات ہوئی تھی، آپ کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ اندرونی خوشی نے آپ کو اتنا خوب صورت بنا دیا تھا کہ میری نظریں آپ کے چہرے پر نہیں ٹکتی تھیں۔ اس لیے میرا آپ کو مشورہ ہے کہ اگر مراد بھائی آپ سے رابطہ کرتے ہیں تو آپ ان سے بات کر لیا کریں۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ باقی آپ کی اپنی مرضی ہے۔ میں آپ کے ہر فیصلے میں آپ کا ساتھ دوں گا۔" اس کے بے حد رسان سے سمجھانے پر کشور کے چہرے کا تناؤ کم ہونے لگا۔ اسی وقت ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔ اس بار آفتاب نے خود فون اٹھایا جبکہ کشور، امید کی طرف متوجہ ہو گئی جو نیند آنے پر خود ہی کاؤچ پر سو گئی تھی لیکن ذرا بے آرام سی تھی۔ اس نے بچی کو گود میں اٹھایا اور اندر بیڈ روم میں لے جا کر بستر پر سلا دیا اور اس کے پھولے پھولے گالوں پر پیار کر کے باہر نکل آئی۔ آفتاب ابھی تک فون پر مصروف تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات خاصے گمبھیر محسوس ہو رہے تھے۔

"آپ حوصلہ رکھیں بھابی! میں اور کشور شام میں آپ کی طرف چکر لگائیں گے۔" اس کے منہ سے نکلنے والے اس جملے نے کشور کو یہ تو بتا دیا کہ وہ بلقیس سے بات کر رہا تھا لیکن مزید تفصیلات جاننے کے لیے اسے آفتاب کے فون بند کرنے کا انتظار کرنا پڑا۔

"بلقیس بھابی تھیں۔ اسلم گھر سے غائب ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رات کو کسی وقت وہ واپس آیا تھا جس کا اندازہ انہیں انیکسی کی لائٹ جلتے دیکھ کر ہو گیا تھا لیکن یہ سوچ کر اسے نہیں چھیڑا کہ ابھی آرام کر لے پھر صبح ناشتے پر اس سے ملاقات کر لی جائے گی۔ صبح وہ ناشتے کے لیے اسے بلانے گئیں تو وہ وہاں نہیں تھا۔ مصطفیٰ خان نے اپنے طور پر چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ بہت صبح سویرے اسے جنگل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ وہ لوگ سیل فون پر بھی اس سے رابطہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں۔"

"یا اللہ! کہیں اسلم کا دماغ تو نہیں الٹ گیا۔ جنگل میں وہ کیا لینے گیا ہے؟" آفتاب کی زبانی حالات جان کر کشور نے تشویش سے تبصرہ کیا۔

"وہ بے وجہ اس طرف نہیں گیا ہے۔ مسز مصطفیٰ نے اشارے کنائے میں بتایا ہے کہ مصطفیٰ خان کو بھی چند ایسے آثار ملے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماہ بانو کو جنگل میں لے جائے جانے کا امکان ہے لیکن ساتھ ہی ان کا یہ خیال بھی ہے کہ اسلم کا اس طرح اٹھ کر جنگل کی طرف چل پڑنا اس کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔ وہ اس کی خیریت کی طرف سے سخت تشویش کا شکار تھیں۔" آفتاب کی باتوں نے اسے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔ وہ دونوں بے چارے اچھی بھلی زندگی گزار رہے تھے اور اب تو ان کے ہاں ننھا مہمان بھی آنے والا تھا۔ ایسی حالت میں معلوم نہیں بے چاری ماہ بانو جانے کہاں پھنسی ہوئی ہے اور کس حال میں ہے اور ساتھ ہی اسلم نے بھی خود کو خطرے میں ڈال لیا ہے۔ میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے کہ جانے دونوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اللہ ان دونوں کی حفاظت کرے۔" اپنی تشویش کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے خلوصِ دل سے دعا بھی کی۔

"آمین۔" آفتاب نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ "بس اسی طرح دعا کرتی رہیں۔ دعا میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ باقی ہم دیکھیں گے کہ عملی طور پر کیا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے بلقیس بھابی سے کہہ دیا ہے کہ شام کو ہم ان کی طرف آئیں گے۔ میں مصطفیٰ خان کے ساتھ بیٹھ کر ڈسکس کروں گا کہ اسلم کی مدد کے لیے ہم کیا عملی اقدامات اٹھا سکتے ہیں۔ ٹیلی فون پر تو اس طرح کی گفتگو قطعی مناسب نہیں ہوتی۔"

"ٹھیک ہے۔ اس دوران میں گھر کے ضروری کام نمٹا لیتی ہوں۔ امید سو رہی ہے، آپ بھی چاہیں تو اطمینان سے اپنا کام کر لیں۔" وہ مراد شاہ کا فون آنے کے بعد خود پر طاری ہونے والی کیفیت فراموش کر چکی تھی اور اب ماہ بانو اور اسلم کے لیے فکرمند بس ان کی سلامتی کے لیے دل ہی دل میں مسلسل دعائیں مانگنے میں مصروف تھی۔

☆☆☆

سبز گھاس پر اچھلتا کودتا چھوٹا سا لمبے لمبے نرم و ملائم سفید بالوں والا کتا بہت ہی خوب صورت لگ رہا تھا۔ وہ اتنا مہذب تھا کہ اس نے لان میں موجود پھول پودوں کو ذرا بھی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ کھیلتے کھیلتے کسی پھول دار... پودے کے قریب پہنچ بھی جاتا تو ایک ادا سے پھولوں کو سونگھنے کے بعد واپس پلٹ آتا اور اپنی اگلی ٹانگوں سے باری باری اس بڑی سی رنگین بال کو کک لگانے لگتا جو کسی نے شاید اس کی اداؤں سے متاثر ہو کر ہی ازراہِ محبت اسے عطا کر دی تھی۔

"کتا تو واقعی بڑا پیارا ہے۔ بنگلے والوں نے اسے بھگانے کے بجائے مستقل اپنے پاس ہی رکھ لیا ہے تو یہ زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی ان کا تعلق جس خبیث قوم سے ہے، اسے یوں بھی ہماری ہر اچھی چیز کو ہتھیا لینے کی فکر رہتی ہے۔" دوربین کی مدد سے بنگلے کے لان کا منظر دیکھتے جاوید علی نے تبصرہ کیا۔ وہ کچھ دیر قبل ہی یہاں پہنچا تھا۔ اس سے قبل اس نے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر اپنی واپسی کی رپورٹ کی تھی اور سلمان کے ساتھ حالات کے مطابق منصوبہ بندی بھی کر ڈالی تھی۔ اب وہ اور سلمان بنگلے سے کافی فاصلے پر موجود ایک بلند عمارت کی پانچویں منزل پر موجود تھے۔

پانچویں منزل کے جس کمرے میں انہوں نے ڈیرا ڈال رکھا تھا وہ ایک تجارتی ادارے کے دفتر کا حصہ تھا۔ اس عمارت میں زیادہ تر دفاتر ہی تھے اور ان میں سے بیشتر شام

پانچ سے چھ کے درمیان بند ہوجاتے تھے۔ سلمان کے ساتھ علاقے کا دورہ کرنے کے بعد جاوید علی نے اس دفتر کا انتخاب کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دور دور سے نگرانی اپنی جگہ لیکن کوئی ایسا انتظام بھی ہونا چاہیے کہ وہ اس عمارت کا بصری جائزہ لے سکیں۔ چنانچہ اب وہ یہاں تھے۔ دفتر کے دروازے کا تالا کھول کر اس میں داخل ہوجانا ان کے لیے مسئلہ نہیں بنا تھا اور وہ باری باری آرام سے دوربین کی مدد سے جائزہ لے رہے تھے۔ بنگلے کی مرکزی عمارت میں کیا ہورہا تھا اور کیا نہیں، انہیں علم نہیں تھا اور وہ صرف مین گیٹ پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ لان میں جھانک لینے تک محدود تھے یا پھر اس ڈیوائس کے ذریعے کوئی بات کانوں میں پڑ جاتی تھی جو کتے کے گلے میں پڑے پٹے کے ساتھ منسلک تھی۔

"اس کی ناز برداری بند کر اور اپنی ڈیوٹی پر جا۔ تجھے معلوم نہیں ہے کیا کہ آج کتنی خاص میٹنگ ہے۔ سیکیورٹی میں ذرا بھی کمی نہیں رہنی چاہیے ورنہ کسی کی بھی خیر نہیں ہوگی۔" ٹیلی اسکوپ نے انہیں لان میں موجود دو افراد کی شکلیں دکھائیں اور کتے کے پٹے کے ساتھ منسلک ڈیوائس نے یہ ڈائیلاگ سنایا تو وہ گویا اس منظر کا حصہ بن گئے۔

"تجھے پتا تو ہے یار کہ مجھے کتے کتنے پسند ہیں۔ ہمارے ساتھ سیکیورٹی میں مدد دینے والا ٹیری پچھلے مہینے مرا تو میں کتنا اداس ہوگیا تھا۔ آج اس کتے کو دیکھ کر بڑے دنوں بعد میرا من خوش ہوا ہے تو تجھ کو پریشانی ہورہی ہے۔" ان دو میں سے ایک جو پہلے سے ہی لان میں موجود تھا اور کتے کی شرارتوں سے لطف اندوز ہورہا تھا، اپنے ساتھی کے اعتراض پر منہ بنا کر بولا اور کتے کو اٹھا کر اپنی بانہوں میں لے لیا۔

"من تو تیرا استاد خوش کرے گا۔ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میٹنگ روم کی سیکیورٹی کے بارے میں انوپم نے ابھی تک رپورٹ کیوں نہیں دی ہے؟"

"ارے باپ رے۔ میں تو سچ مچ بھول گیا تھا۔" اپنے ساتھی کے تنگی سے کہنے پر انوپم کے نام سے پکارے جانے والا بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا اور کتے کو گود میں لیے ہوئے تیزی سے عمارت کی طرف مڑ گیا جبکہ اس کا ساتھی بھی وہاں سے چل پڑا۔ اب ان کے سامنے بس خالی لان تھا جبکہ آواز کوئی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ان کے کان کے ساتھ لگا آلہ ایک بار پھر جاگ اٹھا اور اس پر آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"میٹنگ روم کی چیکنگ کرلی انوپم؟" کسی کا سخت لہجے میں کیا گیا استفسار سنائی دیا۔

"یس سر! سب اوکے ہے۔" انوپم نے رپورٹ دی۔

"ایک بار پھر چیک کرلو۔ آج کی میٹنگ میں میڈم بھی ہوں گی اور ان کی سخت انسٹرکشن ہے کہ کہیں کوئی غفلت نہیں ہونی چاہیے۔" اسی سخت لہجے والے نے ہدایت دی۔

"اوکے سر! میں ری چیک کرلیتا ہوں۔" انوپم نے فوراً ہامی بھرلی۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ انوپم وہاں سے ہٹ گیا ہو، انہیں اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

"چلو یار ٹیری جونیئر۔۔۔ ایک بار پھر چیکنگ کرلیتے ہیں۔ آرڈر تو آرڈر ہوتا ہے نا۔" کچھ دیر انہیں معمولی آہٹیں سنائی دیتی رہیں پھر دوبارہ انوپم کی بڑبڑاہٹ شروع ہوگئی۔

"اے سی اے ون، کھڑکیوں کی جالیاں بالکل فٹ، یہ بٹن آن کرو تو کھڑکی دروازے سب میں کرنٹ دوڑنے لگے گا۔ ادھر سے کوئی آواز باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ کوئی زبردستی اندر گھس سکتا ہے۔ گھسے گا تو خود مرے گا۔ یعنی میٹنگ بالکل سیف طریقے سے ہوسکتی ہے اس لیے مجھے ٹینشن لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" پتا نہیں وہ خود کلامی کررہا تھا یا کتے سے مخاطب تھا لیکن انہیں بڑی اہم معلومات حاصل ہورہی تھیں۔

"او یار ٹیری جونیئر! تم بھی عجیب ہی کتے ہو۔ میں اتنی دیر سے تم سے باتیں کررہا ہوں اور تم یہاں ٹیبل کے نیچے گھس کر سو گئے ہو۔ چلو سوتے رہو۔ میں بعد میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔" انوپم کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ سچ مچ کتوں سے بہت پیار کرتا تھا۔

"سب کو بتا دو کہ بہت محتاط رہنا ہے اور ابھی کسی قسم کی کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی ہے۔ دور رہ کر بس یہ نظر میں رکھیں کہ میٹنگ میں شرکت کے لیے کتنے افراد آتے ہیں اور ان کی شناخت کیا ہے۔ ہمیں جو بھی کارروائی کرنی ہوگی، ان لوگوں کی واپسی کے موقع پر کریں گے۔" دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی خفیف سی آوازوں کے بعد جب کوئی دوسری آواز نہیں ابھری تو یہ واضح ہوگیا کہ واقعی انوپم کتے کو میٹنگ روم میں سوتا چھوڑ کر خود باہر نکل گیا ہے۔ جاوید علی نے دو تین منٹ کے وقفے کے بعد سلمان کو یہ ہدایت دی اور خود دوربین سے تاک جھانک میں مصروف رہا۔ لان بدستور خالی تھا لیکن مختلف پوائنٹس پر پہرے دار نظر آرہے تھے۔

"اگر یہ کتا میٹنگ کے دوران اندر ہی موجود رہے تو کتنا اچھا ہوگا۔ ہمیں وہاں ہونے والی ساری گفتگو سننے کا موقع مل جائے گا۔" ساتھیوں سے رابطہ کرکے انہیں ہدایات

دینے کے بعد سلمان نے بڑی امید سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"ہوں۔۔۔ لیکن ایسا ہونا ذرا مشکل ہی ہے۔ میٹنگ کے وقت کتا اندر رہ گیا تو انوپم کی شامت آجائے گی۔ جو لوگ اپنی سیکیورٹی کے معاملے میں اتنے حساس ہوں کہ محفوظ ترین کمرے میں میٹنگ کا انعقاد کریں، وہ کمرے میں کتے کی موجودگی کیسے برداشت کرسکتے ہیں۔" جاوید علی نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا تو سلمان کو اس سے اتفاق کرنا پڑا۔ اگلے ایک گھنٹے میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہوئی، بس سست روی سے گزرتے وقت کے ساتھ رات نے اپنا کچھ اور سفر طے کرلیا۔ رات کا وقت ہونے کے باوجود انہیں بنگلے پر نظر رکھنے میں دشواری نہیں پیش آرہی تھی۔ طاقتور اسٹریٹ لائٹس کی روشنی نے سارا منظر واضح کررکھا تھا۔ پھر بنگلے کے علاوہ اس کے اردگرد کے دوسرے بنگلوں میں سے بھی تھوڑی بہت روشنی باہر آرہی تھی۔ اس کے باوجود ان کے پاس نائٹ ویژن گاگلز موجود تھے جو کسی بھی قسم کے ہنگامی حالات میں ان کے کام آسکتے تھے۔ گھنٹے سے دو تین منٹ ہی اوپر ہوئے تھے کہ انہوں نے انوپم اور اس کے ایک ساتھی کو مرکزی عمارت سے باہر نکلتے دیکھا۔ انوپم کچھ پریشان نظر آرہا تھا جبکہ اس کے ساتھ باہر آنے والا شخص تسلی آمیز انداز میں اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔

مشکل سے اسّی نوّے سیکنڈ کی گفتگو کے بعد انوپم نے وہاں سے حرکت کی اور پھر انہوں نے ایک بائیک پر سوار اسے بنگلے سے روانہ ہوتے دیکھا۔ سلمان نے فوراً ہی اپنے ایک آدمی کو اس کے تعاقب کے احکامات دے ڈالے۔ اس واقعے کے بعد آدھا گھنٹا مزید گزر گیا۔ انوپم کے تعاقب میں جانے والے سلمان کے ساتھی نے اس دوران میں انہیں رپورٹ پیش کردی تھی۔

"انوپم یہاں سے سیدھا ہاسپٹل گیا ہے۔ وہاں اس کی ماتا جی ایڈمٹ ہیں اور ان کی حالت خاصی خراب بتائی جارہی ہے۔ ایک طرح سے ڈاکٹر نے انہیں جواب دے دیا ہے۔" ساتھی کی رپورٹ نے انہیں انوپم کی اچانک روانگی کی وجہ سے آگاہ کردیا۔

"پتا نہیں کتا اب بھی میٹنگ روم میں ہے یا نہیں؟" اذیت کے شکار سلمان نے سوال اٹھایا۔

"میرے خیال میں تو وہ اب بھی اندر ہی موجود ہے۔ دوسری صورت میں ہمیں کوئی آواز ضرور سنائی دیتی۔" جاوید علی نے جواباً اپنی رائے کا اظہار کیا۔

ذرا مسکرایئے

لڑکی کی شادی پر اس کا پہلا عاشق بھی سج دھج کے بیٹھا ہوا تھا۔ لوگوں نے پوچھا۔

"دولہا تم ہو؟"

"نہیں میں سیمی فائنل میں ہار گیا تھا۔ فائنل دیکھنے آیا ہوں۔" عاشق نے برجستہ کہا۔

☆☆☆

بیوی اپنے خاوند سے۔ "کیا میں کبھی آپ کے خواب میں آئی ہوں؟"

خاوند۔ "کبھی نہیں۔"

بیوی۔ "وہ کیوں؟"

خاوند۔ "کیونکہ میں آیت الکرسی پڑھ کر سوتا ہوں۔"

☆☆☆

انڈیا میں سردار کے جنازے پر سردارنی روتے ہوئے۔ "وے توں او تھے ٹر گیا جتھے نا ڈیوا اور نا بتی، جتھے بجلی نہ پانی، جتھے آٹا اور نہ روٹی۔"

بیٹا اپنی ماں سے۔ "کدرے ابو پاکستان تو نہیں ٹُر گیا؟"

☆☆☆

آدمی۔ سردار جی آج ہم نے تیری بیوی کو نہاتے ہوئے دیکھا۔

سردار۔ "کتے، کمینے، تجھے شرم نہیں آئی؟"

آدمی۔ "ہم نہر میں نہا رہے تھے اور وہ سڑک پر جارہی تھی۔"

☆☆☆

ڈاکٹر، سردار سے۔ "آپ کو کیلے کا چھلکا نظر نہیں آیا جو آپ پھسل گئے؟"

سردار۔ "ہم پاؤں رکھ کے دیکھ رہا تھا کہ چھلکے میں کیلا تو نہیں ہے۔"

☆☆☆

ڈاکو مسافر سے۔ "نکالو جو کچھ ہے۔"

مسافر۔ "جناب میں بہت غریب آدمی ہوں۔"

ڈاکو۔ "ہم تجھ سے بھی غریب ہیں جو خالی پستول دکھا کے لوگوں کو لوٹ رہے ہیں۔"

☆☆☆

سردار کا ٹی وی خراب ہوگیا۔ وہ غریب تھا۔ مکینک کے پاس نہیں لے جاسکتا تھا۔ اس نے ٹی وی خود کھولا تو مرا ہوا چوہا نکلا۔

"ٹی وی کیسے چلتا فنکار تو مرا پڑا ہے۔" سردار نے بے ساختہ کہا۔

(اختر عباس تھراج کے کبیر والا سے چٹکلے)

"سارادن کھیل کود کرتا رہا ہے شاید اس لیے لمبی نیند سو گیا ہے۔ ویسے بھی عابد کا کہنا ہے کہ اس کا کتا رات بھر لمبی تان کر سوتا ہے اور مشکل سے ایک دو بار جاگتا ہے۔ اگر آج بھی یہ طویل نیند سوتا رہا تو ہمارا بھلا ہو جائے گا۔ کیونکہ میرے خیال میں انوپم جتنی ایمرجنسی میں یہاں سے گیا ہے، اسے بالکل بھی یاد نہیں رہا ہوگا کہ کسی کے ذمے کتے کو میٹنگ روم سے باہر نکالنے کا کام لگا دے۔" سلمان کے لہجے میں ایک امید سی تھی۔ اسی وقت انہوں نے ایک گاڑی بنگلے کی طرف آتے دیکھی۔ یہ بالکل نئے ماڈل کی کلٹس تھی۔

چوکیدار نے گاڑی دیکھتے ہی تیزی سے بنگلے کا گیٹ کھول دیا۔ گاڑی اندر چلی گئی۔ بنگلے میں موجود افراد میں سے ایک نے اس کا استقبال کیا اور اپنے ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔ کتے کے ساؤنڈ پروف میٹنگ روم میں سوئے ہوئے ہونے کی وجہ سے وہ لوگ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے سے محروم رہے۔ کلٹس کے بعد چند منٹوں کے وقفے سے تین گاڑیاں مزید بنگلے میں پہنچیں اور آسانی سے اس کے وسیع پورچ میں سما گئیں۔ وہ دونوں جس زاویے سے بیٹھے نگرانی کر رہے تھے، اس سے یہ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ گاڑیاں چلانے والے کون ہیں۔ وہ بس اسی وقت ان کی صورت دیکھتے تھے جب گاڑی سے اترنے کے بعد بنگلے میں ان کا استقبال کیا جاتا تھا۔ آخری گاڑی میں ایک ادھیڑ عمر عورت وہاں پہنچی۔ جاوید علی کو اس کا چہرہ کچھ شناسا لگا لیکن وہ فوری طور پر اسے شناخت نہیں کر سکا اور وہ چند سیکنڈ ہی باہر رکنے کے بعد اندر چلی گئی۔

اس کے اندر جانے کے بعد کچھ دیر کے لیے وہ بالکل تاریکی میں چلے گئے کیونکہ اب نہ تو کچھ دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی سنائی لیکن پھر کان سے لگے آلے میں پہلی آواز سنائی دی تو وہ دونوں ہی خوش ہو گئے۔ اس آواز کے سنائی دینے کا مطلب تھا کہ کتا ہنوز میٹنگ روم میں سویا پڑا ہے اور وہ وہاں ہونے والی گفتگو سن سکتے ہیں۔ وہ دم سادھے میٹنگ کے باقاعدہ آغاز کا انتظار کرنے لگے جس کے لیے انہیں زیادہ زحمت نہیں اٹھانی پڑی اور رسمی ہیلو ہائے کے بعد کسی نے گمبھیر لہجے میں بولنا شروع کر دیا۔

"آپ سب جانتے ہیں کہ یہ میٹنگ کیوں ارینج کی گئی ہے۔ ہم برسوں سے یہاں کام کر رہے ہیں اور ان برسوں میں کئی بار ہمیں اتار چڑھاؤ کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن کچھ عرصے سے تو حالات ہمارے لیے بہت ہی خراب ہو گئے ہیں اور ہمیں کئی بڑے نقصان اٹھانا پڑے ہیں۔ بلتستان میں ہمارا ٹریننگ کیمپ تباہ ہوا، نواب نوازش علی کی کوٹھی کی تباہی سے خواجہ سراؤں کی مدد سے بنائے گئے سیٹ اپ کو خاصا نقصان پہنچا، مساج سینٹروں میں بھی کافی گڑبڑ ہو چکی ہے اور حد یہ ہے کہ ہمارے لیے کام کرنے والی ایک لڑکی عالیہ کی وجہ سے ہمیں خاصا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ خبر نہیں کیسے وہ دشمنوں کے کیمپ سے جا ملی ہے اور اس کے دھوکے کی وجہ سے ہمیں اپنے فائٹنگ ونگ کے اہم ورکرز سے ہاتھ دھونا پڑا ہے۔ حالات کو دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہماری جانی پہچانی حکومتی ایجنسیوں کے علاوہ بھی کوئی خفیہ ایجنسی ایسی ہے جو ہمارے خلاف کام کر رہی ہے اور اس سلسلے میں ہمارے سامنے جو اہم ترین نام ہے وہ کرنل توحید کا ہے۔ ہم اپنے سورسز سے یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ آج کل کرنل توحید پنڈی میں ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہے کہ کرنل کو وہاں سے اغوا کر لیا جائے اور اسی سے ساری انفارمیشن حاصل کی جائے۔

"اغوا کے لیے منصوبہ مس سنتھیا نے تیار کر لیا ہے۔ یہ اپنا منصوبہ آپ لوگوں کے سامنے رکھیں گی تاکہ اگر اس میں کوئی خامی ہو تو دور کر لی جائے۔ پلیز سنتھیا! اپنا منصوبہ سب کے سامنے بیان کرو۔" گمبھیر مردانہ آواز بلند ہوئی تو انہیں ایک زنانہ آواز سنائی دینے لگی۔ بولنے والی کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ خاصی سخت طبیعت کی مالک ہے۔ اس کے لہجے کی ہی طرح اس کا منصوبہ بھی سخت خطرناک تھا۔ جاوید علی کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ شناسا محسوس ہونے والی عورت ڈاکٹر ماریا کی ماں سنتھیا جوزف ہے۔ یہ عورت بہت سی وجوہات کی بنا پر انہیں پہلے ہی مطلوب تھی چنانچہ اس کی یہاں موجودگی کا جان کر وہ خاصا پُرجوش ہو گیا تھا۔ ان کے ریکارڈ کے مطابق یہ عورت ڈبل ایجنٹ تھی اور را کے ساتھ ساتھ موساد کے لیے بھی کام کرتی تھی بلکہ اس کی حقیقی وفاداری تو موساد کے ساتھ ہی تھی لیکن وہ را کے ساتھ بھی بخوبی اس لیے چل رہی تھی کہ مقصد تو دونوں کا ایک ہی تھا۔ پاکستان کو نقصان پہنچانا اور یہاں کے حالات کو اس نہج پر لے جانا جہاں پہنچ کر کرۂ ارض پر سے پاکستان کا نام و نشان مٹانا آسان ہو جائے۔

"ہم کرنل توحید کی روٹین کو مسلسل واچ کر رہے ہیں اور میں نے سوچ لیا ہے کہ کرنل کو جس روز کڈنیپ کیا جائے گا، اس روز آدھے گھنٹے پہلے مینارِ پاکستان بھی تباہ کر دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں بھی سارا ہوم ورک کر لیا گیا ہے۔ البتہ منصوبے کو ہر طرح کی خامی سے پاک رکھنے کے لیے

اسے بھی میں آپ کے سامنے رکھ رہی ہوں۔ آپ میں سے جو بھی چاہے، اپنی رائے دے سکتا ہے۔" وہ لوگ اپنے ناپاک منصوبے کو آپس میں ڈسکس کرنے لگے۔ ان کی یہ باتیں سن کر جاوید علی اور سلمان دونوں ہی کے چہرے طیش سے سرخ ہو رہے تھے۔

دشمن ان کے وطن کو بے شمار نقصانات پہنچانے کے بعد اب ان سے ایک ایسی یادگار بھی چھین لینا چاہتا تھا جس کے بارے میں پاک سرزمین کے ہر بچے کو نہایت فخر سے یہ بتایا جاتا تھا کہ یہ مینار عین اس مقام پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں 23 مارچ 1940ء کو قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی۔ دشمن نے نہایت خباثت سے بڑی گہری چال سوچی تھی۔ ایک طرف وہ اپنے انتقام کی آگ بجھانا چاہتے تھے تو دوسری طرف قوم کو ایک ایسے صدمے سے دوچار کرنے والے تھے جو انہیں سکتے میں مبتلا کر دے۔ ان حالات میں ان کے لیے کرنل توحید کے اغوا کی مذموم سازش پر عمل کرنا آسان ہو جاتا۔

"میری ایک تجویز ہے میڈم! ہمیں چاہیے کہ مینارِ پاکستان کے علاوہ بھی دوسری جگہوں پر بلاسٹ کریں۔ ضروری نہیں کہ وہ جگہیں مینار کی طرح ہی اہم ہوں لیکن ہونی پبلک پلیس ہی چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ ہلاکتیں ہوں اور پورا ملک لرز اٹھے۔" ایک قدرے باریک آواز والے نے نہایت سفاکی سے تجویز پیش کی جو سنتھیا کو بہت پسند آئی اور اس نے اس پر عمل کی منظوری دیتے ہوئے تجویز دینے والے کو فری ہینڈ دے دیا کہ وہ اپنی نگرانی میں جیسے چاہے، یہ کام انجام تک پہنچا دے۔ سازشیوں کے اس ٹولے کی میٹنگ ایسی ہی چند باتوں کے بعد اختتامی مرحلے میں داخل ہو گئی۔

جاوید علی اور سلمان نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑ دی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ماتحتوں کو ہدایت دینے لگے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ وہ میٹنگ کے لیے آنے والے چاروں اہم افراد کو بنگلے سے دور جا کر گھیرنا چاہتے تھے کیونکہ بنگلے میں جو حفاظتی انتظامات تھے، وہ ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔ وہ کافی بڑی فورس کے ساتھ ہی بنگلے پر چڑھائی کر کے کامیابی حاصل کر سکتے تھے لیکن اس میں بھی یہی خدشہ تھا کہ مقابلے کے دوران سرکردہ افراد میں سے کسی کی جان نہ چلی جائے۔ ان کے لیے ان افراد کی ہلاکت سے زیادہ انہیں زندہ گرفتار کرنا زیادہ سودمند ہوتا۔ باقی چھوٹی مچھلیوں سے تو بعد میں بھی نمٹا جا سکتا تھا۔

"میں سنتھیا کے پیچھے جاؤں گا، تم کلٹس والے سے نمٹ لینا۔ اس کے علاوہ راشد اور خرم سے کہو کہ وہ دو دو کے گروپ میں باقی دونوں سے نمٹ لیں۔" وہ جس عمارت کے ایک دفتر سے بنگلے کی نگرانی کر رہے تھے، اب اس کی پارکنگ میں پہنچ چکے تھے۔ پارکنگ میں پہنچ کر اس نے سلمان سے کہا اور لپک کر اپنی بائیک پر سوار ہو گیا۔ یوں تو وہ زیادہ تر گاڑی کا استعمال کرتا تھا لیکن یہاں آتے ہوئے گاڑی ہیڈ کوارٹر میں چھوڑ کر بطور خاص بائیک پر آیا تھا۔ دو پہیوں والی یہ سواری یوں تو تھوڑی خطرناک تھی لیکن اپنی رفتار اور ٹریفک کے رش میں آسانی سے جگہ بنا کر نکل جانے کے باعث خاصی باسہولت بھی لگتی تھی۔

"بنگلے سے ان لوگوں کی روانگی شروع ہو گئی ہے۔ سب سے پہلے کلٹس والا نکلا ہے اور اس کا رخ علاقے سے باہر کی طرف ہی ہے۔" وہ دونوں اپنی اپنی سواریوں کو اسٹارٹ کر کے پارکنگ سے باہر نکل رہے تھے جب نگرانی کرنے والوں میں سے کسی نے اطلاع دی۔ ان دونوں ہی نے اپنے اپنے آپریٹس پر یہ اطلاع سنی۔

"جانے دو، کسی کو بالکل بھی چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔" جاوید علی نے سختی سے حکم دیا جس پر پوری طرح عمل کیا گیا اور ایک ایک کر کے انہیں چاروں ہی کی روانگی کی اطلاع مل گئی۔ ان کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ بنگلے کے گیٹ سے ہی تعاقب شروع کر دیں کیونکہ اس پوش علاقے سے مین روڈ تک پہنچنے کے لیے ایک ہی راستہ تھا۔ جاوید علی نے بھی سنتھیا کی گرے سوک کو جلد ہی پالیا لیکن اس سے چھیڑ چھاڑ کیے

مفت مشورہ

مشہور ادیب ہنری طر نے ایک مرتبہ جوس فروش سے سیبوں کا جوس پیا۔ گلاس لوٹاتے ہوئے اس نے دکان دار سے پوچھا۔ "تم دن بھر کتنے سیبوں کا جوس فروخت کر لیتے ہو؟"

"تقریباً ایک من سیبوں کا۔" دکان دار نے بتایا۔

"تمہیں ایک مشورہ دیتا ہوں جس پر عمل کر کے تم تقریباً ڈیڑھ من سیبوں کا رس بیچ سکتے ہو۔" ہنری نے کہا۔

"وہ کیسے جناب؟" دکان دار نے تجسس سے پوچھا۔

"گلاس پورا بھر کر دیا کرو۔"

(علی کامران کی کتاب گلدستہ لطائف سے

اقتباس: انتخاب ریاض بٹ، حسن ابدال)

بغیر مخصوص فاصلے سے ٹریفک کے ازدحام میں اسی طرح اپنی بائیک چلاتا رہا جیسے بہت سے دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی ایک غیر متعلقہ شخص ہو۔ راستے میں ہی اس نے ہیڈ کوارٹر رابطہ کر کے اب تک کی رپورٹ پیش کرنے کے ساتھ مزید نفری کی درخواست کر دی کیونکہ بنگلے کو کلیئر کرنے کے لیے ان کو زیادہ افراد کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اسے اس سلسلے میں تسلی دے دی گئی۔

"میرا شکار یہاں سے دور نہیں گیا ہے اور علاقے کے ہی ایک دوسرے بنگلے میں پہنچ گیا ہے۔" سنتھیا کا تعاقب کرتے ہوئے اسے اپنے آپریٹس پر خیری کی آواز سنائی دی۔ یہاں آتے ہوئے وہ اس بات کا بندوبست کر کے آئے تھے کہ ایک دوسرے سے مستقل رابطے میں رہیں۔

"ٹھیک ہے، فی الحال اسے مت چھیڑو اور باہر ہی رہ کر نگرانی کرو۔ اس کا بعد میں بندوبست کر لیں گے۔" اس نے خیری کو ہدایت دی اور بہت سی دوسری گاڑیوں کے ساتھ اس روڈ پر مڑ گیا جس کا سنتھیا نے رخ کیا تھا۔ روڈ آگے جا کر کئی شاخوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ سنتھیا نے اپنی گاڑی دائیں بائیں جانے والے راستوں میں سے کسی طرف موڑنے کے بجائے بالکل سیدھ میں موجود پل پر چڑھا دی۔ ٹریفک کے حصوں میں منقسم ہو جانے کے باعث پل پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ جاوید علی کو بھی ایسی ہی کسی جگہ کی تلاش تھی۔ اس نے یک دم ... ہی اپنی بائیک کی رفتار تیز کی اور سنتھیا کی سوک کے قریب سے اس طرح تیزی سے لے گیا جیسے عموماً مردوں کی طرح خاتون ڈرائیور کو ڈرانا مقصود ہو۔ آگے جا کر اس نے ایک تماشا اور کیا اور بگڑے ہوئے تھرل کے متلاشی لڑکوں کی طرح دونوں ہینڈلز پر سے ہاتھ اٹھا کر گاڑی چلانے لگا۔ اس کی ان حرکتوں کے باعث ممکن ہی نہیں تھا کہ سنتھیا اس کی طرف متوجہ نہ ہوتی۔ وہ زور زور سے اپنی گاڑی کا ہارن بجانے لگی کہ کسی طرح اس ایڈونچر کے چکر میں پڑے لڑکے سے اپنے لیے راستہ صاف کروا سکے لیکن وہ کسی طرح اپنی حرکتوں سے باز نہیں آ رہا تھا۔ اس کی یہ بے نیازی سنتھیا کے لیے اشتعال کا سبب بنی اور اس نے اپنی گاڑی کی رفتار بڑھا کر سائڈ میں سے نکلنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں شاید اس کی گاڑی کا کوئی حصہ بائیک کو ذرا سا چھو گیا۔ دیکھنے والوں نے یہی دیکھا کہ بائیک کا توازن بگڑا اور اس کا سوار ہوا میں اڑتا ہوا گر کے سوک کے بونٹ پر جا گرا۔ سنتھیا نے گھبرا کر اپنی گاڑی کو بریکس لگائے۔ جاوید علی بچنے کی کوشش کرتا ہوا جھٹکے سے نیچے گرا۔ لیکن وہ اس زاویے سے گرا تھا کہ گاڑی کے سامنے نہیں آیا تھا ورنہ گاڑی رکتے رکتے بھی اسے کچل ڈالتی۔ گاڑی رکنے کے بعد غصے میں بھری ہوئی سنتھیا باہر نکلی۔ رواں ٹریفک میں سے بھی ایک دو افراد نے اپنی گاڑیاں روک لی تھیں اور نیچے گرے ہوئے جاوید علی کا جائزہ لے رہے تھے۔

"اس ایکسیڈنٹ میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ غلطی اس کی ہی تھی۔ یہ چلتی سڑک پر کرتب دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔" غصے اور پریشانی میں مبتلا سنتھیا نے چیخ کر اپنی صفائی پیش کی جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا تھا لیکن وہ اس جوان کے لیے بھی تشویش میں مبتلا تھے جو زخمی حالت میں پڑا کراہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے میڈم، آپ کی غلطی نہیں ہے لیکن اسے اسپتال تو لے جانا ہی پڑے گا۔" ایک شخص نے انسانیت کا ثبوت دیتے ہوئے اہم نکتہ پیش کیا۔

"میں اسے اسپتال لے کر جاؤں گی تو پولیس والے میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔" وہ تذبذب کا شکار تھی۔ ویسے بھی ایک ایسی عورت جس کے اشارے پر سیکڑوں بے گناہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے، کسی انسان کی زندگی بچانے میں کیا دلچسپی رکھ سکتی تھی۔ وہ تو بس اضطراری عمل کے طور پر وہاں رک گئی تھی اور اب لوگوں کی وجہ سے پھنسی ہوئی تھی۔

"آپ مجھے اسپتال لے چلیں۔ میں آپ کے خلاف کوئی بیان نہیں دوں گا۔" زخمی جاوید علی نے کراہ کر اس سے استدعا کی تو اس کے پاس کوئی عذر نہیں رہا۔

"اچھی بلا گلے میں پڑ گئی ہے۔" لوگوں کے جاوید علی کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھانے تک وہ بڑبڑاتی رہی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے اپنی گاڑی کے نیچے کچل کر وہاں سے روانہ ہو جائے۔

"آپ اتنی ناراض نہ ہوں۔ اسپتال کا بل میں خود ادا کروں گا۔" جاوید نے کچھ چڑانے والے انداز میں اسے تسلی دی۔ ایک زخمی شخص کا یہ انداز دیکھ کر وہ کچھ چونک گئی لیکن اب تو گاڑی اسٹارٹ کر کے چلا ہی چکی تھی چنانچہ لب بھینچے خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی۔

"میری بائیک پل پر پڑی ہوئی ہے۔ حالت خاصی خراب ہے، اسے وہاں سے اٹھوا لینا۔" اپنے ماتھے سے بہنے والے خون پر رومال رکھتے ہوئے اس نے کسی کو یہ ہدایت کی تو ڈرائیونگ کرتی سنتھیا چونک گئی۔ ایک سیکرٹ ایجنٹ کے طور پر وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ یہ لب و لہجہ کسی عام شخص کا نہیں ہو سکتا۔

"کون ہو تم؟" سوال کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تیزی سے ڈیش بورڈ کی طرف بڑھا۔

"اونہہ ہوں، ایسی کوئی غلطی مت کرنا مسز سنتھیا جوزف! ورنہ تمہارا یہ طرح طرح کی ڈائیز سے رنگے بالوں والا سر سلامت نہیں رہے گا۔" جاوید علی نے اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا پسٹل اس کی کھوپڑی سے لگا دیا۔

"تو تم جان کر میری گاڑی کے آگے آئے تھے... وہ بھی اس وقت جب ہم ایک فلائی اوور پر سفر کر رہے تھے؟" وہ سخت متعجب تھی البتہ لہجے میں خوف کا کوئی عنصر نہیں تھا۔

"ہاں بس اچانک ہی اس پاگل پن کے لیے دل مچلا اور دیکھو کتنی سہولت ہو گئی۔ میں اپنی کھٹارا بائیک سے تمہاری اس آرام دہ گاڑی میں شفٹ ہو گیا۔" وہاں بھی قابل دید اطمینان تھا ورنہ سچ یہ تھا کہ اپنی اس عجیب و غریب حرکت کے نتیجے میں اسے ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود خاصی چوٹیں آئی تھیں۔

"مجھے کچھ شک سا تو ہوا تھا لیکن پھر یہی سوچا کہ کوئی شخص ایسی حماقت کیوں کرے گا۔ بہرحال اب یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو اور خود تمہارا تعلق کس ادارے سے ہے؟" وہ زبردست خود اعتمادی کا مظاہرہ کر رہی تھی اور ابھی تک اس کے انداز میں کوئی گھبراہٹ یا بوکھلاہٹ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ پہلے جتنی اسپیڈ کے ساتھ ہی پورے سکون سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔

"فی الحال تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ وہاں پہنچ کر تمہیں اپنے دونوں سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔" وہ سنتھیا سے گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ پہلی بار ڈیش بورڈ کے خانے سے پسٹل نکالنے کی کوشش کرنے کے بعد اس نے دوبارہ کوئی حرکت نہیں کی تھی۔

"اور بدلے میں تم مجھ سے اپنے بہت سے سوالوں کے جواب چاہو گے..." اس کا لہجہ مستفسرانہ تھا۔ ساتھ ہی وہ بڑی مہارت سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ ابھی تک جاوید علی نے اسے اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہیں دی تھی چنانچہ وہ اپنی مرضی سے سیدھی گاڑی دوڑائی جا رہی تھی۔

"یہ یہاں سے لیفٹ لے لو۔" ایک چوراہے پر پہلی بار جاوید علی نے اسے کوئی ہدایت دی لیکن اس نے ان سنی کر دی۔

"تم نے سنا نہیں کہ میں نے کیا کہا؟" جاوید علی اس کی کھوپڑی پر پسٹل کا دباؤ بڑھاتے ہوئے غرایا۔

"میں صرف اپنی مرضی کرنے کی عادی ہوں۔" اس نے ذرا بھی مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا تو جاوید علی کو پہلی بار احساس ہوا کہ اس نے بڑی مشکل شے کو ہینڈل کرنے کی ذمے داری اپنے سر لے لی ہے۔

"سر پر رکھی پسٹل کی نال کے باوجود اگر کوئی شخص اپنی مرضی کرنے کی کوشش کرے تو اس کے سوا کچھ نہیں سمجھا جا سکتا کہ ایسا شخص خودکشی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔" وہ ذرا جھنجلاہٹ کا شکار ہوا۔

"وہ تو کوئی تمہاری حرکت کے بارے میں بھی کہہ سکتا ہے لیکن دیکھو تم صحیح سلامت بیٹھے ہو۔" وہ اس طرح مسکرا کر بولی جیسے اس کا مقابل کوئی ننھا بچہ ہو اور وہ اس کی کیفیت سے پوری طرح لطف اٹھا رہی ہو۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ اب جو موڑ آئے گا وہاں سے یوٹرن لے لینا ورنہ میں تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کروں گا۔" سنتھیا کی مسکراہٹ نے اسے مزید تپا دیا اور وہ پہلے

مشکل

مالک ملازم سے۔ "بلی تو میری مری ہے۔ تم کیوں ہلکان ہو رہے ہو؟"

ملازم۔ "جناب اب میں دودھ پی کر کس کا نام لگاؤں گا؟"

☆☆☆

میراثی نے جوتا موچی کو دیتے ہوئے کہا۔ "اسے مرمت کر دو۔"

موچی جوتے کو بار بار پانی کے ٹب میں ڈبونے لگا۔ شاید چمڑا نرم کر رہا تھا۔

میراثی یہ دیکھ کر بولا۔

"میں نے تمہیں جوتا مرمت کرنے کے لیے دیا ہے۔ تیراکی سکھانے کے لیے نہیں۔"

☆☆☆

ایک صاحب ایک رسالے کے ایڈیٹر تھے مگر کچھ وجوہ کی بنا پر رسالہ بند ہو گیا۔ انہیں ایک ہوٹل میں منیجر کی نوکری مل گئی۔ ایک دن ایک گاہک کو شوربے میں بٹن نظر آیا۔ اس نے آ کر منیجر سے شکایت کی۔ انہوں نے آرام سے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں، معمولی کتابت کی غلطی ہے۔ بٹر کی جگہ بٹن پڑ گیا ہے۔"

(ریاض بٹ، حسن ابدال)

سے زیادہ جھنجلا کر اسے دھمکی دینے لگا۔

"اچھا سلوک تو تم میرے ساتھ کسی صورت نہیں کر سکتے بلکہ اگر میں تمہاری بات مان کر شرافت سے تمہارے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی تو میرے ساتھ یقینی طور پر بہت بُرا سلوک ہوگا اور عمر کے اس حصے میں، میں زیادہ تشدد برداشت کرنے کی اہل نہیں ہو سکتی اس لیے بہتر ہے کہ میں وہی کروں جو میں خود مناسب سمجھتی ہوں۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا اور گاڑی ایک اور فلائی اوور پر چڑھا دی۔ جاوید علی کو احساس ہوا کہ وہ اس کے سامنے بے بس ہے۔ جو شخص مرنے سے نہ ڈرتا ہو اسے پھر کس چیز سے دھمکایا جا سکتا ہے۔

"او کے بوائے، پھر ہم دونوں ہی ایک ساتھ اوپر چلتے ہیں۔ اپنے اس آخری سفر کو تم عالمِ بالا میں بھی یاد رکھو گے۔" بھرپور اطمینان کے ساتھ کہتے ہوئے اس نے یکدم ہی اسٹیئرنگ موڑ دیا۔ گاڑی زوردار دھماکے سے فلائی اوور پر لگے حفاظتی جنگلے سے ٹکرائی اور اسے توڑتی ہوئی نیچے کی طرف گرنے لگی۔

یہ جاوید علی کی زندگی کا خوفناک لیکن شاید سب سے خوش قسمت لمحہ تھا، گاڑی نیچے جا کر گرنے کے بجائے جنگلے میں ہی اٹک گئی۔ سنتھیا نے سیٹ بیلٹ نہیں باندھ رکھی تھی چنانچہ ونڈ اسکرین کو توڑتی ہوئی نیچے رواں ٹریفک کے درمیان جا گری۔ جاوید علی نے اگر ڈرائیونگ سیٹ کی پشت گاہ کو نہ تھام لیا ہوتا تو شاید اس کا بھی یہی انجام ہوتا۔ اب بھی وہ خاصے خطرے میں تھا۔ جنگلے سے جھولتی گاڑی کسی بھی لمحے نیچے گر سکتی تھی اس لیے سنتھیا کی فکر چھوڑ کر وہ سب سے پہلے اپنی جان بچانے کی تدبیر کرنے لگا۔

سب سے پہلے اس نے گاڑی کے دروازوں پر قسمت آزمائی کی لیکن دروازے لاک ہو چکے تھے۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ وہ شیشے توڑ دے لیکن اس کے لیے بھی اسے اپنے ہاتھوں سے ہی کام لینا پڑتا۔ پسٹل تو پہلے ہی جھٹکا لگنے سے اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کی اور دائیں ہاتھ کا زوردار گھونسا مار کر ایک جانب کا شیشہ توڑ دیا۔ اسی وقت اسے اوپر سے جھانکتے دو چہرے نظر آئے۔ یہ یقیناً وہ چشم دید گواہ تھے جنہوں نے حادثہ ہوتے دیکھا تھا اور اب بدقسمت گاڑی کے سواروں کا حال جاننے کے لیے نیچے جھانک رہے تھے۔ رات ہو رہی تھی، اس کے باوجود ابھی اتنا وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک بڑے شہر میں ٹریفک کا زور بالکل ہی ٹوٹ جائے۔ پل کے اوپر اور نیچے سے مسلسل گاڑیاں گزر رہی تھیں۔

"میرا ہاتھ پکڑو بھائی صاحب!" جاوید علی کو اپنی طرف دیکھتا پا کر ان میں سے ایک نے اسے پکارا۔ جاوید علی نے فوراً اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اسے اوپر اٹھنے میں مدد دینے لگا جبکہ دوسرے شخص نے اپنے ساتھی کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا کہ کہیں وہ خود وزن کی وجہ سے الٹ کر نیچے نہ جا گرے۔ چند لمحوں کی کشمکش کے بعد جاوید علی موت کے منہ سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

"شاید آپ کا ساتھی...!" اسے گاڑی سے نکلنے میں مدد دینے والے شخص نے نیچے رک جانے والے ٹریفک کی طرف اشارہ کیا۔ یقینی طور پر وہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ حادثے کا شکار ہونے والا کوئی مرد نہیں بلکہ عورت ہے۔ اس کے اشارے پر جاوید علی نے پل سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ اتنی بلندی سے گر کر کسی کا بچنا ویسے بھی محال تھا اور وہ تو لازماً کئی گاڑیوں کے نیچے بھی کچلی گئی ہوگی جبھی گوشت کے لوتھڑے کی صورت اس زمین پر پڑی تھی جسے اس نے ساری زندگی برباد ہی کرنے کی کوشش کی تھی پھر بھلا اسے اس زمین پر امان کیوں ملتی؟

☆☆☆

رات تقریباً ڈھل چکی تھی اور سپیدۂ سحر پھوٹنے کو تھا۔ ذیشان کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی تھی جبکہ جاوید علی اس کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں پر چھوٹے بڑے زخم موجود تھے تاہم کوئی بھی زخم زیادہ خطرناک نہیں تھا اور وہ معمولی ڈریسنگ کے بعد اسپتال سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ حادثے کے بعد پہنچنے والی پولیس سے جان چھڑا کر نکلنے کے لیے اسے اپنے ادارے کے مراسم کو استعمال کرنا پڑا تھا اور وہ ذیشان کی طرف سے ملنے والے حکم کی وجہ سے سیدھا ہیڈ کوارٹر پہنچا تھا۔

"تم سے اس طرح کی حرکت کی امید نہیں تھی۔ جرأت مندی اور حماقت میں فرق ہوتا ہے۔ بے شک ہم اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے ہر وقت جان کی قربانی دینے کے لیے تیار رہتے ہیں لیکن ہماری تربیت میں خودکشی کی ترغیب تو کہیں بھی شامل نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ تم پر فخر کیا ہے لیکن اس بار تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے جاوید..." ذیشان کے لہجے میں دبا دبا غصہ اور افسوس تھا۔

"سوری سر! میں خود شرمندہ ہوں کہ میں سنتھیا کو زندہ یہاں لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔"

"میں اس وجہ سے تم سے ناراض نہیں ہوں۔" ذیشان نے فوراً اسے ٹوک دیا۔ "مجھے تمہارے طریقۂ کار سے اختلاف ہے۔ تم نے کس احمقانہ انداز میں اس تک رسائی کی کوشش کی تھی۔ اندازے کی ذرا سی غلطی سے تم خود موت کے منہ میں جا سکتے تھے۔"

"بس سر! اس وقت پتا نہیں کیوں میرے ذہن میں یہی ترکیب آئی تھی۔" اس نے بنا تامل اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

"آئندہ تم ایسی غلطی نہیں کرو گے۔" ذیشان نے اسے تنبیہ کی۔

"او کے سر۔" اس نے فوراً ہامی بھر لینے میں ہی بچت محسوس کی۔

"جاؤ جا کر ریسٹ کر لو۔ دوسرے لوگ باقی معاملات نمٹا لیں گے۔" خلافِ توقع ذیشان نے آسانی سے اس کی جان چھوڑ دی۔ وہ فوراً ہی وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ زخموں اور تھکن سے چور اس کا جسم آرام کا خواہش مند تھا لیکن وہ صورتِ حال جانے بغیر کسی طرح سکون سے نہیں سو سکتا تھا۔ ویسے ہی سنتھیا جیسی اہم مجرمہ کے ہاتھ نہ آنے کا غم اسے بے چین کر رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ یہ بھی اعتراف کر رہا تھا کہ اس ادھیڑ عمر عورت نے اپنے ایجنٹ ہونے کا حق ادا کر دیا تھا اور اپنے وطن سے اس طرح وفاداری نبھائی تھی کہ جان دے دی تھی لیکن ایسا موقع نہیں آنے دیا تھا کہ کوئی اس سے زبردستی کچھ اگلوا سکے۔ وہ بہروپ بدل بدل کر برسوں پاکستان میں رہی تھی اور خود کو ایک ایسی موت کے حوالے کر دیا تھا جس نے اس کی لاش تک کو ناقابلِ شناخت بنا دیا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے یار! یہاں کیوں آ گئے، ریسٹ کر لیتے۔" وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو سلمان نے اسے دیکھ کر کہا۔

"طبیعت تو میجر صاحب نے بالکل صاف کر دی ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا رہا؟" اس نے جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواب دیا اور فوراً ہی اپنے مطلب پر بھی آ گیا۔

"بنگلے کو کلیئر کروا لیا گیا ہے۔ وہاں بھاری اسلحہ اور دھماکا خیز مواد موجود تھا۔ آدمیوں کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ سی ایف پی نے خود وہاں کارروائی کرنے کے بجائے رینجرز کے ذریعے آپریشن کیا ہے۔ آپریشن میں وہاں موجود زیادہ تر افراد ہلاک ہو گئے ہیں۔ جو تھوڑے بہت بچے تھے وہ رینجرز کی کسٹڈی میں ہی ہیں اور وہ لوگ خود ان سے نمٹ لیں گے۔"

"ان تینوں کا کیا ہوا جن کا تم، راشد اور خیری پیچھا کر رہے تھے۔ میں تو اپنی جان کی بازی لگانے کے باوجود سنتھیا کو لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔" اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

"ہم بھی کوئی بڑا تیر نہیں مار سکے۔ میں جس آدمی کا پیچھا کر رہا تھا، اسے تعاقب کا اندازہ ہو گیا اور وہ مجھے ڈاج دے کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ خیری بھی اس وجہ سے ناکام رہا کہ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا شکار اس بنگلے میں موجود ہے... جہاں وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچا تھا لیکن ہوا یہ کہ وہ اور اس کا ساتھی اس بنگلے کی نگرانی کرتے رہ گئے اور جب اس شخص کی گرفتاری کے لیے بنگلے پر ریڈ کیا گیا تو انکشاف ہوا کہ وہ بنگلا اندر سے ساتھ والے بنگلے سے ملا ہوا تھا اور خیری کا شکار وہاں سے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ہم چاروں میں صرف راشد اپنے حصے میں آنے والے بندے کو یہاں تک لانے میں کامیاب ہو سکا ہے لیکن بدقسمتی سے اس شخص کو جھڑپ میں سر پر ایسی چوٹ آئی ہے کہ وہ مسلسل بے ہوش ہے۔ اسے اسپتال میں داخل کروا دیا گیا ہے اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بس اس امید پر بیٹھے ہیں کہ وہ ہوش میں آ جائے تو اس سے کچھ معلوم کیا جا سکے۔" سلمان کی فراہم کردہ معلومات اس کے لیے خاصی مایوس کن تھیں۔ اتنی بھاگ دوڑ کے بعد بھی یوں لگ رہا تھا کہ کچھ ہاتھ نہ آیا ہو۔ سلمان کے سامنے اس نے اپنی اس مایوسی کا اظہار کر دیا۔

"خیر، ایسی بھی بات نہیں ہے۔ اپنے دو اہم افراد ہاتھ سے نکل جانے کے باعث دشمن کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ وہ اپنے ایک اہم ٹھکانے سے محروم ہو گئے ہیں۔ اسلحے اور بارودی مواد کے علاوہ ان کے لیے کام کرنے والے کئی خوں خوار فائٹرز نے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھوئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے اپنی میٹنگ میں جو خطرناک سازشیں تیار کی تھیں، ہم ان سے واقف ہو گئے ہیں۔ اب ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا کہ وہ اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو سکیں۔ ہم کرنل صاحب کی سیکیورٹی کے ساتھ ساتھ مینارِ پاکستان سمیت دیگر اہم مقامات کی سیکیورٹی میں اضافہ کر کے سازشیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنے پر مجبور کر دیں گے۔ تم جو اتنے مایوس ہو رہے ہو، یہ سوچ کر ہی خود کو مطمئن کر لو کہ ہم نے اپنی بھاگ دوڑ کے نتیجے میں قوم کو ایک عظیم صدمے سے دوچار ہونے سے بچا لیا ہے۔ اگر خدانخواستہ مینارِ پاکستان کو کوئی نقصان پہنچ جاتا تو ہم شاید کبھی بھی خود کو معاف نہیں کر سکتے۔ سازش سامنے آنے کے نتیجے میں ہم کم از کم حفاظتی انتظامات کو مزید مضبوط کرنے کے قابل تو ہو گئے ہیں نا... بس یہ کامیابی بھی بہت ہے۔ انسان کے حصے میں

ہر بار سو فیصد کامیابی نہیں آتی کیونکہ اگلی پارٹی جس سے ہم لڑ رہے ہیں کوئی معمولی طاقت تو نہیں رکھتی۔ وہ بھی ہماری طرح تربیت یافتہ ایجنٹ ہیں جو ظاہر ہے، ہاتھ باندھے تو ہمارے سامنے حاضر نہیں ہو جائیں گے۔ انہیں بھی تو آخر اپنے دفاع کے لیے کچھ نہ کچھ تو ہاتھ پیر چلانے ہی ہیں تو وہ تم انہیں چلانے دو۔ انشاء اللہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ہم ان کے ہاتھ پیر توڑ کر انہیں ان کے ملک اس حالت میں واپس پہنچائیں گے کہ ان کے دوسرے ساتھی پاکستان کا رخ کرتے ہوئے سو بار سوچیں گے۔'' جاوید علی کی کیفیت کے پیشِ نظر سلمان اسے تسلیاں دیتا رہا جنہوں نے خاطر خواہ اثر کیا اور اس نے بھی سوچا کہ دشمن موجود ہے تو ہمارا حوصلہ بھی تو مردہ نہیں ہوا۔ ابھی بہت بار ایسے مواقع میسر آئیں گے جب دشمن کو خاک چاٹنے پر مجبور کیا جا سکے گا۔

☆☆☆

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ان تینوں نے اپنے سامنے موجود وسیع و عریض عمارت کا جائزہ لیا۔ اس عمارت کا نام ارجن ولاز تھا اور یہاں وہ اس شخص سے نمٹنے آئے تھے جو مبینہ طور پر انہیں ڈاکٹر فرحان جمیل کا پتا بتا سکتا تھا۔ را کے اس ایجنٹ کے پاس سسر سے ملنے والی دولت کے باعث بے پناہ سہولیات موجود تھیں۔ وہ جس محل جیسے گھر میں رہتا تھا، اس میں جہاں خدمت کے لیے ڈھیروں ملازمین تھے، وہیں حفاظت کے انتظامات بھی خوب کیے گئے تھے۔ ان انتظامات میں انسان اور جدید تکنیک دونوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ ان لوگوں کو یہ معلومات عبدالرحمان نے فراہم کی تھیں اور ان معلومات کی روشنی میں وہ غور و خوض کرتے رہے تھے کہ ارجن تک رسائی کیسے ہو۔ بھائی جی کی طرف سے آدمیوں کی فراہمی کی پیشکش کے باوجود ان کے لیے ارجن کی رہائش گاہ پر چڑھائی کر دینا ممکن نہیں تھا کہ جب دو مسلح گروہ آپس میں ٹکراتے تو ہنگامہ ہوتا اور ارجن کی حیثیت کے پیشِ نظر پولیس فوراً اس کے گھر کی طرف دوڑی آتی۔ ایسے میں وہ ارجن سے خاک کچھ حاصل کر سکتے تھے اس لیے اس آئیڈیے کو تو فوری طور پر مسترد کر دیا گیا۔ اس کے بعد بھی کئی آئیڈیاز زیرِ بحث آئے لیکن سب میں یہی قباحت تھی کہ کام خاموشی سے نہیں ہو رہا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کسی کے علم میں آئے بغیر بات بن جائے۔

مسلح سیکیورٹی گارڈز کو جل دے کر اندر گھسنے کی ترکیب سوچتے سوچتے خود شہریار کو ہی ایک تدبیر سوجھ گئی۔ اپنے ذہن میں آنے والے خیال پر عمل کرنے کے لیے اسے عبدالرحمان کی مدد کی ضرورت پڑی اور عبدالرحمان نے اس کے منصوبے کو سراہتے ہوئے فوراً ہی مدد کی حامی بھی بھر لی۔ شہریار کا منصوبہ بہت سادہ تھا۔ اس نے عبدالرحمان سے ایسی نشہ آور دوا منگوانے کو کہا جو کسی کو مشروب میں ملا کر دی جائے تو آدمی فوری طور پر متاثر نہ ہو بلکہ آہستہ آہستہ دوا اس کے اعصاب کو متاثر کرے۔

عبدالرحمان نے اس کی فرمائش پر نہ صرف یہ دوا منگوا دی بلکہ اپنے آدمیوں کے ذریعے ارجن ولاز کے پینے کے پانی اور دودھ میں شامل کرنے کا انتظام بھی کر دیا۔ یہ کام اس طرح انجام پایا کہ ہر روز ولا میں فراہم کیے جانے والے منرل واٹر کی بڑی کین نما بوتلوں میں دوا انجیکٹ کر دی گئی۔ ولا میں اندر باہر تین مختلف مقامات پر ڈسپنسر لگائے گئے تھے جن کا پانی مالکان و ملازمین سب پیتے تھے اور ڈسپنسر نصب کرنے والی کمپنی صبح و شام پانی فراہم کرنے کی پابند تھی۔ پانی کے علاوہ دودھ میں دوا ملانے کا کام محض احتیاطاً کیا گیا تا کہ کام پکا ہو۔ ولا میں مختلف ضروریات کے لیے ٹیٹرا پیک دودھ استعمال ہوتا تھا اور دودھ کے یہ ڈبے روزانہ کی گروسری کے لیے مامور ملازم ہی خرید کر لاتا تھا۔ اس ملازم کو جل دے کر عبدل کے آدمیوں نے بڑی ہوشیاری سے دودھ کے ڈبوں میں دوا انجیکٹ کر دی۔ پانی اور دودھ میں دوا کی ملاوٹ کا یہ کام ایک ہی دن میں کیا گیا اور اب وہ تینوں رات کے اندھیرے میں ارجن ولا کے اندر داخل ہونے کے لیے تیار تھے۔ ولا اور ارجن کی مسلسل نگرانی کرتے رہنے والے بھائی جی کے آدمیوں نے انہیں اطلاع دے دی تھی کہ ارجن، ولا میں ہی موجود ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک یہ کارروائی کے لیے مناسب ترین وقت تھا۔ اس کارروائی کے لیے عبدل کی کھلی پیشکش کے باوجود انہوں نے بھائی جی کے آدمیوں کو اپنے ساتھ لے آنا منظور نہیں کیا تھا اور صرف ایک ڈرائیور کے ساتھ یہاں پہنچ گئے تھے۔

انہیں امید تھی کہ اندر انہیں زیادہ مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ امکان یہی تھا کہ دودھ اور پانی جیسی اہم چیزوں میں دوا کی ملاوٹ کی وجہ سے تقریباً ہر شخص کے معدے میں دوا پہنچ گئی ہو گی اور اپنا کام شروع کر دیا ہو گا۔ مضبوط اعصاب کے لوگ اس دوا سے اگر بے ہوش نہ بھی ہوتے تو کم از کم اس لائق نہیں رہ سکتے تھے کہ ان کا بھرپور مقابلہ کر پائیں۔ چنانچہ وہ نہایت پُرامید حالت میں پوری تیاری کے ساتھ ارجن ولا کے باہر موجود تھے۔ ان کے ساتھ آنے والے ڈرائیور کو باہر ہی رہ کر ان کا انتظار کرنا تھا۔ البتہ وہ تینوں اس سے مسلسل رابطے میں رہتے اور وہ پوری طرح

تیار رہتا کہ کسی گڑبڑ کی صورت میں انہیں وہاں سے فوری طور پر فرار کروا کر محفوظ مقام تک پہنچا دے۔ بصورتِ دیگر وہ ان کی واپسی کے لیے معاون ہوتا۔ ڈرائیور سے رخصت ہو کر انہوں نے چند منٹ پر مشتمل ارجن ولاز تک کا فاصلہ پیدل طے کیا۔ وہ سامنے کی طرف سے نہیں گئے تھے بلکہ ایک بغلی گلی کا انتخاب کیا تھا۔ ولا کی وسیع عمارت اس طرح بنائی گئی تھی کہ چاروں طرف سے اس کی کوئی بھی دیوار کسی دوسری عمارت سے نہیں ملی ہوئی تھی اور تن تنہا کھڑا ولا بڑا مغرور لگتا تھا۔

پروگرام کے مطابق انہوں نے پہلے ولا کے اطراف میں چکر لگانا شروع کیا اور دائیں سائڈ سے گھومتے ہوئے عمارت کے عقب میں پہنچ گئے۔ عقبی طرف دیوار بہت زیادہ بلند اور سپاٹ تھی اس لیے وہاں سے اندر داخل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ صرف یہ دیکھنے آئے تھے کہ اس طرف کوئی پہرے دار تو موجود نہیں ہے۔ ان کا وہاں کسی سے سامنا نہیں ہوا اور وہ اطمینان سے چلتے ہوئے بائیں سائڈ پر گھوم گئے۔ سائڈوں پر دیوار کی بلندی کم تھی اور کوئی ترکیب لڑا کر ان پر چڑھا جا سکتا تھا لیکن انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان دیواروں پر ایسے خاردار تار لگے ہیں جس میں کرنٹ دوڑتا ہے اور بے خبری میں ان پر چڑھنے کی کوشش کرنے والا اپنی جان سے ہاتھ دھونے کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ انہیں حاصل شدہ معلومات کے مطابق دائیں اور بائیں طرف بڑے بڑے خوب صورت پودوں پر مشتمل باغات بنائے گئے تھے اور ان باغات کے درمیان ہی مختلف مقامات پر مسلح افراد پہرا دیتے رہتے ہیں کہ بالفرض اگر کوئی برقی تار سے بچ کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو بھی جائے تو زندہ واپس نہ جا سکے۔ ان تینوں نے دیوار پھلانگ کر اندر جانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور چلتے چلے گئے حالانکہ ان کی پشت پر لدے بیگز میں ایسا سامان موجود تھا جو ان حفاظتی انتظامات کا توڑ ہو سکتا تھا لیکن مکمل جائزہ لینے سے پہلے وہ کوئی بھی اقدام اٹھانے سے گریزاں تھے۔

ان تینوں میں اس وقت شہریار سب سے آگے تھا۔ اس سے قبل کہ دیوار ختم ہونے پر وہ عمارت کے سامنے والے حصے میں پہنچتے، دو افراد کے بولنے کی آواز نے اسے ٹھٹک کر رک جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے پیچھے آتے سلو اور کلام بھی خودکار انداز میں رک گئے۔

''آج سالی نیند بہت آ رہی ہے۔ ڈیوٹی پوری کرنا کٹھن ہو رہا ہے۔'' دیوار سے چپک کر سانس روکے کھڑے ان تینوں کو کسی کی بوجھل سی آواز سنائی دی۔

''آج پھر تو نے اپنی اوقات سے زیادہ چڑھا لی ہو گی جب ہی یہ حال ہے۔'' جواب میں دوسرا مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔

''نہیں یار، دیکھ لے پوا ابھی تک جیب میں آدھے سے زیادہ پڑا ہے۔ میں نے دو تین چسکیاں ہی لگائی ہیں لیکن حال ایسا ہو رہا ہے جیسے شراب کا ڈرم پی گیا ہوں۔'' پہلے والے کے انداز میں بے بسی تھی اور نظر نہ آنے کے باوجود ان تینوں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا ہے۔

''من تو تیرا ڈرم بھر کر شراب پینے کو ہی چاہتا ہے لیکن جورو سے ڈر کر کم پیتا ہے۔'' اس کے ساتھی نے ایک بار پھر اس کا مذاق اڑایا۔

''ہاں تو تو جیسے اپنی جورو سے ڈرتا ہی نہیں ہے۔ سچ بتا آج چھٹی کا دن کیسے اس کی سیوا کرتے ہوئے بتایا؟ اس نے ہفتے بھر کے کاموں کا ڈھیر تیری چھٹی کے دن کے لیے جمع کر کے رکھا ہوا تھا نا؟'' بوجھل آواز والے کی آواز کا بوجھل پن کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا لیکن وہ تھا خاصا تیز جو اس عالم میں بھی اپنے ساتھی کی جوابی کھنچائی پر تل گیا تھا۔

''میری پتنی مجھ سے بڑا پریم کرتی ہے یار... اور اس کے پریم کے بدلے اگر میں اس کا اور گھر کا خیال رکھتا ہوں تو اس میں کوئی برائی تو نہیں ہے۔'' مذاق اڑانے والے کا لہجہ اب کچھ دفاعی ہو گیا۔

''یہ اچھا پریم ہے کہ وہ تجھے ایک بچہ پیدا کر کے دینے کو تیار نہیں اور ہفتے بھر بعد گھر جانے پر بھی ترساتی رہتی ہے۔'' بوجھل آواز والا اب اسے بخشنے کو تیار نہیں تھا۔

''بچہ بھی ہو جائے گا۔ سچ پوچھ تو ابھی وہ خود بچی سی لگتی ہے اور اس کی جان دیکھ کر میرا اپنا من نہیں کرتا اس پر بوجھ ڈالنے کو۔'' اس نے پست سے لہجے میں صفائی پیش کی۔

''چل اوئے... مجھے بے وقوف سمجھا ہے تو نے۔'' پہلے والا یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

''تو اس بات کو جانے دے، چل چل کر سریتا سے بولتے ہیں کہ دو چار کپ چائے بنا کر بھجوائے تا کہ تیری سستی دور ہو جائے۔'' اس نے موضوعِ گفتگو ہی بدل ڈالا۔

''وہ سالی شاید گدھے گھوڑے بیچ کر سو گئی ہے۔ کتنی دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں لیکن انٹرکام ہی نہیں اٹھاتی۔'' بوجھل آواز والے نے جھنجلائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''ایک اور بار ٹرائی کر لیتے ہیں، ہو سکتا ہے اس ٹائم

وہ باتھ روم میں گئی ہوئی ہو۔"

"چل ٹھیک ہے دیکھ لیتے ہیں۔ مجھے سالے اتا کو بھی جگانا ہے۔ دو گھڑی کمر ٹکانے کا بول کر کیبن میں گیا تھا دو گھنٹے ہونے کو آئے ہیں ابھی تک واپس نہیں آیا۔" وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے وہاں سے پلٹ گئے تو شہریار اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔

"یہ دوسرا آدمی خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ چھٹی پر ہونے کی وجہ سے یہ دوا سے بچ گیا ہے۔"

"پروا نہیں، بس اس کے نشانے پر آنے کی دیر ہے۔" سلو نے اپنی سائیلنسر لگی پسٹل کو چوما۔ بڑے ہتھیاروں کے ساتھ یہ پسٹلز وہ تینوں خصوصی طور پر اپنے ساتھ رکھ کر لائے تھے کیونکہ ان کی سب سے بڑی خواہش ہی یہ تھی کہ کسی بھی قسم کے شور شرابے اور ہنگامے سے بچ کر اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں۔

"صورتِ حال کافی نازک ہے۔ یہاں سب لوگ دوا سے پوری طرح متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کو یہ احساس ہوگیا کہ ان کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو وہ پولیس کو بھی انفارم کرسکتا ہے۔" وہ خاصی تشویش کا شکار تھا۔

"اب تو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ لڑنے والوں کو مرنے سے کبھی ڈرنا نہیں چاہیے۔" سلو نے بے نیازی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"میں مرنے سے نہیں ڈرتا لیکن اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے بغیر مرنا بھی نہیں چاہتا۔" شہریار نے خشک لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

"انسان کے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہاں ہر شخص یہ سوچ کر قیامت تک جینا چاہتا ہے کہ ابھی فلاں کام کرنا ہے اور فلاح خواہش باقی ہے۔ لیکن جب موت کا فرشتہ آجاتا ہے تو پھر کسی کی کوئی پیش نہیں چلتی۔" سلو فلسفیانہ موڈ میں تھا۔

"اس بحث کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ ابھی ہمیں پوری توجہ اپنے ٹارگٹ پر رکھنی ہوگی۔" بحث کے طول پکڑنے سے پہلے کلام نے دخل اندازی کی تو شہریار سنجیدگی سے انہیں ہدایات دینے لگا۔ ویسے خود اس کا بھی اس موقع پر مزید بحث جاری رکھنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

"میں مین گیٹ پر نظر رکھتا ہوں، تم کلام کے ساتھ دیوار پھلانگنے کے کام میں حصہ لو۔" اس کی ہدایات سننے کے بعد سلو نے اپنا فیصلہ سنایا۔ عام حالات میں شاید شہریار خود مین گیٹ والوں سے نمٹنے کا فیصلہ کرتا لیکن سلو سے ہونے والی تازہ بحث کی روشنی میں اس نے اس کے فیصلے سے اختلاف کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ رسک زیادہ ہونے کے باوجود بہرحال اسے یہ اطمینان تو تھا کہ سلو بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہے۔ فیصلہ ہو چکنے کے بعد سلو اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھ گیا جبکہ کلام دیوار پر کمند ڈالنے لگا۔ لوہے کا آنکڑا کرنٹ دوڑتے خاردار تار سے ٹکرایا تو چنگاری سی پیدا ہوئی لیکن ان دونوں نے توجہ نہیں دی اور کلام لپک کر رسی کی مدد سے کسی بندر کی سی پھرتی سے اوپر چڑھنے لگا۔ جب وہ اس حد تک اوپر پہنچ گیا کہ خاردار تاروں تک ہاتھ پہنچ جائے تو رک گیا اور رک کر اپنے بیگ سے کچھ نکالنے لگا۔ وہ مخصوص ساخت کا ایک کٹر تھا جس نے اگلے چند سیکنڈوں میں برقی تار کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اس نے احتیاط سے تار کو ہٹا کر گزرنے کے لیے راستہ بنایا اور مزید اوپر چڑھ کر دیوار پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت اندر سے ایک فائر ہوا اور یہ کلام کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت وہ نیچے جھک کر شہریار کو اوپر آنے کا اشارہ کررہا تھا اس لیے اس کی کھوپڑی اڑنے سے بچ گئی۔ اس نے خود کو بچانے کے لیے فوراً ہی اندر چھلانگ لگا دی اور ایک ایسی جگہ جا کر گرا جہاں موتیے کے بہت سارے پودے ایک ساتھ لگے ہونے کی وجہ سے ایک باڑ سی بن گئی تھی۔ اس نے خود کو فوراً ہی اس باڑ میں چھپالیا۔ ایک فائر اس طرف بھی آیا لیکن گولی کلام کو چھوئے بغیر پیچھے دیوار میں گھس گئی۔ اگلا فائر سائیلنسر لگے پسٹل سے ہوا اور کلام نے کسی کے گرنے کی آواز سنی۔ وہ جھاڑی میں سے جھانک کر دیکھتا اس سے پہلے ہی کوئی دھپ سے اس کے قریب کودا۔

"یہ میں ہوں، ذرا خیال رکھنا۔" اسے شہریار کی تیز سرگوشی سنائی دی جو یقیناً اس اندیشے میں مبتلا تھا کہ کہیں آواز سن کر کلام اس پر فائر نہ کردے۔ اس کی آواز سن کر کلام آڑ سے نکل آیا۔ چمپا کے پیڑ کے پاس اسے ایک آدمی گرا ہوا دکھائی دیا۔ اس کا بھیجا اڑ گیا تھا۔ اس آدمی کو شہریار نے دیوار پر سے اس وقت نشانہ بنایا تھا جب وہ کلام پر تیسرا فائر کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"اگر اندر مزید لوگ ہوش میں ہوئے تو ہمارے لیے بڑی مشکل ہوجائے گی۔" شہریار نے تشویش کا اظہار کیا۔

"میرا خیال ہے کہ کوئی ہوش میں نہیں ہے ورنہ تین فائرز کے بعد کوئی ردِعمل ظاہر ہوتا۔" کلام نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اسی وقت انہیں مین گیٹ کے ذیلی دروازے سے سلو اندر آتا دکھائی دی۔

"کیا رہا؟" اس کے قریب آنے پر کلام نے بے قراری سے پوچھا۔

"ایک تو میرے پہنچنے سے پہلے خود ٹن ہوکر گر گیا تھا، دوسرا اسے ہوش میں لانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے پیچھے سے عین دل کے مقام پر گولی مار کر اس کا کام تمام کردیا۔ کیبن میں بھی ایک بندہ سویا ہوا تھا۔ اس کی بھی کنپٹی بجا کر اس کے لیے سونے کا انتظام کر آیا ہوں۔" اس نے بہت پیار سے اپنے پسٹل کا دستہ سہلایا۔

"ویری ویل ڈن، چلو اب اندر کی خبر لیتے ہیں۔" شہریار نے اس کی کارکردگی کو سراہا۔ ارجن ولا کی مرکزی عمارت کے مقابلے میں احاطہ بہت بڑا تھا۔ مین گیٹ سے مرکزی عمارت تک سرخ بجری کی طویل روش تھی جس کے دونوں اطراف میں گاڑیاں پارک کرنے کے لیے خاصی بڑی جگہ موجود تھی اور بیک وقت وہاں چار بڑی اور قیمتی گاڑیاں کھڑی ہونے کے باوجود خاصی گنجائش نظر آرہی تھی۔ مرکزی عمارت کے دونوں جانب لگائے گئے باغ خاصے وسیع تھے اور یقیناً خوب صورت بھی لیکن رات کے وقت ناکافی روشنی کی وجہ سے وہ پوری طرح سے اس کی خوب صورتی کو دیکھنے سے محروم تھے۔ لان میں بڑی بڑی فینسی لائٹس موجود ہونے کے باوجود انہیں روشن نہیں کیا گیا تھا اور بہت معمولی سی روشنی موجود تھی۔ شاید ایسا اس لیے کیا گیا تھا کہ اگر رات کے وقت کوئی چوری چھپے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو مسلح افراد کے ذریعے اسے پکڑ کر اس جرأت کا مزہ چکھایا جاسکے۔ بہرحال ان کی راہ میں تو اس ایک کے سوا کوئی نہیں آیا تھا۔

وہ باغ میں گھوم پھر کے اس کا جائزہ لینے لگے کہ مبادا کوئی چھپا ہوا دشمن بعد میں ان کے لیے مسئلہ نہ بن جائے۔ تلسی کے پودے کے پاس انہیں دو افراد گہری بے ہوشی کی حالت میں پڑے نظر آئے۔ ان میں سے ایک کی انگلیوں کے درمیان بجھا ہوا سگریٹ کا ٹکڑا ابھی دبا ہوا تھا۔ شہریار نے وہ ٹکڑا نکال کر اسے سونگھا تو انکشاف ہوا کہ وہ ہیروئن سے بھرا ہوا سگریٹ تھا۔ ان کی طرف سے ملائی گئی دوا والا پانی پی کر وہ دونوں یقیناً پہلے ہی متاثر ہوچکے تھے، اس پر سے ہیروئن بھرا سگریٹ بھی پینے بیٹھ گئے۔ دو آتشہ نشے نے ان کی برداشت کی حد ختم کردی اور وہ وہیں گر گئے اور امکان یہی تھا کہ کئی گھنٹوں سے پہلے ہرگز بھی ہوش میں نہیں آسکیں گے۔ ان دونوں کے علاوہ ایک اور آدمی تنہا گھاس پر لیٹا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ بھی نشہ آور دوا کے زیرِ اثر گہری نیند سو رہا تھا۔ انہوں نے اسے چھیڑنے کی کوشش نہیں

کی اور اندر جانے کی تدبیر کرنے لگے۔ لکڑی کا مضبوط دروازہ تو یقیناً لاک تھا اور اندر ہی سے کھولا جاسکتا تھا۔ انہوں نے متبادل راستے کے طور پر کھڑکیوں کو استعمال کرنے کا سوچا۔ کھڑکیاں شیشے کی تھیں لیکن ان میں اندر سے لوہے کی مضبوط جالی لگائی گئی تھی۔ جائزہ لیتے ہوئے وہ ایک ایسی کھڑکی تک پہنچے جس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا البتہ لوہے کی جالی اپنی جگہ تھی۔ کلام اور سلو آگے بڑھ گئے جبکہ شہریار وہیں رک کر اندر کا جائزہ لینے لگا۔ یہ اچھا خاصا بڑا کمرا تھا جس کی سیٹنگ سے اندازہ ہورہا تھا کہ یہ کمرا صنفِ نازک کے استعمال میں ہے۔ غور سے دیکھنے پر اسے اندر جلتے نائٹ بلب کی روشنی میں بستر پر سر سے پیر تک چادر اوڑھے کسی وجود کی موجودگی کا بھی احساس ہوگیا۔ سونے کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ بہت گہری نیند میں ہے۔ شہریار نے فیصلہ کرلیا کہ اسی کھڑکی کے راستے اندر داخل ہونا بہتر ہے۔ اس نے اپنی پشت پر ٹنگے بیگ سے جدید ساخت کی چھوٹے سائز پر مشتمل لوہا کاٹنے والی آری نکالی اور کام شروع کردیا۔ آری بہت بہترین تھی۔ اس نے تیزی سے گرل کو کاٹ کر رکھ دیا اور اندر جانے کے لیے راستہ بن گیا۔ اس دوران میں کلام اور سلو عمارت کے گرد چکر لگانے کے بعد لوٹ کر واپس آچکے تھے۔

"تم یہیں رکو، ہم دونوں اندر جاتے ہیں۔" شہریار نے کلام کو ہدایت کی۔ اس کے ذہن میں یہ خدشہ موجود تھا کہ یہاں حفاظت کے جدید انتظامات موجود تھے۔ اس کے باوجود اندر سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ فائرنگ نے بھی کسی پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا تو یہ ایک غیر فطری سی بات تھی۔ وہ خود کو یہ تسلی دے کر بھی مطمئن نہیں ہوسکتا تھا کہ اندر موجود کل افراد بے ہوش پڑے ہوں گے۔ جیسے باہر موجود سیکیورٹی گارڈز میں سے ہر ایک پر بے ہوشی کی دوا یکساں طور پر اثر انداز نہیں ہوئی تھی، اسی طرح اندر بھی کچھ افراد کو ضرور ہوش میں ہونا چاہیے تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے گرل کاٹ کر اندر داخل ہونے کی کوشش کے نتیجے میں عمارت کے کسی حصے میں الارم ضرور بجا ہوگا۔ پھر کیا وجہ تھی کہ کہیں سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہورہا تھا۔ یہ کوئی ٹریپ بھی تو ہوسکتا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ اندر والے خود انہیں اندر داخل ہونے کی چھوٹ دے رہے ہوں تاکہ انہیں چوہے دان میں پھنسایا جاسکے۔ بہرحال جو بھی تھا، وہ اندر داخل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ البتہ کلام کو احتیاطاً باہر چھوڑ دیا گیا تھا کہ حالات بگڑنے کی صورت میں وہ کچھ کرسکے۔

اندر داخل ہونے کے بعد اس نے پہلے بستر کی طرف

رخ کیا اور تھوڑی سی چادر ہٹا کر خوابیدہ وجود کا جائزہ لیا۔ وہ سولہ سترہ سال کی کم سن لڑکی تھی جو بہت گہری نیند سو رہی تھی۔ اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ دوا کے زیرِ اثر ہے پھر بھی اس نے احتیاطاً اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ اب وہ ہوش میں آنے کے بعد بھی کوئی حرکت نہیں کرسکتی تھی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ دونوں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے کمرے سے باہر نکلے۔ ان کے سامنے ایک خالی کوریڈور تھا جس میں بہت سے دروازے کھل رہے تھے۔

وہ ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر ایسے زاویے سے محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے کہ اگر کوئی انہیں ٹریپ کرنے کی کوشش کرے تو بیک وقت دونوں کو نہ پھانس سکے لیکن ان کے خدشات کے برعکس ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کوریڈور میں موجود بیشتر کمرے خالی تھے۔ صرف ایک کمرے میں انہیں بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا سوتا ہوا ملا جو یقیناً ارجن کا بیٹا تھا۔ انہوں نے اس لڑکے کے ساتھ لڑکی والا ہی سلوک کیا اور مزید آگے بڑھے۔

اس طویل کوریڈور میں انہیں مزید کوئی ذی نفس نظر نہیں آیا اور وہ گھومتے ہوئے عمارت کے دوسرے حصے میں داخل ہوگئے۔ اس عمارت میں گھومتے ہوئے شہریار کو اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی وسعت کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت کم ہے لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ بھائی جی کے گرگوں کو بھی اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتے تھے کیونکہ ان پر سو فی صد بھروسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ ادھر بھارت میں پہلے سے کام کرتے کلام کے ساتھیوں کو کال کرنا بھی اس لیے مناسب نہیں تھا کہ کہیں وہ لوگ بھی کسی کی نظر میں آجائیں چنانچہ انہیں رسک لینا پڑا تھا۔

راؤنڈ لیتے ہوئے وہ جدید سہولیات سے آراستہ بڑے سے کچن میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک عورت ساڑی میں ملبوس کچن ٹیبل پر سر ٹکائے دنیا جہاں سے بے خبر سو رہی تھی۔ عورت کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی اور اس کی مانگ میں سندور لگا ہوا تھا۔ وہ یقیناً کچن کی انچارج سریتا تھی۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پیر باندھنے کی زحمت نہیں کی بلکہ ریوالور کے دستے سے کنپٹی پر لگائی گئی ایک جچی تلی ضرب نے یہ اطمینان دلا دیا کہ وہ اب کئی گھنٹے جاگنے کے لائق نہیں رہی ہے۔ کچن سے نکل کر وہ ایک ایسے کمرے میں جا پہنچے جس نے انہیں ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ عمارت کا کنٹرول روم تھا اور وہاں نصب اسکرینز پر عمارت کے اندرونی و بیرونی بہت سے حصوں کے مناظر نظر آرہے تھے۔ وہ خود کھڑکی کے قریب کھڑے کلام کو بہ خوبی دیکھ سکتے تھے۔ اتنے زبردست انتظام کے بعد کسی کو بے خبری میں نشانہ بنالینا کیا مشکل تھا لیکن ان کی خوش قسمتی رہی تھی کہ کنٹرول روم میں موجود دونوں افراد بھی دوا کے زیرِ اثر تھے۔ ان میں سے ایک کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکائے سو رہا تھا تو دوسرے نے کمپیوٹر ٹیبل پر ماتھا ٹکا رکھا تھا۔ دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے وہ اس کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ کنٹرول پینل کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں اندازہ ہوا کہ یہاں سے محض نگرانی کا کام نہیں ہو رہا تھا بلکہ یہ دونوں افراد جدید آلات کی بدولت اس لائق تھے کہ محض انگلی کی جنبش سے وہاں میدان جنگ سجا ڈالتے۔ عمارت میں کئی مقامات پر ایسی خودکار گنز نصب کی گئی تھیں جنہیں یہاں بیٹھے بہ آسانی آپریٹ کیا جاسکتا تھا لیکن ان دونوں کے دنیا و مافیہا سے بے خبر سوئے ہوئے ہونے کے باعث ایسا کچھ نہیں ہوسکا تھا۔

سلو نے بنارعایت ان دونوں کو ناکارہ بنایا جبکہ شہریار کی پیڈ سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے مانیٹر پر عمارت کے مختلف مناظر دیکھنے لگا۔

ارجن کا اپنی حفاظت کے لیے کیا گیا یہ انتظام اب ان کے کام آرہا تھا۔ چند منٹوں میں شہریار نے انگلیوں کی معمولی جنبش سے پوری عمارت کو کھنگال ڈالا۔ انہیں ملنے والا لڑکا، لڑکی کے علاوہ انہیں ایک بیڈروم میں سوئے ہوئے ارجن اور اس کی بیوی دکھائی دیے۔ دیگر مقامات پر موجود لوگ بھی سوئے ہوئے تھے۔ اپنی وضع قطع سے وہ لوگ ارجن کے ملازمین محسوس ہو رہے تھے۔ انہیں حاصل شدہ معلومات کے مطابق بھی وہاں ارجن کے بیوی بچوں کے علاوہ صرف ملازمین ہی موجود ہوتے تھے۔ اپنی انگلی کی جنبش سے اسکرین پر تیزی سے بدلتے ہوئے مناظر دیکھتا شہریار ایک کمرے کا منظر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہاں بستر پر کُرتے پاجامے میں ملبوس ایک مخنی سا آدمی پانی میں شرابور ہٹپٹایا ہوا بیٹھا تھا جبکہ بستر کے قریب ایک موٹی تازی سی عورت ہاتھوں میں پلاسٹک کی بالٹی پکڑے کھڑی مرد سے کچھ کہہ رہی تھی۔ مرد کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ نیند سے جاگنے کے بعد بدحواس ہے اور کوشش کے باوجود عورت کی بات سمجھ نہیں پا رہا ہے جس کی وجہ سے عورت کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا اور مہین سی نائٹی میں مشکل سے سمائے بھاری جسم کی بوٹیاں پھڑک رہی تھیں۔

''تم ارجن اور اس کی بیوی کا بندوبست کر کے آؤ، میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں۔'' سلو کو ہدایت دیتا ہوا وہ تیزی سے حرکت میں آگیا۔ جس کمرے میں اس نے مرد و عورت کو دیکھا تھا، وہ دوسری منزل پر واقع تھا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچنے کے بعد وہ وہیں رک کر اندر کی سن گن لینے لگا۔

''تو کیا کہہ رہی ہے بھاگوان، میری بدھی میں کچھ نہیں آرہا۔'' اندر سے مرد کی آواز سنائی دی جو اس کے وجود کی طرح ہی مخنی سی تھی۔

''میں کہہ رہی ہوں کہ یہاں ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے فائرنگ کی آواز سنی ہے۔'' عورت کی پاٹ دار آواز میں جھنجلاہٹ کا عنصر بھی موجود تھا۔ شاید وہ یہ بات کئی بار شوہر کے گوش گزار کر چکی تھی لیکن اس کا نیند میں ڈوبا ہوا ذہن سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا۔

''ڈاکو آگئے ہیں تو تمہیں اور مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے بھائی کے اس محل میں سارا بندوبست ہے۔ ڈاکو بے چارے آکر خود ہی پھنس جائیں گے۔'' مرد نے جواب دیا اور ساتھ ہی زوردار جمائی بھی لی۔

''تم تو نرے احمق ہی رہنا۔ میں کہتی ہوں اس گولڈن چانس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ بھابی اپنے گہنے کہاں رکھتی ہیں۔ میں وہ گہنے نکال کر اپنے سامان میں چھپا لیتی ہوں۔ بعد میں سب یہی سمجھیں گے کہ گہنے ڈاکو لے گئے ہیں۔'' وہ ارجن کی بہن تھی، سو اس کی طرح چالباز کیوں نہ ہوتی۔ موقع ملنے پر اپنی سگی بھابی کو ہی لوٹنے کا منصوبہ بنانے لگی تھی۔

''کیا بولتی ہے بھاگوان؟ ادھر تو سانس بھی لو تو تیرے بھائی کو خبر ہو جاتی ہے اور تو چلی ہے اپنی بھاوج کے گہنے چرانے۔'' مرد کا لہجہ سہما ہوا تھا۔ اسے ارجن جیسے سالے سے ڈرنا ہی چاہیے تھا۔

''بات سنو میری... مجھے لگتا ہے کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔ میں گولیوں کی آواز سن کر جاگی ہوں اور حیران ہوں کہ ابھی تک کسی نے کچھ کیا کیوں نہیں۔ سارے نوکروں چاکروں اور گارڈز کے علاوہ بھیا اور بھابی بھی گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔ خود تمہیں میں نے بڑی مشکل سے جگایا ہے۔ بالکل ایسا لگتا ہے کہ کسی نے سارے کے ساروں کو نیند کی دوا کھلا کر سلا دیا ہے اور اب یہاں کوئی بڑی گھٹنا ہونے والی ہے۔'' موٹی واقعی بہت ہوشیار تھی اور حالات کا ٹھیک ٹھاک تجزیہ کر رہی تھی۔

''نیند تو مجھے بھی بہت آرہی ہے لیکن تو بتا کہ تو کیوں باقی سب کی طرح سوئی نہیں اور میرا دماغ کھا رہی ہے۔ جا تجھے جو کرنا ہے آپ کرلے اور مجھے سونے دے۔'' مرد اتنا

بھی دبو نہیں تھا جتنا مانیٹر کی اسکرین پر دیکھ کر اپنی صحت اور حلیے کے باعث اسے محسوس ہوا تھا۔

''تم تو سدا ڈرتے ہی رہنا۔ تمہاری یہ کاہلی اور بزدلی ہی ہے جس کے کارن ہم آج تک وہیں کے وہیں ہیں اور ترقی نہیں کرسکے۔'' میاں کا فیصلہ سننے کے بعد عورت اپنی پاٹ دار آواز میں بڑبڑائی اور آوازوں سے یوں محسوس ہوا کہ وہ باہر آنے کو ہی ہے۔ شہریار نے اب مزید وہیں رکے رہنا مناسب نہیں سمجھا اور تیزی سے حرکت کرتا ہوا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ عورت نے جو اسلحہ تھامے ایک نقاب پوش کو اپنے سامنے دیکھا تو چیخنے کے لیے پورا منہ کھول دیا لیکن اس کے حلق سے چیخ برآمد ہونے سے قبل ہی شہریار نے پسٹل کی نال اس کے منہ میں گھسا دی۔

''آواز نکالی تو جان سے جاؤ گی۔'' ساتھ ہی وہ دھیمی آواز میں غرایا لیکن بہرحال اس کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ ... سونے کے لیے بستر پر لیٹ جانے والا مرد اٹھ بیٹھا اور خوف زدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں نے تم دونوں کی ساری باتیں سن لی ہیں اس لیے بہتر ہے کہ جو میں پوچھوں شرافت سے بتاتے جاؤ۔'' اس کے سختی سے کہنے پر عورت نے جلدی سے یوں سر کو جنبش دی جیسے اپنے تعاون کا یقین دلانا چاہتی ہو۔ شہریار نے پسٹل کی نال اس کے منہ سے نکال لی اور وہ ہانپتی ہوئی بستر پر گر گئی۔

''اسے پانی پلاؤ۔'' سرہانے رکھے جگ گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شہریار نے اس کے شوہر کو حکم دیا کیونکہ عورت کی جیسی حالت ہو رہی تھی، اسے دیکھتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

''آ گیا دو تو میں ریفریجریٹر سے کولڈ ڈرنک نکال لیتا ہوں۔ یہ یہاں آکر پانی پینا پسند نہیں کرتی اور اس کی جگہ... صرف کولڈ ڈرنک اور جوس پیتی ہے۔'' مرد نے عاجزی سے درخواست کی تو اس کی سمجھ میں آگیا کہ یہ عورت کیوں جاگ رہی تھی۔ اس نے سرے سے وہ پانی پیا ہی نہیں تھا جس میں انہوں نے خواب آور دوا ملائی تھی۔

''تم دونوں کون ہو اور یہاں کب آئے ہو؟'' مرد کو ریفریجریٹر سے کولڈ ڈرنک نکالنے کی اجازت دیتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

''میں پرکاش ہوں... ارجن کا جیجا اور یہ اس کی دیدی سیتا ہے۔ ہم آج رات ہی سورت سے یہاں پہنچے ہیں اور ہمارا یہاں ایک ہفتہ ٹھہرنے کا پروگرام ہے۔'' اس نے بتایا۔

"کس لیے آئے ہو؟"

"بس یونہی، سیتا کا جب عیش کرنے کو من کرتا ہے تو وہ مجھے یہاں گھسیٹ لاتی ہے۔ میرے پاس اس کے بھائی جتنی دولت جو نہیں ہے۔" وہ کچھ اداس سا بتانے لگا۔

"او کے، تم دونوں بستر سے اٹھو اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" اسے ان دونوں سے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور سخت لہجے میں حکم سنایا۔

"تم ہمیں گولی تو نہیں مارو گے نا؟" کچھ دیر قبل مکارانہ منصوبہ بندی کرتی سیتا نے بھیگی بلی جیسے لہجے میں اس سے پوچھا۔

"نہیں، مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" شہریار نے اسے جواب دیا اور پسٹل لہراتے ہوئے اشارہ کیا کہ فوری اس کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ دونوں میاں بیوی مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اپنی جگہ سے حرکت کر کے دیوار تک پہنچ گئے اور منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ شہریار نے ان کی پشت پر جا کر پہلے مرد کے سر پر دستے سے ضرب لگائی۔ وہ فوراً ہی تیورا کر گرا۔ سیتا اپنے پتی کو گرتے دیکھ کر بے ساختہ پلٹی۔ اس وقت شہریار اسے ضرب لگانے کے لیے ہاتھ کو حرکت میں لا چکا تھا چنانچہ سر کے بجائے چہرے پر ضرب لگی اور اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ تکلیف کے باعث اس نے ایک زوردار چیخ ماری لیکن اس دوران شہریار کا ہاتھ دوبارہ حرکت میں آ چکا تھا۔ اس بار ضرب کنپٹی پر پڑی اور وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر گئی۔

"تم کہاں ہو؟" اس نے اس کام سے فارغ ہونے کے بعد سلو کو پکارا۔ مشن کے دوران ایک دوسرے سے رابطے میں رہنے کے لیے وہ ایک جدید قسم کا آلہ استعمال کر رہے تھے۔ باقی سامان کی طرح یہ آلہ بھی انہیں بھائی جی کی طرف سے ہی فراہم کیا گیا تھا۔

"کنٹرول روم میں۔ میں نے ارجن اور اس کی بیوی کے ہاتھ پیر باندھ دیے ہیں اور باقی عمارت بھی چیک کر لی ہے۔ اب یہاں ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔" سلو نے فوراً اسے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، تم وہیں رہو اور ہر طرف نظر رکھو۔ میں یہاں ارجن سے پوچھ گچھ کرتا ہوں۔ کلام! تم میرے پاس آ جاؤ اور ہاں، آتے ہوئے ارجن کی بیٹی کو بھی لے آنا۔" اس نے بیک وقت اپنے دونوں ساتھیوں کو ہدایات دیں اور خود ارجن کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

خواب گاہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی کسی دولت میں کھیلتے ہوئے آدمی کی ہونی چاہیے۔ وسیع و عریض بیڈ پر اس کے پہلو میں سوئی ہوئی بیوی بھی بے حد خوب صورت تھی اور کہا جا سکتا تھا کہ قسمت کی دیوی ارجن پر مہربان رہی تھی کہ اس امیر زادی کا دل اس پر آ گیا تھا جس نے اس کی زندگی ہی بدل کر رکھ دی تھی لیکن اب قسمت ایک اور کھیل کھیلنے والی تھی جس میں ارجن کے حصے میں کامیابی آنے کا امکان بہت کم تھا۔ وہ آگے بڑھا تو فوراً ہی اس کی نظر میں سائڈ ٹیبل پر رکھی خواب آور گولیوں کی شیشی آ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ ایک سیکرٹ ایجنٹ کی ایسی غفلت بھری نیند کی کہ وہ اپنے ہاتھ پیر باندھنے کے عمل کے دوران بھی نہیں جاگ سکا تھا، کیا وجہ تھی۔ اس بے چارے نے تو انجانے میں ڈبل ڈوز لے لی تھی۔ ایک طرف وہ دن بھر ایسا پانی پیتا رہا تھا جس میں خواب آور دوا ملی ہوئی تھی اور دوسری طرف اس نے اپنے ہاتھوں سے سلیپنگ پلز لے لی تھیں۔ شاید وہ ان کا عادی تھا اور روزانہ سونے سے پہلے یہ گولیاں ضرور کھاتا تھا۔ اس کا ثبوت آدھی سے زیادہ خالی ہو جانے والی شیشی تھی۔ ارجن کے تکیے کے نیچے سے جھانکتا ہوا پسٹل بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں رہا۔ سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود اپنے تکیے کے نیچے پسٹل رکھ کر سونے کی عادت اس کے سیکرٹ ایجنٹ ہونے کا ثبوت تھی۔

شہریار کے اندازے کے باوجود وہ ایک ایسا آدمی ہوگا جو اپنے سائے سے بھی بھڑک جاتا ہوگا۔ ایسے لوگ سفاک ہونے کے ساتھ ساتھ بزدل بھی ہوتے ہیں۔ اسے امید تھی کہ وہ جلد ہی ارجن کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن پہلے تو اسے ہوش میں لانا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر باہر نکالا اور ارجن کے رخسار پر ایک چرکا لگا دیا۔ نتیجے میں اس نے ایک سسکاری لی اور آنکھیں کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے شہریار نے اس کے دوسرے رخسار پر ایک زوردار تھپڑ دے مارا۔ عین اسی وقت کلام، ارجن کی بیٹی کو کندھے پر ڈالے کمرے میں داخل ہوا۔

"کک... ک... کون ہو تم؟" ارجن نے آنکھیں کھول کر اپنے بیڈ روم کا منظر دیکھا اور لکنت زدہ آواز میں پوچھنے لگا۔

"موت کے فرشتے۔" شہریار نے اتنے سرد لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا کہ کلام کو اس کا ساتھی ہونے کے باوجود اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑتی محسوس ہوئی۔

"کیا چاہتے ہو؟" اب ارجن نے خود کو کسی حد تک سنبھال لیا تھا اور نظریں گھما کر ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نظر بیٹی پر پڑی تو بوکھلایا ہوا نظر آنے لگا۔

"سوئٹی کو یہاں کیوں لائے ہو؟" تھوک نگل کر خشک حلق کو تر کرتے ہوئے اس نے بہ مشکل پوچھا۔

"تاکہ سوئٹی کے سوئٹ سے ڈیڈی کو ہمارے سوال کا جواب دینے کے لیے زیادہ سوچنا نہ پڑے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا پھر ہاتھ میں پکڑا خنجر کلام کی طرف اچھال کر اس سے بولا۔

"یہ پکڑو، میرے سوال پوچھنے کے بعد اگر ارجن نے فوری جواب نہیں دیا تو ہر پانچ سیکنڈ بعد اس لڑکی کی ایک انگلی کاٹ دینا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے اس لیے میں اس سے زیادہ مہلت نہیں دے سکتا۔"

"او کے باس۔" کلام کے لیے ایک بے گناہ لڑکی پر ایسا تشدد کرنا بہت مشکل تھا لیکن شہریار جس موڈ میں نظر آ رہا تھا، اسے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ادھر ارجن بھی بلبلا اٹھا۔

"تم اس نردوش بچی پر ایسا ظلم نہیں کر سکتے۔" بندھا ہوا ہونے کے باوجود اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

"ظلم ہم نہیں تم کرو گے۔ ہمارے پوچھے گئے سوال کا جواب نہ دے کر۔" شہریار نے اسی سرد مہری سے جواب دیا۔

"پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو تم لیکن اسے کچھ مت کرنا۔"

"ڈاکٹر فرحان جمیل کو کہاں رکھا گیا ہے؟" شہریار نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا تو وہ چونک گیا۔

"اوہ... تو تم وہ پاکستانی ایجنٹ ہو جو اس چکر میں پریم ناتھ کو بھی نارچ کا نشانہ بنا چکے ہو۔"

"پانچ سیکنڈ بہت جلدی گزر جاتے ہیں ارجن۔" اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے شہریار نے اسے تنبیہہ کی۔

"خبردار! تم میری بیٹی کے ساتھ ایسی حرکت نہیں کر سکتے۔" وہ نفرت زدہ لہجے میں چلّایا۔

"پانچ سیکنڈ پورے ہو گئے ہیں۔" اس کے چیخنے پر دھیان دیے بغیر وہ سپاٹ لہجے میں بولا اور کلام کو اشارہ کیا جس نے قدرے جھجکتے ہوئے لڑکی کی بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر خنجر چلا دیا۔ زخم لگنے سے اس کا جسم بری طرح پھڑکا۔ اس کے باوجود وہ ہوش میں نہیں آئی، بس نیند میں ہی کراہتی

رہی۔ کلام کی بیوی بھی ابھی تک نیند میں ہی تھی لیکن اس کی پلکوں کی جنبش سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کمرے میں جاری کارروائی اسے ڈسٹرب کر رہی ہے اور اب وہ کسی بھی لمحے آنکھیں کھول سکتی ہے۔

"یہ کیا کر رہے ہو ایڈیٹ... تمہیں مجھ سے اپنے سوالوں کے جواب چاہئیں تو مجھے ٹارچر کرو، اس معصوم کو کیوں نشانہ بنا رہے ہو۔" بیٹی کی انگلی کٹتے دیکھ کر وہ چلّانے لگا۔

"کیوں کا جواب بہت واضح ہے ارجن۔ تم نے پاکستان میں اپنے ایجنٹوں کو بم بلاسٹ اور ٹارگٹ کلنگ کے احکامات دیتے ہوئے کبھی سوچا ہے کہ تمہارے اس ظالمانہ اقدام سے کتنی معصوم جانیں ضائع ہو جائیں گی، کتنے لوگ اپنے اعضا سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور کس کس گھر کا چولہا بجھ جائے گا۔" اس نے جذباتی انداز میں اسے جواب دیا اور کلام کی طرف مڑ کر اسے ایک اور انگلی اڑا دینے کا اشارہ کیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اس حکم کی تعمیل کی۔ اس بار لڑکی کا جسم پہلے سے زیادہ بری طرح پھڑکا لیکن ہوش میں وہ اب بھی نہیں آئی۔ اس کے برعکس اس کی ماں نے آنکھیں کھول دیں۔

"تم بچ کر نہیں جا سکو گے۔ ہماری دھرتی پر قدم رکھ کر تم نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ یہاں سے تمہاری لاشیں بھی واپس پاکستان نہیں جائیں گی۔" ارجن کسی پنجرے میں بند درندے کی طرح دھاڑنے لگا۔

"پانچ سیکنڈ پورے ہو گئے ہیں تمہاری اس بکواس میں۔" اس کی دھمکیوں کو خاطر میں لائے بغیر شہریار نے سابقہ انداز میں اسے مطلع کیا جس پر اس کے چہرے کا خون بالکل ہی نچڑ گیا۔

"پلیز... پلیز! میری بچی پر یہ ظلم نہیں کرو۔ یہ تو پہلے ہی مُردوں سے بدتر حالت میں جی رہی ہے۔ تم اور مار کر کیا کرو گے؟" ہوش میں آ کر ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوئی ارجن کی بیوی نے اچانک ہی دخل اندازی کرتے ہوئے لجاجت سے درخواست کی۔

"کیا مطلب؟" اس کے جملوں نے شہریار کو چونکا دیا اور وہ بے ساختہ ہی پوچھ بیٹھا۔

"یہ کوکین کا نشہ کرتی ہے اور اس نشے نے اسے اندر سے بالکل کھوکھلا کر دیا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اس کا علاج ہو جائے لیکن یہ ہمارے ساتھ کوآپریٹ ہی نہیں کرتی۔ آج بھی اس نے پیپر ویٹ مار کر کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا تھا اور

دھمکی دی تھی کہ اگر ہم نے اسے کوکین نہیں دی تو اپنی گردن میں شیشہ مار کر اپنی جان لے لے گی۔ مجبوری میں ہمیں اپنے ہاتھ سے اسے یہ زہر دینا پڑا۔'' تفصیل بتا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شہریار اس انکشاف پر اپنی جگہ دنگ رہ گیا۔ لوگوں میں موت بانٹتے پھرنے والے ارجن کے اپنے گھر میں موت نے اس طرح پنجے گاڑ دیے تھے کہ اس کی اکلوتی بیٹی کے جسم سے قطرہ قطرہ کر کے زندگی نچوڑ رہی تھی اور وہ بے بس تھا۔ شاید اپنی اسی بے بسی کی وجہ سے اسے سونے کے لیے نیند کی گولیوں کی مدد لینی پڑتی تھی۔

''فرسٹ ایڈ باکس کہاں ہے؟'' وہ انسان تھا خود پر کتنی ہی درندگی طاری کرنے کی کوشش کرتا، اپنے اندر کی انسانیت کو نہیں پچھاڑ سکتا تھا۔ اس وقت بھی اسے سیکنڈوں کی گنتی بھول گئی۔

''وہ اس الماری میں۔ سب سے نیچے والے خانے میں۔'' مسز ارجن نے سسکتے ہوئے بتایا۔

''اس کی بینڈیج کر دو۔'' اس نے کلام کو حکم دیا۔ وہ تو جیسے منتظر ہی تھا، فوراً فرسٹ ایڈ باکس نکال کر بے ہوش لڑکی کی مرہم پٹی کرنے لگا۔ بے ہوشی کی دوا کے علاوہ یہ اس کی رگوں میں دوڑتے کوکین کے نشے کا زہر بھی تھا جو وہ ایک بے پناہ اذیت ناک تجربے سے گزرنے کے باوجود ہوش میں نہیں آسکی تھی۔

''اب تم کیا بولتے ہو؟ تمہارے کسی لائق نہ ہونے کے باوجود ہم نے تمہیں رعایت اور مہلت دونوں دے دی ہیں لیکن اب بھی اگر تم نے اپنی زبان نہیں کھولی تو ہمارا اگلا نشانہ تمہارا بیٹا ہوگا اور اس بار میں انگلیاں کٹوانے میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔ سیدھے سیدھے ہر پانچ سیکنڈ بعد اس کا ایک ایک عضو کٹتا جائے گا۔'' کلام اپنے کام سے فارغ ہوگیا تو وہ دم بخود پڑے ارجن سے مخاطب ہوا۔

''یہ تم سے کیا پوچھ رہے ہیں ارجن، انہیں بتا دو۔ میں اپنی نظروں کے سامنے اس طرح اپنے بچوں کو کٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔'' اس کی بیوی روتے ہوئے زور سے چیخ کر بولی۔

''یہ مجھ سے دیش کا ایک اہم راز جاننا چاہتے ہیں۔'' ارجن نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں اسے بتایا۔

''تو بتا دو، تم کون سا بڑے دیش بھگت ہو۔ لاکھوں کا ٹیکس کھا جاتے ہو، لوگوں کو بے وقوف بناتے ہو اور موقع ملنے پر بلیک میلنگ سے لے کر منی لانڈرنگ تک سب کچھ کر گزرتے ہو تو پھر ایک راز بتانے میں کیا مسئلہ ہے؟'' اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ارجن کی دیوانی تھی اور اپنی دیوانی محبت میں اس نے اس کی حیثیت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے باپ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے سے کئی گنا نیچے خاندان سے تعلق رکھنے والے ارجن کو اپنے اکلوتے داماد کے طور پر قبول کر لے۔ بیاہ کے بعد بھی اس نے اپنا تن من دھن پتی پر نچھاور کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور سب سیاہ و سفید کا مالک اسے بنا دیا تھا لیکن اس وقت معاملہ اس کی اولاد کا تھا چنانچہ وہ ایک وفادار پتنی سے زیادہ ماں دکھائی دے رہی تھی جس کی دیوانگی اپنی اولاد کی بقا کے سوا کچھ نہیں چاہتی تھی۔

''لڑکے کو یہاں لے آؤ۔'' بیوی کی باتیں سن کر ارجن کے چہرے کی رنگت یوں بھی تیزی سے بدل رہی تھی، شہریار نے کلام کی طرف رخ کر کے یہ حکم صادر کیا تو اس کا چہرہ بالکل ہی زرد پڑ گیا۔

''ٹھہرو، میں بتاتا ہوں۔'' کلام ابھی کمرے کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور اس نے بے بس انداز میں اسے پکارا۔

''اسے گاندھی نگر کے ایک اسپتال میں رکھا گیا ہے۔ اس کی ذہنی اور جسمانی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے اس لیے اس کا اسپتال میں رہنا ضروری ہے۔'' ارجن کے بتانے پر اس کا دماغ چکرا سا گیا۔ قدرت کتنی بار انہیں گاندھی نگر لے جا چکی تھی لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکا تھا کہ ان کا گوہر مقصود وہاں موجود ہے۔ ڈاکٹر فرحان جمیل کی تلاش میں بھٹکتے اگر آج وہ ارجن تک نہیں پہنچتے تو کبھی خیال بھی نہیں آپاتا کہ ہر بار گھوم پھر کر گاندھی نگر ہی کیوں جا پہنچتے ہیں۔ ان لمحات میں جہاں اسے ڈاکٹر فرحان کا پتا مل جانے کی خوشی ہو رہی تھی، وہیں ان کی حالت ٹھیک نہ ہونے کا سن کر شدید غصہ بھی آرہا تھا۔ اندازہ تھا کہ بھارتیوں کی تحویل میں انہیں اتنی شدید ذہنی اور جسمانی اذیتیں دی گئی ہوں گی کہ ان کا حلیہ ہی بدل کر رہ گیا ہوگا۔ اس نے تصویر میں ڈاکٹر صاحب کو دیکھا تھا اور بلاشبہ وہ اچھی شخصیت کے مالک ایک ایسے انسان تھے جن کے چہرے سے ہی ان کی ذہانت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ ایسے شاندار شخص کی بری حالت کا سن کر اس کا دل و دماغ غصے سے بھر گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو اس حال تک پہنچانے میں جن لوگوں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا، ان میں سے ایک ارجن اگروال بھی تھا اور اس کے لیے وہ اپنے دل میں جان بخشی کی کوئی گنجائش نہیں پاتا تھا چنانچہ کچھ سوچتا ہوا مسز ارجن کی طرف پلٹا اور بولا۔

''مسز ارجن! آپ کی جیولری کہاں ہے؟ ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔''

اس کے اس مطالبے پر وہ بنا کسی احتجاج کے خود کار انداز میں اٹھی اور ایک دیوار پر لگی پینٹنگ کی طرف قدم بڑھائے۔ پینٹنگ میں جنگل کے ماحول میں ایک شیر کو ہرن پر حملہ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ مسز ارجن نے پینٹنگ کے سامنے کھڑے ہو کر شیر اور ہرن پر اپنا ایک ایک ہاتھ جمایا اور ہاتھوں کو یوں حرکت دی جیسے ہرن کو شیر کی گرفت سے چھڑوا رہی ہو۔ دفعتاً ایک کھٹکا سا ہوا اور فریم اس طرح دو حصوں میں تقسیم ہوگیا کہ شیر ایک طرف اور ہرن دوسری طرف۔ درمیان میں پیدا ہونے والے خلا میں نمبروں والی ایک تجوری نظر آرہی تھی۔ مسز ارجن اگروال نے نمبر ملا کر وہ تجوری کھولی تو ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ تجوری زیورات اور نوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ یعنی کچھ دیر قبل مسز اگروال نے اپنے شوہر پر منی لانڈرنگ کا جو الزام لگایا تھا، وہ غلط نہیں تھا۔

''یہ سب ایک بیگ میں ڈال کر ہمارے حوالے کر دو۔'' فوری فیصلہ کرتے ہوئے شہریار نے اسے حکم دیا۔ یہ مال ارجن نے محنت سے زیادہ چار سو بیسی کے بل بوتے پر کمایا تھا چنانچہ اگر وہ اسے را کی چار سو بیسی کا جواب دینے کے لیے خرچ کر ڈالتے تو کوئی حرج بھی نہیں ہوتا۔ ارجن کی پتنی نے اس حکم کی بھی تعمیل کی جبکہ وہ خود بستر پر پڑا بے بسی سے یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔ اس کی بیوی کو تو ان لوگوں نے اپنے مقصد کے لیے بندشوں سے آزاد کر دیا تھا جبکہ وہ اب تک بندھا پڑا تھا۔ دواؤں کے اثر کے باعث جسم ویسے ہی سست پڑا ہوا تھا ورنہ شاید وہ ان بندشوں سے آزاد ہونے کی کوئی ترکیب لڑا بھی لیتا۔ ابھی تو کھلی آنکھوں سے تماشا دیکھنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

''پولیس کو اس واردات کی رپورٹ لکھواتے ہوئے تمہیں یہ بتانا ہوگا کہ تمہارے گھر میں کچھ ڈاکو گھس آئے تھے جنہوں نے تمہارا سارا زیور اور پیسا لوٹ لیا۔ زیور کے لیے افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اگر ہم اسے ساتھ نہ لے جاتے تو تمہاری سگی نند نے اسے چرا لینا تھا اور ہاں... پولیس کو یہ بھی بتانا کہ مزاحمت کرنے پر ڈاکوؤں نے تمہارے شوہر مسٹر ارجن اگروال کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔'' بولنے کے ساتھ ہی اس نے پسٹل کا رخ ارجن کی طرف کر کے اسے گولی ماردی۔ گولی اس کے سینے میں بائیں جانب گھسی اور اس کے جسم نے ایک زوردار جھٹکا لیا۔ اس کی

بیوی یہ منظر دیکھ کر اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ چیخنا بھول گئی۔

''سوری مسز اگروال! یہ شخص میرے وطن کا دشمن تھا اس لیے میں اسے کسی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا۔ اب یہ آپ پر ہے کہ میرا بتایا ہوا بیان دے کر خود کو اور اپنے بچوں کو پریشانی سے بچا لیتی ہیں یا سچ بول کر اپنے لیے مزید مصیبتیں کھڑی کرتی ہیں۔'' پسٹل جیب میں رکھ کر وہ ارجن کی طرف بڑھا اور اسے بندشوں سے آزاد کرنے لگا۔ اب وہ شخص انہیں یا کسی دوسرے کو ضرر پہنچانے کے لائق نہیں تھا۔

کلام کے ساتھ کمرے سے باہر قدم رکھتے ہوئے اسے مسز ارجن کی پہلی سسکی سنائی دی جسے سن کر اسے دکھ بھی محسوس ہوا لیکن اس نے اس کیفیت کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ لوگوں میں موت بانٹنے والے ارجن کی وجہ سے کتنی سہاگنوں کو بیوہ ہو کر ماتم کرنا پڑا تھا چنانچہ اگر آج اس کی بیوی اس کی لاش پر بیٹھی بین کر رہی تھی تو اسے مکافاتِ عمل کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

''میں نے یہاں کی لینڈ لائن کاٹ دی ہے۔ ارجن اور اس کی بیوی کے موبائل پہلے ہی میرے قبضے میں ہیں اس لیے اس کی بیوی کے لیے فوری طور پر پولیس سے رابطہ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔'' وہ کنٹرول روم کے سامنے سے گزرے تو سلو بھی ان سے آملا اور اپنا کارنامہ سنایا جس پر شہریار کی سمجھ میں آیا کہ اسے ارجن اور اس کی بیوی کے آس پاس موبائل فون کیوں نظر نہیں آئے تھے ورنہ عموماً لوگ اپنے سیل فون کو سوتے وقت اپنے قریب ہی رکھ کر سونا پسند کرتے ہیں۔

''آپ لوگ جلدی سے باہر آجائیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ کچھ گاڑیاں خاموشی سے ارجن ولا کو گھیرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔'' ابھی وہ پوری طرح اطمینان کا سانس لے بھی نہیں سکے تھے کہ بھائی جی کی طرف سے مہیا کیے گئے ڈرائیور نے اطلاع دی۔ اسے وہ اپنے فرار کے لیے باہر ہی چھوڑ کر آئے تھے۔

''او کے، ہم آرہے ہیں۔ تم ریڈی رہو۔'' شہریار نے اسے جواب دیا۔ ساتھ ہی ان تینوں کے قدم بھی تیز ہوگئے۔ واپسی کے لیے انہوں نے اسی راستے کو اختیار کیا جس راستے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ ارجن کی بیٹی کے کمرے کی کھڑکی کا ٹوٹا شیشہ یقیناً اس کی اس دیوانگی کی نشانی تھا جو کوکین نہ ملنے کی صورت میں اس پر طاری ہو جاتی ہوگی۔ اس پہلے سے ٹوٹے ہوئے شیشے کی وجہ سے ہی یقیناً وہاں کا سیکیورٹی الارم بھی کام نہیں کر رہا تھا اور ان کا کام مزید آسان ہوگیا تھا لیکن یہ نہ جانے کون لوگ تھے جو اچانک ہی وہاں نمودار ہوگئے تھے اور ظاہر ہے ان کے فرار کی راہ بھی روکنے والے تھے۔ شاید یہ اس فائرنگ کا ردعمل تھا جو اندر گھستے وقت انہیں کرنی پڑی تھی لیکن یہ کچھ لیٹ ردِعمل تھا جس کی یہی توجیہہ ہو سکتی تھی کہ پاکستان کی طرح بھارتی پولیس بھی شکایت کے ردعمل میں متحرک ہونے میں خاصا وقت لیتی تھی۔

''اس طرف کوئی نظر نہیں آرہا۔'' وہ جس طرف سے خاردار برقی تار کاٹ کر اندر داخل ہوئے تھے، اسی جانب دیوار پر چڑھ کر سلو نے جائزہ لیا اور سرگوشی میں اطلاع دی۔

''تمہیں مشکوک گاڑیاں کس طرف نظر آرہی ہیں اختر؟'' اس نے ڈرائیور کو آہستہ سے مخاطب کر کے سوال کیا۔

''وہ لوگ فرنٹ اور بیک پر ہیں۔ آپ لوگ اگر سائڈ سے آجائیں تو بچ سکتے ہیں۔ میں گاڑی کچھ فاصلے پر لے گیا ہوں تاکہ کسی کی نظروں میں نہ آسکوں۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''او کے، ہم آرہے ہیں۔'' اس نے ڈرائیور کو جواب دیا اور اشارے سے سلو کو نیچے اترنے کو کہا۔ وہ جس طرف سے یہاں داخل ہوئے تھے، وہ دیوار اس جگہ کے مخالف سمت میں تھی جہاں ڈرائیور ان کا منتظر تھا۔ چنانچہ سلو کے نیچے اترنے کے بعد انہوں نے دوسری دیوار کی طرف پیش قدمی کی۔ وہاں موجود خاردار تاروں کو کاٹ کر دوسری طرف کودنے کے عمل میں کچھ تاخیر ہوگئی تھی جس کی سزا انہیں کلام کے دائیں پیر میں اترنے والی گولی کی صورت میں بھگتنی پڑی۔ گولی کی وجہ سے کلام کے لیے خود بھاگ کر فاصلہ طے کرنا ممکن نہیں تھا، چنانچہ اسے اور سلو کو کلام کو سہارا دینا پڑا۔ یہ صورت حال ایسی تھی کہ ان کے لیے حملہ آوروں کی نظر میں آئے بغیر بھاگ نکلنا ممکن نہیں تھا۔ گولیوں کی پوری ایک باڑ ان کے تعاقب میں آئی اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ چند انچ کے فاصلے سے بچ گئے تھے اور گولیاں ان کے دائیں بائیں سے نکل گئی تھیں۔

''لیٹ جاؤ۔'' شہریار زور سے چیخا اور وہ دونوں کلام کو ساتھ لیتے ہوئے نیچے لیٹ گئے۔ ایک بار پھر ان کی قسمت نے یاوری کی اور گولیاں ان کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں۔

''تم کلام کو لے کر آگے نکلو۔ میں ان سے نمٹتا ہوں۔'' حملہ آوروں کو روکے بغیر فرار ممکن نہیں ہے، اس بات کو سمجھ لینے کے بعد شہریار نے سلو کو حکم دیا اور خود وہیں رک کر اپنی پشت پر بندھے بیگ سے اپنے مطلب کی چیز نکالنے لگا۔ اس دوران خود کو مسلح ظاہر کرنے کے لیے اس نے

ایک ہاتھ سے گولیاں چلانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی چلائی ہوئی گولیاں دشمن تک رسائی نہیں حاصل کر سکتیں لیکن کچھ تو کرنا ہی تھا۔

ابھی اس کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ بیگ میں موجود جدید ساخت کی رائفل کے ٹکڑوں کو نکال کر جوڑتا اور دوسرے کو منہ توڑ جواب دے پاتا اس لیے بیگ میں موجود اسموک بم نکالا اور اس طرح اچھال دیا کہ دشمن اور اس کے درمیان دھوئیں کی ایک چادر سی تن گئی۔ اس نے فوری طور پر اپنی پوزیشن تبدیل کی اور رائفل کے ٹکڑے نکال کر اسے جوڑنے کے بعد اندازے سے ایک برسٹ مارا۔ جدید رائفل کا یہ برسٹ اس بات کا اعلان تھا کہ مقابل انہیں خود سے کمتر نہ سمجھے۔ برسٹ مارنے کے بعد وہ رکے بغیر آگے کی طرف بھاگا۔ فوراً ہی اسے سلو اور کلام نظر آگئے۔ کلام کی زخمی ٹانگ کی وجہ سے ان کے بھاگنے کی رفتار بہت کم تھی۔

''میں اسے سہارا دیتا ہوں، تم اپنی رائفل نکال لو۔'' اس نے قریب پہنچ کر سلو کو حکم دیا تو وہ فوراً عمل پیرا ہوگیا۔ ایسے موقعوں پر اس کی پھرتی دیکھنے والی ہوتی تھی اور وہ یوں چاق و چوبند نظر آنے لگتا تھا جیسے موت سے لڑنے نہیں، کرکٹ میچ کھیلنے گراؤنڈ میں اتر رہا ہو۔ ادھر شہریار کچھ تشویش کا شکار تھا۔ اپنے ذاتی بیگ کے علاوہ اس نے وہ زیورات اور نوٹوں سے بھرا بیگ بھی اٹھا رکھا تھا پھر کلام کو سہارا بھی دینا تھا۔

''میری رائفل بھی نکال دیں۔ بھاگ نہ سکا تو کم سے کم دو چار کو تو مار سکوں گا۔'' اس موقع پر کلام نے اس سے فرمائش کی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے سوچ میں پڑا اور پھر اس کی فرمائش مان لی۔ اس کے کان ان گاڑیوں کی غراہٹیں سن رہے تھے جو دھوئیں کی چادر سے گزر کر ان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ان گاڑیوں سے مسلسل فائرنگ بھی کی جا رہی تھی جس کا جواب سلو اپنی رائفل سے دے رہا تھا لیکن ایک بات یقینی تھی کہ نقصان دونوں طرف سے کسی کا نہیں ہو رہا تھا۔

''میں نے آپ لوگوں کو دیکھ لیا ہے۔ اگر آپ دس قدم اور آگے بڑھ آئیں تو میں آپ تک گاڑی لے آؤں گا۔'' نہایت مخدوش حالت میں ڈرائیور کی آواز ان کے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑا گئی۔ وہ دیوانہ وار اس طرف بھاگے۔ اس بار سلو انہیں کور دے رہا تھا اور اس مہارت سے فائرنگ کر رہا تھا کہ ایک اکیلا ہی دس کے برابر محسوس ہو رہا تھا۔ اگر بھارتی جان لیتے کہ یہ وہی سلو ہے جسے انہوں نے پاکستان کی تباہی کے لیے بڑی محنت سے تیار کیا تھا تو اپنا سر پیٹ لیتے۔

رائفل کو بے تحاشا استعمال کرتے ہوئے اس نے اچانک ہی اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک ہینڈ گرینیڈ نکال کر دانتوں سے اس کی پن کھینچنے کے بعد اس سمت اچھال دیا جہاں سے دشمن کی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس دھوئیں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی آرہی تھیں۔ ہینڈ گرینیڈ گرا تو گویا وہاں قیامت ہی برپا ہوگئی۔ سب سے آگے آنے والی گاڑی براہِ راست اس کی زد میں آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ کا گولہ بن گئی۔ اس کے پیچھے آنے والی گاڑی کا ڈرائیور بروقت بریک لگانے میں ناکام رہا اور وہ گاڑی بھی جلتی ہوئی گاڑی میں گھس گئی۔ افراتفری کے اس عالم میں کس کو ہوش رہتا کہ ان کا پیچھا کرے۔ وہ لوگ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانیں بچانے کے لیے بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ سلو کے لیے یہ موقع مناسب تھا۔ وہ تیزی سے شہریار اور کلام کے پیچھے بھاگا اور فوراً ہی ان سے جا ملا۔ بھائی جی کا ڈرائیور اپنے کہے کے مطابق وہاں ان کا منتظر تھا۔ کلام کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھانے کے بعد وہ دونوں بھی تیزی سے سوار ہوگئے اور ڈرائیور نے برق رفتاری سے گاڑی دوڑا دی۔ سید حامین روڈ پر جانے کے بجائے وہ ذیلی سڑکوں اور گلیوں کا انتخاب کر رہا تھا اور ان کے اندازے کے مطابق جائے حادثہ سے دور نکلتا چلا گیا۔

پوش علاقہ ہونے کی وجہ سے وہاں گلیاں اور راستے کشادہ تھے اس لیے ڈرائیور کو کسی قسم کی مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔ بڑے بڑے محلوں میں رہنے والے ان چوہے سے کمزور دل رکھنے والوں میں سے کسی کے اندر حوصلہ نہیں تھا کہ باہر نکل کر صورتِ حال کا جائزہ لیں۔ ان لوگوں سے زیادہ سے زیادہ یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اعلیٰ عہدے داران کی نیندیں فون کر کر کے حرام کر دیں اور ان سے پوچھیں کہ ایسے پوش علاقے میں کوئی ہنگامہ برپا ہوا تو کیونکر۔۔۔؟

ادھر شہریار اور سلو چلتی گاڑی میں کلام کی ٹانگ کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ گولی اس کی پنڈلی کا گوشت پھاڑتی ہوئی ہڈی میں گھس گئی تھی اور وہ شدید تکلیف کے علاوہ مستقل خون بہتے رہنے کے باعث کمزوری بھی محسوس کر رہا تھا۔ گاڑی میں جلتے بلب کی محدود روشنی میں وہ اس کا زرد پڑتا ہوا چہرہ دیکھ سکتے تھے لیکن حقیقی طبی امداد دینا ان کے بس میں نہیں تھا۔ اس کے لیے باقاعدہ آلاتِ جراحی اور مستند ڈاکٹر کی ضرورت تھی جو کسی ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد ہی میسر آسکتا تھا۔ فی الحال انہوں نے صرف اتنا کیا کہ اس کے

زخم سے خون کا بہاؤ کم سے کم کرنے کے لیے اس کے اوپر مضبوطی سے پٹی باندھ دی۔

''اسے یہ جوس پلائیں کمزوری کم ہوگی۔'' ڈرائیور نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے جوس کا ایک ڈبا ان کی طرف بڑھایا جسے شہریار نے تھام لیا۔ یہ سرخ انگوروں کا جوس تھا۔ شہریار نے اس میں اسٹرا ڈال کر کلام کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ بے چارہ زخمی ٹانگ کے ساتھ کافی بھاگ دوڑ کر چکا تھا اور اب اس کی ہمت جواب دینے لگی تھی، اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔

''آنکھیں کھولو کلام۔ یہ جوس پیو۔'' شہریار نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''میری ہمت نہیں...'' اس نے ٹوٹتے لہجے میں بہت دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''بی بریو کلام۔ ہم مشکل سے نکل آئے ہیں، بس جیسے ہی کسی ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تمہارا علاج شروع ہو جائے گا لیکن اس وقت تک تمہیں خود کو سنبھالنا ہوگا۔ لو یہ جوس پیو تاکہ تمہاری توانائی بحال ہوتی رہے۔'' شہریار نے اسے سمجھاتے ہوئے ایک بار پھر زبردستی اسٹرا اس کے ہونٹوں سے لگایا۔

اس بار اس نے ایک گھونٹ بھر لیا۔ باقی کا راستہ بھی شہریار نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ سلو البتہ خاموش بیٹھا تھا اور گاہے بگاہے شہریار کے چہرے پر ایک نظر ڈال لیتا تھا جو نہ جانے کیوں اس کی طرف سے بالکل بے نیاز نظر آ رہا تھا۔

ایمبولینس اور پولیس کی گاڑیوں کے سائرن تو جانے کب کے پیچھے رہ گئے تھے اور ڈرائیور بھی گلیاں چھوڑ کر گاڑی مین روڈ پر لا چکا تھا۔ ہر بڑے شہر کی طرح رات گئے بھی جاگتے رہنے والے ممبئی کی سڑکوں پر کون تھا جو خاص ان کی گاڑی کی طرف توجہ دے پاتا۔ چنانچہ وہ بہ خیریت اپنے ٹھکانے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں عبدالرحمان ان کا منتظر تھا۔ اسے کلام کو گولی لگنے کی خبر ڈرائیور راستے میں دے چکا تھا چنانچہ جیسے ہی وہ لوگ وہاں پہنچے، دو آدمی اسٹریچر لیے گاڑی کی طرف لپکے اور کلام کو تیزی سے گاڑی سے اسٹریچر پر منتقل کیا گیا۔

''تمہارا بلڈ گروپ کیا ہے؟'' سفید کوٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر آدمی نے اسٹریچر کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے کلام سے سوال کیا۔

''بی پازیٹو۔'' اس نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

''گڈ... اس گروپ کا بلڈ ہمارے کلیکشن میں موجود ہے۔'' ادھیڑ عمر شخص نے مسرت کا اظہار کیا لیکن وہ باقاعدہ کسی سے مخاطب نہیں تھا اور اس کی توجہ پوری طرح کلام پر ہی تھی۔ شہریار اور سلو بھی خودکار انداز میں اس کے اسٹریچر کے پیچھے بھاگتے جا رہے تھے۔

''آپ لوگ یہیں رکیں۔ ڈاکٹر صاحب کام کے دوران کسی کی موجودگی کو پسند نہیں کرتے۔'' اسٹریچر کوٹھی کے ایک ایسے حصے میں پہنچا جہاں اس سے قبل کبھی ان کا جانا نہیں ہوا تھا تو اسٹریچر اٹھانے والوں میں سے ایک نے سختی سے کہتے ہوئے انہیں روک دیا۔ اس کی بات سن کر ان دونوں نے ہی اپنے قدم روک لیے۔ یہ کوئی غیر اصولی بات نہیں تھی کہ ڈاکٹر تسلی اور اطمینان سے کام کرنے کے لیے غیر متعلقہ لوگوں کے داخلے کو ناپسند کرتا تھا۔ اتنا نازک کام کرنے والوں کو یکسوئی کے لیے اس کی ضرورت بھی تھی۔ روک دیے جانے کے بعد وہ دونوں پلٹ کر واپس اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں اب تک ان کا زیادہ اٹھنا بیٹھنا رہا تھا۔ عبدالرحمان پہلے سے وہاں موجود تھا اور اس نے ٹی وی آن کر رکھا تھا۔

''آؤ بھئی، تم لوگ تو بڑا کمال دکھا کر آئے ہو۔ ممبئی کی پولیس ہل کر رہ گئی ہے۔ ایک تو ارجن اگروال کے گھر ڈکیتی اور قتل و غارت گری ہوئی ہے، دوسری طرف پورے تو پولیس والے مارے گئے ہیں۔ زخمی بھی بہت ہوئے ہیں۔ پولیس نے پورے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے اور مشکوک افراد کی گرفتاری کے لیے کوششیں ہو رہی ہیں۔ لیکن کمال دیکھو کہ تم لوگ شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے بعد کتنی آسانی سے صحیح سلامت یہاں پہنچ گئے ہو۔'' اس نے کھلے دل سے ان کی کارکردگی کو سراہا۔

''ہمارا ایک ساتھی شدید زخمی ہے۔'' نہایت سنجیدگی سے کہتے ہوئے شہریار نے گویا اسے یاد دلایا۔

''اس کی فکر مت کرو دوست۔ وہ دو چار دن میں چنگا بھلا ہو جائے گا۔ ڈاکٹر دیپک اپنے کام میں بڑا ماہر ہے۔ یہ آس پاس گھومتے اپنے پلے دیکھ رہے ہو نا۔ ان میں سے ہر ایک کئی کئی بار زخمی ہو کر یہاں پہنچا ہے۔ یہ سالے آئے دن کسی نہ کسی لفڑے میں پڑ کر یہاں پہنچتے ہیں اور ڈاکٹر دیپک ان کا علاج کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ جسم کے ہر حصے سے گولی نکالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس واسطے تمہیں اپنے ساتھی کے لیے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اسے ریپئر کروا کر ہی تمہارے حوالے کریں گے۔'' عبدالرحمان کا انداز اگرچہ غیر سنجیدہ تھا لیکن اس نے معلومات ایسی فراہم کی تھیں کہ انہیں تسلی ہو گئی تھی۔

''یہ بولو کہ مشن میں کامیاب لوٹے ہو یا نہیں؟ خبروں میں تو بتا رہے ہیں کہ ارجن کے سینے میں گولی ماری گئی ہے اور اس کی حالت بہت نازک ہے۔'' گفتگو جاری رکھتے ہوئے

عبدل نے موضوعِ گفتگو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔
''اوہ... وہ گندگی کی پوٹ ابھی تک زندہ ہے۔'' ارجن کے زندہ ہونے کا سن کر اسے افسوس ہوا۔
''زندہ ہے لیکن ہوش میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر بھی اس کے بچنے کی زیادہ امید نہیں دلا رہے ہیں۔'' میڈیا کی تیز رفتاری کی وجہ سے بغیر کسی کوشش کے بھی اہم خبریں ان تک پہنچ رہی تھیں۔ اسی وقت ٹیلی ویژن پر ارجن کی بیوی کا بیان دکھایا جانے لگا۔ صدمے سے اس کی بری حالت تھی اور وہ اٹک اٹک کر بتا رہی تھی کہ ان کے گھر میں چند ڈاکو زبردستی گھس آئے تھے جنہوں نے ان کی بیٹی کو تشدد کا نشانہ بنا کر ان سے سارے زیورات اور روپیا لوٹ لیا اور مزاحمت پر ارجن کو گولی ماردی۔ اس کے اس مختصر بیان کے ساتھ ہی اس کی بیٹی کا زخمی ہاتھ اور ارجن کو اسپتال منتقل کیے جانے کے مناظر بھی دکھائے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی نیوز اینکر کا رواں تبصرہ بھی جاری تھا جو اس سفاکانہ عمل کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی ظاہر کر رہا تھا کہ ڈکیتی کی اس واردات کے پیچھے اصل کہانی کچھ اور ہے کیونکہ عام ڈاکوؤں کے لیے کسی طور یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ارجن ولا کے حفاظتی سسٹم کو شکست دے کر اندر تک رسائی حاصل کر سکیں اور ساتھ ہی کیمروں کا ریکارڈ بھی غائب کر دیں۔ سلو کے انجام دیے گئے کارنامے کے سبب وہاں ایک کام اور ہوا تھا۔ پولیس والوں کے زبردستی وہاں گھسنے کی کوشش میں مختلف مقامات پر نصب خودکار گنیں برس پڑی تھیں اور کئی پولیس اہلکار گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔
اینکر کے مطابق کسی عام ڈاکو میں اتنی ذہانت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس پیچیدہ سسٹم کو سمجھ کر آپریٹ کر سکے۔ دوسرے ڈاکوؤں کو ضرورت بھی نہیں تھی کہ پولیس اہلکاروں کو نشانہ بناتے۔ اس طرح کی منصوبہ بندی تخریب کار یا دہشت گرد ہی کر سکتے تھے۔ اپنے اس نکتۂ نظر کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اینکر پرسن نے ہینڈ گرینیڈ سے پولیس کی گاڑیوں کو تباہ کرنے کے واقعے کی بھی مثال پیش کی تھی۔ اس کے مطابق کسی پڑوسی کی طرف سے ارجن ولا میں فائرنگ کی آواز سنے جانے کی شکایت پر وہاں پہنچنے والی پولیس کی گاڑیوں کو فرار ہوتے ہوئے ڈاکوؤں نے ہینڈ گرینیڈ سے نشانہ بنایا تھا۔ یعنی آنے والے اتنی تیاری کے ساتھ آئے تھے کہ کسی صورت انہیں روکا جانا ممکن نہیں تھا۔ اینکر پرسن نے سوال اٹھایا تھا کہ کیا کوئی عام ڈاکو اس طرح دستی بموں کا استعمال کر سکتا ہے؟ اینکر پرسن کی عادت و تربیت کے مطابق اس کی طرف سے مسلسل بولنے اور سوالات و قیاس آرائیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ شہریار نے ایک نظر سلو کی طرف دیکھا اور اس ایک نظر میں وہ سمجھ گیا کہ اس سے کیا غلطی ہوئی ہے۔ ہینڈ گرینیڈ کے استعمال نے ہر ایک کو چونکا دیا تھا حالانکہ ان کے درمیان یہ بات پہلے سے طے ہوگئی تھی کہ انتہائی ناگزیر حالات کے علاوہ اس کا استعمال نہیں کیا جائے گا۔
''تم لوگوں نے تو خاصی تھرتھری مچا کر رکھ دی ہے۔ ایک تو ارجن اگروال کے گھر پر حملہ کیا، اوپر سے اتنے پولیس والوں کو لمبا لٹا دیا۔ اوپر سے نیچے تک سب ہل کر رہ گئے ہوں گے۔'' عبدالرحمان نے لطف لینے والے انداز میں انہیں داد دی پھر خیال آنے پر پوچھنے لگا۔
''ارجن کے گھر سے کتنا مال ہاتھ لگا؟ خبروں میں تو بتا رہے ہیں کہ ڈاکو لاکھوں کا زیور اور نقد ساتھ لے گئے ہیں۔''
''خبروں میں غلط بتا رہے ہیں۔'' شہریار نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا تو وہ چونک گیا۔
''کیا مطلب؟ کیا تم نے وہاں سے کچھ نہیں لوٹا؟''
''لوٹا ہے لیکن اس کی مالیت لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں ہوگی۔'' اس نے بھرا ہوا بیگ عبدل کے سامنے الٹ دیا جسے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ طلائی زیورات میں سے بیشتر زیورات ایسے تھے جن میں مختلف اقسام کے قیمتی ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ سونا چھوڑ کر صرف ان ہیروں کو ہی بیچا جاتا تو بہت بڑی رقم حاصل ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ رقم بھی انڈین کرنسی میں نہیں، ڈالرز کی شکل میں تھی جنہیں دیکھ کر عبدالرحمان کی آنکھیں پھٹنا بجا تھا۔
شہریار نے یہ سب کچھ اس نیت سے حاصل کیا تھا کہ ارجن کی حرام کی کمائی بھارتی چال بازوں کی چالوں کا جواب دینے کے لیے استعمال کرے گا لیکن وہ یہ سب کچھ عبدالرحمان سے نہیں چھپا سکتے تھے۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ ان کے پاس ایک زائد بیگ موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اس سونے اور ہیروں کو اپنے طور پر مارکیٹ میں بیچ کر رقم حاصل کر سکتے۔ ایسی کسی کوشش میں وہ مشکل میں بھی پڑ سکتے تھے اس لیے بہتر تھا کہ ان لوگوں پر ہی بھروسا کر لیا جائے۔ لوٹ کا یہ مال ان سے لٹ بھی جاتا تو فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ جو چیز جیسے آتی ہے، ویسے چلی بھی جاتی ہے۔ خود کو بے نیاز ظاہر کرتا وہ خاموشی سے عبدالرحمان کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسی وقت کمرے میں موجود انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ عبدالرحمان نے خود ریسیور اٹھایا اور دوسری طرف کی بات سنجیدگی سے سننے لگا۔ بات سن کر اس نے خاموشی سے ریسیور واپس رکھ دیا اور روئے سخن ان دونوں کی طرف کیا۔
''ڈاکٹر دیپک بات کر رہا تھا۔ اس کے مطابق تمہارے ساتھی کی ٹانگ سے گولی نکال لی گئی ہے لیکن گولی نے اس کی ہڈی کو اتنی بری طرح متاثر کیا ہے کہ وہ اب چلا بھی تو لنگڑا کر چلے گا۔ اس کی ٹانگ پہلے کی طرح نہیں ہو سکے گی۔'' یہ خبر شہریار کے لیے گہرا صدمہ ثابت ہوئی اور بے ساختہ اس کی نظر دولت کے اس ڈھیر پر پڑی جسے لٹا کر بھی وہ کلام کو اس کی اصل صحت مند ٹانگ واپس نہیں دلا سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ بہت گہری نیند سو رہی تھی۔ اتنی گہری نیند کہ دیکھنے والے کو یہی گمان گزرے کہ اب صبح ہی کی خبر لائے گی لیکن یکدم ہی اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کی نیند ٹوٹنے کا سبب ایک پکار تھی۔
''ماہ بانو...'' کسی نے بہت زور سے اسے پکارا تھا اور وہ اس پکار کا جواب دینے کے لیے بے چین ہوگئی تھی لیکن ادھر ادھر دیکھتی جب نیند کے خمار سے نکلی تو احساس ہوا کہ ان مضبوط دیواروں کو پار کر کے نہ تو کوئی آواز اس تک آ سکتی ہے اور نہ ہی وہ اپنی آواز کو کسی تک پہنچا سکتی ہے۔ اس نے جو سنا اور جو دیکھا، سب ایک خواب تھا۔ نیند میں اسے پکارنے والا اسلم تھا جو جنگل کی وسعت اور پیچیدگیوں سے بے نیاز اسے ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا تھا اور دیوانہ وار اسے پکار رہا تھا۔ وہ بھی اس کی پکار کا جواب دینا چاہتی تھی لیکن حلق سے آواز برآمد ہونے سے قبل ہی حقیقت کے خارزاروں میں کھینچ لی گئی جہاں اسلم کے خود تک پہنچنے کا گمان بھی نہیں تھا۔
حقیقتاً وہ خود بھی ڈھنگ سے نہیں جانتی تھی کہ کہاں اور کیوں ہے۔ اسے یہاں پہنچانے کا ذمے دار شخص بھی دوبارہ اس سے نہیں ملا تھا اور وہ اجنبیوں کے سامنے سر پٹختی رہتی تھی کہ اسے یہاں سے جانے دیا جائے لیکن وہ تو گویا گونگے بہرے تھے جو نہ تو اس کی کوئی بات سنتے تھے اور نہ ہی کسی بات کا جواب دیتے تھے۔ یہاں اس کی زندگی اس چھوٹے سے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ کمرے میں زندگی کی تمام بنیادی سہولتیں موجود تھیں اور بظاہر اسے کسی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا لیکن اس کے لیے یہی اذیت بہت تھی کہ اسے اس کے گھر اور شوہر سے دور اس تنہائی میں لا پھینکا گیا ہے جہاں وہ کسی اپنے سے بات کرنے اور اس کی صورت دیکھنے کے لیے بھی ترستی ہے۔ یہاں رہ کر اسے اپنے

ہونے والے بچے کی بھی فکر لگی تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ لوگ اس کا بھرپور خیال رکھ رہے تھے اور ڈاکٹر کی طرف سے تجویز کردہ دواؤں کے ساتھ ساتھ شیڈول کے مطابق بہترین خوراک بھی مہیا کی جاتی تھی لیکن پھر بھی اس کا دل انجانے خدشوں سے لرزتا رہتا تھا۔ یہاں لائے جانے کے بعد اس کے مختلف قسم کے ٹیسٹ بھی لیے گئے تھے اور الٹرا ساؤنڈ بھی ہوا تھا لیکن وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ کون خدائی فوجدار ہیں جو اسے ایک نارمل زندگی سے نکال کر یہاں لے آئے ہیں اور خود اس کی صحت اور دیکھ بھال کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے ہیں۔ یہاں جن چہروں سے اس کا سامنا ہو رہا تھا، وہ سب کے سب اس کے لیے ناآشنا تھے البتہ اسے یہاں تک پہنچانے کا ذمے دار شخص اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس شخص کا نام تھا ڈاکٹر طارق۔
ڈاکٹر طارق وہ شخص تھا جس سے اس کی کراچی میں قیام کے دوران ملاقات ہوئی تھی۔ شہریار نے اسے مہرین کے نام سے کراچی کے جس کالج میں داخلہ دلوایا تھا، وہاں اس کی راحیلہ نامی ایک لڑکی سے دوستی ہوگئی تھی اور وہ راحیلہ کے اصرار پر کبھی کبھار اس کے گھر بھی جانے لگی تھی۔ وہیں اس کی ملاقات اس کے بھائی ڈاکٹر طارق سے ہوئی تھی۔ وہ پڑھائی کے سلسلے میں ان دونوں کی مدد کر دیا کرتا تھا اور ماہ بانو کے نزدیک ایک اچھا انسان تھا لیکن اس اچھے انسان نے اپنی اصلیت اس وقت دکھائی جب اسے ایک اتفاق کی وجہ سے اس بات کا علم ہوا کہ ماہ بانو پنجاب کے ایک وڈیرے سے اپنی جان اور عزت بچاتی پھر رہی ہے۔ اس موقع پر اس نے نہایت کمینگی کا ثبوت دیتے ہوئے چودھری کو اس کے بارے میں اطلاع دے دی اور وہ کالج کے ہاسٹل سے سوتے میں اٹھالی گئی۔ اس واقعے کے بعد اس کی زندگی کا دھارا ہی بدل گیا اور اسے ایک بار پھر تعلیم حاصل کر کے کسی اچھے مقام تک پہنچنے کے خواب سے دست بردار ہونا پڑا۔ اللہ کی مہربانی سے اسے اسلم جیسے چاہنے والے شخص کا ساتھ مل گیا اور وہ لوگ شہریار کے تعاون سے آئرلینڈ وشفٹ ہو کر ایک خاصی مطمئن زندگی گزارنے لگے لیکن یہاں بھی بدقسمتی نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔
اس روز جب معائنے کے لیے اسے کلینک پر چھوڑ کر بلقیس خود شاپنگ کے لیے چلی گئی تھی، وہ جلد فارغ ہونے کے سبب کسٹرڈ کی ڈریسنگ اور سلاد میں شامل کیے جانے والے کچھ ساسز خریدنے کی نیت سے قریبی اسٹور تک چلی گئی۔ اتفاق سے اسے وہاں چکر آ گیا اور اس سے قبل کہ وہ

چکرا کر گرتی، کسی نے اسے تھام لیا۔ حالت سنبھلنے پر اس نے اپنے محسن کو دیکھا تو ڈاکٹر طارق کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ اس نے خود بھی اسے پہچان لیا اور اس سے قبل کہ وہ اس سے منہ موڑ کر چل پڑتی، بڑی لجاجت سے اپنی صفائی بیان کرنے کا ایک موقع دینے کی درخواست کرکے قریبی ریسٹورنٹ تک چلنے کی فرمائش کی۔ وہ شاید اس کی یہ خواہش پوری نہ کرتی لیکن وہ اتنی عاجزی اور لجاجت سے بول رہا تھا کہ اس کا دل پسیج گیا اور وہ اس کے ساتھ ریسٹورنٹ تک جانے کے لیے راضی ہوگئی۔ وہاں انہوں نے کافی پی اور طارق اس سے معافی مانگتا رہا کہ ...... اس نے اس کے اعتماد کو دھوکا دیا۔ اس کے بقول اسے امریکا آکر اسپیشلائزیشن کرنے کا جنون تھا لیکن وسائل کی کمی کے باعث وہ اپنی یہ خواہش پوری کرنے سے قاصر تھا۔ لہٰذا ایسے میں جب اسے یہ معلوم ہوا کہ چودھری کو ماہ بانو کا پتا بتانے کی صورت میں اسے بھاری رقم مل سکتی ہے تو اس کا ایمان ڈگمگا گیا۔ ماہ بانو نے اسے خوب باتیں سنائیں کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہ ایک بے یارومددگار لڑکی کی زندگی سے کھیلنے سے بھی نہیں کترایا تو آگے کیا خاک دکھی انسانیت کی خدمت کرے گا۔

طارق نے نہایت خندہ پیشانی سے اس کی ہر بات سنی اور شرمندگی کا اظہار کرتا رہا کہ وقتی طور پر اس پر شیطان غالب آگیا تھا لیکن اب وہ اپنے اس عمل پر بہت پچھتاتا ہے اور کفارے کے طور پر تعلیم مکمل کرنے کے بعد وطن واپس جاکر غریب ہم وطنوں کی خدمت کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ مروت اور خلوص سے گندھی ماہ بانو نے اس کی معذرت کو قبول کرلیا اور اسی سبب ایک بار پھر اس پر اعتماد کرنے کی غلطی کر بیٹھی۔ چنانچہ ڈاکٹر طارق کی کلینک تک ڈراپ کرنے کی آفر رد نہ کرسکی۔ ریسٹورنٹ سے کلینک دور بھی کہاں تھا۔ وہ پیدل بھی آرام سے جاسکتی تھی لیکن کچھ اس ڈر سے بھی اس کی پیشکش قبول کرلی کہ کہیں راستے میں ایک بار پھر چکر نہ آجائیں۔ ریسٹورنٹ سے نکل کر کلینک تک کا مختصر راستہ طے بھی نہیں ہوا تھا کہ جانے کیسے اس کی آنکھ لگ گئی اور جب وہ دوبارہ جاگی تو اس کمرے میں موجود تھی۔ اس نے بہت شور مچایا، روئی پیٹی، چیخی چلائی کہ اسے یہاں سے جانے دیا جائے لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ یہاں تک کہ اس کی طارق سے ملاقات کی خواہش تک پوری نہیں کی گئی۔ تھک ہار کر اس نے رونا دھونا چھوڑ دیا اور کھانا اور دوائیں باقاعدگی سے لینے لگی کیونکہ دوسری صورت میں اس کے بچے کے لیے خطرات پیدا ہوجاتے۔

اس موقع پر جانے کیوں اسے بلتستان کے پہاڑوں میں قائم دہشت گردوں کے تربیتی کیمپ میں ملنے والا لڑکا عمران بہت یاد آیا۔ اس لڑکے نے ہی اسے یہ سبق سکھایا تھا کہ کبھی بھی زندگی کی مشکلوں سے ہارنا نہیں ہے اور ہر لمحے جیتے رہنے کی کوشش کرنی ہے کیونکہ زندگی کی جنگ جیتنے والا قدرت کی طرف سے کسی خاص مقصد کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ عمران خود تو ایک ایوالانچ کی زد میں آکر اپنی جان کھو بیٹھا تھا لیکن اس کے دیے ہوئے حوصلے کے سہارے وہ ان برف زاروں سے صحیح سلامت نکل آنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح اس نئی مصیبت سے بھی بچ نکلے گی لیکن فی الحال کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اس کمرے کی قیدی تھی اور قید کرنے والے کبھی اس کے قفس کا دروازہ باہر سے بند کرنا نہیں بھولتے تھے چنانچہ اس نے خود کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا تھا لیکن آزادی کی خواہش تو دل سے نہیں نکال سکتی تھی۔ یہی خواہش شاید خواب بن کر اس کی آنکھوں میں آسمائی تھی اور اب وہ یہ ادراک ہوجانے کے بعد کہ جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا محض خواب تھا، نڈھال سی بستر پر لیٹی تھی۔

''اسلم... کہاں ہو تم؟ دیکھو میں اور تمہارا بچہ کس مشکل میں پھنسے ہیں۔ تم آکر ہمیں اس مشکل سے نکالتے کیوں نہیں ہو؟'' تکیے پر سر رکھے وہ آنکھیں موند کر لیٹی تو خود بہ خود ہی ہونٹوں سے شکوہ اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ روتے روتے اس کی آنکھوں میں ایک شبیہ اور لہرائی۔

''اور آپ... آپ تو مجھے یہاں بھیج کر بالکل بے فکر ہوگئے ہیں۔ کبھی پلٹ کر حال تک نہیں پوچھا کہ ماہ بانو جیتی بھی ہے یا نہیں۔'' شہریار کی شبیہ سے لڑتے ہوئے اس کے آنسو کچھ اور بھی شدت سے رواں ہوگئے تھے اور وہ اردگرد سے اس حد تک غافل ہوگئی تھی کہ یہ بھی نہ جان سکی کہ کوئی آہستہ سے دروازہ کھول کر دبے قدموں کمرے میں داخل ہوا ہے اور بستر پر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا ہے۔

آنے والے نے دھیرے دھیرے سے اس کے جسم کو سہلانا شروع کیا اور ہاتھ کو حرکت دیتا ہوا اس کے رخسار تک لایا تو وہ بے خودی کی کیفیت سے نکلی اور بدک کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔ پشت پر سے آکر جسم سہلانے والا اس کے سامنے آگیا اور وہ اسے دیکھ کر حیرت سے یوں انگشت بدنداں ہوئی کہ منہ سے کچھ بول ہی نہیں سکی۔

یہ پُرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

فرشتۂ اجل

سیریناراض

زندگی میں کوئی ایک لمحہ ضرور ایسا آتا ہے جب ٹوٹ کر رونے اور رو کر ٹوٹنے کا عمل ٹھہراؤ تو پیدا کرتا ہے... لیکن ..... احساسات و جذبات اور کیفیات کو طوفانی موجوں کے سپرد کر دیتا ہے... گوروں کی سرزمین پر کھیلے جانے والے بے حدوحساب کھیلوں میں سے ایک اور مکروقبیح فعل کا ماجرائے عبرت سامان...

زندگی اور موت کی حقیقت جاننے کے لیے کیے جانے والے تجربات کا نچوڑ

ویکس ریان کی آنکھ کھلی تو الارم بج رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر گھڑی کا الارم بند کیا اور غنودہ لہجے میں کہا۔ ''جیمی! اٹھ جاؤ۔''

جیمی کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اچانک اسے جھٹکا لگا اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کے پہلو والی جگہ خالی تھی۔ وہ بھول گیا تھا کہ جیمی کو اس دنیا سے گزرے چھ مہینے ہوچکے ہیں اور وہ اب تک اس کی موت کو قبول نہیں کرسکا تھا۔ ویکس نے سر تھام لیا۔ وہ جیمی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ الارم نے

دوبارہ بج کر اسے یاد دلایا کہ اسے دفتر جانا ہے اور وقت کم ہے۔ ویکس ریان نیویارک پولیس کے ہومی سائڈ ڈپارٹمنٹ میں کام کرتا تھا۔ سینتیس سالہ ویکس چہرے سے سخت گیر دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ اس کے نقوش اچھے تھے مگر دیکھنے والے کی توجہ اس کے سخت تاثرات پر جاتی۔ پندرہ سال میں ترقی کر کے وہ لیفٹیننٹ کے عہدے تک پہنچ گیا تھا اور یہ ترقی اس نے خالصتاً اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے کی تھی۔ اس نے اٹھ کر شاور لیا اور دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

جیمی سے اس کی ملاقات ایک سال پہلے ایک کیس کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ ایمکس انٹرنیشنل کا ایک ایگزیکٹو مارٹن بوش اپنے اپارٹمنٹ میں قتل ہو گیا تھا۔ ایمکس انٹرنیشنل مستقبل کی دواؤں اور علاج کے طریقوں پر ریسرچ کرتی تھی لیکن اسے اکثر پروجیکٹ وزارتِ دفاع کی طرف سے ملے ہوئے تھے۔ مارٹن بوش ایسے ہی ایک پروجیکٹ کا سربراہ تھا اور جیمی اسی کے ماتحت فرم میں کام کرتی تھی۔ جیمی بایولوجیکل اینالسٹ تھی۔ یہ کیس ویکس اور اس کے پارٹنر مائیک کین کے سپرد ہوا تھا۔ جیمی سے ملاقات بعد میں ذاتی نوعیت کی دلچسپی میں بدل گئی۔ دلچسپی دوطرفہ تھی اور تیس سالہ حسین جیمی بھی اسے پسند کرنے لگی۔ جلد یہ دلچسپی بڑھ کر شادی کے تعلق کی حد تک پہنچ گئی۔ ایک مہینے بعد انہوں نے شادی کر لی تھی۔ دونوں کی یہ دوسری شادی تھی۔ پہلی ناکام شادی کے تجربے نے دونوں کو محتاط کر دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے اور پھر ایک ہونے سے نہ رہ سکے تھے۔

جیمی کو پا کر ویکس خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگا تھا۔ جیمی اس سے زیادہ خوش تھی۔ وہ ویکس اور گھر کی خاطر جاب بھی چھوڑنے کو تیار تھی لیکن ویکس نے اسے منع کیا کیونکہ وہ اکثر دیر تک گھر سے باہر رہتا تھا اور جیمی گھر میں بور ہوتی اس لیے ویکس نے اسے جاب جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ جیمی کی موت سے دو ہفتے پہلے وہ ایک کیس کی تفتیش کے لیے شکاگو گیا ہوا تھا۔ وہاں اسے دس دن لگے۔ واپسی پر اس نے محسوس کیا کہ جیمی کا رویّہ کسی قدر بدلا ہوا ہے، وہ خوف زدہ یا پریشان تھی۔ ویکس نے اس سے پوچھا لیکن جیمی نے تردید کی۔ ویکس کی شکاگو واپسی کے چوتھے دن وہ دفتر میں تھا کہ اسے اپنے اپارٹمنٹ والی بلڈنگ کے منیجر کی کال آئی۔ اس نے اطلاع دی کہ جیمی ساتویں فلور پر واقع اس کے اپارٹمنٹ سے نیچے گر کر مر گئی ہے۔ ویکس کو یقین نہیں آیا۔ حالانکہ اس نے منیجر کی آواز شناخت کی تھی۔ اس نے تصدیق کے لیے خود منیجر کے نمبر پر کال کی۔ پھر وہ آندھی طوفان کی طرح اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

مگر جیمی جا چکی تھی۔ اس کا گڑیا جیسا وجود بلندی سے گر کر بکھر گیا تھا اور جب ویکس نے اسے دیکھا تو میڈیکل کا عملہ اس کی لاش پلاسٹک بیگ میں رکھ رہا تھا۔ ویکس کی حالت اس قابل نہیں تھی اور پھر وہ اس کی بیوی تھی اس لیے ہومی سائڈ والوں نے کیس کی تفتیش دوسرے افسران کے سپرد کر دی۔ شروع میں واضح تھا کہ جیمی نے خودکشی کی۔ اپارٹمنٹ کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کسی مزاحمت، مداخلت یا دراندازی کے آثار نہیں تھے۔ جیمی کھڑکی سے گری تھی اور اس سے اتفاقاً گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر چھوٹا سا گاؤن تھا۔ وہ جس کھڑکی سے گری، وہ لاؤنج میں تھی۔ وہاں ٹی وی بھی رکھا ہوا تھا اور ٹی وی چلتا ہوا پایا گیا۔ قالین پر ایک کشن یوں پڑا تھا جیسے جیمی اس کے سہارے بیٹھی تھی۔ یہ جگہ کھڑکی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ پھر وہ کھڑکی تک آئی، اس کا پٹ اوپر کر کے وہ باہر فٹ بھر کے چھجے پر نکلی اور یہاں سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ پولیس کو لاؤنج میں کوئی غیر متعلقہ یا ایسی چیز نہیں ملی تھی جو اس کی موت پر روشنی ڈالتی۔ اس نے کوئی نوٹ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اچانک ہی اس کا خودکشی کا موڈ ہوا اور اس نے خودکشی کر لی۔

ویکس کو ماننے میں دشواری پیش آئی تھی کہ جیمی خودکشی کر سکتی ہے لیکن یہ سو فیصد خودکشی تھی۔ اس موت میں کوئی بیرونی عوامل کارفرما نہیں تھے۔ جیمی کے دفتر میں بھی سب ٹھیک تھا۔ ایملس انٹرنیشنل کی چیف ایگزیکٹو ماریا ایمکس، جیمی کی تدفین میں شریک تھی اور اس نے ویکس سے کہا تھا کہ وہ اس کی فرم کی چند بہترین کارکنوں میں سے ایک تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جیمی جیسی زندگی سے بھرپور عورت خودکشی کر سکتی ہے جبکہ وہ اپنے دل پسند شخص کے ساتھ زندگی بھی گزار رہی تھی۔ ایمکس انٹرنیشنل نے پولیس سے مکمل تعاون کیا... اور اسے جیمی کے ذاتی پروجیکٹ میں تمام معلومات تک رسائی دی.... لیکن یہ معلومات کلاسیفائڈ تھیں اس لیے پولیس رپورٹ میں ان کا ذکر نہیں آیا تھا۔ بہرحال مارٹن بوش کے قتل کی وجہ اور قاتل کی طرح پولیس جیمی کی خودکشی کی بھی وجہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکی تھی اور تین مہینے بعد کیس داخل دفتر ہو گیا۔

ان دنوں ویکس مافیا سے متعلق ایک کیس پر کام کر رہا تھا۔ دو دن پہلے آئرش مافیا کا ایک دوسرے درجے کا چیف جوزف بین سب وے میں بیشمار افراد کے سامنے آنے والی ٹرین کے ٹریک پر کود گیا۔ وہ مخالف سمت میں بھاگا لیکن ٹرین کی رفتار کہیں تیز تھی اور اس نے جوزف کے ٹکڑے کر دیے۔ عینی شاہدین کا کہنا تھا کہ اس کے پاس کوئی نہیں تھا اور نہ ہی وہاں کوئی ہنگامہ ہوا تھا۔ بس جوزف اچانک ہی پلیٹ فارم سے نیچے ٹریک پر کودا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ حالانکہ اس وقت ٹرین مشکل سے بیس گز کی دوری پر تھی۔ اسے تین چار قدم سے زیادہ اٹھانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ یہ کیس ویکس اور مائیک کے سپرد ہوا تھا۔ جوزف کے پاس سے ایک پستول، اس کا پرس، موبائل، چابیاں اور اس کی جیکٹ کی جیب سے ایک ٹوٹی ہوئی شیشی ملی تھی۔ بدقسمتی سے شیشی ٹوٹ گئی تھی اور اس میں بھرا سیال بہہ نکلا تھا۔ کوشش کے باوجود اس کا نمونہ حاصل نہیں کیا جا سکا تھا۔ فارنسک لیب کے مطابق یہ ڈھائی انچ لمبی اور ایک انچ قطر کی شیشی تھی جس پر ائرلاک کیپ لگایا جاتا ہے اور ایک بار کھلنے کے بعد یہ کیپ دوبارہ نہیں لگتا۔ گویا شیشی میں موجود چیز ایک ہی بار استعمال کی جا سکتی تھی۔

جوزف کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ظاہر تھا کہ وہ نشے میں نہیں تھا اور نہ ہی اس کے خون میں کسی نشہ آور شے کے اثرات ملے تھے۔ گویا اس نے ٹریک پر کودنے کا عمل بقائمی ہوش و حواس میں کیا تھا۔ لیکن اگر اس کا خودکشی کا ارادہ تھا تو مخالف سمت میں کیوں بھاگا تھا؟ جوزف شادی شدہ اور ایک بچی کا باپ تھا۔ اس کی بیوی کا کہنا تھا کہ وہ خودکشی کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ جوزف سینٹرل پارک کے پاس ایک علاقے کا نگران تھا۔ یہاں مافیا کے چلنے والے نائٹ کلب اور منشیات کے اڈے اس کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ مافیا نے اس قتل کا الزام مخالفوں پر لگایا تھا لیکن یہ بے بنیاد الزام تھا۔ درجنوں افراد کے سامنے جوزف خود ٹریک پر کودا تھا۔ جوزف کا بھائی ریف بین سخت جذباتی تھا۔ اس نے الزام لگایا کہ ان کے دشمنوں نے جوزف کو کسی طریقے سے اس حرکت پر مجبور کیا تھا، ورنہ اس کا سب وے پر موجود ہونے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ریف نے ایک الزام یہ بھی لگایا کہ ان کے مخالفین مارکیٹ میں ایک نیا نشہ پھیلا رہے ہیں جو بہت زوداثر اور بہت ہی مہنگا ہے۔ لیکن وہ اس نشے کے بارے میں وضاحت نہیں کر سکا تھا۔

دو مہینے پہلے مائیک کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اس لیے فی الحال وہ بھاگ دوڑ کے قابل نہیں تھا اور پلاستر میں جکڑی ٹانگ کے ساتھ دفتر میں بیٹھ رہا تھا۔ ویکس دفتر پہنچا تو مائیک آ گیا تھا اور جوزف کے کیس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے علیک سلیک کے بعد کہا۔ ”ایسا لگ رہا ہے کہ جوزف کا دماغ اچانک چل گیا اور اس نے ٹریک پر چھلانگ لگا دی۔“

ویکس نے اسے یاد دلایا۔ ”وہ مخالف سمت میں بھاگا تھا۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عین موقع پر زندگی سے محبت جاگ گئی ہو اور اس نے جان بچانے کی کوشش کی۔“

”کل شام میں نے ایک عینی گواہ مینڈی سے انٹرویو کیا ہے۔ وہ جوزف کے سب سے زیادہ نزدیک تھی اور اس کا کہنا ہے جب وہ وہاں پہنچی تو جوزف پہلے سے موجود تھا۔ مینڈی پلیٹ فارم پر آنے والی دوسری فرد تھی۔ ٹرین آنے میں دس منٹ تھے۔ اس کا کہنا ہے کہ جوزف خوف زدہ تھا۔ وہ بار بار چونک کر آس پاس دیکھ رہا تھا جیسے اسے کسی کا ڈر ہو۔“

”اس نے مینڈی کی طرف بھی دیکھا تھا؟“

”نہیں، اس نے مینڈی یا بعد میں آنے والوں میں سے کسی پر بھی توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے بجائے وہ پلیٹ فارم کی چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اس کے خوف میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مینڈی کا کہنا ہے کہ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ مافیا کا آدمی ہے اس لیے وہ اسے دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ ٹریک پر کودنے سے ایک منٹ پہلے اس نے چھت کی طرف دیکھا تو انتہائی خوف زدہ ہو گیا جیسے اسے کوئی بہت خوفناک چیز نظر آئی ہو۔ اس نے یوں ہاتھ اوپر کیے جیسے اس چیز سے بچنا چاہ رہا ہو۔ مینڈی کا کہنا ہے کہ اس نے چھت کی طرف دیکھا تو اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اسی لمحے جوزف اچانک بھڑکا اور اس نے ٹریک پر چھلانگ لگا دی۔ پلیٹ فارم پر موجود لوگ چیخنے لگے اور اسی دوران میں ٹرین جوزف سے ٹکرا گئی۔“

”سوال یہ ہے کہ وہ کس چیز سے خوف زدہ تھا؟“

ویکس اور مائیک کا کمرا ایک ہی تھا۔ ویکس اپنی میز پر آ گیا۔ ”جوزف کے بھائی ریف نے الزام لگایا ہے کہ ان کے حریف مارکیٹ میں کوئی نیا نشہ متعارف کرا رہے ہیں جو بہت زوداثر اور مہنگا ہے۔“

”اب تک ایسے کسی نشے کی رپورٹ ہمارے پاس نہیں آئی ہے۔ میں نے متعلقہ ڈپارٹمنٹ سے معلوم کیا ہے۔“ مائیک بولا۔ ”ویسے آئرش مافیا کا حریف اس علاقے میں سیاہ فام گروپ ہے، جس کا باس مالینی ہے۔“

”تب مجھے ان کا جائزہ لینا ہوگا۔“

”بہت احتیاط سے۔“ مائیک نے خبردار کیا۔ ”سیاہ

فام مافیا خاندانوں پر انحصار نہیں کرتی اس لیے اسے افراد کی کمی نہیں ہے۔ یہ مرنے مارنے سے نہیں ڈرتے اور پولیس کے خاص طور سے دشمن ہیں۔"

"فکر مت کرو، میں احتیاط کروں گا۔ تمہارا کیا حال ہے؟"

"ڈاکٹر کل تک پلاستر اتار دے گا۔ مجھے امید ہے کہ ایک ہفتے بعد میں پوری طرح فارم میں آجاؤں گا۔"

ویکس چھ بجے دفتر سے نکلا۔ گھر جانے کے بجائے وہ ایک بار چلا آیا۔ یہاں کچھ وقت گزار کر اس نے اپنے پسندیدہ ریستوران میں ڈنر کیا اور پھر مالینی کے نائٹ کلب کا رخ کیا۔ یہ سینٹرل پارک سے کچھ دور تھا اور ظاہر ہے سیاہ فاموں کی اکثریت والے علاقے میں تھا۔ مگر نائٹ کلب کے ساتھ والی سڑک پر لاتعداد مہنگی کاروں کی موجودگی بتا رہی تھی کہ یہ ایک ہائی کلاس نائٹ کلب ہے۔ کلب کے باہر بے شمار ایسے افراد کا ہجوم تھا جو اندر جانے کی خواہش رکھتے تھے لیکن وہ استعداد نہیں رکھتے تھے۔ انٹری صرف بھاری جیب والوں کی ہو رہی تھی۔ ویکس نے دیکھا کہ دو سیاہ فام بدمعاش رشوت لے کر لوگوں کو اندر جانے دے رہے تھے۔ ویکس آگے آیا تو ایک بدمعاش نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے چند نوٹ اس کی ہتھیلی میں دبا دیے۔ اس کے چہرے پر خفیف سی نرمی آئی اور اس نے سر ہلا کر اسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ ویکس کو دو سو ڈالرز کی قربانی دینا پڑی تھی ورنہ اسے اپنا پولیس بیج دکھانا پڑتا۔

وہ مرکزی ہال میں داخل ہوا جہاں وسیع رقبے پر بنے رنگ میں سیکڑوں افراد تیز موسیقی پر ناچ رہے تھے۔ ان میں عورتوں اور لڑکیوں کی تعداد مردوں سے دگنی سے بھی زیادہ تھی۔ ویکس ان کے درمیان سے گزرتا ہوا بار تک آیا اور اس نے بارٹینڈر کو۔۔۔ اشارہ کیا۔ اس نے چھوٹا سا گلاس اس کے سامنے رکھ دیا۔ ویکس نے اسے ایک ہی سانس میں حلق سے اتار لیا۔ وہ لوگوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ وہاں چاروں طرف لوگ کرسیوں، صوفوں اور اسٹولز پر بیٹھے تھے۔ وہ شراب اور تمباکو سے شغل کر رہے تھے لیکن کوئی نشہ کرتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ویکس جانتا تھا کہ یہ حصہ صرف نمائش کے لیے ہے۔ نشے کے شوقین کہیں اور تھے۔ ایک طرف سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ ویکس نے دیکھا، سرخ لباس میں ایک دوغلی نسل والی لڑکی اپنی دو ساتھی لڑکیوں سے بات کر رہی تھی۔ وہ خوب صورت تھی مگر اس کی خوب صورتی ماند پڑ رہی تھی۔ یہ تیز رفتار زندگی اسے چاٹ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی، ویکس اس کے پیچھے آیا اور سیڑھیوں سے پہلے وہ یوں اس سے لگ گیا جیسے اس کے ساتھ ہی ہو۔ وہ نشے میں دھت تھی اور اسے احساس بھی نہیں ہوا۔ لیکن اس کی وجہ سے ویکس بہ آسانی اوپر پہنچ گیا۔ اگر وہ لڑکی کے ساتھ نہ ہوتا تو سیڑھیوں پر موجود کلب کا کارندہ اسے اوپر جانے کی اجازت نہ دیتا۔

نیچے جتنا شور اور ہیجان تھا، اوپر اتنا ہی سکون اور سناٹا تھا۔ یہ اوپری طبقے کے لوگوں کے لیے مخصوص جگہ تھی۔ وہاں بیش قیمت فرنیچر تھا۔ یہاں بھی عورتوں اور لڑکیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی اور ان میں سے بیشتر نشے میں دھت تھیں۔ کچھ مرد بھی تھے جو عورتوں کی بے خودی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر ویکس کو یہاں بھی نشے کے لوازمات نظر نہیں آئے۔ سرخ لباس والی لڑکی لہراتی بل کھاتی ہوئی اندر کہیں چلی گئی۔ ویکس کچھ دیر وہاں پھرتا رہا جب اسے کوئی مشکوک چیز نظر نہیں آئی تو وہ دوبارہ نیچے آگیا۔ اس نے سیڑھیوں کے پاس ایک تنومند صاف سر والے سفید فام کو دیکھا۔ اس کے بازو ٹیٹوز سے گدے ہوئے تھے اور اس کے دائیں بازو پر پروں والے سیاہ فام فرشتے کا ٹیٹو بنا ہوا تھا۔ تنومند شخص اسے گھورتا ہوا اوپر چلا گیا اور اس نے درمیان میں رک کر نگران سے کچھ پوچھا بھی۔ ویکس دوبارہ بار کی طرف آگیا۔ اس مرتبہ اس نے بیئر طلب کی۔ یہاں کا شاٹ بہت تیز اور تلخ تھا اور وہ اپنے ہوش و حواس میں رہنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد اچانک سرخ لباس والی لڑکی اس کے سامنے آئی۔ وہ مسکرائی تو اس کے بہت سفید دانت نمایاں ہونے لگے۔ وہ بے تکلفی سے بولی۔

"ہائے۔"

"ہائے۔"

"تم ویکس ریان ہو نا؟"

اسے جھٹکا لگا۔ لڑکی اسے پہچان گئی تھی۔ "ہاں، تم نے کیسے جانا؟"

"تمہاری بیوی نے خودکشی کر لی تھی۔"

ویکس کا چہرہ تن گیا۔ یقیناً لڑکی نے انہی دنوں اسے۔۔۔ ٹی وی یا اخبار میں تصویر کی صورت میں دیکھا تھا۔ "ہاں لیکن اس موقع پر اس کا ذکر کس لیے۔۔۔؟"

لڑکی آگے جھکی۔ "اگر تم پسند نہیں کرتے ہو تو میں ذکر نہیں کروں گی۔ ویسے میں جیمی کو جانتی ہوں۔"

ویکس کو پھر جھٹکا لگا۔ اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ لڑکی نے اسے ٹی وی یا اخبار کے توسط سے شناخت کیا تھا۔

"تم جیمی کو کیسے جانتی ہو؟"

"یہ میں یہاں نہیں بتا سکتی۔" لڑکی نے آس پاس دیکھا۔ ویکس کو اس کے چہرے پر خوف آمیز تاثرات نظر آئے۔ "تم مجھے کہیں اور لے جا سکتے ہو؟"

ویکس نے سر ہلایا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

"نہیں، تم جاؤ۔۔۔ میں بعد میں آؤں گی۔ تم گاڑی اگلے سگنل تک لے جاؤ۔"

ویکس نے ایسا ہی کیا۔ وہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ لڑکی جیمی کو کیسے جانتی تھی۔ اس کے خیال میں جیمی کا اس سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔ لڑکی تاخیر سے آئی اور کار میں بیٹھتے ہی اس نے مضطربانہ انداز میں کہا۔ "پلیز چلو یہاں سے۔"

"تمہیں کسی کا خوف ہے؟"

"ایسا ہی سمجھ لو۔" لڑکی نے عقبی آئینے میں دیکھا اور ایسا کرتے ہوئے وہ ویکس کے خاصے قریب آگئی تھی۔ ویکس نے اس کے وجود کی خوشبو اور حرارت محسوس کی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ "مجھے اپنے گھر لے چلو۔"

ویکس نے کار کا رخ اپنے اپارٹمنٹ کی طرف موڑ دیا لیکن وہ اسے سامنے سے نہیں بلکہ عقبی حصے سے اندر لے گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی لڑکی کو اس کے ساتھ دیکھے۔ چھ منزلوں کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچتے پہنچتے لڑکی کی حالت بُری ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً کسی نشے کی عادی تھی کیونکہ اس کا اسٹیمنا بہت کم تھا۔ یہ چیز اس کی آنکھوں کے گرد حلقوں سے بھی واضح تھی۔ جب وہ ویکس کے اپارٹمنٹ کے پاس پہنچے تو وہاں لفٹ دیکھ کر وہ غصے میں آگئی۔ "تم مجھے لفٹ سے نہیں لا سکتے تھے؟"

ویکس نے اسے دروازہ کھول کر اندر دھکیلا۔ "میں نہیں چاہتا کہ کسی کی نظر تم پر پڑے۔"

اندر آتے ہی لڑکی کا انداز بدل گیا۔ "کیوں، کیا تم بہت نیک نام ہو؟" وہ بولتے ہوئے لگاوٹ بھرے انداز میں اس کے قریب آگئی۔ ویکس اس کی طرف توجہ دیے بغیر کوٹ اتارنے لگا تو وہ پیچھے ہٹی اور پھر بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے اچانک اس نے اپنا فراک نما لباس اتار دیا اور گھوم کر بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ ویکس پہلے حیران ہوا پھر کوٹ ہینگر پر ٹانگ کر اس کے پیچھے لپکا۔ "اے، ایک منٹ۔۔۔ میں تمہیں اس لیے نہیں لایا ہوں۔"

وہ اس کے بیڈ پر دعوت دینے کے انداز میں لیٹی ہوئی تھی۔ "پھر کس لیے لائے ہو؟"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم جیمی کو کیسے جانتی ہو؟"

"یہ میں تمہیں اس صورت میں بتاؤں گی جب تم میرے پاس آؤ گے اور میری خواہش پوری کرو گے۔" یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔

"مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" ویکس کا لہجہ خشک ہو گیا۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر ایک جھٹکے سے اٹھی۔ اس نے نیچے پڑا لباس اٹھا کر پہنا اور تیزی سے راہداری کی طرف بڑھ گئی۔ ویکس اس کے پیچھے آیا تو وہ دروازے کے پاس تھی۔ وہ باہر جانے سے پہلے رکی اور بولی۔ "میں جیمی کو اس طرح جانتی ہوں کہ وہ بھی وہاں آتی تھی۔" یہ کہہ کر وہ ہنسی اور باہر نکل گئی۔ ویکس سن رہ گیا۔ لڑکی کا مطلب تھا کہ جیمی بھی اسی نائٹ کلب میں جاتی تھی۔ وہ سوچتا رہا پھر تیزی سے باہر آیا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکی اب لفٹ سے باہر گئی ہو گی لیکن وہ سیڑھیوں سے گئی تھی۔ ویکس ٹھنڈی سانس لے کر واپس آگیا۔ لڑکی نے جان بوجھ کر سیڑھیوں والا راستہ اختیار کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ویکس اگر اس کے پیچھے آیا تو وہ پہلے لفٹ کو دیکھے گا۔ تب تک وہ نکل چکی ہو گی۔ ویکس ٹھنڈی سانس لے کر واپس آگیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ کل وہ دوبارہ مالینی کے کلب جائے گا۔

لڑکی عمارت کے عقبی حصے سے باہر نکلی اور تیز قدموں سے سڑک کی طرف جانے لگی۔ موسم نہایت سرد تھا لیکن مختصر لباس میں وہ موسم سے بے نیاز لگ رہی تھی۔ وہ تیز قدموں سے جا رہی تھی اور اس کا سانس بھی تیز چل رہا تھا۔ اچانک اسے لگا جیسے عقب سے کوئی آواز آئی ہو۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمودار ہوئے۔ عقب میں عمارتوں پر ایک سیاہ ہیولا نمودار ہوا جس کے لہراتے پر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ لڑکی کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی مگر چند قدم کے بعد ہی وہ گری۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سیاہ ہیولا بالکل اس کے اوپر آگیا تھا۔ پھر وہ اس کی طرف جھپٹا۔ لڑکی کے منہ سے نکلنے والی چیخ فوراً ہی گھٹ کر رہ گئی۔ کسی نے نہیں دیکھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح ویکس کی آنکھ کھلی تو ابھی صرف ساڑھے چھ بجے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی۔ فوراً ہی سیل فون کی بیل نے اسے جواب دیا۔ اس کی آنکھ بیل سن کر کھلی تھی۔ اس نے سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ اسکرین پر مائیک کا نام آ رہا تھا۔ ویکس کے کال ریسیو کرتے ہی اس نے کہا۔ "تم اپنے اپارٹمنٹ کی عقبی گلی میں آنا پسند کرو گے؟"

"کیوں... کیا ہوا؟"

"میں اور ہومی سائڈ والے یہاں موجود ہیں۔ ایک لڑکی کی لاش ملی ہے۔"

"میں آرہا ہوں۔"

ویکس نے کہا۔ اس نے عجلت میں منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور کپڑے بدل کر باہر آگیا۔ بارش ہو رہی تھی اور موسم سرد ہو چلا تھا۔ گلی کے آخری سرے پر کئی پولیس کاریں اور ایک ایمبولنس بھی موجود تھی۔ پولیس نے پیلی پٹیاں لگا کر گلی کو دونوں طرف سے بند کر دیا تھا۔ ویکس آگے آیا۔ مائیک بڑی سی چھتری تلے پڑی لڑکی کی لاش دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہومی سائڈ کا ایک آفیسر بیلی جارڈن بھی موجود تھا۔ ویکس اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ ان کی طرف بڑھا۔ لڑکی کو اس نے دور سے ہی سرخ لباس سے شناخت کر لیا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور گردن پر گہرے نشان موجود تھے۔ اسے گلا دبا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ مائیک اسے دیکھتے ہی اٹھ کر اس کے پاس آیا۔ اس کا پلاسٹر اتر گیا تھا اور وہ چھڑی کے سہارے چل رہا تھا۔

"ابھی پلاسٹر اترا کر نکلا تھا کہ یہاں آنا پڑا۔" مائیک نے کہا۔ "تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟"

ویکس نے سر ہلایا۔ "یہ کل مجھے مالینی کے کلب میں ملی تھی۔ خود سے میرے پاس آئی اور پھر اس نے خوف کا اظہار کرتے ہوئے میرے ساتھ گھر چلنے کی فرمائش کی۔"

"تم اسے کیوں لے کر آئے؟" مائیک نے وجہ پوچھی۔

ویکس نے گہری سانس لی۔ "یہ جیمی کو جانتی تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ اسے کیسے جانتی ہے لیکن میرے اپارٹمنٹ میں آنے کے بعد اس کا رویّہ کال گرل کا سا ہو گیا۔ جب میں نے کوئی دلچسپی نہیں لی تو یہ واپس چلی گئی۔" ویکس نے یہ ذکر نہیں کیا کہ لڑکی نے جیمی کے بارے میں کیا کہا تھا۔

"وقت کیا تھا؟"

"یہ بارہ بجنے سے چند منٹ پہلے میرے اپارٹمنٹ سے نکل گئی تھی۔"

"تمہاری گاڑی عقبی گلی میں کھڑی ہے؟"

"میں اسے اسی طرف سے لے کر گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے میرے ساتھ دیکھے۔ لیکن تم یہ سوالات کیوں کر رہے ہو؟"

مائیک نے ہاتھ آگے کیا تو اس پر ویکس کا پولیس بیج اور کارڈ تھا۔ "یہ دونوں چیزیں اس کے پاس سے ملی ہیں۔"

ویکس نے اپنا پرس نکال کر دیکھا۔ اس میں سے دونوں چیزیں غائب تھیں۔ "میرا خیال ہے کہ اس نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے میرے کوٹ سے نکالی تھیں۔"

"سوال یہ ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟"

ویکس نے شانے اچکائے۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر لیا ہے؟"

"ہاں لیکن سردی کی وجہ سے موت کا درست وقت نہیں بتا سکا، پوسٹ مارٹم سے پتا چلے گا۔ بہرحال جب صبح پانچ بجے لاش دیکھی گئی تو اسے مرے ہوئے یقیناً کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔"

"لاش کس نے دریافت کی؟"

"ایک سٹی ورکر نے جو صفائی کے لیے یہاں آیا تھا۔"

ویکس لاش کی طرف آیا۔ اس نے لاش کو سیدھا کیا... فوراً ہی اس کے بائیں ہاتھ نے اس کی توجہ حاصل کر لی۔ اس پر مستقل ہو جانے والے رنگ سے پروں والا سیاہ فرشتہ پینٹ کیا گیا تھا۔ یہ فرشتۂ اجل کا نشان تھا۔ ویکس کو یاد آیا کہ اس نے کلب میں اس تنومند سفید فام مرد کے بازو پر بھی سیاہ فرشتے کا ٹیٹو دیکھا تھا۔ کیا اس نشان کی کوئی خاص اہمیت تھی؟ مائیک اس کی طرف آیا۔ "میں زیادہ دیر کھڑا نہیں ہو سکتا ہوں، اس لیے آج آرام کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، میں کام دیکھ لوں گا۔" ویکس نے کہا۔ "کیا میرا بیج اور کارڈ رپورٹ کا حصہ بنے گا؟"

"باقاعدہ رپورٹ کا تو نہیں لیکن کیپٹن تک یہ اطلاع ضرور جائے گی اور وہ شاید تم سے پوچھ گچھ کرے۔" مائیک نے جواب دیا۔ "فی الحال یہ تمہیں نہیں ملے گا۔ تم شام کو بیلی سے بات کر لینا۔"

ویکس تیار ہو کر دفتر آیا۔ اس نے سب سے پہلے لڑکی کا کیس دیکھا۔ اس کا نام ایکاشا تھا۔ وہ افریقن نژاد امریکن تھی اور اس کا باپ جنوبی افریقا سے آیا تھا۔ اس کی ماں مقامی سفید فام تھی۔ اسی لیے ایکاشا میں دونوں نسلوں کا تاثر موجود تھا۔ ویکس کو افسوس تھا۔ اگر وہ تھوڑی زحمت کر لیتا اور سیڑھیوں والے راستے سے اس کے پیچھے جاتا تو شاید وہ زندہ ہوتی۔ قتل، ڈکیتی کی واردات نہیں تھی کیونکہ اس نے گلے میں سونے کی زنجیر پہنی ہوئی تھی۔ اسی طرح اس کا چھوٹا سا پرس بھی اس کے پاس موجود تھا۔ اس میں خاصی رقم اور دوسری چیزیں موجود تھیں۔ دوپہر تک پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی۔ اس کے مطابق قتل رات بارہ بجے کے آس پاس ہوا تھا۔ یعنی جب وہ ویکس کے اپارٹمنٹ سے نکل کر گئی تھی۔ کسی بہت

طاقتور آدمی نے اتنی قوت سے اس کا گلا دبایا تھا کہ نرخرہ اور رگیں پس کر رہ گئی تھیں۔ اس کے علاوہ جسم پر کوئی نشان نہیں تھا اور نہ ہی اس پر مجرمانہ حملہ ہوا تھا۔ اس کے خون میں الکوحل یا کوئی اور نشہ آور عنصر نہیں پایا گیا تھا۔

شام کو ویکس اپنا بیج اور کارڈ لینے بیلی کے پاس گیا۔ وہ شرارت سے بولا۔ "شکر کرو تم ہومی سائڈ کے آفیسر ہو ورنہ خاصی مشکل میں پڑ جاتے۔"

"کیا مطلب؟" ویکس سنجیدہ ہو گیا۔

"مطلب تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ اگر کسی اور کی دستاویزات کسی مقتول کے پاس سے نکلتیں تو تم اس کے ساتھ کیا کرتے؟"

"بکواس کرنے کے بجائے بہتر ہو گا تم بیج اور کارڈ میرے سپرد کر دو۔" ویکس نے سرد لہجے میں کہا۔

"ضرور۔" بیلی نے دونوں چیزیں اس کے سامنے ڈال دیں۔ "تمہیں کیپٹن جیف نے طلب کیا ہے۔ ذرا اس کی بکواس بھی سن لو۔"

ویکس جانتا تھا کہ اسے اس سلسلے میں مشکلات سے گزرنا پڑے گا۔ کیپٹن جیف نے اس سے سوالات کیے اور اس نے بغیر کچھ چھپائے اسے سب بتا دیا، سوائے ایک بات کے کہ جیمی بھی مالینی کے کلب میں جاتی تھی۔ کیپٹن اس پر اعتماد کرتا تھا اس لیے اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ لیکن اس نے ویکس کی یہ کیس دیکھنے کی درخواست مسترد کر دی۔ "تمہارے پاس پہلے ہی دو کیس ہیں اور دوسرے تمہارا تعلق بھی بن گیا ہے اس لیے بہتر ہے کہ تم یہ کام بیلی کو کرنے دو۔"

کیپٹن جیف نیک نام اور ایمان دار پولیس افسر تھا۔ خاص طور سے منشیات فروشوں کے خلاف اس کے اقدامات قابلِ ستائش تھے۔ اس نے بے شمار منشیات فروشوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچایا تھا۔ مائیک شام کو دفتر آیا۔ فزیو تھراپی سے اس کی حالت خاصی بہتر ہوئی تھی اور اب وہ چھڑی کے سہارے آرام سے چل رہا تھا۔ ویکس نے کہا۔ "میں جوزف بین کے بھائی ریف سے ملنے جا رہا ہوں۔"

"میں بھی چلوں گا۔ گھر اور دفتر میں بیٹھ کر بور ہو گیا ہوں۔"

ریف بین اپنے بھائی کے کلب میں موجود تھا۔ وہ دکھی تھا کہ اب تک اس کے بھائی کے کیس میں پولیس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ "اسے قتل کیا گیا ہے۔" ریف نے زور دے کر کہا۔

"تمام شواہد خودکشی کے ہیں پھر تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"دیکھو، جوزف خودکشی کرنے والا شخص نہیں تھا اور نہ ہی اس کی وجہ تھی۔ وہ اپنی ذمے داریاں بھی ٹھیک طریقے سے ادا کر رہا تھا۔ بزنس اور گھر میں بھی مسئلہ نہیں تھا۔ پھر وہ کیوں خودکشی کرنے لگا؟ وہ آج تک سب وے میں نہیں گیا، اسے ٹرین سے نفرت تھی۔"

"تمہارا مطلب ہے یہ کوئی سازش ہے؟"

"بالکل... دیکھو وہ مرنے سے پانچ گھنٹے پہلے گھر سے نکلا۔ لیکن اس کے بعد وہ کہاں رہا، کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس کی گاڑی بھی اس سب وے اسٹیشن سے دور ملی۔ وہ وہاں تک کیسے گیا؟ اور پھر اس نے ٹریک پر چھلانگ لگائی تھی۔ وہ کسی سے بچنے کے لیے بھاگا تھا مگر تم لوگ اس پر توجہ ہی نہیں دے رہے ہو۔"

"پولیس نے اس وقت پلیٹ فارم پر موجود ایک ایک فرد سے تفتیش کی ہے۔ دو درجن سے زیادہ افراد میں سے ایک بھی مشکوک نہیں ہے۔ وہ سب عام لوگ ہیں جن کا کسی مافیا یا جرائم پیشہ گروہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیمروں کی رپورٹ سے ظاہر ہے کہ کوئی فرد اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کے برعکس وہ خوف زدہ تھا اور بار بار اوپر دیکھ رہا تھا۔"

"تب وہ کسی دوا یا چیز کے زیرِ اثر تھا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ دشمنوں نے اسے اغوا کر کے کچھ استعمال کرایا تھا۔"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کے خون میں کسی قسم کا کوئی نشہ آور کیمیکل یا عنصر نہیں پایا گیا۔"

"ممکن ہے یہ کوئی ایسا نشہ ہو جس کا خون میں سراغ نہ ملتا ہو؟"

"ریف! تم نے الزام لگایا کہ مالینی گروپ مارکیٹ میں نیا نشہ پھیلا رہا ہے جو بہت زود اثر اور مہنگا ہے لیکن ہماری رپورٹ کے مطابق مارکیٹ میں ایسی کوئی چیز نہیں آئی ہے۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟"

ریف سوچ میں پڑ گیا جیسے بتانے یا نہ بتانے کا فیصلہ کر رہا ہو۔ پھر اس نے گہری سانس لی۔ "سنو، میں جو جانتا ہوں وہ تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں لیکن میں کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"ٹھیک ہے، تمہارا نام نہیں آئے گا۔" مائیک نے اسے تسلی دی۔

"دو ہفتے قبل ہمارے آدمیوں نے مالینی گروپ کا ایک آدمی پکڑا۔ وہ ہمارے علاقے میں پھر رہا تھا۔ ہمارا مقصد اسے نقصان پہنچانا نہیں تھا۔ اس نے بھی مزاحمت نہیں کی۔ اس کی تلاشی لی گئی تو اس کے پاس سے یہ نکلی۔"

ریف نے میز کی دراز سے ایک شیشی نکال کر سامنے رکھ دی جس میں ہلکے سبز رنگ کا سیال بھرا ہوا تھا۔ مائیک اور ویکس چونک گئے کیونکہ یہ ایسی ہی شیشی تھی جیسی جوزف کے پاس سے ملی تھی۔ اگرچہ وہ ٹوٹ گئی تھی لیکن اس کے اوپر ربر پلاسٹک کی ایسی ہی سیل تھی۔ ریف نے بات جاری رکھی۔ ”یہ شیشی لینے پر وہ پاگل ہو گیا اور ہمارے آدمیوں سے بھڑ گیا۔ پھر وہ اچانک بھاگ کھڑا ہوا اور ایک بلاک آگے سڑک سے گزرنے والے ٹرک کی زد میں آ گیا۔“

”یہ کیا چیز ہے؟“ ویکس نے شیشی اٹھا کر معائنہ کیا۔

”میں نہیں جانتا۔ میں نے اسے کھولا بھی نہیں لیکن مجھے شک ہے کہ جوزف کی موت اسی وجہ سے ہوئی ہے۔“

ویکس سوچ رہا تھا کہ اگر مالینی گروپ نے جوزف کو اس شیشی کی واپسی کے لیے اٹھایا تھا تو اس کی جیب میں ایسی ہی ایک شیشی کی موجودگی کا کیا جواز بنتا تھا۔ وہ اور مائیک کھڑے ہو گئے۔ مائیک نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، اگر ضرورت پڑی تو پھر تم سے رابطہ کریں گے۔“

”میں نے یہ چیز تمہارے سپرد کر دی ہے۔ اب میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں جوزف کی طرح مرنا نہیں چاہتا۔“

”تب بہتر ہوگا احتیاط کرو۔ جو لوگ جوزف کو لے جا سکتے ہیں، ان کے لیے تمہیں لے جانا بھی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ مائیک نے مشورہ دیا تو وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔

”اسی لیے میں اپنے کلب سے باہر نہیں جا رہا۔“

وہ باہر آئے۔ مائیک نے پوچھا۔ ”کیا خیال ہے، یہ سچ کہہ رہا ہے؟“

”بظاہر ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ ویکس نے کہا اور ہاتھ میں دبی شیشی کا معائنہ کیا۔ اس پر کسی قسم کا کوئی لیبل یا شناختی نشان نہیں تھا۔ یہ بالکل سادہ شیشی تھی اور اس کی نیلے رنگ کی سیل بھی سادہ تھی۔ اس نے شیشی مائیک کے سپرد کر دی۔ ”میرا خیال ہے کہ اسے لیب بھیج دیا جائے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”ادویات کے ریکارڈ سے معلوم کیا جائے کہ کون سی دوائیں یا کیمیکلز اس قسم کی شیشی میں پیک کیے جاتے ہیں۔“

”میں کہہ دوں گا۔“ مائیک نے کہا۔ ”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”میں ایک بار پھر مالینی کے کلب جاؤں گا۔“

”یہ خطرناک ہوگا۔“ مائیک نے خبردار کیا۔ ”لڑکی کا تمہارے پیچھے آنا اور پھر کارڈ اور بیج لے جانا ظاہر کرتا ہے کہ تم پر شک ہو گیا تھا... اور لڑکی کی موت ظاہر کرتی ہے کہ وہ کچھ جانتی تھی جسے چھپانا مقصود ہے۔“

”میں وہی بات جاننے کی کوشش کروں گا۔“ ویکس نے کہا پھر اس نے مائیک کو ایکاشا کی آخری بات بتا دی۔ ”وہ جانتی تھی کہ جیمی مالینی کے کلب میں گئی تھی اور وہیں اس نے جیمی کو دیکھا تھا۔“

مائیک سوچ میں پڑ گیا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ جیمی کا بھی اس کیس سے تعلق ہے؟“

”مجھے سیاہ فرشتے کا نشان پریشان کر رہا ہے۔ اس کی کوئی اہمیت ہے۔“

مائیک چونکا۔ ”سیاہ فرشتہ... موت کی نشانی۔“

”اسی وجہ سے مجھے گنجا سفید فام بھی مشکوک لگ رہا ہے۔“ ویکس نے کہا۔ ”میں اس کی نگرانی کروں گا۔“

”اور میں ریکارڈ روم جاؤں گا۔“ مائیک نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

”کیوں؟“

”میں جیمی کیس کی فائل ایک بار پھر دیکھوں گا۔ مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔“

”اوکے... پھر مجھے بھی بتانا۔“ ویکس نے کہا اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ مائیک واپس دفتر پہنچا۔ وہاں اس نے ریکارڈ روم سے جیمی کیس کی فائل نکلوائی اور پھر گھر روانہ ہو گیا۔ غسل اور ڈنر کے بعد اس نے فائل نکالی اور اپنی اسٹڈی میں آ گیا۔ اس نے پہلے کیس دیکھا پھر تصویروں کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک درجن تصاویر جیمی کی لاش کی تھیں۔ لاش جائے وقوعہ سے ہٹانے سے پہلے یہ تصاویر لی گئی تھیں۔ جیمی پہلو کے بل گری تھی اور اس کا دایاں ہاتھ ہتھیلی کے رخ سے نیچے کی طرف تھا۔ مائیک چونکا، اسے کلائی پر ایک سیاہ نشان دکھائی دیا تھا۔ اس نے تصویر کو روشنی کے نیچے کیا مگر نشان واضح نہیں تھا پھر اس نے محدب عدسہ نکال کر اس سے نشان دیکھا تو اس بار یہ واضح تھا۔ مائیک چونک گیا۔ یہ سیاہ فرشتہ تھا جو سیاہ رنگ سے کلائی پر بنا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے سیل فون نکالا اور ویکس کا نمبر ملایا۔ بیل جا رہی تھی لیکن کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے دوبارہ نمبر ملایا۔ اس بار بھی کال ریسیو نہیں ہوئی۔ اس نے جھنجھلا کر فون رکھ دیا۔

اسی لمحے اسے لاؤنج کی طرف سے کھٹکا سنائی دیا۔ وہ چونک کر اٹھا اور اس نے میز پر پڑا پستول اٹھا لیا۔ وہ دبے قدموں لاؤنج کی طرف آیا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ مگر وہ اس کھٹکے کو اپنا وہم سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے واضح

سنا تھا کہ کوئی یہاں آیا ہے۔ تب اس کی نظر ایک چھوٹی تپائی پر گئی جو لڑھک گئی تھی اور کھٹکا اسی کے گرنے سے ہوا تھا۔ وہ چھڑی بھول آیا تھا اس لیے کسی قدر مشکل سے جھکا اور اس نے تپائی سیدھی کی تھی کہ آنکھوں کے گوشوں سے کوئی چیز اپنی طرف جھپٹتی محسوس ہوئی۔ اس نے چونک کر سیدھا ہونا چاہا لیکن اسے مہلت نہیں ملی۔ اس کی تیز چیخ گونج کر رہ گئی۔

☆☆☆

ویکس مالینی کے کلب میں تھا اور وہاں سب گزشتہ رات جیسا تھا۔ وہاں نشے میں دھت ناچنے والوں کو پتا بھی نہیں تھا کہ کل تک اس کلب میں موجود ایکاشا کی لاش اس وقت مردہ خانے میں پڑی تھی۔ ویکس کو وہاں تنومند سفید فام بھی نظر نہیں آیا۔ یہ سیاہ فاموں کا کلب تھا اور وہاں ایک سفید فام بدمعاش کی موجودگی معنی خیز تھی۔ وہ کاؤنٹر پر آیا اور اپنے لیے بیئر طلب کی۔ اسی دوران میں اس نے سیل فون نکال کر دیکھا۔ اس پر مائیک کی دو مس کالز موجود تھیں اور اسے یہاں شور میں پتا نہیں چلا تھا۔ بیئر کا گلاس خالی کر کے وہ کلب سے باہر آیا اور مائیک کو کال کی۔ بیل جاتی رہی مگر مائیک نے کال ریسیو نہیں کی۔ دوسری ناکام کوشش کے بعد اس نے دفتر فون کیا اور ایڈمن سے مائیک کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔

”مائیک جیمی کیس کی فائل لے کر گھر چلا گیا تھا۔“

ویکس عجلت میں مائیک کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ وہ راستے میں بار بار اسے کال کرتا رہا اور جب جواب نہیں ملا تو اس نے ایمرجنسی کال کر کے علاقے میں موجود پیٹرول پولیس کو مائیک کے گھر پہنچنے کو کہا۔ جب وہ مائیک کے گھر کے سامنے پہنچا تو پیٹرول کار پہلے ہی وہاں پہنچ گئی تھی اور ایک آفیسر اندر تھا۔ ویکس نے باہر موجود آفیسر کو اپنا کارڈ دکھایا۔

”کیا صورتِ حال ہے؟“

”دروازہ کھلا ہوا تھا... اور میرا ساتھی اندر گیا ہے۔“

اسی لمحے ریڈیو جاگ اٹھا۔ ”اندر ایک لاش ہے... کسی نے اسے چاقو سے مارا ہے۔“

یہ سنتے ہی ویکس تیزی سے مکان کی طرف بڑھا۔ مائیک کی لاش لاؤنج میں موجود تھی اور اسی کے کچن کا چاقو دستے تک اس کے سینے میں پیوست تھا۔ ویکس کا صدمے سے برا حال ہو گیا۔ وہ گھٹنوں کے بل مائیک کی لاش کے پاس بیٹھ گیا۔ مائیک کا پستول پاس پڑا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ اسے حملہ آور کے خلاف مدافعت کا موقع ہی نہیں ملا اور اس نے چاقو مائیک کے سینے میں اتار دیا۔ صدمے کے باوجود اس نے لاش یا کسی چیز کو چھونے کی کوشش نہیں کی۔ پھر اسے خیال آیا تو وہ اٹھ کر مائیک کی اسٹڈی میں آیا۔ وہاں روشنی تھی اور میز پر ایک عدسہ پڑا تھا لیکن جیمی کیس کی فائل غائب تھی۔ آدھے گھنٹے میں ہومی سائیڈ افسران اور طبی عملہ آ گیا تھا۔ لیب والے مکان سے نشانات اٹھا رہے تھے۔ ویکس نے اپنا بیان ریکارڈ کرایا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ دفتر کی طرف تھا۔ جیمی کیس کی ہارڈ فائل غائب تھی لیکن اس کا کمپیوٹر ریکارڈ تو موجود تھا۔ ویکس اپنے دفتر میں آیا اور اپنا کمپیوٹر آن کر کے اس نے سینٹرل ریکارڈ سے جیمی کیس اوپن کرنا چاہا تو مرکزی سرور نے ایسی کسی فائل کی موجودگی سے انکار کیا۔ ویکس نے کمپیوٹر ریکارڈز کے شعبے میں کال کی۔

”میں جیمی کیس کی فائل کھولنا چاہ رہا ہوں لیکن کمپیوٹر انکار کر رہا ہے۔ ایسی کوئی فائل سرور پر موجود نہیں ہے۔“

”میں چیک کرتا ہوں۔“ کمپیوٹر سیکشن کے انچارج نے کہا۔ دس منٹ بعد اس نے تصدیق کی۔ ”یہ درست ہے۔ سسٹم میں ایسی کوئی فائل نہیں ہے۔“

”بکواس... سسٹم سے فائل کیسے غائب ہو سکتی ہے؟“

”ایک منٹ، میں مزید چیک کرتا ہوں۔ ہمارے پاس ڈیٹا تین جگہ ہوتا ہے۔“ کمپیوٹر سیکشن انچارج نے کہا لیکن مزید چیک کرنا بھی بے سود رہا۔ فائل تمام جگہوں سے غائب تھی۔ ویکس نے کیپٹن جیف کو کال کی۔ وہ بھی حیران ہوا۔ پھر مائیک کے قتل نے اسے پریشان کر دیا۔ ویکس نے

کہا۔

’’مجھے یقین ہے کہ اس میں اندر کا کوئی آدمی ملوث ہے۔‘‘

’’لیکن یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟‘‘

’’جس طرح سے فائل غائب ہوئی ہے، اس سے تو یہی لگتا ہے اسی اندر کے آدمی نے قاتلوں کو اطلاع دی کہ مائیک فائل لے گیا ہے وہ اسے قتل کر کے فائل لے اڑے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس کے گھر میں کسی چیز کو نہیں چھوا۔‘‘

’’تمہارا کیا خیال ہے؟‘‘

’’فی الحال کوئی خیال نہیں ہے۔‘‘ ویکس نے کہا لیکن اس کے ذہن میں شک بڑھ رہا تھا۔ اب اسے لگ رہا تھا کہ جیمی، جوزف اور مائیک کی اموات ایک ہی سلسلے کی کڑی تھی۔ اچانک اسے اس شیشی کا خیال آیا جو ریف بین نے انہیں دی تھی۔ مائیک کے گھر میں اسے شیشی نظر نہیں آئی تھی۔ اس نے پولیس لیب کے انچارج کو کال کر کے شیشی کے بارے میں پوچھا۔

’’نہیں جناب! ایسی کوئی چیز مسٹر مائیک کی طرف سے ہمیں نہیں ملی۔‘‘

ویکس گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ مائیک شیشی بھی گھر لے گیا تھا اور اسے قتل کرنے والا فائل کے ساتھ شیشی بھی لے گیا تھا۔ اسے خیال آیا کہ شاید قتل بھی فائل کی وجہ سے نہیں بلکہ شیشی کی وجہ سے ہوا تھا مگر اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔ اس صورت میں پولیس کے کمپیوٹر سسٹم سے جیمی کیس کی فائل غائب کیوں ہوئی؟ مایوس اور دل شکستہ ویکس دفتر سے نکلا تو رات گہری ہو گئی تھی۔ وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس معاملے پر سوچ رہا تھا۔ اچانک اسے ایک خیال آیا اور اس نے کار کا رخ اسپتال کی طرف موڑ دیا جس کے مردہ خانے میں غیر فطری موت کا شکار افراد کی لاشیں پوسٹ مارٹم اور محفوظ کرنے کے لیے لائی جاتی تھیں۔ مردہ خانے کا انچارج ڈاکٹر ریکٹر اسے جانتا تھا کیونکہ ویکس آئے دن وہاں جاتا تھا۔ اس کی نائٹ شفٹ تھی۔ اس نے ویکس کو دیکھ کر گرم جوشی سے کہا۔

’’ہائے ویکس... مائیک کیسا ہے؟‘‘

’’وہ کچھ دیر میں یہاں آنے والا ہے۔‘‘ ویکس نے جواب دیا۔ ’’میں ایک لاش کے سلسلے میں آیا ہوں۔‘‘

’’نام... تاریخ بتاؤ۔‘‘

’’نام نہیں معلوم لیکن وہ دو ہفتے پہلے روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا تھا۔‘‘

’’دو ہفتے پہلے۔‘‘ ڈاکٹر نے اپنے کمپیوٹر پر چیک کیا۔ ’’ٹھیک دو ہفتے پہلے ڈریک نامی سیاہ فام کی لاش آئی تھی۔ اسے ٹرک نے کچل دیا تھا۔‘‘

’’میرا خیال ہے یہی ہے۔‘‘

’’آؤ میرے ساتھ۔‘‘ ڈاکٹر ریکٹر اسے مردہ خانے میں لایا۔ تالا کھول کر وہ اندر آئے۔ یہاں درجۂ حرارت صفر تھا۔ ڈاکٹر نے ایک خانہ کھولا اور اس کی ٹرے باہر کھینچی۔ ڈریک کی تڑی مڑی لاش اس میں تھی۔ ویکس نے لاش کا معائنہ کیا اور پھر اس کے بازو چیک کیے۔ اس کی توقع کے عین مطابق اس کے بازو پر سیاہ فرشتے کا ٹیٹو موجود تھا۔ اس نے اپنے آئی فون سے اس ٹیٹو کی تصویریں لیں۔ وہ واپس ڈاکٹر ریکٹر کے دفتر میں آئے۔

’’اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کیا ہے؟‘‘

’’موت کی وجہ دماغ پر لگنے والی چوٹ تھی۔‘‘

’’خون میں کوئی نشہ آور چیز پائی گئی؟‘‘

’’نہیں، البتہ الکوحل کی مقدار معمول سے کچھ زیادہ تھی مگر یہ نشے کے لیے ناکافی تھی۔‘‘

ویکس اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے نکلنے والا تھا کہ مائیک کی لاش آ گئی۔ ڈاکٹر ریکٹر دم بہ خود رہ گیا۔ ویکس نے آہستہ سے کہا۔

’’میں نے کہا تھا نا کہ مائیک یہاں آنے والا ہے۔‘‘

ویکس گھر پہنچا تو اس کا سر درد سے بوجھل ہو رہا تھا۔ اس نے گرم پانی سے غسل کر کے پین کلر لی اور بستر پر گر کر بے خبر سو گیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو دس بج رہے تھے۔ سر کا درد اور بوجھل پن کم ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر اپنے لیے کافی بنائی اور دوسرے کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرا جیمی اور اس نے کام کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ کبھی جیمی کو اپنا اضافی کام کرنا ہوتا یا ویکس کوئی کیس دیکھنے کے لیے گھر لاتا تو یہی کمرا استعمال ہوتا تھا۔ وہاں جیمی کا لیپ ٹاپ موجود تھا۔ اس کی خودکشی کے بعد پولیس نے اس کا لیپ ٹاپ بھی دیکھا تھا لیکن اس کا ای میل اکاؤنٹ چیک نہیں کیا تھا۔ ویکس نے جیمی کا ای میل اکاؤنٹ کھولنا چاہا۔ پاس ورڈ اس کے علم میں تھا۔ یہی اس کا آفیشل ای میل تھا۔ لیکن پاس ورڈ مسترد ہو گیا۔ اس نے دوبارہ پاس ورڈ ڈالا، اس بار بھی مسترد ہو گیا۔ پھر اس نے خفیہ سوال کی مدد سے پاس ورڈ ریکوری کی کوشش کی تو خفیہ سوال بھی بدلا ہوا تھا۔ ویکس کی پیشانی پر شکنیں آ گئیں۔ معاملہ اس کی توقع سے زیادہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ تیار ہو کر دفتر آیا۔ ہومی سائڈ کے ایک آفیسر کا قتل معمولی بات نہیں

تھی۔ کیپٹن جیف میڈیا بریفنگ میں مصروف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایسے کسی معاملے میں میڈیا کی قیاس آرائی سے پہلے اسے حقائق سے آگاہ کر دینا ہی مناسب ہوتا ہے۔ اس کے بعد تمام آفیسرز کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں مائیک کی یاد میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی پھر کیپٹن جیف نے کیس ویکس اور ایک آفیسر مینڈل کے سپرد کر دیا۔ ویکس نے درخواست کی۔

’’مائیک میرا دوست تھا اس لیے بہتر ہوگا کہ یہ کیس مینڈل اور کسی دوسرے آفیسر کے سپرد کیا جائے۔‘‘

کیپٹن جیف نے اس کی درخواست مان لی اور مینڈل کے ساتھ ایک اور آفیسر کو لگا دیا۔ ویکس اپنے کمرے میں آیا۔ اس نے کمپیوٹر آن کیا اور انٹرنیٹ پر کچھ چھان بین کرنے لگا۔ اس کی تفتیش کا مرکزی نکتہ سیاہ فرشتہ تھا۔ پہلے اس نے سیاہ فرشتے کے بارے میں تحقیق کی۔ سیاہ فرشتہ مغربی دیو مالا میں عام طور سے موت کا فرشتہ سمجھا جاتا تھا۔ کسی فرد کو یہ فرشتہ نظر آنے کا مطلب ہوتا تھا کہ اس کی موت آ گئی ہے۔ ویکس دوپہر تک اس کی چھان بین کرتا رہا لیکن اس بارے میں کچھ خاص معلوم نہیں ہوا۔ دوپہر دو بجے وہ لنچ کے لیے ایک نزدیکی ریستوران میں آیا۔ لنچ کے بعد اس نے سیل فون نکال کر ایمکس انٹرنیشنل کے نمبر پر کال کی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے آپریٹر سے ماریا ایمکس سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ کچھ دیر بعد وہ لائن پر تھی۔

’’مس ایمکس! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’کس سلسلے میں مسٹر ریان؟‘‘

وہ ہچکچایا۔ ’’میں جیمی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں؟‘‘

’’آفیشلی؟‘‘

’’نہیں، نجی ملاقات ہوگی۔‘‘

ماریا کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ ’’ٹھیک ہے، تم شام چھ بجے آ جاؤ۔ میں دفتر میں ملوں گی۔‘‘

ویکس ساڑھے پانچ بجے دفتر سے نکلا اور چھ بجے سے ذرا پہلے وہ ایمکس انٹرنیشنل کی شاندار عمارت کے سامنے تھا۔ شیشوں اور دھات سے بنی یہ عمارت جدید ترین ڈیزائن کی تھی اور اس کی تمام تیس منزلیں ایمکس انٹرنیشنل کے استعمال میں تھیں۔ سیکیورٹی بہت سخت تھی اور متعلقہ افراد بھی پوری طرح جانچ پڑتال کے بعد ہی اندر آ جا سکتے تھے۔ یہاں تین شفٹوں میں کام چلتا تھا اور عمارت میں ایک ہزار سے زائد افراد کام کرتے تھے۔ ویکس کو بھی پوری تلاشی اور جانچ کے بعد اندر جانے کی اجازت ملی۔ البتہ اس کا پستول نہیں لیا گیا تھا۔ وہ لفٹ کے ذریعے آخری منزل پر واقع ماریا ایمکس کے دفتر پہنچا۔ دفتر کے باہر ایک دیو قامت شخص موجود تھا۔ اس نے ایک بار پھر ویکس کی تلاشی لی اور اس سے پستول مانگا۔ ویکس نے انکار کیا تو اس نے کہا۔ ’’تم نجی ملاقات کے لیے آئے ہو اس لیے پستول لے کر اندر نہیں جا سکتے۔ اگر تمہیں منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ واپس جا سکتے ہو۔‘‘

ویکس نے بادل ناخواستہ پستول اس کے حوالے کر دیا تو اس نے دروازے کے ساتھ لگے ایک باکس کے پاس جا کر آہستہ سے کہا۔ ’’اوپن۔‘‘

مضبوط ترین اسٹیل کا پالش سے چمکتا دروازہ بے آواز کھل گیا۔ وہ اندر آیا جہاں بڑے سے ہال کے ایک کونے میں ماریا اپنی شیشے کی بنی میز کے دوسری طرف موجود تھی۔ وہاں ہر چیز شیشے یا دھات کی تھی۔ فرش بھی شیشے کا بنا ہوا لگ رہا تھا۔ ماریا تقریباً چالیس برس کی بے حد حسین عورت تھی۔ اس نے سپاٹ انداز میں اسے ہیلو کہا اور ایک طرف موجود صوفے پر لے آئی۔ ’’مسٹر ریان... تم کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟‘‘

’’جیمی کے سلسلے میں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کس پروجیکٹ میں کام کر رہی تھی؟‘‘

ماریا ذرا آگے جھکی۔ ’’مسٹر ریان... بے شک وہ تمہاری بیوی تھی لیکن وہ فرم کی قوانین کی پابند تھی۔ یہاں کے کام کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتا سکتی تھی اور مجھے یقین ہے اس نے کبھی تم سے اپنے کام کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہوگا۔ یہ پابندی اس کے مرنے کے بعد بھی برقرار ہے۔‘‘

ویکس کا چہرہ سخت ہو گیا۔ ’’اگر یہ موت طبعی ہوتی لیکن اس نے خودکشی کی۔‘‘

’’تمہارا کیا خیال ہے، اس کی خودکشی کی وجہ کام تھا؟ جبکہ تحقیق ثابت کرتی ہے کہ عورتوں کی خودکشی کی نوّے فیصد وجوہات گھر کے اندر ہوتی ہیں۔‘‘ ماریا کا انداز چیلنج کرنے والا تھا۔

ویکس خود پر قابو پانے لگا۔ ’’مس ایمکس! میں تم سے بحث نہیں کر رہا ہوں۔ جیمی کی خودکشی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ لیکن اس کی موت کے بعد کچھ پُراسرار چیزیں میرے علم میں آئی ہیں۔ ایک نائٹ کلب میں ملنے والی لڑکی نے مجھے بتایا کہ جیمی وہاں جاتی تھی جبکہ جیمی اس قسم کی عورت نہیں تھی۔ اسے نائٹ کلبس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پھر وہ لڑکی میرے گھر سے نکلنے کے بعد پُراسرار موت کا شکار ہو گئی۔ پھر میرا پارٹنر

جیمی کے کیس کی تحقیقات کر رہا تھا تو اسے اپنے گھر میں قتل کر دیا گیا۔“

”یہ سب ٹھیک ہے لیکن فرم کا اس سے کیا تعلق ہے؟ یہ ایک سائنسی تحقیق کا ادارہ ہے۔ ہمارا جرائم یا قتل و غارت گری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”ممکن ہے جیمی کے کام کی وجہ سے...“

ماریا کھڑی ہو گئی۔ ”مسٹر ریان... میرے پاس مزید وقت نہیں ہے۔ امید ہے آئندہ جب تک کوئی سرکاری ضرورت نہ ہو، تم مجھ سے رابطہ نہیں کرو گے۔“

ویکس باہر آیا تو مایوس تھا۔ اس نے دن میں دو بار کیپٹن جیف سے رابطہ کیا اور ہر بار اسے یہی معلوم ہوا کہ تفتیش کی جا رہی ہے کہ سسٹم سے جیمی کیس کا ریکارڈ کیسے غائب ہوا۔ اس نے ایک بار کا رخ کیا اور وہاں ایک کونے میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے لگ رہا تھا کہ تفتیش اور حقیقت تک جانے والے راستے رفتہ رفتہ بند کیے جا رہے ہیں۔ جیمی کے بعد اسے اپنے پارٹنر اور دوست کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا۔ یہ اموات اتفاقی نہیں تھیں۔ ان کے پیچھے کوئی گہرا چکر تھا۔ سوچتے ہوئے اسے مالینی کے کلب کا خیال آیا جہاں اس نے ایکاشا کو دیکھا تھا۔ اسے لگا کہ اگر اسے کوئی سراغ مل سکتا ہے تو اسی جگہ سے مل سکتا ہے۔ وہ بار سے مالینی کلب کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے کار کلب سے کچھ دور ایک تاریک جگہ پارک کی اور اتر کر پیدل کلب کی طرف بڑھا۔ اس بار وہاں موجود افراد دوسرے تھے اس لیے اسے اندر جانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اندر جانے سے پہلے اس نے پی کیپ پہن لی۔ اندر کیمرے تھے، وہ ان سے بچنا چاہتا تھا۔ وہ بار کی طرف بھی نہیں گیا بلکہ ایک کونے میں نشست پر آ گیا۔ ایک ویٹریس فوراً آئی اور اس نے اسے ڈرنک کا آرڈر دیا۔ وہ سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں وہی نگران تھا۔ ویٹریس اس کے لیے ڈرنک لے کر آئی تو اس نے آہستہ سے کہا۔

”میں اوپر جانا چاہتا ہوں۔“

”آج کل بہت مشکل ہے۔“ ویٹریس بولی۔ ”صرف مخصوص لوگ اوپر جا سکتے ہیں۔“

”تم چاہو تو میں جا سکتا ہوں۔“ ویکس نے کہتے ہوئے سو ڈالر کے دو نوٹ اس کے ہاتھ میں دبا دیے۔ ”یہ نگران مجھے جانے نہیں دے گا۔ اس کے ساتھ کچھ مسئلہ ہوا تھا۔ اگر یہ کچھ دیر کے لیے یہاں سے ہٹ جائے تو میرا کام ہو جائے گا۔“

”اگر اتنے ہی اور دو تو میں کوشش کر سکتی ہوں لیکن وعدہ نہیں کر سکتی۔ اگر ناکام رہی تو آدھی رقم واپس کر دوں گی۔“

ویکس نے دو نوٹ اور دیے۔ چار سو ڈالرز اچھی خاصی رقم تھی لیکن اس جگہ رقم پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔ ویٹریس چلی گئی۔ کچھ دیر بعد ایک لڑکی لہراتی بل کھاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ نشے میں دھت ہے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ اچانک لڑکھڑا کر گری اور نگران بے ساختہ اس کی طرف آیا۔ اس نے لڑکی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ یقیناً وہ اس کی جانی پہچانی تھی۔ وہ اس قابل نہیں تھی کہ از خود اوپر جا سکتی اس لیے نگران اسے سہارا دے کر اوپر لے جانے لگا۔ ویکس تیزی سے اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف آیا۔ جیسے ہی نگران لڑکی سمیت اوپر مڑا، وہ دبے قدموں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گیا اور دائیں طرف مڑ گیا۔ نگران لڑکی سمیت بائیں طرف گیا تھا۔ اس طرف کمرے تھے اور ان کے دروازے بند تھے لیکن اندر سے آتی انسانیت سے گری آوازیں بتا رہی تھیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ یہاں چھپنے کی جگہ نہیں تھی اور راہداری آگے سے بند تھی۔ اگر وہ جلد کسی جگہ پناہ نہ لیتا تو نگران واپس آتے ہوئے اسے دیکھ لیتا۔

وہ دروازوں کے ہینڈل گھما کر دیکھنے لگا۔ ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے ذرا سا کھول کر اندر جھانکا۔ مصروف جوڑا ایک دوسرے میں اس طرح گم تھا کہ اسے ویکس کی آمد کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ لباس کے ساتھ ان کا دوسرا سامان بھی نیچے قالین پر پڑا ہوا تھا۔ ویکس خاموشی سے اندر آیا۔ اس نے نیچے بیٹھ کر لڑکی کا پرس اپنی طرف کیا اور اسے کھول کر دیکھا۔ اندر دوسری چیزوں کے ساتھ ویسی ہی سبز سیال والی تین عدد شیشیاں تھیں جیسی ریف بین نے انہیں دی تھی۔ اس نے انہیں نکال کر جیکٹ کی جیب میں رکھا اور جس طرح خاموشی سے آیا تھا، اسی طرح خاموشی سے باہر نکل گیا۔ لیکن باہر آنے پر جب وہ سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا تو اس کا سامنا اسی تنومند سفید فام سے ہوا۔ وہ سیڑھیوں کے پاس تھا۔ اس نے ویکس کو کمرے سے برآمد ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے گھور رہا تھا پھر وہ سرد لہجے میں بولا۔ ”مسٹر ریان! تم دوسری بار یہاں آئے ہو... تم چاہتے کیا ہو؟“

سفید فام کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسے جانتا ہے۔ ویکس مسکرایا۔ ”پچھلی بار میں اتفاق سے آیا تھا لیکن دوسری بار میں ایکاشا کی وجہ سے آیا ہوں۔“

”کون ایکاشا؟“

”وہی جو مجھے اس کلب میں ملی اور پھر میرے ساتھ لگ کر میرے گھر تک پہنچ گئی اور وہاں سے میرا پولیس کارڈ اور بیج چوری کر لیا جو بعد میں اس کی لاش کے پاس سے برآمد ہوا۔“

”یہاں ایکاشا نام کی کوئی لڑکی نہیں ہوتی تھی۔“

”جب پولیس تحقیق کرے گی تو سب پتا چل جائے گا۔“ ویکس نے کہا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ عقب سے تنومند شخص نے بلند آواز میں کہا۔

”مسٹر ریان! آئندہ صرف سرکاری حیثیت میں یہاں آنا۔“

نیچے آتے ہی ویکس نے باہر کا رخ کیا۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر تنومند شخص کو اس کے پاس سبز سیال والی شیشیوں کا علم ہو جاتا تو وہ ہرگز اتنی آسانی سے اسے جانے کی اجازت نہ دیتا۔ کار آگے بڑھاتے ہوئے وہ مسلسل عقبی آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ بات کھلتے ہی اس کا پیچھا نہ کیا جائے۔ اس چیز کے لیے یہ لوگ کسی حد تک بھی جا سکتے تھے۔ یہ جوزف اور مائیک کی موت سے واضح تھا۔ ویکس اس سیال کا تجزیہ کرانا چاہتا تھا لیکن اس مقصد کے لیے وہ پولیس لیب کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جیمی کی فائل کی گمشدگی سے ظاہر تھا کہ اندر کے لوگ بھی ان سے ملے ہوئے تھے۔ ویکس کے زمانۂ طالب علمی کا ایک دوست کلارک ان دنوں ایک فارماسیوٹیکل لیبارٹری میں کام کر رہا تھا۔ ویکس نے کچھ دور نکلنے کے بعد اس سے رابطہ کیا۔

”کلارک! میں ویکس بات کر رہا ہوں۔ مجھے ایک معاملے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”کس معاملے میں؟“

”میرے پاس ایک سیال ہے اور مجھے شبہ ہے کہ یہ نشہ آور خصوصیات رکھتا ہے۔ میں اسے چیک کرانا چاہتا ہوں۔“

”اتفاق سے آج میری نائٹ ہے، تم لیب آ جاؤ۔“ کلارک نے خوش دلی سے کہا اور اسے لیب کا پتا سمجھایا۔ ویکس آدھ گھنٹے بعد وہاں تھا۔ کلارک نے سیکیورٹی کو کال کر دی اس لیے اس کا کارڈ دیکھ کر اسے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ یہ بھی ایکس انٹرنیشنل کے پائے کی لیب تھی اور کلارک یہاں سینئر سائنٹسٹ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ وہ گرم جوشی سے ویکس سے ملا۔ ”کہاں غائب ہو... آج پورے پانچ سال بعد تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“

”بس گردش میں ہوں۔“ ویکس نے ٹھنڈی سانس لی۔

”میں نے جیمی کا سنا تھا، مجھے افسوس ہے۔“ کلارک

مشق

ہوائی فوج کے نوجوان باری باری پیراشوٹ باندھ کر ہوائی جہاز سے کودنے کی مشق کر رہے تھے۔ جب آخری نوجوان آیا تو افسر بولا۔

”ٹھہرو! تم نے پیراشوٹ نہیں باندھا۔“

نوجوان بولا۔ ”کوئی بات نہیں جناب! مشق ہی تو ہے۔“

شراب

ایک ٹرک ڈرائیور شراب کے نشے میں دھت ٹرک چلا رہا تھا لیکن اسٹیئرنگ پر پوری طرح کنٹرول نہیں کر پا رہا تھا۔ اچانک ٹرک لڑکھڑایا اور ایک بڑے سے درخت سے جا ٹکرایا۔ اسے سخت چوٹیں آئیں اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے قریب بیٹھے ہوئے آدمی سے پوچھا۔ ”جناب! میں کہاں ہوں؟“

آدمی نے جواب دیا۔ ”کمرا نمبر دس میں۔“

ڈرائیور بولا۔ ”اسپتال کے یا جیل کے؟“

نیلی

ایک بوڑھے آدمی نے اپنے پرس میں اداکارہ نیلی کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ ایک دفعہ اتفاق سے ان کے بیٹے نے وہ تصویر دیکھ لی تو بولا۔

”واہ ابا جی، خوب! آپ نے اپنے پرس میں نیلی کی تصویر رکھی ہوئی ہے۔“

بوڑھے نے کہا۔ ”بیٹا رکھی تو تمہاری ماں کی تصویر تھی مگر پڑے پڑے نیلی ہو گئی۔“

فٹ بال

ایک پرانا کھلاڑی چند سکھوں کو فٹ بال کھیلنا سکھا رہا تھا۔ جب کھیل کے سب قاعدے ایک ایک کر کے سمجھا چکا تو آخر میں یہ گر کی بات بتائی کہ ہمیشہ یاد رکھو۔ ”سارے کھیل کا دارومدار فقط زور سے کک لگانے پر ہے۔ اس سے کبھی نہ چوکو، اگر گیند کو کک نہ کر سکو تو پروا نہیں۔ اپنے مخالف ہی کو کک کر دو۔ اچھا اب کھیل شروع کرو۔ گیند کدھر ہے۔“

”گیند دی ایسی تیسی! تسی کھیڈ شروع کرو خالصہ۔“

انتباہ

مشرقی جرمنی کے ایک قصبے میں ایک سرکاری باغ کے چاروں طرف خاردار تار لگا کر اس میں برقی کرنٹ دوڑا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بورڈ لگایا گیا جس پر یہ الفاظ تحریر تھے۔

”جو اس جال کو چھوئے گا فی الفور ختم ہو جائے گا۔“

اس تحریر کے نیچے یہ الفاظ بھی تحریر تھے۔

”خلاف ورزی کرنے والوں کو ایک ہفتہ قید کی سزا دی جائے گی۔“

(مرسلہ: نسیم اختر، کوٹ ادو)

نے تعزیت کی۔
رسمی باتوں اور کافی کے بعد وہ کام کی بات پر آئے۔ ویکس نے اسے ایک شیشی نکال کر دی۔ کلارک نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ ”اس کے تجزیے میں کچھ وقت لگے گا۔“
”کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن رپورٹ ملنی چاہیے۔“
”میرے ساتھ آؤ۔“ کلارک اسے ایک جگہ لایا۔ یہاں جدید ترین مشینیں لگی ہوئی تھی۔ اس نے پہلے شیشی سے کچھ سیال ایک چھوٹی سی ٹیسٹ ٹیوب میں ڈالا اور اسے ایک مشین میں رکھ دیا۔ پھر وہ کمپیوٹر کے سامنے آگیا، کی بورڈ پر کچھ ٹائپ کیا اور پھر ویکس کی طرف دیکھا۔ ”ابھی کچھ دیر میں یہ مشین تجزیہ کرکے بتائے گی کہ اس کمپاؤنڈ میں کون سے عناصر کس مقدار میں شامل ہیں۔“
”کتنا وقت لگے گا؟“
”ایک سے ڈیڑھ گھنٹا... یہ کمپاؤنڈ میں موجود عناصر پر مبنی ہے۔ کمپاؤنڈ جتنا پیچیدہ ہوگا، اس کے تجزیے میں اتنا ہی وقت لگے گا۔“ کلارک نے کہا۔ ”ویسے تم اسے پولیس لیب سے بھی چیک کرا سکتے تھے۔“
”نہیں، یہ میرا نجی مسئلہ ہے۔“ ویکس نے کہا۔ ”کلارک، تم اس فیلڈ کے آدمی ہو کیا تم نے کسی نئے نشے کے بارے میں سنا ہے؟“
”شاید تم فرشتۂ اجل کی بات کر رہے ہو۔“
ویکس دنگ رہ گیا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ”تم اس بارے میں جانتے ہو؟“
”دیکھا نہیں، صرف سنا ہے۔ آج کل یہ مارکیٹ میں پھیل رہا ہے۔ اپر کلاس کے لوگ خاص طور سے اس کی طرف آرہے ہیں۔“
”تم مزید کیا جانتے ہو؟“
”میں تمہیں سنی سنائی بات بتا رہا ہوں۔ سننے میں آیا ہے کہ یہ جسمانی سسٹم پر کوئی اثر نہیں چھوڑتا۔ انتہائی حد تک سرور دینے کے باوجود یہ انسان کو عام نشے کی طرح عادی نہیں بناتا ہے۔“
”تب یہ نشہ کیسے ہوا؟“
”ایک بات یہ بھی سنی گئی ہے کہ اس کے اثرات اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب نشے کا وقت ختم ہونے لگتا ہے اور ان اثرات سے بچنے کے لیے آدمی دوبارہ نشہ استعمال کرتا ہے۔ لیکن میں ان اثرات کے بارے میں نہیں جانتا۔“
”یہ سب تمہیں کیسے پتا چلا؟“
”میرے ایک واقف کار نے بتایا ہے، وہ اس نشے کا عادی تھا۔“
”کون ہے؟“ ویکس اضطرابی لہجے میں بولا۔
”کلارک! یہ بہت اہم معاملہ ہے۔“
”اس کے بارے میں بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ دو مہینے پہلے ہائی وے پر اس کی کار حادثے میں الٹ گئی اور وہ ہلاک ہوگیا۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ کار کسی چیز سے نہیں ٹکرائی تھی لیکن وہ بُری طرح لہرا رہی تھی اور پھر الٹ کر ہائی وے سے اتر گئی۔“
ویکس سوچ میں پڑ گیا۔ اس معاملے سے متعلق جو افراد سامنے آرہے تھے، وہ اموات کا شکار ہو چکے تھے۔ اس نے کلارک سے کہا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ یہ وہی نشہ ہے۔“
ڈیڑھ گھنٹے بعد کمپیوٹر نے تجزیے کی رپورٹ پیش کر دی۔ اس میں تمام عناصر وہی تھے جو نشہ آور چیزوں میں پائے جاتے ہیں لیکن ان کی کمپوزیشن الگ الگ تھی۔ کلارک نے شبہ ظاہر کیا کہ یہ کسی قسم کا بایولوجیکل کمپاؤنڈ بھی ہو سکتا ہے۔ ویکس نے وضاحت چاہی تو کلارک نے کہا۔ ”تمام ایسے بایولوجیکل کمپاؤنڈز جن کا مقصد ذہن پر قابو پانا ہوتا ہے، اصل میں نشہ آور ہی ہوتے ہیں۔“
”ان کے اثرات کیا ہوتے ہیں؟“
”کسی مخصوص انسانی جذبے کو دبانا یا ابھارنا۔ جیسے اگر مخالف فوج پر استعمال کرنا ہو تو خوف کے جذبات ابھارنا یا اپنی فوج کو دینا ہو تو رحم دلی اور خوف کے جذبات کو ختم کرکے دلیری کو ابھارنا۔“
”کیا ان بایولوجیکل کمپاؤنڈز پر کام ہو رہا ہے؟“
کلارک نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”ارے دوست... ان پر کام نہیں، ان کا استعمال ہو رہا ہے۔ اب تو ان کمپاؤنڈز کی نئی نسل پر کام جاری ہے۔“
”تمہارے خیال میں یہ بھی ایسی کوئی چیز ہو سکتی ہے؟“
”بالکل، اگر تم انٹرنیٹ پر سرچ کرو تو تمہیں اس بارے میں بہت کچھ معلوم ہوگا۔“
ویکس نے یہی کیا۔ اس رات وہ دیر تک کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا سرچ کرتا رہا اور اس کے سامنے حیرت انگیز انکشافات آئے۔ امریکی فوج اور دفاعی ادارے کم سے کم دو درجن پروجیکٹس پر کام کر رہے تھے اور ان میں سے بیشتر نجی کمپنیوں کو ٹھیکے پر دیے ہوئے تھے۔ ویکس کے لیے سب سے بڑا انکشاف نجی کمپنیوں کی فہرست میں ایمکس انٹرنیشنل کا نام تھا۔ اس کے بعد ویکس نے ان افراد اور سائنس دانوں کے نام نکالے جو اس قسم کے بایولوجیکل

کمپاؤنڈز پر کام کر رہے تھے... اور ایک گروپ میں وہ جیمی کا نام دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ یہ جیمی کے باس مارٹن کا گروپ تھا۔ ویکس نے اس گروپ کے کام سے متعلق مضامین کھولے۔ جیسے جیسے وہ مضامین پڑھ رہا تھا، اس کی رگوں میں خون کی روانی تیز ہو رہی تھی۔ غیر تصدیق شدہ ذرائع کے مطابق اس گروپ کو ایسے بایولوجیکل کمپاؤنڈز تیار کرنے کا ٹھیکا ملا تھا جو ایک عام فوجی میں بزدلی اور موت سے خوف کے جذبات ختم کرکے اسے دلیری سے لڑنے والا فوجی بنا دے۔ جنگیں افراد کی بہادری سے جیتی جاتی ہیں اور بزدلی کی وجہ سے ہاردی جاتی ہیں۔ چند سو موت کے خوف سے بے نیاز فوجی ہزاروں کی ایسی فوج پر بھاری ثابت ہو سکتے تھے جو مرنے کا خوف رکھتی ہو۔ کلارک کی بات اتنی جلدی درست ثابت ہو جائے گی، یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔
یہ پروجیکٹ مشکوک تھا۔ پہلے اس کے سربراہ کو اس کے گھر میں قتل کر دیا گیا اور پھر جیمی نے خودکشی کر لی۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا اسے بھی قتل کیا گیا تھا؟ پھر اس کے قتل کو... خودکشی بنا دیا گیا۔ جیمی کیس ہومی سائڈ کے دو افسران جیمز پارسن اور ایڈ گرشین کے سپرد کیا گیا تھا۔ انہوں نے تفتیش کے بعد اسے خودکشی قرار دیا تھا۔ کیا انہوں نے ایمکس انٹرنیشنل کے معاملے میں چھان بین نہیں کی تھی؟ اس نے باری باری دونوں افسران سے فون پر بات کی اور دونوں نے یہی کہا کہ انہیں ایمکس انٹرنیشنل کے معاملات میں شک کی کوئی بات نظر نہیں آئی تھی۔ ویکس نے جیمی کے پروجیکٹ کے بارے میں پوچھا کہ انہوں نے اس کی کیا چھان بین کی تو انہوں نے جواب دیا کہ انہیں اس میں بھی کوئی مشکوک چیز نظر نہیں آئی تھی۔ ان سے گفتگو کے بعد اس کے شبہات مزید بڑھ گئے۔ ویکس جیمی کے حوالے سے ذہن پر زور دینے لگا۔ اس نے کبھی کوئی ایسی بات کی ہو یا کوئی ایسی چیز جس سے اس معمے پر روشنی پڑ سکے۔ اچانک اسے خیال آیا۔ جیمی کے پاس ایک فلیش ڈرائیو تھی جس میں وہ اپنا ڈیٹا جمع رکھتی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد ویکس کو وہ فلیش ڈرائیو نظر نہیں آئی تھی اور نہ پولیس رپورٹ میں اس کا ذکر تھا۔
ویکس کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے تمام جگہوں پر دیکھ لیا۔ شیلف سے کتابیں ہٹا کر معائنہ کر لیا۔ پھر وہ میز کی طرف آیا۔ اس کی نیچے کی سطح پر ہاتھ پھیرا۔ اسے زیادہ امید نہیں تھی اس لیے جب اس کا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا تو وہ چونکا۔ یہ چیز دراز کے عقب میں تھی اور بالکل کونے میں چپکی ہوئی تھی اس لیے اگر کسی پولیس والے نے میز کا معائنہ کیا بھی تھا تو اسے یہ نظر نہیں آئی۔ اس کی ساخت بتا رہی تھی کہ وہ فلیش ڈرائیو ہی ہے۔ ویکس نے کوشش کرکے سخت ٹیپ اکھاڑا اور اسے نکال لیا۔ یہ جیمی کی فلیش ڈرائیو ہی تھی۔ اس نے ڈرائیو کمپیوٹر کی یو ایس بی پورٹ میں لگائی اور اسے آن کیا۔ ڈرائیو میں کئی فولڈرز تھے۔ اس میں ایک پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ ویکس نے اسے کھولا تو اندر ایک مووی فائل تھی۔ اسے چلایا تو اسکرین پر جیمی نظر آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔
”اگر تم یہ مووی دیکھ رہے ہو تو اس کا مطلب ہے، میں اس دنیا میں نہیں ہوں۔ ویکس! میں سب سے پہلے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں دنیا میں کسی سے محبت کرتی ہوں تو وہ تم ہو۔“ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ ویکس نے بے اختیار اسکرین پر انگلیاں رکھیں جیسے جیمی کو چھو رہا ہو۔ ”اب میں بتاؤں گی کہ میں نے تم تک اپنی بات اس طرح کیوں پہنچائی۔ مجھے اندازہ تھا کہ جو لوگ میرے پیچھے لگے ہیں، وہ کسی صورت اس راز کو افشا ہونے نہیں دیں گے۔ ہمیں ایک ایسا بایولوجیکل کمپاؤنڈ تیار کرنے کا پروجیکٹ ملا ہے جو آدمی میں خوف اور مایوسی کے جذبات ختم کر دے۔ اسے موسموں اور احساسات سے بے نیاز کر دے۔ وہ حکم پر بلا جھجک اور بے خوف عمل کرے۔ ہمارا پروجیکٹ کامیاب رہا اور ہم نے ایسا بایولوجیکل کمپاؤنڈ تیار کر لیا لیکن جب اس کا عملی تجربہ کیا گیا تو اس کے بہت خوفناک نتائج سامنے آئے۔ پچاس ملی لیٹر کی مقدار میں استعمال کرنے والا فرد آنے والے چوبیس گھنٹوں کے لیے خوف، احساس، مایوسی اور موسم کے اثرات سے بے نیاز ہو جاتا تھا۔ شدید سردی یا گرمی اس پر اثر نہیں کرتی تھی لیکن جب چوبیس گھنٹے بعد اس کے اثرات ختم ہونے لگتے تو آدمی شدید خوف اور بے چینی محسوس کرتا۔ اسے لگتا جیسے موت کا فرشتہ اس کے تعاقب میں ہو۔ یہ کیفیت اتنی شدید ہوتی ہے کہ متاثرہ افراد کو اگر باندھ کر رکھا جائے، تب بھی وہ دہشت سے مر جاتا۔“ جیمی نے کہتے ہوئے سبز سیال والی شیشیوں سے بھرا ایک کنٹینر دکھایا۔ ”یہ وہ بایولوجیکل کمپاؤنڈ ہے۔ اس کے منفی اثرات دیکھتے ہوئے پروجیکٹ کے سربراہ مارٹن نے ماریا ایمکس سے فوری طور پر اس پروجیکٹ کو ترک کرنے کا مطالبہ کیا اور بہ ظاہر ماریا نے مان لیا۔ لیکن اس کے کچھ عرصے بعد مارٹن اپنے گھر میں مردہ پایا گیا۔ فرم کی جانب سے پروجیکٹ بند کرکے اس کا تمام ڈیٹا ضائع کر دیا گیا تھا۔ لیکن چند دن پہلے مجھے پتا چلا ہے کہ ایمکس انٹرنیشنل میں یہ کمپاؤنڈ بڑے پیمانے پر تیار ہو

رہا ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں اس پروجیکٹ سے متعلق اپنے پاس ہر چیز فرم کے حوالے کردوں اور میرے پاس کمپیوٹر یا انٹرنیٹ پر کوئی ڈیٹا ہے تو اسے ضائع کردوں۔ مجھے یقین ہے جیسے ہی میں نے یہ کام کیا، یہ مجھے بھی ختم کردیں گے۔ ویکس! میری جان... تمہیں ان لوگوں سے بچانے کی واحد تدبیر یہی ہے کہ میں تمہیں بے خبر رکھوں۔ مجھے مار کر یہ اس بات کی یقین دہانی کریں گے کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس لیے میں تمہیں براہِ راست بتانے کے بجائے حقیقت اس طرح سے بیان کررہی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایمکس انٹرنیشنل والے یہ بایولوجیکل کمپاؤنڈ کیوں تیار کر رہے ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ اس ملک اور دنیا پر اس کے اثرات بہت بھیانک ہوں گے۔ ان لوگوں کو روکنا بہت ضروری ہے۔ یو ایس بی میں ایسے دستاویزی اور تصویری ثبوت ہیں جو ان لوگوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے کافی ہوں گے۔" جیمی نے کہا اور پھر حوصلے سے مسکرائی۔

"ویکس! میں تم سے مرنے کے بعد بھی محبت کروں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اکیلے رہ جاؤ گے اور مجھے مس کرو گے اس لیے میری خواہش ہے کہ تمہیں جلد زندگی کا دوسرا ساتھی مل جائے اور تم پھر سے ازدواجی زندگی بسر کرو۔"

یہاں تک پہنچ کر ویڈیو ختم ہوگئی اور جیمی کی تصویر ساکت ہوگئی۔

☆☆☆

دو دن بعد ایف بی آئی اور اینٹی نارکوٹکس نے بڑے پیمانے پر آپریشن کیا اور بیک وقت ایمکس انٹرنیشنل کی لیب اور مالینی کلب پر دھاوا بول دیا۔ آپریشن کے دوران ایمکس انٹرنیشنل لیب سے بڑی مقدار میں فرشتۂ اجل نامی کمپاؤنڈ برآمد ہوا جسے چھوٹی شیشیوں میں پیک کیا جارہا تھا۔ یہی کمپاؤنڈ مالینی کے کلب سے بڑی مقدار میں ملا جہاں اسے اوپری طبقے کے دولت مند لوگوں کو فراہم کیا جارہا تھا۔ نشے کی انتہائی کیفیت کے ساتھ ساتھ یہ کمپاؤنڈ استعمال کرنے والے کو جسمانی طور پر بہت توانا کردیتا تھا اور عیاشی پسند افراد کے لیے یہ ایک ٹکٹ میں دو مزے والی بات تھی لیکن وہ اس کے تباہ کن اثرات سے بے خبر تھے۔ صرف ایک بار استعمال کرنے کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے اس کے غلام بن جاتے تھے۔ اگر یہ انہیں دوبارہ نہ ملے تو خوف اور دماغی انتشار کی کیفیت انہیں موت تک لے جاتی تھی۔ مالینی ایف بی آئی کے ایجنٹوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا اور تنومند سفید فام آئزک جو اصل میں ماریا ایمکس کا نمائندہ تھا، گرفتار ہو گیا۔ ماریا اور اس کی فرم کے ایک درجن اعلیٰ عہدے دار جو اس کام میں ملوث تھے، انہیں بھی گرفتار کرلیا گیا۔

آئزک نے اعتراف کیا کہ مارٹن، جیمی، ایکاشا اور مائیک کا قتل اس نے کیا تھا۔ جیمی کو زبردستی یہ کمپاؤنڈ استعمال کرایا گیا اور جب اس کے اثرات ختم ہوئے تو نتیجے میں اس نے خودکشی کرلی۔ ایکاشا کو ویکس کے پیچھے لگایا گیا تھا کہ وہ اس کی جاسوسی کرے لیکن وہ نشے کے چکر میں اپنا کام ادھورا چھوڑ کر ویکس کے اپارٹمنٹ سے نکل آئی اور اس جرم میں ماری گئی۔ جیمی کی فائل کی گمشدگی کے بعد پولیس کے محکمے کے کئی افراد بھی زیرِ تفتیش آئے اور بالآخر ماریا ایمکس کے انکشاف پر پولیس چیف جیف اور کئی اعلیٰ افسران کو گرفتار کرلیا گیا۔ ماریا نے آئزک پر الزام لگایا کہ کمپاؤنڈ کو نشے کے طور پر استعمال کرنے کا آئیڈیا اسی کا تھا اور وہ خود بھی اس کا عادی ہے۔ جواب میں آئزک نے ماریا پر الزام لگایا کہ وہی اس معاملے کی اصل ذمے دار تھی۔ ویکس کو شک تھا کہ اس معاملے میں پولیس حکام بھی ملوث ہیں لیکن یہ اس نے سوچا نہیں تھا کہ پولیس چیف کیپٹن جیف بھی ملوث نکلے گا۔ احتیاط کے طور پر اس نے جیمی کی یو ایس بی میں موجود تمام ثبوت ایف بی آئی اور اینٹی نارکوٹکس کو فراہم کردیے۔ ساتھ ہی اس نے یہ ثبوت مزید جگہوں پر کاپی کیے۔ اسے ایک خدشہ یہ بھی تھا چونکہ پروجیکٹ محکمۂ دفاع کی طرف سے دیا گیا تھا تو ایف بی آئی اور اینٹی نارکوٹکس والے بھی کسی کارروائی سے گریز کریں۔ اس صورت میں ویکس نے انتظام کرلیا تھا کہ یہ تمام شواہد اور جیمی کی ویڈیو وہ ملک اور دنیا کے سو بڑے اخبارات اور ٹی وی چینلز کو بھیج دے گا اور اسے انٹرنیٹ پر بھی ڈال دے گا لیکن اس کی نوبت نہیں آئی اور فیڈرل ایجنسیز نے کامیاب آپریشن کرکے تمام ذمے دار افراد کو گرفتار کرلیا۔

میڈیا میں ایک طوفان آگیا تھا اور حکومت سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ اس قسم کے پروجیکٹس دیتے ہوئے حکومت چیک رکھا کرے کہ نجی لیبس عوام کے ٹیکس پر ذاتی مقاصد کے لیے تو تحقیق نہیں کررہی ہیں۔ دوسری طرف سیکڑوں افراد جو اس کمپاؤنڈ کے عادی ہوگئے تھے، اب کمپاؤنڈ نہ ملنے کی وجہ سے اسپتالوں میں پہنچ رہے تھے جہاں ان کا علاج کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ ویکس روپوش تھا۔ آپریشن کے بعد وہ منظرِ عام پر آیا اور اس نے اس کامیابی کو جیمی، مارٹن اور مائیک جیسے لوگوں سے موسوم کیا جنہوں نے اپنی جانیں دے کر ان لوگوں کو ناکام بنایا۔

☒

حساب

بابر نعیم

دبی ہوئی راکھ کو کریدنے سے نہ صرف انگلیاں فگار ہوتی ہیں... بلکہ دبے ہوئے قصے بھی آنکھ مچولی کا کھیل شروع کردیتے ہیں... وقت کی گردشوں کی نذر ہوجانے والے واقعات جو گمشدہ اور گمنامیوں کے اندھیروں میں ڈوب جانے کے باوجود ایک بار پھر تازہ ہوکر سامنے آگئے تھے...

بیتے ہوئے دنوں کا قرض... جن کے حساب دینے کا لمحہ آچکا تھا...

سرائے کے مالک نے گودام کا دروازہ کھولا تو لاش پر نظر پڑتے ہی چونک گیا۔ یہ وہی شخص تھا جو تین دن پہلے سرائے کے بار میں دیگر دو افراد کے ساتھ خوش گوار ماحول میں گفتگو کررہا تھا پھر وہ تینوں اچھے دوستوں کی طرح وہاں سے چلے گئے تھے۔ خزاں کا موسم رخصت ہوچکا تھا اور سردی کی آمد آمد تھی۔ ابھی لوگوں کی آمد و رفت شروع ہونے میں ایک گھنٹا باقی تھا لہٰذا اس نے سوچا کہ عمارت کے برابر میں واقع بنے ہوئے شیڈ پر ایک نظر ڈال لے۔ وہ گزشتہ دو

..... ہفتوں سے وہاں نہیں گیا تھا کیونکہ وہاں لکڑیوں کے سوا کچھ اور نہ تھا اس لیے کبھی دروازہ مقفل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس نے معمول کے مطابق دروازہ کھولا اور اپنے سامنے ایک مردہ شخص کو دیکھ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ مردہ شخص لکڑیوں کے گٹھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی کمر دیوار سے لگی ہوئی تھی اور اس کے پاؤں فرش سے چند انچ اوپر تھے۔ سرائے کے مالک نے دروازہ بند کیا اور خاموشی سے چلتا ہوا سرائے میں واپس آکر پولیس کو لاش کی موجودگی کی اطلاع دی۔ اس کی بیوی قریب ہی کھڑی... گلاس صاف کر رہی تھی، اس نے جیسے ہی اپنے شوہر کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو کانپ کر رہ گئی۔ اس نے اپنے قدم مضبوطی سے زمین پر جمائے اور گلاس پر اپنی گرفت سخت کرلی جیسے اسے گلاس کے گرنے کا ڈر ہو۔ اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو فون پر کہہ رہا تھا۔ ''ہاں، وہ لاش تین دن سے لکڑیوں کے گودام میں پڑی ہے۔'' پھر اس نے ایک کپڑا اٹھایا اور وہ گلاس صاف کرنے لگا جو اس کی بیوی نے دھو کر رکھے تھے اب اسے پولیس کی آمد کا انتظار تھا۔

مائیکل گیٹ بار پولیس اسٹیشن میں فون کال موصول ہونے کے چند منٹ بعد ہی ایک کانسٹیبل موقع واردات پر پہنچ گیا۔ سرائے کے مالک نے گودام کا دروازہ کھول کر اسے لاش دکھائی۔ اس پر نظر پڑتے ہی کانسٹیبل کے منہ سے ایک عجیب وغریب لفظ نکلا جو سرائے کے مالک کی سمجھ میں نہ آیا۔ شاید وہ اس کا تکیہ کلام ہو۔ کانسٹیبل نے کچھ کہے بغیر دروازہ بند کر دیا اور باہر آکر ریڈیو پر سی آئی ڈی اور پولیس سرجن کو سرائے پہنچنے کے لیے کہا۔ پھر ریڈیو بند کر کے اس نے جیب سے اپنی نوٹ بک نکالی اور سرائے کے مالک کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟''

''ڈیوڈ کوکس۔'' سرائے کے مالک نے اطمینان سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے ڈیوڈ بھی کہہ سکتے ہو۔''

وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سرائے کے دروازے تک آ گئے۔ کانسٹیبل نے پوچھا۔ ''تم اس سرائے کے مالک ہو؟''

''ہاں۔'' ڈیوڈ نے فخریہ انداز میں کہا پھر اس نے جیب سے پائپ اور تمباکو کا پیکٹ نکالا اور بولا۔ ''بیس سال پہلے میری شادی میگی سے ہوئی تھی اور اس کے صرف ایک ہفتے بعد ہی ہم دونوں یہاں آ گئے تھے تب سے یہی ہمارا ٹھکانا ہے۔ سال میں دو ہفتے کے لیے ہم لوگ اپنے آبائی قصبے چلے جاتے ہیں۔ اب یہی ہماری زندگی ہے۔ اس سرائے کی آمدنی سے ٹھیک ٹھاک گزر بسر ہو جاتی ہے۔''

''تم اس شخص کو جانتے ہو جو برابر والے گودام میں مردہ پڑا ہوا ہے؟''

''نہیں۔'' ڈیوڈ نے لائٹر سے پائپ سلگایا اور گہرا کش لیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ شخص تین دن پہلے مر چکا تھا اور کوئی شخص رات کے وقت اسے چپکے سے یہاں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ آج جمعرات ہے۔ میں نے اسے تین دن پہلے یعنی پیر کو پہلی اور آخری بار دیکھا تھا۔ اس نے یہی پیلے رنگ کا ویسٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ یہی مونچھیں اور چاندی جیسے بال۔ میں اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کرسکتا۔ میرا خیال ہے کہ تم صبح کی شفٹ میں ڈیوٹی کرتے ہو؟''

''ہاں۔'' کانسٹیبل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میری ڈیوٹی صبح چھ بجے سے دو بجے تک ہوتی ہے۔''

''میں بھی پہلے شفٹوں میں کام کیا کرتا تھا۔'' ڈیوڈ کے اس انکشاف پر کانسٹیبل نے چونک کر دیکھا تو ڈیوڈ نے کہا۔ ''حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام شروع کرنے سے پہلے میں فائر مین تھا۔''

''پھر تم نے وہ کام کیوں چھوڑ دیا؟''

''یہ فیصلہ میں نے نہیں کیا بلکہ قسمت کو یہی منظور تھا۔ میری بائیں ٹانگ ایک حادثے میں ضائع ہو گئی۔ ہم لوگ ایک گودام میں آگ بجھانے گئے تھے کہ اس کی چھت ہم پر آن گری۔ دو فائر مین تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے جبکہ مجھ سمیت چار شدید زخمی ہوئے اور ہمیں معذوری کی بنا پر ملازمت سے ریٹائر کر دیا گیا۔ اب میں مصنوعی ٹانگ کے سہارے چلتا ہوں پھر میں شادی کر کے یہاں آ گیا اور تب سے اس سرائے کو چلا رہا ہوں۔ بیس سال میں اس نوعیت کا یہ واقعہ پہلی بار پیش آیا ہے۔''

''تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس سے تمہارے کاروبار پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔'' کانسٹیبل نے کہا۔ ''کیا اس روز یہ شخص اکیلا ہی ڈرنک کر رہا تھا؟''

''نہیں، اس کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے۔ تقریباً اسی کے ہم عمر۔ ان کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہو گی۔ ان کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا کہ اسکول کے پرانے ساتھی بڑے عرصے بعد آپس میں ملے ہوں۔''

''اگر میں تم سے ان دونوں کے بارے میں سوچنے کے لیے کہوں تو کیا تمہیں کچھ یاد آسکتا ہے کیونکہ سی آئی ڈی کے آفیسرز تم سے ان کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہیں گے۔''

''کیا تمہیں اس کی موت کے حوالے سے کسی پر شبہ ہے؟'' ڈیوڈ نے بھویں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ بہت زیادہ پینے کے بعد بھٹکتا ہوا یہاں آ گیا تھا اور آخری بار ایسا بیٹھا کہ اٹھنا نصیب نہ ہوا کیونکہ مجھے اس کے جسم پر کوئی زخم نظر نہیں آیا۔''

''ہم پولیس والے ہر بات کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔'' کانسٹیبل اپنی نوٹ بک بند کرتے ہوئے بولا۔ ''جب کوئی دوسرا ٹھوس ثبوت سامنے نہ آ جائے، یہ شک موجود رہے گا۔''

☆☆☆

''دیکھنے میں تو یہی لگتا ہے کہ اس کی گردن پر چوٹ آئی ہے۔'' پولیس سرجن ڈاکٹر گراہم نے لاش کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' جارج ہنری نے کہا۔ اسے صرف ایک درمیانی عمر کا شخص لکڑی کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے لیکن اس کے جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔

''اس کا سر صحیح پوزیشن میں نہیں ہے بلکہ ایک طرف کو ڈھلکا ہوا ہے۔ پوسٹ مارٹم سے ہی اس کی موت کی وجہ کا تعین ہو سکے گا۔ میں البتہ موت کا وقت بتا سکتا ہوں جو اس روز ساڑھے گیارہ بجے شب کا ہے۔''

''شکریہ ڈاکٹر۔'' ہنری نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ اس کے بعد ڈاکٹر وہاں سے ہٹ گیا تاکہ تفتیشی افسر لاش اور جائے وقوعہ کی تصاویر بنا سکیں۔ ڈاکٹر گراہم اپنا سیاہ بیگ ہاتھ میں پکڑے کار کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ہنری کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد ہنری سرائے کے مالک کی طرف متوجہ ہوا جو گودام کے باہر کھڑا یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ ہنری نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''مجھے انسپکٹر ہنری کہتے ہیں اور میں پولیس سراغ رساں ہوں۔ غالباً تم مسٹر ڈیوڈ ہو۔ اس سرائے کے مالک؟''

''ہاں۔'' ڈیوڈ نے بیزاری سے کہا۔ وہ جان گیا تھا کہ ایک بار پھر اسے سوال جواب کے مرحلے سے گزرنا ہو گا۔

''مجھے کانسٹیبل نے بتایا ہے کہ تم نے اس شخص کو پیر والے روز سرائے میں شراب پیتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''ہاں، اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔''

''اس سے پہلے بھی تم نے کبھی اسے یہاں دیکھا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''نہیں اور نہ ہی اس کے ساتھیوں کو... لیکن وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔''

''اس شخص کا نام ارنسٹ وائن تھا۔'' ہنری نے اس کا والٹ دکھاتے ہوئے کہا جو مرنے والے کی جیکٹ سے برآمد ہوا تھا اور اب انسپکٹر کی ہتھیلی پر سیلوفین کی تھیلی میں لپٹا ہوا رکھا تھا۔ ''اس تصویر سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے اور اس کے ساتھ جو عورت ہے وہ یقیناً اس کی بیوی ہو گی۔''

ڈیوڈ نے بڑے غور اور اشتیاق سے تصویر دیکھی اور بولا۔ ''لگتا ہے کہ یہ دونوں فوج میں رہ چکے ہیں۔''

''سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے والٹ میں سو پاؤنڈ سے زیادہ رقم موجود ہے اور اس کے لباس کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس کے لباس اور وضع قطع کو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ شخص کسی اچھی جگہ ملازمت کرتا تھا اور اب تک اس کی گمشدگی کی اطلاع کسی پولیس اسٹیشن میں درج کرائی جا چکی ہو گی۔ یہ بتاؤ کہ تم نے ان تینوں کو دیکھ کر کیا اندازہ لگایا؟''

''جیسا کہ میں کانسٹیبل کو بھی بتا چکا ہوں کہ وہ تینوں اچھے دوستوں کی طرح ڈرنک کرتے رہے البتہ آخر میں کچھ تلخی دیکھنے میں آئی لیکن اس عمر کے لوگوں کے لحاظ سے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی البتہ میرا خیال ہے کہ شروع میں کچھ کھنچاؤ موجود تھا۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' انسپکٹر نے کہا۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ مرنے والا ان دونوں سے پہلے سرائے میں آ گیا تھا اور تھوڑا سا مضطرب دکھائی دے رہا تھا جیسے اسے یہ توقع نہ ہو کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس وقت بار میں وہی ایک شخص تھا۔ اس وقت عموماً بار میں زیادہ لوگ نہیں ہوتے۔ اس لیے مجھے وہ تینوں یاد رہ گئے۔ ویسے بھی اس کاروبار میں لوگوں پر نظر رکھنا بہتر ہوتا ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' انسپکٹر نے اس کی تائید کی۔

اس سے پہلے کہ ڈیوڈ کچھ کہتا، اسے کانسٹیبل آتا ہوا دکھائی دیا جو ہنری سے بات کرنے کے لیے بے چین نظر آ رہا تھا۔

''معافی چاہتا ہوں جناب۔'' اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''آپ کے لیے ایک اطلاع ہے۔''

''ہاں بولو۔''

''کنٹرول روم نے وائرلیس پر اطلاع دی ہے کہ مرنے والے کی بیوی نے کل دوپہر کے کھانے کے وقت اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی تھی۔''

''ٹھیک ہے۔ کنٹرول روم سے کہہ دو کہ وہ مسز وائن سے رابطہ کر کے اسے گھر پر رہنے کی ہدایت کرے۔ پولیس

کسی وقت بھی وہاں جاسکتی ہے۔''
''بہتر جناب۔'' کانسٹیبل نے اپنے کندھے سے لگا ریڈیو سیٹ اتارا اور کچھ فاصلے پر جا کر کنٹرول روم کو پیغام بھیجنے لگا۔
''یہ اتنا آسان نہ ہوگا۔'' ڈیوڈ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔
''کیا؟''
''مسز وائن کو بتانا اتنا آسان نہ ہوگا کہ اس کا شوہر مر چکا ہے۔''
''ہاں، یہ واقعی ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب ورثا کو لاش کی شناخت کے لیے مردہ خانہ بلایا جاتا ہے۔ اگر واقعی ان کے درمیان سچی محبت ہو تو اس کا اظہار وارث کے جذبات سے ہو جاتا ہے ورنہ دوسری صورت میں وہ گہرا سکون کا سانس لیتا ہے اور اس کے چہرے کے تاثرات بتا دیتے ہیں کہ وہ فریق ثانی کو مردہ حالت میں دیکھ کر شکر ادا کر رہا ہے۔''
ڈیوڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں اس بات پر یقین کر سکتا ہوں۔''
''اب دیکھنا یہ ہے کہ شوہر کو مردہ خانے میں دیکھ کر مسز وائن کے تاثرات کیا ہوں گے خیر، چھوڑو ان باتوں کو ہم پھر پیر کو رونما ہونے والے واقعات کی طرف آتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ انتظار کی کیفیت میں مسٹر وائن پر جھنجلاہٹ کے آثار نمایاں ہوئے تھے؟''
''ہاں۔''
''کیا وہ دونوں ایک ساتھ آئے تھے یا الگ الگ؟''
''وہ دونوں ساتھ ہی آئے تھے۔'' ڈیوڈ نے جواب دیا۔
''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تینوں دوستوں کے درمیان اس جگہ ملنے کا پروگرام طے نہیں تھا اور ہر کوئی اپنے پروگرام کے مطابق سرائے میں آیا۔''
''نہیں بالکل نہیں۔'' ڈیوڈ نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''مرنے والا اس سے پہلے پہنچا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا لگ رہا تھا اور مسلسل سگریٹ پیے جا رہا تھا پھر وہ دونوں ایک ساتھ نمودار ہوئے۔ ان تینوں نے آپس میں گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اپنے لیے شراب خریدی۔ اس کے بعد پہلا شخص پُرسکون ہو گیا اور وہ تینوں باتوں میں مشغول ہو گئے کبھی کبھی ان کے قہقہوں کی آواز بھی سنائی دی۔''
''اور ان دونوں کا موڈ کیسا تھا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔
''ان کی کیفیت بھی مسٹر وائن سے مختلف نہ تھی۔ وہ تینوں تقریباً ہم عمر تھے اور اپنے انداز و اطوار سے سابق فوجی معلوم ہو رہے تھے۔''
''تم ان میں سے کسی کو نہیں پہچانتے؟''
''نہیں، وہ تینوں میرے لیے اجنبی تھے۔''
''اگر انہیں دوبارہ دیکھو تو پہچان لو گے؟''
''شاید۔'' ڈیو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''وہ دونوں لارل اور ہارڈی کی طرح تھے۔ ان میں سے ایک لمبا چوڑا، مضبوط و توانا اور گنجا شخص تھا جبکہ دوسرا دبلا پتلا چھوٹے قد کا سیاہ بالوں والا تھا۔ بھاری بھرکم شخص ان کا لیڈر معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا انداز تحکمانہ تھا اور وہ بات کرتے وقت آگے کی طرف جھک جاتا تھا۔ اس کے برعکس دوسرا شخص کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے ان کی باتیں سنتا رہا اور کبھی کبھی ان کے قہقہوں میں شامل ہو جاتا۔ وہ تینوں بڑے مزے لے کر وہسکی اور وائن پی رہے تھے۔ البتہ میں نے ان کے جسم پر کوئی شناختی نشان یا ٹیٹو وغیرہ نہیں دیکھا۔''
''ان کا لہجہ کیسا تھا؟''
''ان کا لہجہ شمالی انگلستان بلکہ یارک شائر والوں جیسا تھا۔ معاف کرنا میں اس سلسلے میں تمہاری زیادہ مدد نہیں کر سکتا۔''
''تم بہت اچھے جا رہے ہو مسٹر ڈیوڈ۔'' انسپکٹر نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ ''ان کے لباس کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟''
''انہوں نے اسپورٹس جیکٹ، اونی پتلون اور مناسب جوتے پہن رکھے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ لباس ان کی عمر اور موقع کی مناسبت سے موزوں تھا۔ میں سرائے میں ایسے لوگوں کو نہیں آنے دیتا جنہوں نے مزدوروں جیسا لباس پہن رکھا ہو۔''
''کیا تم نے ان کی گفتگو یا اس کا کچھ حصہ سنا تھا؟''
''نہیں، میں نے تفصیل سے تو نہیں سنا لیکن لگ رہا تھا جیسے وہ پرانے دوستوں کو یاد کر رہے ہیں، ان کے آپس کے ہنسی مذاق سے یہی اندازہ ہو رہا تھا۔''
''کیا تم نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا؟''
''نہیں، بیگی نے مجھے کسی کام سے بلا لیا تھا۔ چند منٹ بعد واپس آیا تو وہ جا چکے تھے اور انہوں نے اپنے گلاس میز پر چھوڑنے کے بجائے کاؤنٹر پر رکھ دیے تھے۔''
''وہ کتنی دیر سرائے میں رہے؟''
''تقریباً ایک گھنٹا یا شاید اس سے کچھ کم۔'' ڈیوڈ نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے اپنے لیے ایک ایک راؤنڈ خریدا تھا جبکہ وائن ان کے آنے سے پہلے ہی دو پیگ چڑھا چکا تھا۔ اس طرح اس نے پانچ پیگ لیے جبکہ ان

دونوں نے تین تین پیگ پر ہی اکتفا کیا۔''
''لارل اور ہارڈی۔'' ہنری نے اپنی نوٹ بک بند کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ مسٹر ڈیوڈ۔''
''ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔'' ڈیوڈ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''ہمیشہ دیر ہو جاتی ہے۔''
''کیا ہوا؟'' ہنری مسکراتے ہوئے بولا۔
''اگر یہاں کیمرا لگا ہوتا تو تمہیں بہت آسانی ہو جاتی۔ شاید اگلے ہفتے یا دس دنوں میں یہاں خفیہ کیمرا نصب ہو جائے لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔''
''کوئی بات نہیں، ایسے کیمرے کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے۔'' ہنری نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ڈیوڈ سرائے کے اندر چلا گیا تو ہنری وہیں کھڑے ہو کر سڑک کی جانب دیکھنے لگا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہاں دو گاڑیاں آکر رک گئیں۔ ان میں سے ایک سیاہ رنگ کی وین تھی جس پر جلی سنہری حروف میں ایچ ایم کورونر، لکھا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں سرخ اور سفید رنگ کی ریلے آر ایم ای تھی۔ ہنری کی نظریں اسی کار پر جم گئیں۔
وین کا ڈرائیور اور اس کا ساتھی گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ انہوں نے وقت گزاری کے لیے سگریٹ سلگا لیے تھے اور اخبار پڑھنا شروع کر دیا جبکہ کار رکتے ہی اس میں سے ایک عورت سیاہ چرمی بیگ کندھے پر لٹکائے باہر آئی۔ وہ ایک دبلی پتلی عورت تھی لیکن چالیس سال سے زیادہ ہونے کے باوجود جوان نظر آنے کا فن جانتی تھی۔ اس نے بالوں پر سیاہ خضاب لگا رکھا تھا اور ہلکے میک اپ کی وجہ سے پُرکشش نظر آرہی تھی۔
''گڈ آفٹر نون انسپکٹر۔'' وہ ہنری کو پہچانتے ہوئے بولی۔
''ڈاکٹر ایرے۔'' ہنری نے تعظیماً کہا۔ ''اس طرف آجاؤ۔'' وہ گودام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا جہاں وائن کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ وہ فارنسک پیتھالوجسٹ تھی اور اس کی رپورٹ سے ہی وائن کی موت کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کی جاسکتی تھی۔

☆☆☆

وہ بہت مضبوط عورت تھی۔ ہنری اس کی جذباتی طاقت سے بہت متاثر ہوا۔ مسز وائن کا جسم کمزور لیکن اس کے سینے میں شیر کا دل تھا۔ وہ دبلی پتلی عورت المونیم کی چھڑی کے سہارے پردے کے پاس کھڑی ہوئی تھی اور اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے اس کے لیے چلنا پھرنا محال ہے۔ ہنری نے نرس کو اشارہ کیا جس نے رسی کھینچ کر مخمل کا پردہ ایک طرف کر دیا۔ اس کے ہٹتے ہی شیشے کی دیوار نظر آئی جس کے عقب میں وائن مردہ حالت میں ایک ٹرالی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا سر پٹیوں میں اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ صرف چہرہ ہی نظر آرہا تھا اس کا بقیہ جسم بھی سفید چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ اس عورت نے شیشے کے پار دیکھا اور غیر جذباتی آواز میں بولی۔ ''ہاں یہی میرا شوہر ارنسٹ وائن ہے۔''
یہ کہہ کر وہ مڑی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لکڑی کی بینچ پر بیٹھ گئی۔ نرس نے رسی کھینچ کر پردہ برابر کر دیا۔ ہنری نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے چند لمحوں بعد مسز وائن اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''کیا تمہارا کوئی آدمی مجھے گھر تک پہنچا سکتا ہے مسٹر ہنری؟''
''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں خود تمہیں گھر تک چھوڑ کر آؤں گا۔''
مسز وائن کا گھر شہر کے مضافات میں واقع تھا۔ مکان کے سامنے اور عقبی حصے میں خوب صورت باغ تھا جس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کی دیکھ بھال پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ مسز وائن نے ہنری کو اندر آنے کے لیے کہا تو وہ اس کی پیشکش رد نہ کر سکا۔ دراصل وہ خود بھی مسز وائن سے کچھ باتیں کرنا چاہ رہا تھا۔ مسز وائن نے اسے کرسی پیش کی تو وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ وہ اس عورت سے گفتگو کرنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہا تھا جسے صرف ایک گھنٹے پہلے معلوم ہوا کہ وہ بیوہ ہو چکی ہے۔ یقیناً اس کی جذباتی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ اس نازک موضوع پر بات کی جائے۔ وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ مسز وائن کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔''
''رہنے دو۔ اس کی ضرورت نہیں۔''
''لیکن میں چائے کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔ دنیا میں بہت سی عورتیں بیوہ ہوتی ہوں گی۔ اب ان میں میرا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ مجھے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔''
''کیا تمہاری کوئی فیملی ہے؟'' ہنری نے پوچھا۔
''ہاں، دو بیٹے ہیں۔''
''انہیں بھی اطلاع دینی چاہیے۔ اگر تم انہیں کال کرنا چاہو.....''
''انہیں اطلاع کر دی جائے گی۔'' مسز وائن نے تیز لہجے میں کہا۔ ''انہیں معلوم ہے کہ ان کا باپ لاپتا ہو گیا ہے۔ تمہارے جانے کے بعد میں انہیں فون کر دوں گی۔ مجھے اس

خبر کو عام کرنے سے پہلے اپنے آپ کو تیار کرنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ وہ دونوں لندن میں ہیں۔ تم چینی کتنی لوگے؟''

''شکریہ، بس دودھ کافی ہے۔'' ہنری نے کہا۔ وہ ابھی تک یہی سوچ رہا تھا کہ یہ عورت لوہے کی بنی ہوئی ہے یا اس کا دل جذبات سے خالی ہے۔

چائے کا پہلا گھونٹ لینے کے بعد ہنری نے مسز وائن سے پوچھا۔ ''کیا آپ جانتی ہیں کہ آپ کا شوہر گزشتہ پیر کو لنچ ٹائم میں کس سے ملنے گیا تھا؟''

''ان لوگوں کے نام تو میں نہیں جانتی مگر وہ اس کی رجمنٹ واٹکنز اون یارکشائر فیوزی لیئرز سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک انفنٹری یونٹ ہے۔ ہماری ملاقات رجمنٹ کے سالانہ ڈنر اور ڈانس کے موقع پر ہوئی تھی۔ میں ویمنز رائل آرمی میں تھی۔ میرا شوہر سارجنٹ تھا جبکہ میں سول جاب کرتی تھی۔ میں نے اس سے شادی کے بعد ملازمت چھوڑ دی۔ میرا شوہر چند سال پہلے ریٹائر ہوا تھا پھر اس نے ایک سیکیورٹی کمپنی میں ملازمت کرلی۔''

''وہ اس روز جن لوگوں سے ملنے گیا تھا...''

''معاف کرنا، میں اصل موضوع سے ہٹ گئی۔ ان لوگوں کا فون سننے کے بعد وہ کچھ پریشان نظر آرہا تھا۔ اس ٹیلی فون کال نے اسے مضطرب کردیا تھا لیکن اس نے اپنی پریشانی کی وجہ نہیں بتائی بس اتنا کہا کہ اسے دو آدمیوں سے ملنے کے لیے جانا ہے۔''

''اسے یہ فون کال کب موصول ہوئی تھی؟''

''جمعے کی شام۔ دفتر سے آنے کے بعد وہ بارش کے رکنے کا انتظار کررہا تھا تاکہ باغ میں جاکر کچھ کام کرسکے۔ وہ موسم سرما شروع ہونے سے پہلے لان کی مٹی اور کھاد تبدیل کرنا چاہ رہا تھا لیکن بارش ہوجانے کی وجہ سے جمعے کی شام آرام کرتا رہا۔ شام ڈھلے فون کی گھنٹی بجی تو اس نے لپک کر فون اٹھالیا۔ بات ختم کرنے کے بعد جب واپس آیا تو کچھ فکرمند لگ رہا تھا لیکن اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اس نے ہفتے کو بھی باغ میں کوئی کام نہیں کیا بلکہ دونوں دن دوپہر میں سرائے جاتا رہا۔ واپس آکر سوجاتا اور شام میں دوبارہ باہر نکل جاتا جبکہ پہلے اس نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہتا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں کچھ نہیں سن رہی لیکن میرے کانوں نے مورث مین کے الفاظ صاف سنے۔''

''مورث مین۔'' ہنری نے دہراتے ہوئے کہا۔

''میں ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہوں۔''

''مجھے خود بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔'' مسز وائن بولی۔

''اس نے یہ بھی کہا تھا، ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی معاملے میں قصوروار سمجھ رہا تھا۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگا ہے لیکن اصل بات مجھے معلوم نہ ہوسکی۔'' وہ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ''اس نے بھی کسی معاملے میں مجھ پر بھروسا نہیں کیا۔ ہماری زندگی مشینی انداز میں گزر رہی تھی جسے اپنے مقام کا پتا ہو۔ لیکن اس میں جذبات کا دخل نہیں تھا۔ کیا تم شادی شدہ ہو؟''

''شادی شدہ تھا۔'' ہنری نے جواب دیا۔

''پھر کیا طلاق ہوگئی؟''

''نہیں، میری بیوی کا انتقال ہوچکا ہے۔''

''اوہ، مجھے یہ جان کر افسوس ہوا۔''

''شکریہ، لیکن یہ پرانی بات ہوگئی۔ اسے مرے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا ہے۔ اس وقت وہ جوان تھی۔''

''تم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے؟''

''ہاں، لیکن وہ بہت جلد مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔''

''تم خوش قسمت ہو کہ محبت کرنے والی بیوی ملی۔'' مسز وائن نے رشک آمیز انداز میں کہا۔ ''میری شادی، خیر جانے دو۔ اب ان باتوں سے کیا حاصل ہو؟''

''کیا تمہارا شوہر برطانوی فوج میں تھا؟'' ہنری نے پوچھا۔

''ہاں، اسے مجھ سے زیادہ فوج سے محبت تھی۔ مجھ سے زیادہ اس کی رجمنٹ کے ساتھی تمہیں اس کے بارے میں زیادہ بہتر طور پر بتاسکتے ہیں۔''

☆☆☆

''لاش کی گردن ٹوٹی ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر ایرے نے وائن کے مردہ جسم کو سفید چادر سے ڈھانپتے ہوئے کہا۔ ''یہ کام اتنی صفائی اور مہارت سے کیا گیا ہے کہ فوری طور پر قتل کا شبہ ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا سبب ریڑھ کی ہڈی پر لگنے والی ضرب ہے اور یہ کام صرف وہی کرسکتا ہے جسے اس کے بارے میں مکمل معلومات ہوں۔''

''میں سمجھ گیا۔'' ڈپٹی سارجنٹ رچرڈ نے جواب دیا جو لیبارٹری کے ایک کونے میں کھڑا پوسٹ مارٹم کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔

''اس کے علاوہ کسی اور زخم کے نشانات نہیں ملے۔ بظاہر صحت مند اور کسی بیل کی طرح مضبوط نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود اپنی گردن کو ٹوٹنے سے نہیں بچاسکا۔''

''شکریہ ڈاکٹر۔'' رچرڈ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں انسپکٹر ہنری کو بتادوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ جیسے ہی یہ رپورٹ ٹائپ ہوتی ہے۔ میں اسے فیکس کردوں گی۔''

☆☆☆

''ہاں، میں وائن کو جانتا ہوں۔'' یہ نام سنتے ہی بیرے کی آنکھوں میں چمک آگئی اور وہ جلدی سے بولا۔ ''خیریت تو ہے۔ تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو۔ کہیں وہ کسی مشکل میں تو نہیں۔''

''اگر کوئی مشکل تھی تو وہ ختم ہوگئی ہے۔ وائن اب اس دنیا میں نہیں ہے۔'' ہنری نے آہستہ سے کہا۔

''اوہ، بہت افسوس ہوا۔ پچھلے ہفتے ہی تو وہ یہاں آیا تھا۔ اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟''

''اسے قتل کیا گیا ہے۔'' ہنری کے لہجے کی نرمی برقرار رہی۔ ''ابھی ابھی سارجنٹ نے فون پر اس کی تصدیق کردی ہے۔''

''کیسے؟ اسے کون قتل کرسکتا ہے؟'' بیرے نے بے یقینی کے عالم میں کہا۔

''فی الحال یہ نہیں بتاسکتا کہ اسے کیسے قتل کیا گیا البتہ ہم قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کررہے ہیں اور میں اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔''

''اوہ۔'' بیرے نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر وائن کو یہاں سب لوگ جانتے تھے۔''

''تم اس کے کسی خاص دوست یا دوستوں کا نام بتا سکتے ہو؟''

''تم ٹام مور سے اس سلسلے میں بات کرسکتے ہو۔ وہ کچھ دیر بعد یہاں آئے گا۔''

''کیا وہ اس وقت گھر پر مل سکے گا؟'' ہنری نے پوچھا۔

''شاید۔''

''تم مجھے اس کے گھر کا پتا دے سکتے ہو؟''

''مجھے اس کی اجازت نہیں ہے۔'' بیرے نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے کہ اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا کیونکہ میں اس کے دوست کے قتل کی تحقیقات کررہا ہوں۔''

''میں فون کرکے اس سے اجازت لے لیتا ہوں۔''

''جو کرنا ہے جلدی کرو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' ہنری نے ناگواری سے کہا۔

☆☆☆

سرائے کے مالک نے ارنسٹ وائن کے جن دو ساتھیوں کو لارل اور ہارڈی سے تشبیہ دی تھی۔ ٹام مور کا حلیہ

داماد

ایک آدمی گھبرایا ہوا ڈاکٹر کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ''ڈاکٹر صاحب، جلدی چلیں، میں نے اپنے داماد کی ٹانگ میں گولی مار دی ہے۔''

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''آپ نے داماد کے گولی کیوں ماری؟''

اس آدمی نے جواب دیا۔ ''جب میں نے اسے گولی ماری اس وقت وہ میرا داماد نہیں تھا۔''

ذمے داری

ہنی مون کے دوران میں بیوی کے دانت میں شدید درد ہوگیا۔ شوہر اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

''اس دانت کو ایک سال قبل نکال دینا چاہیے تھا۔''

شوہر بولا۔ ''آپ دانت نکال کر اس کا بل میرے سسر کو بھیج دیں کیونکہ یہ غفلت میری شادی سے پہلے ان سے سرزد ہوئی ہے۔''

متبادل

ایک شخص سیڑھیوں سے گر کر ٹانگ کی ہڈی تڑوا بیٹھا۔ ڈاکٹر نے پلاسٹر چڑھا دیا اور ہدایت کی کہ سیڑھیاں وغیرہ مت چڑھنا۔

''ہائے میں کیا کروں۔ ہمارا تو فلیٹ ہی دوسری منزل پر ہے۔'' وہ شخص فکرمند لہجے میں بولا۔

''کوئی اور انتظام کرلینا۔'' ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔

ڈیڑھ دو ماہ بعد ڈاکٹر نے اس کا پلاسٹر اتار دیا اور کہا۔ ''اب تم ٹھیک ہو۔ سیڑھیاں اترا اور چڑھ سکتے ہو۔''

''شکریہ۔'' مریض نے خوشی سے کہا۔ ''پلاسٹر کے ساتھ پائپ کے ذریعے اوپر چڑھنے اور اترنے میں مجھے بہت مشکل پیش آتی تھی۔''

آرزو

ایک آدمی کو باؤلے کتے نے کاٹ لیا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے کہا۔

''آپ فوراً ٹیکے لگوالیں، ورنہ آپ پاگل ہوجائیں گے۔ لوگوں کو کاٹیں گے اور وہ مرجائیں گے۔''

آدمی۔ ''مجھے کاغذ اور قلم دیجیے۔''

ڈاکٹر۔ ''کیا آپ وصیت لکھنا چاہتے ہیں؟''

آدمی۔ ''جی نہیں، میں ان لوگوں کی فہرست بنانا چاہتا ہوں جنہیں میں کاٹوں گا۔''

(مرسلہ: طیب اسد، ڈی آئی خان)

بالکل لارل جیسا تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے سے کاٹیج میں انسپکٹر ہنری کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا جو دریا اور ریلوے لائن کے درمیان واقع تھا۔ ہنری کو اس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا۔

''ارنی کی موت کا سن کر افسوس ہوا۔'' وہ ہنری کو کچن میں رکھی ہوئی میز پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ''اسٹیوارڈ نے فون کر کے تمہاری آمد کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اسی لیے میں نے کیتلی میں پانی گرم کرنے کے لیے رکھ دیا ورنہ میری زیادہ لوگوں سے واقفیت نہیں ہے۔''

ہنری کے لیے وہ ایک اچھا دن تھا جب اسے دن میں دوسری بار چائے پینے کا موقع ملا۔ اس سے پہلے صبح میں مسز وائن نے اس کی تواضع چائے سے کی تھی لیکن دونوں جگہ کی چائے میں ایک واضح فرق تھا۔ مسز وائن کی پیالیاں بہت چھوٹی تھیں جبکہ ٹام مور نے بڑے مگ کا انتخاب کیا۔ ہنری نے غور سے مگ کو دیکھا۔ اس پر فیوز بلیرز کا نشان کندہ تھا۔ ٹام اس کی دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔

''میں بائیس سال تک اس رجمنٹ میں رہ چکا ہوں۔ وہیں میری ملاقات ارنی سے ہوئی تھی۔ ہم دونوں سویلین تھے اور چند ماہ کے وقفے سے آگے پیچھے سارجنٹ کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ اس نے ایک سیکیورٹی کمپنی میں ملازمت کر لی اور میں عدالت میں پیش کار کے طور پر کام کر رہا ہوں۔ جب کمرائے عدالت میں لوگ زور زور سے بولنا شروع کر دیتے ہیں تو انہیں خاموش کرانا یا باہر نکالنا بھی میرے فرائض میں شامل ہے۔''

''اب مجھے یاد آ گیا کہ تمہیں کہاں دیکھا ہے۔'' ہنری مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یارک کراؤن کورٹ میں۔ تم سیاہ لبادے کے بغیر بالکل مختلف لگ رہے ہو۔''

''ہاں، میں وہیں کام کرتا ہوں۔ آج کل چند روز کی چھٹیوں پر ہوں۔''

''میں تم سے اس دوسرے شخص کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' ہنری نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''کون سا دوسرا آدمی؟'' ٹام مور چونکتے ہوئے بولا۔

''وہی جس کو لے کر تم ارنی سے ملنے گئے تھے اور تم تینوں نے لنچ کے وقفے میں ایک ساتھ ڈرنک کی تھی۔''

''تم اس کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟''

''یہ میرا اندازہ ہے۔'' ہنری نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔ اس نے ٹام پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ سرائے کا مالک اسے اس بارے میں تفصیل سے آگاہ کر چکا ہے۔ ''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ارنسٹ وائن اپنے دو دوستوں کے ساتھ پیر کے روز سرائے میں موجود تھا۔ عینی شاہدوں نے وائن کے دوستوں کا جو حلیہ بتایا ہے، ان میں سے ایک پر تم فٹ بیٹھتے ہو جبکہ وہ دوسرا تمہارا دوست تھا۔ اب تمہیں صرف یہ تصدیق کرنی ہے کہ میرا اندازہ کتنا درست ہے؟''

''میں اسے نہیں جانتا تھا اور گزشتہ پیر سے پہلے اس سے کبھی نہیں ملا تھا۔'' ٹام نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ارنی سے ملنا چاہ رہا تھا کیونکہ ارنی اس کے بھائی کو جانتا تھا۔ جب ارنی کارپورل تھا تو اس کا بھائی بھی اسی رجمنٹ میں تھا اور وہ بھی مرنے والوں میں شامل تھا۔''

''کیا وہ لڑائی میں مارا گیا تھا؟'' ہنری نے پوچھا۔

''نہیں، یہ ایک خطرناک پیشہ ہے جس میں جنگ کے علاوہ امن کے زمانے میں بھی حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ میرا بڑا بھائی انجینئر تھا لیکن لازمی بھرتی کے تحت اسے دو سال کے لیے فوج میں جانا پڑا۔ وہ گروپ سولہ لڑکوں پر مشتمل تھا لیکن دو سال بعد جب انہیں فوج سے فارغ کیا گیا تو صرف بارہ لڑکے ہی زندہ بچے تھے۔''

''اس حساب سے تو ہر چھ ماہ بعد ایک آدمی کی موت واقع ہو جاتی ہوگی۔'' ہنری نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، وہ سب حادثات کی وجہ سے ہی ہلاک ہوئے۔ ان کی موت دشمن کی کسی کارروائی کے نتیجے میں واقع نہیں ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک چٹان سے اترتے ہوئے اپنی گردن تڑوا بیٹھا جبکہ دوسرا بارش سے بچنے کے لیے ایک ٹینک کے نیچے جا کر لیٹ گیا۔ گیلی زمین ہونے کی وجہ سے ٹینک نے جگہ چھوڑ دی اور تھوڑا سا آگے کی جانب کھسک گیا اور اس جوان کو کچل ڈالا۔ میں نہیں جانتا کہ بقیہ دو کے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا کیونکہ ڈیوڈ نے ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ ان کی موت بھی اسی نوعیت کے حادثات کی وجہ سے ہوئی تھی۔''

''لیکن جیسا تم نے بتایا، ان کی نوعیت مختلف تھی۔'' ہنری نے کہا۔

''ہاں، وہ رجمنٹ کی تاریخ کا سیاہ دور تھا۔ ان دنوں ہم رہائن کی بیرکوں میں مقیم تھے کہ اچانک ہی سپاہیوں میں خودکشی کی لہر چل پڑی۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ انہیں قتل کر کے خودکشی کا نام دے دیا گیا تھا۔ ایک لڑکے کو اتنی بری طرح زدوکوب کیا گیا کہ وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ کئی دوسرے سپاہیوں پر حملے ہوئے اور انہیں کافی دنوں تک اسپتال میں رہنا پڑا۔ کچھ جوانوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن پکڑے گئے تاہم انہوں نے اپنے بھاگنے کی وجہ نہیں بتائی اور انہیں فوج سے نکال دیا گیا۔''

''ان واقعات کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی؟'' ہنری نے پوچھا۔

''ظاہر ہے اور اس کی تحقیقات کے لیے آرمی اسپیشل انویسٹی گیشن برانچ کی مدد لی گئی گو کہ وہ بھی اس کا کھوج نہ لگا سکے لیکن ان کے آنے کے بعد خودکشی، حملوں اور فرار کا سلسلہ رک گیا اور جب اس طرح کے واقعات رونما ہونا ختم ہو گئے تو سپاہیوں کا مورال ایک بار پھر بلند ہونے لگا۔''

''مجھے ایک بات بتاؤ، کیا تم نے کبھی مورٹ مین، کے بارے میں سنا ہے؟''

ٹام مور کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے کئی سالوں سے یہ الفاظ نہیں سنے۔ یقیناً ان کا کوئی مطلب ہوگا جب رجمنٹ میں خودکشی، حملوں اور فرار کا سلسلہ چل رہا تھا تو بہت سے لوگوں کی زبان پر یہ الفاظ تھے لیکن مجھے ان کا مفہوم معلوم نہ تھا اور نہ ہی میں نے کبھی سوچا کہ زندگی میں کبھی یہ الفاظ دوبارہ سننے کو ملیں گے۔''

''تم نے سب باتیں تفصیل سے بیان کر دیں۔ اب اس تیسرے آدمی کا نام بھی بتا دو۔''

''اس کا نام رینالڈ شارٹ ہے۔ وہ خود بھی سابق سپاہی ہے لیکن اس کا تعلق مختلف رجمنٹ سے تھا۔ اسے جب وائن کا پتا چلا تو اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ اس سے اپنے بھائی کے بارے میں معلوم کرنا چاہ رہا تھا۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ اس کے بھائی نیوز بلیر شارٹ کی موت بھی ایسے ہی کسی حادثے کی وجہ سے ہوئی تھی۔''

''یعنی اس کی موت کو بھی خودکشی کا نام دے دیا گیا تھا؟''

''ہاں، رینالڈ نے یہی کہا تھا۔ وہ اس بارے میں حقائق جاننے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ اسی کی تجویز تھی کہ ہم تینوں اس سرائے کے بار میں ملاقات کریں۔ وہاں بس کے ذریعے جانا آسان ہے اور ہر آدھ گھنٹے بعد بس مل جاتی ہے۔ ہماری ملاقات یارک کے بس اسٹیشن پر ہوئی اور وہاں سے ہم نے اکٹھے سفر کیا۔ وائن پہلے سے سرائے میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا معلوم ہوا جس پر مجھے تھوڑی سی حیرانی بھی ہوئی۔''

''تم اس معاملے میں کہاں فٹ ہوتے ہو؟'' ہنری نے پوچھا۔ ''تمہاری وہاں موجودگی کیوں ضروری تھی؟''

''مجھے ان دونوں کا تعارف کروانا تھا۔'' ٹام مور نے جواب دیا۔ ''رینالڈ نے مجھ سے رجمنٹ کے سابق سپاہیوں

اعداد و شمار کے ماہر جناب جی ایم نوشاہی نے ایک مرتبہ اپنے دوستوں کو بتایا کہ اوسط درجے کا ہر آدمی روزانہ پچیس ہزار الفاظ بولتا ہے جبکہ اوسط درجے کی عورت روزانہ تیس ہزار الفاظ بولتی ہے۔

پھر آہ بھر کر انہوں نے کہا۔ ''بدقسمتی سے شام کو جب میں دفتر سے اپنے گھر پہنچتا ہوں تو اپنے پچیس ہزار الفاظ استعمال کر چکا ہوتا ہوں جبکہ میری بیوی اپنے تیس ہزار الفاظ بولنے کا آغاز کرتی ہے۔''

☆☆☆

گڈو میاں بیمار پڑے۔ ڈاکٹر آیا۔ اس نے اسٹیتھ اسکوپ لگا کر سینے کا معائنہ کیا۔

''ڈاکٹر صاحب۔'' گڈو میاں نے پوچھا۔ ''کیا آپ میرے جراثیم کو فون کر رہے ہیں؟''

☆☆☆

امریکا کے مشہور ماہر معاشیات برن اسٹائن کا کہنا ہے۔ ''دنیا کی موجودہ رفتار کو دیکھ کر پیش گوئی کرنے کو دل چاہتا ہے کہ جلد ہی عرب کے لوگ ایک سے ایک بڑھ کر کیڈیلاک پر دندناتے پھر رہے ہوں گے اور ہم امریکی اونٹوں کی سواری سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔''

☆☆☆

استانی نے کلاس میں پوچھا۔ ''کسی ایسے جانور کا نام بتاؤ جو بہت تیزی سے بڑھتا ہے؟''

ایک بچے نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''مچھلی، مس!''

''شاباش۔'' استانی نے کہا۔ ''کیا تم اس کے بڑھنے کی رفتار بتا سکتے ہو؟''

''جی ہاں مس۔'' بچہ بولا۔ ''پچھلے ہفتے ابو جان نے جو مچھلی پکڑی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ روزانہ دو تین انچ کا اضافہ کر دیتے ہیں اور ابھی تک اسی رفتار سے اضافہ جاری ہے۔''

☆☆☆

مچھلی کے شکار پر جاتے ہوئے تم اپنی بیوی کو گھر کیوں چھوڑ جاتے ہو؟''

''اس کی ایک بہت اہم وجہ ہے۔''

''وہ وجہ مجھے نہیں بتاؤ گے؟''

''وجہ یہ ہے کہ مچھلیوں پر میری بیوی کی موجودگی کا اچھا اثر نہیں پڑے گا۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ وہ یہ دیکھ کر میرے جال میں پھنسنے کے لیے تیار نہیں ہوں گی کہ میں خود کتنی بری طرح اس عورت کے جال میں پھنسا ہوا ہوں۔''

(مرسلہ: سید نجیب الرحمن، گرگری)

کی ایسوسی ایشن کے ذریعے رابطہ کیا تھا۔ میں اس تنظیم کا سیکریٹری ہوں۔ اس نے پوچھا کہ کیا میں ارنسٹ وائن کو جانتا ہوں۔ میرا جواب ہاں میں تھا۔ اس پر وہ بولا کہ میں وائن کے ساتھ اس کی ملاقات کا بندوبست کردوں۔ میں نے وائن کو فون کیا۔ پہلے تو وہ ہچکچایا لیکن بعد میں اس سے ملنے پر رضامند ہوگیا۔ رینالڈ نے ہی ملاقات کے لیے وہ جگہ تجویز کی تھی جو کہ عام راستے سے ہٹ کر تھی لیکن چند وجوہات کی بنا پر وہ کالونی کی حدود میں ملنا نہیں چاہ رہا تھا۔"

"وہاں کیا ہوا؟" ہنری نے تشویش کے انداز میں پوچھا۔

"ہماری ملاقات بڑے پُرسکون انداز میں شروع ہوئی۔ رینالڈ صرف اپنے بھائی کے بارے میں معلوم کرنا چاہ رہا تھا۔ وائن نے اسے بتایا کہ اس کا چھوٹا بھائی بہت ہی اچھا انسان تھا اور اس کی خودکشی پر اسے بہت افسوس ہوا تھا۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ جب پرانے ساتھی مل بیٹھیں تو ماضی کے اچھے دنوں کا ذکر خودبخود شروع ہو جاتا ہے۔ ہم بھی کافی دیر تک رنگ بھری زندگی کو یاد کرتے رہے پھر ہم ایک ساتھ ہی وہاں سے روانہ ہونے کے لیے اٹھے۔ میں تھوڑا سا آگے تھا۔ وہ دونوں ٹائلٹ چلے گئے چنانچہ مجھے ان کا انتظار کرنا پڑا لیکن تھوڑی دیر بعد رینالڈ اکیلا ہی واپس آیا اور اس نے بتایا کہ وائن مزید وھسکی پینے کے لیے رکنا چاہ رہا ہے۔ میں نے اس کی بات پر یقین کرلیا اور ہم دونوں ایک ساتھ ہی پارک واپس آگئے۔ اس روز میں نے آخری بار وائن کو دیکھا تھا۔"

"میں رینالڈ سے کہاں رابطہ کرسکتا ہوں؟" ہنری نے پوچھا۔

"برطانوی رجمنٹ کی اسٹیتھ برانچ میں۔ وہ کافی لمبا تڑنگا اور گنجا شخص ہے۔"

☆☆☆

رینالڈ شارٹ سے ملاقات دوسرے روز ممکن ہوسکی کیونکہ وہ کسی کام کے سلسلے میں مانچسٹر گیا ہوا تھا۔ جب ہنری نے اسے وائن کی موت کے بارے میں بتایا تو اس نے بڑے سرسری انداز میں کہا۔ "اچھا، مر گیا۔"

"تمہیں یہ سن کر حیرت نہیں ہوئی؟" ہنری نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کے برابر میں سارجنٹ رچرڈ بیٹھا ہوا تھا جس کی نظریں رینالڈ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ مرنا تو سب کو ہے۔ کوئی پہلے چلا جاتا ہے اور کسی کا نمبر بعد میں آتا ہے۔ وائن بھی پچاس سال سے زیادہ کا ہوگیا تھا لیکن میرا بھائی... وہ تو نوجوانی کے عالم میں چلا گیا۔"

"ہاں مجھے اس کے بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا۔"

"شاید تم یہ نہیں جانتے کہ وہ مرنے سے پہلے کتنا خوف زدہ تھا۔ وہ اس رجمنٹ کو چھوڑنا چاہ رہا تھا۔ اس نے تبادلے کی درخواست دی لیکن اس سے پہلے ہی مر گیا۔ وہ پہرے پر متعین تھا اور اس نے خود کو گولی مارلی۔ وہ صرف انیس سال کا تھا۔ اس کی موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا۔ جب ہم اس کی لاش لینے گئے تو میں نے اس کے ایک ساتھی کو بڑبڑاتے ہوئے سنا۔ وہ زیرلب کہہ رہا تھا۔ "مورٹ مین۔"

"یہ اصطلاح پہلے بھی استعمال ہوتی رہی ہے۔ کیا تم اس کا مطلب جانتے ہو؟"

"ہاں، اب جان گیا ہوں۔ یہ فرانسیسی الفاظ ہیں جن کا لفظی ترجمہ مردہ ہاتھ ہے لیکن قانونی طور پر یہ اصطلاح اس زمین کے لیے استعمال کی جاتی ہے جسے فروخت نہ کیا جاسکے اور مالک کے انتقال کرجانے کی صورت میں اس کی ملکیت وارثوں کو منتقل ہو جاتی ہے۔ چاہے مالک کو پیسوں کی کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو اگر اسے وہ جائداد مورٹ مین کے تحت وراثت میں ملی ہے تو وہ اسے فروخت نہیں کرسکتا۔ بلکہ وہ زمین نسل درنسل منتقل ہوتی رہتی ہے اور مالک کے لیے وہ بے قیمت جائداد بھی جاتی ہے۔"

"اس معاملے کا تمہارے بھائی کی خودکشی سے کیا تعلق ہے؟"

"صرف نام کی حد تک۔ دراصل یہ ٹھگوں کے ایک گروہ کا کام ہے جو ان دنوں رجمنٹ کے سپاہیوں کو زیادہ دولت کمانے کا لالچ دے کر لوٹ رہا تھا۔ میرا بھائی بھی ان کے جال میں پھنس گیا۔ اس کا پتا مجھے چند ماہ پہلے ملا۔ جب ایک ٹیلی فون کال موصول ہوئی۔ کوئی شخص مجھے میرے بھائی کی موت کے بارے میں کچھ بتانا چاہ رہا تھا..."

اتنا کہہ کر وہ رک گیا کیونکہ بار میں کام کرنے والی خادمہ میز پر سے خالی گلاس اٹھانے آگئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد رینالڈ نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "اس شخص نے اپنا نام نہیں بتایا لیکن وہ میرے بھائی کے ساتھ کام کرچکا تھا۔ اسی نے مجھے مورٹ مین کی حقیقت بتائی۔ یہ ایک گروہ تھا جو لوگوں کو سود پر قرض دینے کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ ان کا نشانہ نوجوان سپاہی تھے جنہیں وہ آسان شرائط پر پچاس پاؤنڈ قرض دینے کی پیشکش کرتے۔ نوجوان سپاہیوں کی تنخواہیں کم ہوتی ہیں اور انہیں سیروتفریح کا بھی شوق ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی تنخواہ مہینے کے وسط میں ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے وہ ان کے جھانسے میں آگئے لیکن قرض لینے کے تھوڑے ہی عرصے بعد پتا چلا کہ انہیں پچاس نہیں بلکہ پانچ سو پاؤنڈز ادا کرنا ہیں کیونکہ وہ لاعلمی میں قرض کی دستاویز پر دستخط کرچکے تھے اور انہیں یہ رقم ہر حال میں ادا کرنی تھی۔ بصورتِ دیگر انہیں سنگین نتائج کی دھمکیاں دی گئیں اور ان میں سے چند ایک کو اس طرح قتل کیا گیا کہ وہ خودکشی نظر آئے۔ میرے بھائی کے سر میں بھی دو گولیاں لگی تھیں۔"

"تعجب ہے۔ دو گولیاں لگنے کے باوجود بھی اسے خودکشی قرار دیا گیا؟" ہنری نے سوال کیا۔

"اس کا ریوالور آٹومیٹک تھا۔ اس لیے یہ ممکن ہے۔ بہرحال اسے گولی ماری گئی یا اس نے خود ہی مورٹ مین کے ڈر سے خودکشی کرلی۔ میری نظر میں دونوں ایک ہیں۔ فون کرنے والے شخص نے بتایا کہ اسے تلاش کرنے میں دشواری ہورہی تھی ورنہ مجھے پہلے ہی اس بات کا پتا چل جاتا۔ اس نے بتایا کہ وہ گروہ اس کے بھی پیچھے لگا ہوا تھا لیکن اسپیشل انوسٹی گیشن برانچ کے آجانے سے انہیں اپنی سرگرمیاں روک دینا پڑیں۔ لیکن اس وقت تک ان کی وجہ سے چند لڑکے موت کے منہ میں جاچکے تھے۔ کچھ کو اس بیدردی سے مارا گیا کہ وہ کئی ہفتے تک اسپتال میں زیرعلاج رہے اور بعد میں انہیں طبی بنیاد پر ملازمت سے فارغ کردیا گیا۔ اسی طرح جن لوگوں نے اس گروہ کے ڈر سے فرار کی کوشش کی تھی انہیں بھی سزا کے طور پر فوج سے فارغ کردیا گیا۔ فون کرنے والے شخص نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ٹھگوں کا یہ گروہ چند جونیئر نان کمیشنڈ افسروں پر مشتمل تھا جس کا سربراہ ایک بدطینت سارجنٹ ارنسٹ وائن تھا۔"

"تم نے اس شخص کی بات پر اعتبار کرلیا؟" ہنری نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وائن کے کسی دشمن نے تمہیں اس کے پیچھے لگا دیا ہو۔"

"میں سوچ سمجھ کر قدم بڑھانے کا عادی ہوں۔ اسی لیے چند روز پہلے اس کے گھر کا فون نمبر تلاش کرکے اسے فون کیا۔ جب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ ارنی وائن سے ہی بات کررہا ہوں تو میں نے اسے اشاروں اشاروں میں کچھ باتیں یاد دلائیں۔ مثلاً مورٹ مین... ریائن بیرکس، پچیس سال پہلے اور جب میں نے اپنے بھائی کا نام لیا تو اس کی سانس اکھڑنے لگی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ میں تم پر اپنے بھائی کے قتل کا الزام عائد نہیں کررہا لیکن تمہیں اس کی موت کا ذمے دار ضرور سمجھتا ہوں۔ اگر اس نے خودکشی کی تب بھی اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ اس نے تمہارے گروہ کے خوف سے موت کو گلے لگالیا۔"

"وائن کی سانس زور زور سے چلنے لگی اور اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں تمہارا حساب بے باق کرنے کو تیار ہوں۔ تم اپنا مطالبہ بتاؤ، میں نے کوئی جواب دیے بغیر فون رکھ دیا۔ فون کرنے والے نے جو کچھ بتایا تھا۔ وائن سے بات کرنے کے بعد اس کی تصدیق ہوگئی پھر میں نے ٹام مور سے رابطہ کیا اور کہا کہ وہ وائن سے میری ملاقات کا بندوبست کرے۔"

"لیکن تمہیں اس کو قتل کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔" انسپکٹر ہنری نے غصے سے کہا۔

"میں نے اسے قتل کیا۔" رینالڈ مکاری سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو انسپکٹر؟"

"گویا تم اس جرم سے انکار کررہے ہو؟"

"ہاں کیونکہ کسی نے مجھے اس کو قتل کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ گزشتہ پیر ہائیک اینڈ ہیرون، کے باہر کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ اسی طرح ہماری یہ گفتگو بھی آف دی ریکارڈ ہے۔"

"یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟" ہنری نے پوچھا۔

"کیونکہ مجھے اس گفتگو کے بارے میں پہلے سے مطلع نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی اسے ٹیپ کیا گیا ہے۔ یہاں کوئی وکیل بھی موجود نہیں ہے۔ اس لیے اسے آف دی ریکارڈ ہی سمجھا جائے گا۔" وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "اگر تم مجھ سے باضابطہ گفتگو کرنا چاہتے ہو تو میرے گھر کا پتا تمہارے پاس ہے۔ میں کہیں نہیں جارہا البتہ تب بھی میرا جواب یہی ہوگا کہ وائن کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"واقعی تم کہیں نہیں جارہے بلکہ یہاں سے سیدھے جیل ہی جاؤ گے۔" یہ کہہ کر ہنری نے سارجنٹ رچرڈ کو اشارہ کیا جس نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رینالڈ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ ہنری نے اپنی پتلون کی جیب پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "اس گفتگو کا ایک ایک لفظ میرے جیبی ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ ہے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور جائے وقوعہ سے ملنے والے تمہارے قدموں اور انگلیوں کے نشانات سے بھی بہت کچھ واضح ہورہا ہے۔ تم اگر چاہو تو اپنے وکیل کے ذریعے میری اس حرکت کو عدالت میں چیلنج کرسکتے ہو کہ میں نے تمہیں مطلع کیے بغیر یہ گفتگو ریکارڈ کرلی۔ اس بارے میں عدالت کو مطمئن کرنا میرا کام ہے۔ ویسے بھی تمہارے جرم کے مقابلے میں اس حرکت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

تنویر ریاض

آستین کا سانپ

سرمایہ داری اور کاروباری ذہنیت کے حامل افراد ہمہ وقت نفع و نقصان کے اتار چڑھائو میں مشغول رہتے ہیں... آج کی دنیا میں اسے ہی کامیاب سمجھا جاتا ہے جو موقع سے فائدہ اٹھانا جانتا ہو... آگے بڑھنے کے لیے فوری اور حتمی فیصلے کی ضرورت ہوتی ہے... جو سوچتا ہے وہ پچھتاتا ہے... ایک ایسے ہی شخص کا احوال جس نے سوچ بچار میں پڑ کر خسارے کا سودا کر لیا تھا...

کم وقت میں زیادہ فائدہ اٹھانے والے شاطر لوگوں کی عکاس دنیادار کہانی...

ٹونی پیکر دو سرمایہ کار کمپنیوں کے بیس لاکھ ڈالرز لے کر غائب ہو گیا تھا۔ اس لیے روسکو کو اس معاملے میں شامل ہونا پڑا۔ اس نے مجھے اپنی مدد کے لیے بلایا تھا۔ ساری کہانی سننے کے بعد میں نے کہا۔ ''میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر پیکر یورپ یا ایشیا کے کسی ملک میں نہیں گیا بلکہ قریب میں ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔''

''پولیس اور ایف بی آئی ان خطوط پر نہیں سوچ رہی۔ انہیں اس سے غرض نہیں کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے، انہیں تو اس سے رقم نکلوانی ہے۔'' روسکو نے کہا۔ وہ سان فرانسسکو کی سب سے بڑی لاء فرم کا پارٹنر تھا اور اس کیس میں اس کی کلائنٹ دو سرمایہ کار کمپنیاں تھیں جنہوں نے پیکر کی سافٹ ویئر کمپنی کے لیے بیس لاکھ ڈالرز فراہم کیے تھے۔

''ان دونوں محکموں میں احمقوں کی اکثریت ہے۔'' میں نے روسکو کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ایف بی آئی سمیت قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کارکردگی کا معیار کیا ہے۔ خاص طور پر جب کسی کو تلاش کرنا ہو تو یہ بالکل ہی صفر ہو جاتے ہیں۔ اس کیس میں تو ان کی کامیابی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ ہمارا مجرم کوئی احمق نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہے۔'' میں خاموش رہا۔

''چلو مان لیا۔'' روسکو گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''وہ دوسری بات کیا ہے؟''

''دوسری بات؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں، تم نے کچھ دیر پہلے دو باتوں کی جانب اشارہ کیا تھا۔''

''اچھا، یاد آیا۔'' میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ ڈاکٹر پیکر کہاں چھپا ہوا ہے۔''

روسکو کا منہ کھلا رہ گیا۔ میں اس کے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہ رہا تھا اس لیے اسے حیرت کے سمندر میں ڈوبا ہوا چھوڑ کر وہاں سے کھسک لیا۔ میں جس مشن پر روانہ ہونے والا تھا، اسے سب سے خفیہ رکھنا بہت ضروری تھا۔

اڑتالیس گھنٹے بعد میں جوئے کاربون کے ہمراہ اوبیسپو کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ میرے جیل کے دنوں کا ساتھی تھا۔ ٹرین روانہ ہونے کے پانچ منٹ بعد ہی وہ خراٹے لینے لگا اور میرے ذہن میں روسکو کے ساتھ ہونے والی ملاقات کا منظر کسی فلم کی طرح چلنے لگا۔ وہ میرے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تم جانتے ہو کہ ٹونی پیکر کہاں ہے؟''

''ہاں لیکن اس کا صحیح پتا مجھے معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ بیس تیس میل کے دائرے میں ہی ہے۔''

''اس میں تو بہت بڑا رقبہ آجاتا ہے۔''

''ہاں اور اس لیے تمہارے کلائنٹ کو مجھے کچھ معاوضہ دینا ہوگا تاکہ میں اسے ڈھونڈ نکالوں۔''

''کتنے پیسوں میں کام چل جائے گا؟'' روسکو نے مجھے شک کی نگاہ سے دیکھا جیسے میں اس کو بلیک میل کر رہا ہوں۔

''میرا خیال ہے کہ بیس ہزار ڈالرز کافی ہوں گے۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''یہ کچھ زیادہ نہیں ہیں؟''

''بیس لاکھ ڈالرز کے مقابلے میں یہ معاوضہ بہت معمولی ہے اور یہ رقم میں ان اخراجات کے لیے مانگ رہا ہوں جو ڈاکٹر پیکر کی تلاش میں ہوں گے۔''

''تم اس رقم کا کیا کرو گے؟'' روسکو کو شاید میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید میں یہ سارے پیسے اپنی جیب میں رکھ لوں گا۔

''اس کا جواب دینے سے پہلے میں تم سے ایک سوال کروں گا۔ کیا تم نے کبھی پیرس میں واقع کیفے لیس ڈیوکس میگوٹس کا نام سنا ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا تو میں نے اسے بتایا کہ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران یہ کیفے اس لیے مشہور تھا کہ وہاں اپنے وقت کے نامور مصور، ادیب، شاعر، نقاد اور ڈراما نگار آیا کرتے تھے۔ ان میں وائلڈ، سارتر، ہیمنگوے اور پکاسو جیسی عظیم شخصیات شامل تھیں۔ اس کیفے کے بارے میں مشہور تھا کہ دنیا کا کوئی بھی سراغ رساں اپنے مطلوبہ شخص کی تلاش میں صبر اور سکون کے ساتھ اس کیفے میں بیٹھ جائے تو جلد یا بدیر وہ شخص اسے نظر آجائے گا۔ ممکن ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ ہو لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بچھڑے ہوئے دوست سے ملنے کے لیے وہ کیفے بہترین جگہ تھی۔

''کیا تم بھی کوئی کیفے کھولنے کا ارادہ کر رہے ہو؟'' روسکو نے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔''

''خدا کا شکر ہے۔'' روسکو ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''ورنہ مجھے اپنے کلائنٹ اور پارٹنرز کو سمجھانا مشکل ہو جاتا۔ وہ یہی سمجھتے کہ میرا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔'' اس نے دوبارہ قہقہہ لگایا اور مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ اپنے اوپر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔ ''تم اس رقم کو کیسے خرچ کرو گے؟''

''میں پیزا پارلر کھولنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے جوئے کاربون کی طرف دیکھا جو گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ جب میں نے اس کے سامنے پیزا پارلر کھولنے کی تجویز رکھی تو پہلے اس نے ٹال دیا لیکن بعد میں وہ میرا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ میرے منصوبے کا لازمی حصہ تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ چوری شدہ چیزوں کا سودا کر کے زندگی گزارنے کو

ترجیح دیتا تھا اور دوسرے یہ کہ وہ ڈیٹرائٹ میں ایک ایسی فیملی کو جانتا تھا جو تین نسلوں سے پیزا بنا رہی تھی۔ ہم دونوں نے جیل کی کوٹھری میں نو مہینے ایک ساتھ گزارے تھے۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ پورے کیلی فورنیا میں اچھا پیزا ملنا بہت مشکل ہے۔ میرا پانچ سالہ بھانجا اس سے اچھا پیزا بنا سکتا ہے۔

"کیلی فورنیا کے پیزا میں ایسی کیا برائی ہے؟" میں نے اسے چھیڑنے کی خاطر کہا۔

وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "تم نے کالج میں پڑھ کر ڈگری ضرور حاصل کی ہے لیکن تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے کہ کیلی فورنیا کے پیزا میں کیا خرابی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ کی تین انگلیاں اوپر اٹھائیں اور ان پر باری باری چھوٹی انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

"پنیر، ساس اور گندھا ہوا آٹا۔ سب سے پہلے پنیر کی بات کرتے ہیں۔ ایک تو وہ ضرورت سے زیادہ اس کا استعمال کرتے ہیں اور اس کا معیار اور ذائقہ اچھا نہیں ہوتا۔ ساس میں بھی کوئی چٹ پٹا پن نہیں ہے اور نہ ہی ان لوگوں کو آٹا گوندھنا آتا ہے۔ جب اس جیل سے رہائی ملے گی تو میں تمہیں صحیح پیزا کھلاؤں گا۔"

جوئے اپنی بات پر قائم رہا۔ وہ مجھ سے چھ مہینے پہلے رہا ہو گیا تھا اور جب میں جیل سے رہا ہونے کے بعد سان فرانسسکو آیا تو اس نے خاص طور سے میرے لیے پیزا تیار کیا۔ اس کا پہلا لقمہ لیتے ہی میں بے اختیار بول اٹھا۔ "یقین کرو، میں نے پوری زندگی میں اس سے اچھا پیزا نہیں کھایا۔"

جب میں نے اس کے سامنے پیزا پارلر کی تجویز رکھی تو وہ مجھے ٹالتے ہوئے بولا۔ "مجھے پیزا بنانا نہیں آتا۔"

میں جانتا تھا کہ وہ ایک بار پھر کسی دوست کے ساتھ مل کر چوری شدہ سامان کا کاروبار کرنے والا ہے۔ میں نے زیادہ اصرار کیا تو وہ بولا۔ "اس میں میرا کیا فائدہ ہے؟"

"بھائی! اس کام میں منافع بہت ہے اور یہ تمہاری قانونی کمائی ہوگی جسے تم بلا خوف و خطر خرچ کر سکتے ہو اور نہ ہی تمہیں پکڑے جانے کا ڈر ہوگا۔"

"وہ لوگ تمہیں پیزا پارلر کھولنے کے لیے ایک بڑی رقم دے رہے ہیں تاکہ تم اس شخص کو تلاش کر سکو جو ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر غائب ہو گیا ہے۔ پولیس اور پرائیویٹ سراغ رساں ایک سال میں اس کا سراغ نہ لگا سکے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ وہ ساری دنیا کو چھوڑ کر تمہاری اس جگہ پر چلا آئے گا؟"

"وہ جگہ پیزا پارلر کہلائے گی۔" میں نے اس کی تصحیح کی۔

☆☆☆

روسکو جیکسن نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا تھا لیکن اس سے پہلے وہ جاننا چاہ رہا تھا مجھے کس طرح معلوم ہوا کہ ڈاکٹر پیکر اس علاقے میں چھپا ہوا ہے؟

"سب کچھ اس میں موجود ہے۔" میں نے اس کی میز پر رکھی ہوئی ایک موٹی فائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔ جب تمہیں معلوم ہے تو بتا کیوں نہیں دیتے؟"

"یہ میں نہیں کر سکتا کیونکہ اگر تمہیں معلوم ہو گیا تو تم یہ بات اپنے کلائنٹ کو بتا دو گے اور پیکر کو بھی اس کی سن گن مل جائے گی۔ مجھے شبہ ہے کہ دونوں کمپنیوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں میں اس کے لوگ موجود ہیں جو اسے لمحہ بہ لمحہ ہونے والی پیش رفت سے باخبر رکھتے ہیں۔"

روسکو کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے لیکن وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی تھی اس لیے کلائنٹ سے معلومات شیئر کرنے میں خاصا محتاط ہو گیا ہوں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ تمہیں یہ جانے بغیر بیس ہزار ڈالرز کیوں دیں گے کہ تم اس رقم کو کیسے خرچ کرنا چاہتے ہو؟"

"انہیں مطمئن کرنا تمہارا کام ہے۔"

"کیا میں ان سے یہ کہوں کہ اس رقم سے تم پیزا پارلر کھولنا چاہتے ہو؟"

"اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ مناسب نہیں تو کوئی اور بہانہ بنا دینا۔ مثلاً تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ مجھے یہ رقم سفری اخراجات اور مختلف شہروں میں قیام و طعام کے لیے درکار ہے۔ ویسے ان کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں کہ یہ پیسے کہاں اور کس طرح خرچ کیے جائیں گے۔ تم انہیں میری طرف سے یہ اطمینان دلا سکتے ہو کہ مجھے ڈاکٹر پیکر کے ٹھکانے کا علم ہے اور میں اس تک پہنچے بغیر معاوضے کی مد میں کوئی پائی وصول نہیں کروں گا۔"

☆☆☆

"تم یہ بات کس طرح یقین سے کہہ سکتے ہو کہ وہ اس چھوٹے سے شہر میں چھپا ہوگا؟"

"اس جگہ کا نام سان لوئیس اوبیسپو ہے اور یہاں کے رہنے والے اسے ایس ایل او کہتے ہیں۔"

"تمہارے خیال میں اس نے چھپنے کے لیے اس شہر کا انتخاب کیوں کیا ہوگا؟"

"بڑی آسان سی بات ہے۔ وہ شخص وہیں پلا بڑھا جبکہ وہ امریکا کی کسی بھی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر سکتا تھا۔ گزشتہ بیس برسوں کے دوران اپنے انٹرویوز میں وہ اس شہر کو زمین پر جنت قرار دے چکا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے یہاں کی سماجی تنظیموں کو لاکھوں ڈالرز عطیے میں دیے ہیں جس کی وجہ سے لوگ اس کے گرویدہ ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ اسے بچپن سے ہی سمندر میں نہانے کا شوق ہے اور یہ شہر وسطی کیلی فورنیا کے ساحل سے چند منٹ کی مسافت پر ہے۔"

"تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟" جوئے نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"سان فرانسسکو میں ایسی کئی لائبریریاں ہیں جہاں انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا۔ تمہاری دلیل میں وزن ہے لیکن اس شہر میں بہت سے لوگ اسے جانتے ہیں اور انہوں نے بیس لاکھ ڈالرز کی چوری کے بارے میں ضرور سنا ہوگا۔ اگر کسی نے اسے یہاں دیکھا ہوتا تو اب تک اس کی کوئی نہ کوئی اطلاع مل چکی ہوتی۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔" میں نے جوئے کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ "یقیناً بہت سے لوگ اسے جانتے ہوں گے لیکن اس سے بھی زیادہ تعداد اسے پسند کرنے والوں کی ہے کیونکہ اس نے یہاں بہت زیادہ سماجی خدمت کی ہے۔ شاید ان کی نظر میں اس رقم کی چوری کوئی جرم نہ ہو کیونکہ یہاں کے لوگوں کے لیے وہ رابن ہڈ جیسا ہے جو امیروں سے دولت چھین کر غریبوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔"

"میں تمہاری بات سمجھ گیا۔" جوئے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن مقامی پولیس اور شیرف کیوں خاموش ہیں؟ اگر وہ اس شہر میں موجود ہوتا تو پولیس کو بھی اس کی خبر ہو جاتی؟"

"ضروری نہیں۔ تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ اتنا احمق نہیں ہے کہ وہ پورے شہر میں گھوم پھر کر لوگوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلائے۔ اس نے اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھا ہوا ہے اور ممکن ہے کہ بھیس بدل کر یہاں رہ رہا ہو۔ مجھے اس پر بھی کوئی حیرت نہیں ہوگی کہ پولیس اور شیرف کے دفتر کے کچھ لوگ اس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ پولیس چیف بھی ان لوگوں میں شامل ہو جو اسے لمحہ بہ لمحہ باخبر رکھتے ہیں۔"

ہم نے گرے ہاؤنڈ اسٹیشن سے ایک مقامی اخبار خریدا اور دو گھنٹے بعد ہی ایک آراستہ اپارٹمنٹ کرائے پر لینے میں کامیاب ہو گئے جو مرکزی شاہراہ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ اس شام ہم نے شہر کے بازاروں کا دورہ کیا اور خاص طور پر چھوٹے ریستوران دیکھے۔ کئی جگہ پیزا بھی فروخت ہو رہا تھا لیکن جوئے نے اپنی ناک سکیڑ کر ناگواری کا اظہار کیا اور بولا۔ "ایسی جگہوں پر جہاں تیز میوزک بج رہا ہو، کسی اچھے کھانے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کے لوگ برسوں بعد بھی ہمارے پیزا کو یاد رکھیں گے۔"

دو ہفتے کے اندر ہی ہمیں پیزا پارلر کے لیے مناسب جگہ مل گئی۔ میں نے ایک مقامی آرٹسٹ کی خدمات حاصل کر کے پُرکشش سائن بورڈ بنوایا اور اندرونی دیوار پر بھی ایک فوڈ اسٹریٹ کی بڑی سی تصویر بنوائی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں سے گزرتے ہوئے لوگ چند سیکنڈ کے لیے رک کر اندر ضرور جھانکتے اور پارلر کے بارے میں ان کا تجسس بڑھ جاتا۔ ضروری سامان خریدنے اور پارلر کی تزئین و آرائش کرنے کے ساتھ ہی میں نے سابق اٹارنی اتابیل فیونٹ کی بھی خدمات حاصل کر لیں تاکہ وہ لائسنس کے حصول میں ہماری مدد کر سکے۔

ہم اس کے دفتر میں بیٹھے فارم بھر رہے تھے کہ فیونٹ نے پوچھا۔ "تم نے پارلر کے لیے کیا نام تجویز کیا ہے؟"

"ایس ایل او پیزا۔" میں نے فوراً ہی جواب دیا۔ یہ نام اچانک ہی میرے ذہن میں آیا تھا۔

میں نہیں جانتا کہ وہ اس نام سے متاثر ہوئی یا نہیں تاہم اس کا کہنا تھا کہ اگر پیزا کا معیار اچھا ہوا تو ہماری کامیابی کے کافی امکانات ہیں۔

"جوئے کا تعلق ڈیٹرائٹ کی پیزا بنانے والی فیملی سے ہے جو معیار پر کبھی سمجھوتا نہیں کر سکتا۔ تم اپنے دوستوں کو ہمارے بارے میں بتا دو۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں مایوسی نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہوتے ہوئے بولی۔ "اگر تمہیں ڈیلیوری بوائے کی ضرورت ہے تو میں دو لڑکوں کو جانتی ہوں جو اس کام کے لیے مناسب رہیں گے۔"

"شکریہ لیکن ہمارا پیزا باہر نہیں جائے گا۔ یہ اسی وقت مزہ دے گا جب اسے تازہ تازہ کھا لیا جائے۔"

کچھ دنوں بعد ہی ہمارے پارلر کا افتتاح ہو گیا۔ مجھے

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ کافی تعداد میں لوگ وہاں آرہے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کا کہنا تھا کہ انہیں مسز فیونٹ یا ہمارے مالک مکان نے اس پیزا پارلر کے بارے میں بتایا تھا۔ ... جبکہ کچھ لوگوں نے کہا کہ یہاں سے گزرتے ہوئے وہ پیزا کی خوشبو سے اس جانب متوجہ ہوئے۔ جوئے نے کچن سنبھال لیا تھا جبکہ میں میزوں کے درمیان گھوم پھر کر ان سے باتیں کرتا اور پہلا لقمہ لینے کے بعد ان کے جو تاثرات ہوتے، اس سے لطف اندوز ہوتا۔ ہم ڈھائی بجے پارلر بند کر دیتے اور جوئے تھوڑی سی نیند لینے اپارٹمنٹ چلا جاتا۔ اس دوران میں میں پارلر کی صفائی کرتا۔ ہم پانچ بجے دوبارہ پارلر کھولتے۔ رات دس بجے تک میں بُری طرح تھک چکا ہوتا تھا۔

"مجھے امید ہے کہ بہت جلد پیکر یہاں آئے گا۔" میں نے ایک دن آخری گاہک کے جانے کے بعد بیرونی دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "نہ جانے کب تک یہ ڈیوٹی دینا پڑے گی۔ میری تو ٹانگیں اور کمر اکڑ کر رہ گئی ہے۔"

جوئے نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ "اب تمہیں اندازہ ہو گیا کہ ایک ریستوران یا اس جیسا چھوٹا سا پیزا پارلر چلانا کتنا مشکل کام ہے۔ بہرحال میں تو بہت خوش ہوں۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اپنے خاندانی کام سے دور رہ کر میں نے کتنی بڑی غلطی کی۔"

ایک ہفتے بعد ہی لنچ اور ڈنر کے اوقات میں گاہکوں کا رش اتنا بڑھ گیا کہ ہمیں جوئے کی مدد کرنے کے لیے ایک لڑکا رکھنا پڑ گیا۔ ہم اتنا تھک جاتے کہ بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی اور ہر روز یہی محسوس ہوتا کہ پیزا کی فروخت بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمارے منصوبے کے مطابق یہاں آنے والوں میں معززینِ شہر اور یونیورسٹی کے طالب علموں کی اکثریت تھی کیونکہ یہاں موسیقی کا شور، ویڈیو گیم اور بڑی اسکرین والا ٹی وی نہیں تھا جس پر ہر وقت کھیل یا تفریحی پروگرام چلتے رہتے ہوں۔ اسی لیے لوگ پُرسکون ماحول میں پیزا سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ڈاکٹر پیکر بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتا تھا اور میں جانتا تھا کہ جلد یا بدیر وہ ضرور یہاں آئے گا۔ میری ہر ہفتے روسکو سے ٹیلی فون پر بات ہوتی اور میں ہر بار اسے یہی سمجھایا کرتا۔

"اس کے علاوہ ہم خوب پیسے کما رہے ہیں۔" میں نے حال ہی میں ہونے والی گفتگو کے دوران اس سے کہا۔ "مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کام میں اتنا منافع ہے۔ اگر ہمیں بیئر اور وائن بیچنے کا پرمٹ مل جائے تو وہ ہمارے لیے نوٹ چھاپنے کا لائسنس ہوگا۔"

تین دن بعد پانچ افراد آئے جب ہم دوپہر میں پارلر بند کر رہے تھے۔ ان کے حلیے سے لگ رہا تھا کہ وہ سمندر میں نہا کر آرہے ہیں۔ ان میں سے دو درمیانی عمر کے تھے جبکہ تیسرا ان سے دس سال چھوٹا لگ رہا تھا۔ بقیہ دو کی عمر بیس اور پچیس کے درمیان تھی۔ ان سب نے ٹی شرٹس اور ہاف پینٹ پہن رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک شخص جو قدرے مہذب لگ رہا تھا، بولا۔ "کیا ہمیں آنے میں دیر ہو گئی؟ ہم کچھ دیر پہلے آجاتے لیکن سمندر کی موجوں نے راستہ روک لیا۔ واقعی آج وہاں نہانے میں بہت مزہ آیا۔"

"ہم دو بجے پارلر بند کر دیتے ہیں۔" جوئے نے دروازے پر لگے ہوئے بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کی پابندی لازمی نہیں۔ میں تم لوگوں کو پارلر میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ یہاں تمہیں بالکل تازہ پیزا ملے گا۔"

"تمہارے پاس بیئر کون سی ہے؟" ایک نوجوان لڑکے نے پوچھا۔

"ہمیں اس کی اجازت نہیں ہے کیونکہ حکومت سمجھتی ہے کہ اس طرح عام مقامات پر ہنگامہ آرائی کا خطرہ ہے۔ لوگ نشے میں آکر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں اور اس کی وجہ سے دوسرے گاہکوں کو پریشانی ہوتی ہے۔"

تینوں بڑوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور ان میں سے داڑھی والا بولا۔ "ٹھنڈی بیئر کے بغیر تو پیزا کھانے کا مزہ نہیں آئے گا۔ کیا خیال ہے اگر ہم اپنی بیئر لے آئیں؟ جیپ میں ٹھنڈی بوتلوں سے بھرا ہوا کولر موجود ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جیسے لوگوں کے لیے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"تم جیسے لوگوں سے کیا مراد ہے؟" ان میں سے ایک چونکتے ہوئے بولا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرا اندازہ ہے کہ تم میں سے ایک جج اور دو کا تعلق پولیس سے ہے۔"

"بہت خوب۔" چالیس سالہ شخص بولا اور اس نے سفید بالوں والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ جج سام جیکسن ہیں جبکہ میٹ اور جیمس کا تعلق شیرف کے دفتر سے ہے۔" پھر اس نے دوسرے داڑھی والے شخص کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "بل پیٹرسن یہاں کی سب سے بڑی اور پرانی سیون ہلز وائنری کے مالک ہیں۔ میرا نام چارلس ینگ ہے اور میں ڈاکٹر ہوں۔"

"تم لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" میں نے گرم جوشی سے فرداً فرداً سب سے مصافحہ کیا۔ انہوں نے تین بڑے سائز کے پیزا کا آرڈر دیا اور جاتے وقت بل کے علاوہ بیس ڈالر بھی ٹپ کے طور پر دے گئے۔ جوئے بولا۔ "انہیں ہمارا پیزا پسند آیا۔"

"ہاں، بہت زیادہ۔" میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ چالیس سالہ شخص جس نے بل اور ٹپ دی، وہ کوئی اور نہیں بلکہ ڈاکٹر پیکر تھا۔"

"اچھا۔" اس نے یوں سر ہلایا جیسے میں نے اسے موسم کا حال سنایا ہو۔ "تمہیں یقین ہے کہ وہ ڈاکٹر پیکر ہی تھا؟"

"ننانوے فیصد۔ اس نے داڑھی رکھ لی ہے اور تھوڑی سی پلاسٹک سرجری بھی کروائی ہے۔ انگلیوں کے نشانات سے یہ پتا لگایا جا سکتا ہے لیکن وہ بیئر کی خالی بوتلیں اپنے ساتھ لے گئے۔"

"شاید انہیں وہ بوتلیں واپس کرنا ہوں۔" جوئے نے کہا۔ "اب تم اسے کس طرح شناخت کرو گے؟"

"فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے اس بارے میں سوچنا ہوگا۔ وہ شخص بہت چالاک اور ہوشیار ہے اور اس نے اپنے تحفظ کا پورا بندوبست کر رکھا ہے۔ اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ ہوگا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم روسکو جیکسن کو بھی اس پیش رفت سے آگاہ نہیں کرو گے؟"

"نہیں۔" میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "دراصل پیکر پر ہاتھ ڈالنا اور اس سے بیس لاکھ ڈالرز برآمد کرنا بہت ہی حساس معاملہ ہے۔ اگر میں نے روسکو کو پیکر کی یہاں موجودگی کی اطلاع دے دی تو وہ لازماً اپنے کلائنٹ کو بتائے گا اور وہ یہ خبر سان فرانسسکو کی پولیس کو دیں گے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ وہ بھی سن لو۔ اس سے پہلے کہ سان فرانسسکو کی پولیس روانہ ہو، پیکر کسی دوسرے شہر یا ملک چلا جائے گا۔ وہ لوگ اسے نہیں پکڑ سکیں گے اور ہماری اطلاع کو غلط سمجھا جائے گا جس کے نتیجے میں دونوں فنانس کمپنیاں ہمیں فیس دینے سے انکار کر سکتی ہیں۔"

"یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔" جوئے فکرمندی سے بولا۔

"ہاں، واقعی یہ اچھی بات نہیں ہے لہٰذا اس نقصان سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ میں پیکر کے بارے میں مزید معلومات حاصل کروں۔ مثلاً یہ کہ وہ کہاں رہ رہا ہے اور اس کے روزمرہ کے معمولات کیا ہیں۔ اس سے پہلے میں روسکو کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔" جوئے ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"اگر ہم پیکر کو اپنا مستقل گاہک بنانے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمارا کاروبار بہت کامیاب ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ تم بتا رہے تھے کہ یہ اس کا آبائی شہر ہے اور وہ یہاں کافی مقبول ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی اور بھی لوگ یہاں آنے لگیں گے۔"

میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا۔ "تم بھول رہے ہو کہ ہم نے یہ پیزا پارلر محض ڈاکٹر پیکر کو تلاش کرنے کے لیے کھولا تھا۔ اسے پولیس کے حوالے کرنے کے بعد ہمارا کام ختم ہو جائے گا اور ہم یہ سارا ساز و سامان بیچ کر کمپنیوں سے لیا ہوا پیسا واپس کر دیں گے۔ تمہارا کہنا درست ہے کہ پیکر یہاں کے لوگوں میں بے حد مقبول ہے۔ اس لیے جب انہیں معلوم ہوگا کہ اسے پکڑوانے میں ہمارا ہاتھ ہے تو وہ ہمیں ایک سیکنڈ کے لیے بھی اس شہر میں برداشت نہیں کریں گے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا۔" جوئے نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن میں انابیل فیونٹ کے دفتر میں بیٹھا اسے پیزا پارلر میں ان پانچوں افراد کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ یہ جان کر خاصی مرعوب ہوئی کہ ہمارے گاہکوں میں ایک جج، وائن کمپنی کا مالک اور چارلس ینگ جیسے معززین کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اگر انہیں تمہارا پیزا پسند آگیا تو اس سے تمہارے پارلر کی خوب پبلسٹی ہوگی اور اس کے بعد تم اتنے مصروف ہو جاؤ گے کہ تمہیں سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملے گی۔"

"ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "زیادہ پیسے آئیں گے تو ہمیں مصروفیت کا احساس بھی نہیں ہوگا۔" میں نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور بولا۔ "تم چارلس ینگ کے بارے میں کیا جانتی ہو؟ اس نے اپنا تعارف ہیلتھ کیئر کے ماہر کے طور پر کروایا تھا۔ میں اور جوئے ہیلتھ انشورنس کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ کیا ہم اس سے اس سلسلے میں بات کر سکتے ہیں؟"

"اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ وہ ہیلتھ انشورنس کا کام کرتا ہے تو میرا جواب نفی میں ہے۔"

میں نے اس کے اگلے جملے کا انتظار کیا لیکن جب وہ

کچھ نہ بولی تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اسے ذاتی طور پر جانتی ہو؟''

''کیا تمہارے لیے یہ جاننا ضروری ہے؟'' وہ کچھ ناگواری سے بولی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟''

''میرا کوئی خاص مقصد نہیں ہے۔'' میں نے سنبھلتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے رویّے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ چارلس ینگ کے بارے میں مزید کوئی بات کرنا بیکار ہے پھر بھی اسے مطمئن کرنے کی خاطر میں نے کہا۔ ''میں صرف یہاں کی اہم شخصیات سے متعارف ہونا چاہ رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں جوئے اور میں مقامی کنٹری کلب کا ممبر بننا چاہیں۔ اس وقت ہمیں ان لوگوں کا حوالہ دینے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔''

انا بیل نے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''تمہیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے اور یہاں کے رہنے والے ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہیں جن کی کوئی سیاسی یا کاروباری حیثیت ہو۔ تم جیسے نئے لوگوں کی جانب سے ان کے بارے میں سوالات کرنا بہت سے شبہات کو جنم دے سکتا ہے۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ اپنے کام پر توجہ دو۔ کیا تمہارے اطمینان کے لیے یہ کافی نہیں کہ چارلس اور اس کے دوستوں نے تمہارے پیزا کو پسند کیا؟''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے چلا آیا۔ دو دن بعد چارلس ینگ ایک بار پھر پیزا پارلر آیا۔ اس مرتبہ وہ اکیلا تھا۔ پارلر بند ہوئے بیس منٹ ہو چکے تھے اور میں فرش پر اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ میرے دونوں پاؤں دیوار کے ساتھ اوپر کی جانب اٹھے ہوئے تھے۔ یہ یوگا کی پریکٹس تھی جو میں گھر جانے سے پہلے کیا کرتا تھا۔

''ہائے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہائے۔'' میں نے اپنی دونوں ٹانگیں نیچی کیں اور کروٹ کے بل کھڑا ہو گیا۔

''لگتا ہے کہ پارلر بند ہونے والا ہے۔'' اس نے مایوسی کے عالم میں کچن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جہاں پوری طرح اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

''پارلر بند ہو چکا ہے۔'' میں نے اسے مطلع کیا۔ ''لیکن اگر تمہارا کام پیزا کے ایک یا دو ٹکڑوں سے چل سکتا ہے تو تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔ جوئے نے جانے سے پہلے میرے لیے ایک پیزا تیار کیا تھا۔ تمہیں اپنے ساتھ شریک کر کے مجھے خوشی ہوگی۔''

میں نے دو آدمیوں کے لیے میز لگائی۔ جب تک پیزا تیار ہوتا، ہم مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ پھر میں اوون سے پیزا نکال کر لایا اور اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ''خیال رکھنا تمہارا منہ نہ جل جائے۔ یہ اب بھی اندر سے کافی گرم ہے۔''

وہ مسکرایا اور اپنی پلیٹ میں ایک ٹکڑا رکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ تم لوگوں سے میرے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''لوگوں سے نہیں، صرف انا بیل سے بات کی تھی۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے اس پر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی جب اس نے تمہارے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔''

''کیوں۔ تمہیں اس پر حیرت نہیں ہوئی؟'' اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''بالکل نہیں۔'' میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس سمیت شہر کے دیگر بااثر افراد مثلاً بل پیٹرسن اور جج جیکسن جانتے ہیں کہ تم چارلس ینگ نہیں ہو اور وہ کبھی بھی تمہاری اصلیت ظاہر نہیں کریں گے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو۔ میں کون ہوں؟''

''تم ڈاکٹر ٹونی پیکر کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتے۔''

میں نے پیزا کا ٹکڑا منہ میں رکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''پیزا کیسا تھا؟''

''میں نے آج تک اتنا لذیذ پیزا نہیں کھایا۔'' وہ اعتراف کرتے ہوئے بولا۔ ''یہاں تک کہ اٹلی میں بھی نہیں جہاں کی یہ سوغات ہے۔ اور اگر تم ٹونی پیکر کی بات کر رہے ہو تو اس کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ بینکاک میں بادشاہوں جیسی زندگی گزار رہا ہے۔''

''یہ کل کی خبر ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جب میں سان فرانسسکو سے روانہ ہوا تھا تو اطلاع ملی تھی کہ تم ہو چی منہ سٹی میں ایک پُرتعیش زندگی گزار رہے ہو۔ اس خبر کی روشنی میں ایف بی آئی اور پرائیویٹ سراغ رساں ادارے میکانگ ڈیلٹا سے لے کر ہنوئی تک تمہاری تلاش میں لگے ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں بھاری رقم خرچ کر رہے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسی خبریں تمہارے دوستوں اور ہمدردوں کی جانب سے پولیس اور ایف بی آئی کو گمراہ کرنے کے لیے پھیلائی گئی ہیں۔ میرا شروع سے ہی یہ اندازہ تھا کہ تمہیں چھپنے کے لیے اس شہر سے اچھی جگہ کوئی نہیں مل سکتی۔''

پیکر نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''تمہارا اندازہ غلط بھی ہوسکتا ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم نے ڈاکٹر پیکر کو گھیرنے کے لیے پیزا پارلر کا کاروبار کیوں شروع کیا؟ جبکہ میں جانتا ہوں کہ تم اپنے دوست روسکو جیکسن کے لیے کام کر رہے ہو جو ان دونوں کمپنیوں کا وکیل ہے جن سے بیس لاکھ ڈالرز ادھار لیے گئے تھے۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ وہ اسے ادھار سمجھتے ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ان کی نظر میں یہ چوری ہے۔''

''اس کے باوجود میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے یہ پیزا پارلر کیوں کھولا؟''

''اس سوال کا جواب بعد میں دوں گا۔ تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں روسکو جیکسن کے لیے کام کر رہا ہوں؟''

''صرف ایک فون کال کے ذریعے میں تمہاری حقیقت جاننے میں کامیاب ہو گیا۔ میری ایک دوست سان فرانسسکو میں ہے۔ اسی نے میری درخواست پر تمہارے بارے میں معلومات اکٹھی کیں۔ تمہاری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے اور تم اتنے بے پروا ہو کہ یہاں آنے کے بعد تم نے اپنا نام بدلنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ تم شاید بھول گئے تھے کہ انٹرنیٹ کو صرف نام کی ضرورت ہوتی ہے۔ باقی سارا کام وہ خود ہی کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں یہ خیال بھی نہیں رہا کہ اس شہر میں آنا اور پیزا پارلر کھولنا بہت سے لوگوں کو شک میں مبتلا کر سکتا ہے۔ لہٰذا میں نے پہلی فرصت میں تمہارے متعلق معلومات حاصل کر لیں۔ اب بتاؤ کہ تم نے پیزا پارلر کیوں کھولا؟''

''کیا تم نے کبھی پیرس کے کیفے لیس ڈیوکس میگوٹس کا نام سنا ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا تو میں نے اسے بھی اس کیفے کے بارے میں وہی کہانی سنائی جو اس سے پہلے روسکو جیکسن اور جوئے کو سنا چکا تھا۔

اس نے اپنا سر پیچھے کی جانب کیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بالکل بچکانا خیال ہے۔ اگر پیکر یہاں نہیں ہے تو تم کب تک اس کے انتظار میں یہ پارلر کھولے بیٹھے رہو گے؟''

پھر وہ کرسی پر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ تم نے ابھی تک اپنے دوست کو یہ نہیں بتایا کہ تم نے مجھے تلاش کر لیا ہے۔''

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا ہوگا؟''

''کیونکہ اگر تم نے اسے بتایا ہوتا تو اب تک ایف بی آئی حرکت میں آچکی ہوتی۔''

''تمہارا خیال درست ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''روسکو کو ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں نے اسے کیوں نہیں بتایا تو اس کی وجہ بہت آسان ہے۔ میرا کام صرف تمہیں تلاش کرنے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ تمہیں پولیس کے حوالے کرنا بھی میرے معاہدے میں شامل ہے اور مجھے اسی صورت میں معاوضہ ملے گا جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مجھے ڈر تھا کہ روسکو کو فون کرنے اور پولیس کے یہاں آنے

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی ذہانت اور دینی بصیرت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار ایک انگریز نے جو فارسی، عربی اور انجیل پر پوری دستگاہ رکھتا تھا، شاہ صاحب سے ایک سوال کرنے کی درخواست کی۔ آپؒ نے فرمایا اجازت ہے۔ اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی برتری اور فضیلت بیان کرتے ہوئے ایک فارسی شعر پڑھا جو یہ تھا:

کہ بہ گفت عیسیٰ ز مصطفیٰ اعلیٰ ست
کہ ایں بزیر زمیں دفن او بہ اوج سماست

گویا اس نے حضور سرور کائناتؐ پر اس طرح حضرت عیسیٰؑ کی فوقیت و فضیلت ثابت کرنی چاہی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو خاک میں دفن ہیں اور حضرت مسیح آسمان پر اٹھا لیے گئے ہیں اور آسمان کو زمین پر بہرحال فوقیت حاصل ہے۔

یہ طرزِ استدلال بظاہر بڑا منطقی تھا اور معمولی فہم و ادراک کا انسان شاید اس دلیل سے مطمئن ہو جاتا لیکن شاہ صاحب کو اللہ قدیر و قادر نے عرفانِ شریعت اور دین کی بصیرت عطا کی تھی، چنانچہ آپؒ نے مومنانہ فراست کے ساتھ اس سوال کا جواب شعر کی زبان میں اس طرح دیا

بہ گفتمش کہ نہ ایں حجت قوی باشد
حباب برسرآب و گہر تہ دریاست

(ترجمہ: یہ حجت زیادہ قوی نہیں ہے۔ حباب پانی کے اوپر ہوتا ہے لیکن موتی دریا کی تہ میں ہوتا ہے)

اس منطقی دلیل اور حقیقت افروز کلام کو سن کر انگریز ساکت ہو گیا اور اس پر مدہوشی کی کیفیت طاری ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد دنیا نے دیکھا کہ وہ اسلام کی آغوش میں پہنچ گیا۔

(مرسلہ: جنید اقبال، کراچی)

کے وقفے کے دوران میں تم غائب نہ ہو جاؤ۔ لہٰذا اسے فون کرنے سے پہلے میں تمہارے گرد گھیرا تنگ کرنا چاہ رہا تھا اور یہ اسی صورت ممکن تھا کہ مجھے تمہارے بارے میں مکمل معلومات اور دستاویزات حاصل ہو جائیں۔"

"کہیں تم یہ تو نہیں سوچ رہے کہ میں تمہیں خاموش رہنے کی قیمت ادا کروں اور وہ کبھی بھی میرے ٹھکانے کے بارے میں نہ جان سکیں؟"

میں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔ "میں نے زندگی میں یہی ایک سبق سیکھا ہے کہ کبھی کسی بے ایمان اور دھوکے باز شخص کے ساتھ سودے بازی نہ کی جائے۔ میری کوئی مجرمانہ نیت نہ تھی، بس تھوڑا سا وقت درکار تھا تاکہ تمہارے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو جائیں اور میں اسی مقصد کے تحت مسز فیونٹ کے پاس گیا تھا لیکن وہ بھی تمہاری زرخرید نکلی۔ بائی دا وے، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے یہ رقم کیوں چرائی؟ تم تو خاصے دولت مند ہو۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، میں نے ایسا کیوں کیا؟"

"مجھے یقین ہے کہ تم نے دولت کی خاطر ایسا نہیں کیا اور نہ ہی تمہیں پُرتعیش کاروں یا ذاتی جہاز خریدنے کی خواہش ہے۔ یہ سب کچھ تم اپنی کمائی سے بھی کر سکتے تھے اور نہ ہی تم بیس لاکھ ڈالرز کی خاطر ساری عمر روپوش رہ سکتے ہو۔ ضرور کوئی اور بات ہے۔ جب تک میں اس کا پتا نہ چلا لوں، روسکو یا کسی اور کو نہیں بتاؤں گا کہ میں نے تمہیں تلاش کر لیا ہے۔"

میں نے اپنے سر کو جھٹکا دیا جیسے یہ بات ابھی ابھی میرے ذہن میں آئی ہو اور بولا۔ "تمہارا ابھی یہ ارادہ نہیں ہوگا کہ ساری عمر روپوش رہو۔"

"یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ تمہارا ارادہ ہرگز اس رقم کو اپنے پاس رکھنے کا نہیں تھا بلکہ تم اسے مناسب وقت پر واپس کر دیتے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم رقم لے کر غائب کیوں ہو گئے؟"

"دراصل میں نے جس شاندار طریقے سے کیریئر کی ابتدا کی تھی، اب اس میں ٹھہراؤ آ گیا تھا، چنانچہ میں کسی ایسی جگہ سرمایہ کاری کرنے کا خواہش مند تھا جہاں منافع کی شرح سب سے زیادہ ہو۔ اس کے لیے میں نے اسٹاک مارکیٹ کا انتخاب کیا۔ انہی دنوں وال اسٹریٹ میں میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو معاشی تجزیہ کار تھا۔ یہ لوگ حساب کتاب کی بنیاد پر اسٹاک مارکیٹ کے بارے میں پیش گوئی کرتے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں سے ان لوگوں کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے اور یونیورسٹیوں کے پروفیسرز کو وال اسٹریٹ میں بھاری معاوضے پر رکھا جا رہا ہے۔ ان لوگوں کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ تمام بروکر محض اپنے تجربے اور اندازے کی بنیاد پر شیئرز کا کاروبار کرتے ہیں جس میں کبھی کبھار منافع اور زیادہ تر نقصان ہوتا ہے۔"

"اب بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی ہے۔" میں نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "تم خود بھی ایک حساب داں ہو اس لیے تم نے خفیہ طریقے سے معاشی تجزیہ کار بننے کا فیصلہ کیا لیکن اس کا سافٹ ویئر بنانے اور ابتدائی سرمایہ کاری کے لیے تمہیں لمبی رقم کی ضرورت تھی۔"

پیکر نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ "میں نے پروگرام تیار کر لیا تھا اور کئی روز کی آزمائش کے بعد مجھے اس کی کامیابی کا یقین ہو گیا۔ حساب کتاب کرنے پر پتا چلا کہ اس کھیل میں شریک ہونے کے لیے مجھے کم از کم بیس لاکھ ڈالرز کی ضرورت ہوگی۔"

"میں اب بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم نے یہ رقم کیوں چرائی؟ تمہاری ذہانت اور قابلیت پر کسی کو شک نہیں۔ اگر تم سرمایہ کار کمپنی میں اپنے پارٹنرز کو اس منصوبے کے بارے میں بتاتے تو وہ تمہیں یہ رقم فراہم کر سکتے تھے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سرمایہ کار کمپنیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟"

"شاید۔" میں نے اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"سب سے پہلے تم یہ سمجھ لو کہ سرمایہ کر کمپنیاں کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لیتیں۔ ان کمپنیوں کو چلانے والے زیادہ تر بینکرز اور اکاؤنٹنٹ ہیں جو کسی بھی نئی فرم یا پروگرام کے لیے سرمایہ فراہم کرنے سے پہلے یقینی منافع کا یقین کرتے ہیں۔ وہ کبھی ایسے کمپیوٹر پروگرام میں دلچسپی نہیں لے سکتے جو حساب کے اصولوں کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہو اور جسے اس ملک میں چند رہ لوگ ہی سمجھ سکتے ہوں۔ اگر انہوں نے سرمایہ فراہم کر دیا تب بھی اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ یہ پروگرام خفیہ رہ سکے گا۔ اور اگر ایک بار لوگوں کی اس تک رسائی ہو گئی تو میرے لیے یہ بیکار ہو جائے گا۔"

"لیکن یہ ان کا پیسا ہے۔ وہ جہاں چاہیں اسے لگائیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو اسی لیے مجھے ان کی رضامندی کے بغیر یہ رقم ادھار لینا پڑی۔"

"تم اس چوری کو ادھار سمجھتے ہو؟" میں نے طنزاً کہا۔

"ہاں اگر میری نیت اسے بمع سود واپس کرنے کی ہے تو یہ ادھار ہی کہلائے گا اور اگر انہیں معقول منافع مل گیا تو وہ بھول جائیں گے کہ میں نے ان کی رضامندی کے بغیر یہ رقم ادھار لی تھی۔"

"ممکن ہے کہ ایسا ہو جائے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن سرکاری وکیل محض اس بنیاد پر اس کیس سے دستبردار نہیں ہوگا کہ رقم بمع سود واپس کر دی گئی ہے۔ تمہارے خلاف بیس لاکھ ڈالرز چرانے کا الزام ہے اور تمہیں اس کی سزا بھگتنا ہوگی۔"

پیکر کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور وہ بولا۔ "سرکاری وکیل، اٹارنی جنرل اور وہ صدر امریکا کے لیے کام کرتا ہے اور صدر ہم جیسے لوگوں کے لیے کام کرتا ہے۔ ایک شخص بینک میں بیس ہزار ڈالرز کا ڈاکا مارے تو اسے سیدھا جیل بھیج دیا جاتا ہے، چاہے رقم وصول ہو یا نہیں۔ اور اگر مجھ جیسا کامیاب کاروباری منتظم بیس لاکھ ڈالرز ادھار لینے کے بعد ساری رقم بمع سود واپس کر دے، اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھے تو اس کے ساتھ بھی اس ڈاکو جیسا سلوک ہی ہوگا۔"

"تم اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھو گے؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "اس منصوبے پر جو اخراجات ہو رہے ہیں، وہ کیسے پورے ہوں گے؟"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ ساری زندگی بیٹھ کر کھا سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھ میں اتنی صلاحیت ہے کہ اپنی کمپنی کھول کر اس کے لیے فنڈز اکٹھا کروں اور اسے کسی منافع بخش کاروبار مثلاً اسٹاک مارکیٹ میں لگا دوں۔ میں اپنی ساکھ کے بل بوتے پر خاصی بڑی رقم حاصل کر سکتا ہوں۔"

"تم نے بیس لاکھ ڈالرز سے جو سرمایہ کاری کی ہے، اس کا منافع کہاں جا رہا ہے؟"

"یہ ایک غیر سرکاری اور غیر منافع بخش تنظیم ہے جس کی سربراہی جج جیکسن اور بل پیٹرسن کرتے ہیں۔ اس منافع میں سے سرمایہ کار کمپنیوں کا حصہ نکالنے کے بعد بقیہ رقم اسی شہر میں استعمال کی جاتی ہے۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

"یہ پیسا عوامی بھلائی کے کاموں پر خرچ ہوتا ہے۔ مثلاً غریب بچوں کے علاج اور تعلیم یا مقامی اسکولوں میں موسیقی اور کھیلوں کے فروغ کے لیے رقم فراہم کی جاتی ہے۔ اسی لیے اعلیٰ تعلیم کے خواہش مند غریب طالب علموں کو وظائف بھی دیے جاتے ہیں۔"

"کیا تمہیں اتنا منافع ہو رہا ہے جس سے یہ اخراجات

پورے ہو سکیں؟"

"تمہارے تصور سے بھی زیادہ۔ ہم نہ صرف یہ اخراجات پورے کر رہے ہیں بلکہ کمپنیوں کا منافع بھی دینے کے قابل ہو گئے ہیں ..... اس رقم پر جو ادھار لی گئی تھی۔"

"تم بار بار غلط لفظ استعمال کر رہے ہو۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم نے وہ رقم چرائی تھی۔ غریبوں کی مدد کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم بے گناہ ہو۔"

"شاید میں تمہیں پوری طرح سمجھا نہیں سکا۔" اس نے مایوسی سے کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے جواب میں کہا۔ "میں یہاں صرف تمہیں تلاش کرنے آیا تھا۔ تمہارے بارے میں فیصلہ کرنا میرے اختیار میں نہیں۔ تمہارے بارے میں سب کچھ جان لینے کے بعد اب میں روسکو کو فون کر سکتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہیں دیر ہو گئی۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "کم از کم آٹھ گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ۔"

میں نے سر ہلایا۔ جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے کہا۔ "گویا تمہارے یہاں آنے سے پہلے معاملات طے ہو چکے ہیں۔"

"تقریباً۔" اس نے مطمئن انداز میں کہا۔ "جج جیکسن آج صبح ہی سان فرانسسکو کے لیے روانہ ہو گیا تھا اور اس کا سارا دن سرمایہ کار کمپنی اور امریکی اٹارنی سے ملاقاتوں میں گزرا ہے۔"

"تم نے تو بہت تیزی دکھائی۔" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ہم گزشتہ دو ماہ سے اس پر کام کر رہے تھے۔ اس دوران میں ہم کیلی فورنیا کے دونوں سینیٹرز اور کانگریس کے ممبروں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔"

"مجھے یقین نہیں کہ تم جو بتا رہے ہو، وہ سچ ہے۔ لگتا ہے اس میں بھی کوئی کہانی پوشیدہ ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"تم جب پہلی بار اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں آئے، اس وقت تک میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اور دوسرے ہی دن تم نے سان فرانسسکو فون کر کے میرے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔ میرے بارے میں جاننے کے باوجود تم نے دو دن انتظار کرنے کے بعد جج جیکسن کو سان فرانسسکو بھیجا جبکہ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں نے روسکو کو تمہارے بارے میں بتایا ہے کہ نہیں۔"

"شاید مجھے جوا کھیلنا پسند ہے۔" اس نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

"لیکن اس معاملے میں تم نے کوئی جوا نہیں کھیلا بلکہ بڑی ہوشیاری سے منصوبہ بندی کی اور اس طرح تمہیں سودے بازی کرنے کا موقع مل گیا۔" اچانک ہی میرے ذہن میں زوردار جھماکا ہوا۔ "اوہ میرے خدا..... جوئے۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور بولا۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نے سان فرانسسکو میں کسی کو بھی فون نہیں کیا۔"

"اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔" وہ میرے شبہے کی تصدیق کرتے ہوئے بولا۔ "تین دن پہلے ہم یہاں آئے تھے۔ اس کے دوسرے روز جوئے نے تمہاری غیر موجودگی کے دوران جج کو فون کیا اور مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے مجھے تمہارے اور روسکو جیکسن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور یہ بھی کہ تم میرے بارے میں مکمل معلومات حاصل کیے بغیر روسکو کو میری موجودگی کی اطلاع نہیں دو گے۔ اس طرح ہمیں سان فرانسسکو میں اپنے معاملات طے کرنے کا موقع مل گیا۔ جوئے جانتا تھا کہ تم اسے بتائے بغیر جیکسن کو فون نہیں کرو گے۔"

"تمہارے درمیان کیا طے ہوا..... میرا مطلب ہے کہ وہ کتنے پیسوں میں بک گیا؟"

پیکر نے چاروں طرف نظریں گھما کر پیزا پارلر کا جائزہ لیا اور بولا۔ "اس نے پیسوں کا مطالبہ نہیں کیا، بس وہ اس پیزا پارلر کا مالک بننا چاہتا ہے۔ لہٰذا سرمایہ کار کمپنیوں سے ہمارا جو معاہدہ ہوا ہے، اس کے مطابق دونوں وہ رقم معاف کرنے پر رضامند ہو گئی ہیں جو تمہیں یہ پیزا پارلر شروع کرنے کے لیے دی گئی تھی۔"

"میں تو سراسر گھاٹے میں رہا۔ تم نے سرمایہ کار کمپنیوں سے رابطہ کر کے مجھے اس فیس سے محروم کر دیا جو تمہاری تلاش کے عوض مجھے ملنے والی تھی۔"

"اسے تم تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لو۔" پیکر نے کہا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اگر دھکا لگنے کا خطرہ ہو تو میں کسی شخص پر بھروسا نہیں کرتا اور تمہیں بھی نہیں کرنا چاہیے۔ جوئے ایک جرائم پیشہ شخص ہے۔ تم نے اس پر آنکھ بند کر کے بھروسا کیا اور وہی تمہارے لیے آستین کا سانپ ثابت ہوا۔"

جیسا میں نے سوچا تھا، وہی ہوا۔ سرمایہ کار کمپنیوں نے مجھے فیس دینے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پیکر کے منظرِ عام پر آنے سے اس معاہدے کی اہمیت ختم ہو گئی جو میرے ساتھ کیا گیا تھا۔ روسکو نے ان پر بہت دباؤ ڈالا لیکن کچھ حاصل نہ کر سکا۔ میں خالی ہاتھ سان فرانسسکو آ گیا لیکن یہ اطمینان ضرور تھا کہ پیکر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگر جوئے میری پیٹھ میں چھرا نہ گھونپتا اور مجھے روسکو کو پیکر کے بارے میں اطلاع دینے کی مہلت مل جاتی تو اس کامیابی کا سہرا میرے سر ہی بندھتا۔ میں نے ان کمپنیوں پر مقدمہ کرنے کے بارے میں سوچا لیکن ان دونوں کا شمار روسکو کی فرم کے بڑے گاہکوں میں ہوتا تھا اور روسکو ان کے مقدمات لڑنے کے عوض ہزاروں ڈالرز وصول کیا کرتا تھا۔ ایسی صورت میں وہ میرا ساتھ کیونکر دیتا۔ وہ میرے لیے ان پر اخلاقی دباؤ تو ڈال سکتا تھا لیکن ان کے مقابلے پر آنے کی اس میں ہمت نہیں تھی اور کسی دوسرے وکیل کی فیس برداشت کرنا میرے بس سے باہر تھا۔

جوئے مجھے ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے آیا تو میں اپنی ناراضی ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا جس کا اس نے بُرا منایا اور تلخ لہجے میں بولا۔ "ہر شخص کو آگے بڑھنے اور اچھی پوزیشن تک پہنچنے کا حق حاصل ہے۔ آج کی دنیا میں وہی شخص کامیاب سمجھا جاتا ہے جو موقع سے فائدہ اٹھانا جانتا ہو۔ موقع تو تمہیں بھی ملا تھا لیکن تم نے سوچنے میں وقت ضائع کر دیا جبکہ اس بھاگتی دوڑتی دنیا میں سوچ بچار کرنے کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔"

میں نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "بہرحال، تمہیں پیکر سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ انتہائی دھوکے باز اور فریبی شخص ہے۔"

اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ "میری ساری زندگی ایسے ہی لوگوں کے درمیان گزری ہے۔ اتنی بڑی رقم ہڑپ کرنے کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو بے ایمان نہیں سمجھتا، اسی لیے اسے کسی کی پروا نہیں ہے۔ اگر اس نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اس کے ساتھ وہ سلوک کروں گا جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔"

مجھے اس کے بڑبولے پن پر ہنسی آ گئی۔ وہ پیکر جیسے شاطر شخص کا کیا مقابلہ کرتا جس نے بیس لاکھ ڈالرز کی چوری کو ادھار میں بدل دیا اور جو لوگ اسے تلاش کر رہے تھے، اب وہی اپنی رقم کی واپسی کے لیے اس سے معاہدہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور یہ سب کچھ جوئے کی وجہ سے ہوا جو صحیح معنوں میں آستین کا سانپ تھا۔

ٹرین آ گئی تھی۔ میں نے ڈبڈباتی آنکھوں سے اپنے خالی بٹوے کو دیکھا اور ٹرین میں سوار ہو گیا۔

نفس کا قیدی

سلیم فاروقی

زندگی میں ایک مخصوص مقام کی حدوں تک پہنچنے کے بعد ٹھہراؤ لازمی ہے... کیونکہ اسی ٹھہراؤ میں کامیابیوں کی راہیں تھم جاتی ہیں... کچھ لوگ ان حدوں کو چھونے کے بعد بھی بے کل اور بے سمتی کا شکار ہو جاتے ہیں... وہ منزل پر پہنچ چکا تھا مگر اس کے اندر کا آدمی کسی اور ہی دنیا کا قیدی بنا ہوا تھا جو اسے نکیلے کنکروں سے اَٹے ہوئے راستے پر لے گیا اور وہ اپنے مذموم ارادوں... بے لگام خواہشات کا اسیر ہو کے محض زنداں کا قیدی بن کر رہ گیا...

لالچ و ہوس کے بیوپاریوں کا ایک اور گھناؤنا کھیل... سرورق کا تیز رفتار رنگ

شہر میں گویا ایک بھونچال آ گیا تھا۔ ملک کے معروف صنعت کار عارف شیرازی کا نوجوان بیٹا آصف اور اس کی بیوی ثمرہ غائب ہو گئے تھے۔ شیرازی نہ صرف ملک کا بہت بڑا صنعت کار تھا بلکہ وہ چیمبر آف کامرس کا صدر بھی تھا۔ آصف اس کا اکلوتا بیٹا تھا جو حال ہی میں امریکا سے اعلیٰ تعلیم کے بعد وطن لوٹا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ باپ کے ساتھ کاروباری جھمیلوں میں الجھتا، بیگم شیرازی نے اس کی شادی کر دی تھی۔ اس کی شادی بھی ایک طرح سے کاروباری

شادی تھی۔ ثمرہ بھی ملک کے ایک بہت بڑے جاگیر سردار جہانگیر کی بیٹی تھی۔ سردار جہانگیر معروف سیاست داں تھا اور اس وقت حکمراں پارٹی کا سینیٹر بھی تھا۔

ایسے میں میڈیا نے ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ اس کا سارا نزلہ پولیس اور دوسرے سرکاری اداروں پر گر رہا تھا۔ شیرازی اور سردار جہانگیر نے الگ پولیس کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ بیٹے کے غم میں بیگم تہمینہ شیرازی کی حالت بھی بہت خراب تھی۔

ایک ہفتہ قبل آصف کی شادی ہوئی تھی۔ شادی سے پہلے ہی شیرازی نے اس کے سپرد ایک پروجیکٹ کر دیا تھا۔ بیگم شیرازی نے اس پر احتجاج بھی کیا تھا لیکن شیرازی نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کر دیا تھا کہ ابھی صرف اس پروجیکٹ کی شروعات ہیں۔ اس پر کام تو آصف شادی کے بعد ہی کرے گا۔ آصف نے اس پروجیکٹ پر شادی سے پہلے ہی بھرپور کام شروع کر دیا۔ وہ بہت بڑا پروجیکٹ تھا۔ اس میں شیرازی کے ساتھ ساتھ سردار جہانگیر بھی شامل تھا۔

اپنی مصروفیات کے پیش نظر آصف نے اپنا ہنی مون سوئٹزر لینڈ یا یورپ کے بجائے پاکستان ہی میں منانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اور ثمرہ بدھ کی صبح مری اور سوات وغیرہ جانے کے لیے لینڈ کروزر میں نکلے تھے۔ آصف نے پلان بنایا تھا کہ وہ کراچی سے نکل کر ایک دن سکھر میں قیام کرے گا۔ وہاں کی سیر کے بعد وہ ملتان کا رخ کرے گا اور ملتان میں دو دن رکنے کے بعد وہ لوگ لاہور جائیں گے اور وہاں چار دن قیام کر کے اسلام آباد، مری اور پھر آگے کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔

بیگم شیرازی نے انہیں اپنے ساتھ ڈرائیور کو بھی لے جانے کو کہا تھا لیکن آصف نے انکار کر دیا تھا کہ ہنی مون میں ڈرائیور کا کیا کام؟

آصف کے چچا احسن نے بھی اس کے تنہا جانے کی مخالفت کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ کم سے کم اپنے ساتھ دو گارڈز ضرور لے جائے۔ ملک کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ سڑک کے ذریعے اتنا طویل سفر تنہا طے کیا جائے۔

آصف نے ہنس کر کہا تھا۔ ''چاچو! میں تنہا کب ہوں۔ ثمرہ میرے ساتھ ہے۔ پھر ملک میں ایسی بھی آفت نہیں آئی ہوئی ہے کہ میں کہیں کھو جاؤں گا۔ مجھے اپنی حفاظت کرنا خوب آتی ہے۔ اپنی حفاظت کے لیے میرے پاس اسلحہ بھی موجود ہے۔ میں ہنی مون پر جا رہا ہوں، کسی جنگ پر نہیں جا رہا ہوں کہ محافظوں کی فوج کے ساتھ سفر کروں۔''

احسن نے تجویز پیش کی تھی کہ تم اپنے ساتھ گارڈز کو نہ بٹھاؤ۔ میں گارڈز کے لیے ایک دوسری گاڑی کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ وہ لوگ تمہارے پیچھے رہ کر تمہاری حفاظت کریں گے۔

اپنے چچا کی اس بات پر آصف مزید چڑ گیا تھا کہ میں کوئی اسکول کا بچہ ہوں جس کی آپ لوگوں کو اتنی فکر ہے۔ گارڈز کی وجہ سے تو میں خواہ مخواہ لوگوں کی نظروں میں آ جاؤں گا۔

سردار جہانگیر نے بھی آصف کی اس بات کی تائید کی تھی کہ آج کل گارڈز کو دیکھ کر لوگ فضول میں متوجہ ہو جاتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں کہ کوئی اہم آدمی سفر کر رہا ہے۔

آصف کا پروگرام تھا کہ وہ بدھ کی دوپہر یا سہ پہر تک سکھر پہنچ کر گھر والوں کو کال کرے گا، پھر ملتان سے کال کرے گا لیکن سکھر پہنچ کر اس نے گھر کال نہیں کی۔

بیگم شیرازی نے اپنے سیل فون کے ذریعے آصف کا نمبر ملایا تھا لیکن اس کا سیل فون بند تھا۔ انہوں نے ثمرہ کے سیل فون پر بھی کال کی تھی لیکن اس کا سیل فون بھی بند تھا۔ اس صورتِ حال سے وہ بری طرح گھبرا گئی تھیں۔

انہوں نے شیرازی کو ٹیلی فون کیا لیکن وہ کسی اہم میٹنگ میں مصروف تھا۔ اس کی پی اے نے بیگم شیرازی کو بتایا کہ میں صاحب کو ایک گھنٹے سے پہلے کوئی کال ٹرانسفر نہیں کر سکتی۔ انہوں نے سختی سے منع کیا ہے۔

بیگم شیرازی نے جھنجلا کر شیرازی کے سیل فون پر کال کی لیکن حسبِ توقع اس کا سیل فون بند تھا۔ وہ جب بھی کسی اہم میٹنگ میں مصروف ہوتا تھا، اپنا سیل فون آف کر دیتا تھا۔

بیگم شیرازی نے اسے دس دس منٹ کے وقفے سے دو ایس ایم ایس کیے تھے کہ ابھی تک آصف کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی ہے۔ آصف اور ثمرہ دونوں کے سیل فون بند ہیں۔ آپ فوراً گھر پہنچیں۔

وہ بہت زیادہ پریشان ہو گئی تھیں۔ گھر میں ملازمین کے علاوہ کوئی اور تھا بھی نہیں جو انہیں تسلی دیتا۔ احسن بھی اپنے دفتر میں تھا۔ بیگم شیرازی نے اسے اس لیے ٹیلی فون نہیں کیا تھا کہ وہ بھی کسی اہم میٹنگ میں مصروف تھا۔ اگر اسے اطلاع ملتی تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر کی طرف بھاگتا۔ وہ اپنے بھتیجے کو بہت زیادہ چاہتا تھا۔

احسن، شیرازی سے دس بارہ سال چھوٹا تھا اور کاروبار میں برابر کا حصے دار تھا۔ اس نے چند سال پہلے کسی ائیر ہوسٹس

سے شادی کی تھی جو صرف چند مہینے ہی چل سکی۔ پھر ان دونوں کے درمیان طلاق ہو گئی۔ احسن نے اس کے بعد دوسری شادی نہیں کی تھی۔ وہ آصف کو ماں اور باپ دونوں سے بڑھ کر چاہتا تھا۔ اس کے پیر میں کانٹا بھی چبھ جاتا تو وہ بے چین ہو جاتا۔ آصف بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔

آخر جب شام کے سات بج گئے اور آصف کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی تو بیگم شیرازی نے احسن کو ٹیلی فون کر دیا۔ آپریٹر نے اسے بتایا کہ صاحب ایک ضروری میٹنگ میں ہیں۔ بیگم شیرازی نے اسے جھڑک دیا اور کہا کہ احسن سے ابھی میری بات کراؤ۔ آپریٹر بیگم شیرازی کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر میں نے کال احسن صاحب کو ٹرانسفر نہ کی تو میری ملازمت جا سکتی ہے۔

اس نے فوراً ہی کال احسن کو ٹرانسفر کر دی۔

''کیا بات ہے صبا؟'' احسن نے جھنجلا کر کہا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ......''

''سر! مسز شیرازی لائن پر ہیں اور وہ بہ ضد ہیں کہ ان سے فوراً آپ کی بات کرائی جائے۔''

''اچھا بھابی کا ٹیلی فون ہے۔'' احسن نے کہا۔ ''بات کراؤ۔''

دوسرے ہی لمحے بیگم شیرازی، احسن سے بات کر رہی تھیں۔

فون سننے کے بعد احسن نے کہا۔ ''حضرات! مجھے ایک ایمرجنسی کی وجہ سے جانا پڑے گا اس لیے ہم یہ میٹنگ بعد میں کریں گے۔''

''ہم لوگ کل شام کی فلائٹ سے ملائیشیا جا رہے ہیں۔'' میٹنگ میں شریک ایک شخص نے کہا۔ ''مسٹر احسن شیرازی! اگر آج یہ میٹنگ فائنل نہ ہوئی تو یہ پروجیکٹ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

''تو نکل جائے۔'' احسن نے بے نیازی سے کہا۔

''سر! اس سے ہمیں تقریباً ستر کروڑ روپے کا نقصان ہوگا۔'' اس کے سیکریٹری نے جھک کر اس کے کان میں کہا۔

''ہوا کرے۔'' احسن نے کہا اور بلند آواز میں بولا۔ ''جنٹل مین! میٹنگ از اوور۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا بریف کیس اور لیپ ٹاپ سنبھالا اور میٹنگ کے شرکاء کی طرف دیکھے بغیر میٹنگ روم سے باہر نکل آیا۔ اس کا سیکریٹری اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

ٹیلی فون آپریٹر صبا نے حیرت سے احسن کو دیکھا کہ ابھی تو اسے مزید ایک گھنٹا میٹنگ میں مصروف رہنا تھا، اس نے میٹنگ ختم کیسے کر دی۔ احسن اس کے نزدیک سے گزرا تو وہ احتراماً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

احسن گھر پہنچا تو بیگم شیرازی اضطراب کے عالم میں ٹہل رہی تھیں۔ ان کے چہرے سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ روتی بھی رہی ہوں۔ وہ احسن کو دیکھ کر واقعی رونے لگیں۔

''ارے بھابی! آپ تو بہت جلد گھبرا جاتی ہیں۔ آصف کوئی چھوٹا سا بچہ نہیں ہے۔ اس نے اپنا سیل فون اس لیے بند کر دیا ہوگا کہ دفتر کے لوگ اور اس کے دوست اسے ڈسٹرب نہ کریں۔ اسے آپ سے بات کرنا ہوگی تو وہ اپنا سیل فون آن کر لے گا۔ اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟''

''میں آصف کے لیے تو یہ مان سکتی ہوں۔'' بیگم شیرازی نے کہا۔ ''لیکن ثمرہ کا سیل فون کیوں آف ہے؟ اسے تو دفتر والوں کے ٹیلی فونز کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''ثمرہ نے بھی آصف ہی کے کہنے پر ایسا کیا ہوگا۔ آپ جانتی نہیں ہیں کہ ثمرہ کا باپ سردار جہانگیر اسے.... جنون کی حد تک چاہتا ہے۔ اس نے ایک گھنٹے بعد ہی ثمرہ کو کال کرنا شروع کر دی ہوگی۔ آپ پریشان نہ ہوں، ابھی آصف کا ٹیلی فون آ جائے گا۔ میں خود بھی کوشش کرتا ہوں، اس سے رابطہ کرنے کی۔''

احسن بظاہر تو بیگم شیرازی کو تسلی دے رہا تھا لیکن وہ خود اس سے بھی زیادہ پریشان تھا کہ اب تک تو آصف کا ٹیلی فون آ جانا چاہیے تھا۔ وہ اگر ٹیلی فون کرنا بھول بھی گیا تھا تو کم سے کم اپنا سیل فون آف تو نہ کرتا۔ اس نے خود بھی آصف کے دونوں نمبروں پر کال کی لیکن اسے بھی ریکارڈنگ سننے کو ملی کہ آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔ برائے مہربانی تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔ ثمرہ کے سیل فون سے بھی یہی ریکارڈنگ سنائی دے رہی تھی۔ احسن بھی کافی پریشان ہو گیا۔ وہ آصف کو ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ اب اس کے دل میں برے برے وہم آ رہے تھے کہ کہیں خدانخواستہ آصف کی گاڑی کسی حادثے کا شکار تو نہیں ہو گئی.... یا پھر وہ دونوں کسی اور مصیبت میں تو نہیں پڑ گئے۔

اسی وقت شیرازی بھی آ گیا۔ اس نے بھی اپنی بیوی کے ایس ایم ایس پڑھ لیے تھے۔

اسے دیکھ کر بیگم شیرازی نے ایک بار پھر رونا شروع کر دیا۔

''حوصلہ رکھیں بیگم۔'' شیرازی نے کہا۔ ''آپ تو بچوں کی طرح رو رہی ہیں۔ ممکن ہے آصف کی گاڑی خراب ہو گئی ہو۔''

''اس کی گاڑی کے ساتھ ساتھ کیا سیل فون بھی خراب ہوگیا؟'' بیگم شیرازی نے کہا۔ ''اسے کم سے کم ہمیں اطلاع تو دینی چاہیے تھی۔ پھر گاڑی تو بالکل نئی ہے اور اسی سال کا ماڈل ہے۔ اس میں ایسی کیا خرابی ہوسکتی ہے؟''

شیرازی جانتا تھا کہ اس کی بیوی درست کہہ رہی ہے لیکن اس وقت تو سوائے بیگم کو تسلی دینے کے وہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتا تھا۔

ان میں سے کسی نے کھانا کھایا نہ چائے پی۔ وہ تینوں اسی پریشانی کے عالم میں ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شیرازی نے اتنا ضرور کیا تھا کہ اپنے سکھر کے کاروباری دوستوں کو آصف کی گاڑی کا میک، ماڈل اور رجسٹریشن نمبر بتا کر درخواست کی تھی کہ اگر ایسی کوئی گاڑی وہاں نظر آئے تو مجھے فوراً اطلاع دیں۔

تھوڑی دیر بعد سردار جہانگیر بھی آگیا۔ اس کے ساتھ سرکاری اور نجی گارڈز کی ایک فوج بھی تھی۔ وہ سندھ کا بہت بڑا جاگیردار تھا۔ پھر موجودہ حکمراں پارٹی کا سینیٹر بھی تھا۔ اس لیے اسے کروفر دکھانے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا لیکن اس وقت وہ بہت پریشان تھا۔ ثمرہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بیوی کی موت کے بعد اس نے ثمرہ ہی کی وجہ سے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اپنی سیاسی مصروفیات سے وہ جتنا بھی وقت نکالتا تھا، ثمرہ کے ساتھ گزارتا تھا۔ وہ اندرونِ سندھ کے کسی قبیلے کا سردار اور جاگیردار تھا لیکن کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں بھی اس کے بنگلے تھے۔

اس نے بھی کئی دفعہ ثمرہ اور آصف کا نمبر ٹرائی کیا پھر مایوس ہوکر بولا۔ ''دونوں کے سیل فون بند ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کروں.... کیا پولیس کو اطلاع دے دوں؟''

''سردار صاحب! میرے خیال میں ابھی پولیس کو انفارم کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ بھائی صاحب نے اپنے سکھر کے دوستوں سے رابطہ کیا ہے، پہلے ان کی طرف سے جواب موصول ہوجائے پھر....''

''میں بھی سکھر میں اپنے آدمیوں کو فون کرتا ہوں۔'' سردار جہانگیر نے کہا۔ ''وہ لوگ زیادہ تیزی سے کام کریں گے۔''

پھر اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

وہ لوگ ابھی تک بھوکے پیاسے بیٹھے تھے۔ اس کا خیال سب سے پہلے شیرازی کے ایک دیرینہ ملازم غلام رسول کو آیا۔ وہ برسوں سے شیرازی کا ملازم تھا۔ اس نے آصف کو گودوں میں کھلایا تھا۔ اس لیے وہ شیرازی اور بیگم شیرازی سے بلاجھجک بات کرلیا کرتا تھا۔

وہ ٹرالی میں سینڈوچز، برگر، انڈوں کا آملیٹ اور کافی سمیت بہت سے لوازمات لے کر آگیا اور بولا۔ ''صاحب جی! پہلے آپ لوگ کچھ کھالیں۔ آپ نے صبح صرف ہلکا پھلکا ناشتا کیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ دفتر میں لنچ بھی نہیں کرتے ہیں۔ پہلے کچھ کھالیں، خالی پیٹ تو انسان کا ذہن بھی کام نہیں کرتا۔''

''نہیں غلام رسول! اس وقت کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔'' احسن نے کہا۔

''صاحب جی! خالی پیٹ تو آپ کچھ سوچ بھی نہیں سکتے۔ کچھ کھالیں اور کافی پی لیں۔''

اس کے اصرار پر ان لوگوں نے تھوڑا بہت کھایا، ایک ایک کپ کافی پی اور پھر اپنے اپنے ذہن کے گھوڑے دوڑانے لگے۔

''میں ایسا کرتا ہوں۔'' احسن نے کہا۔ ''خود سکھر جاتا ہوں۔ وہ لوگ بھی سپر ہائی وے سے گئے ہیں۔ میں بھی اسی راستے سے جاؤں گا۔ ممکن ہے، مجھے کچھ سراغ مل جائے۔''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے احسن! اگر خدانخواستہ آصف کی گاڑی کو کوئی حادثہ پیش آیا ہوتا تو اب تک ہمیں اطلاع مل چکی ہوتی۔''

اس بحث مباحثے میں رات کے بارہ بج گئے تو سردار جہانگیر نے کہا۔ ''میں اب پولیس کو اطلاع دے رہا ہوں۔''

کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ اس نے اپنا سیل فون نکال کر کوئی نمبر ملایا اور بولا۔ ''نثار! میں.... کون بول رہا ہے؟'' وہ درشت لہجے میں بولا۔ ''بابا ٹیلی فون آئی جی صاحب کو دو۔ میں سردار جہانگیر بول رہا ہوں۔'' اس کے انداز میں پریشانی کے باوجود رعونت تھی۔ چند لمحے بعد وہ پھر بولا۔ ''ہاں نثار! کیا حال ہیں.... خیریت نہیں ہے یار!'' اس نے پریشانی سے کہا پھر آئی جی کو سب تفصیل بتادی....

''میں اس وقت شیرازی صاحب کے گھر میں ہوں.... ہاں، تم ادھر ہی آجاؤ۔'' اس نے سیل فون کا سلسلہ منقطع کر کے شیرازی سے کہا۔ ''آئی جی نثار احمد خان ابھی دس منٹ میں یہاں پہنچ رہا ہے۔''

☆☆☆

آصف اور ثمرہ گھر سے نکلے تو موسم بہت خوش گوار تھا۔ آتی سردیوں کے دن تھے اس لیے موسم میں اس وقت معمولی

سی خنکی بھی تھی۔ آصف جانتا تھا کہ کراچی سے نکلتے ہی خنکی بڑھ جائے گی اس لیے اس نے اپنی جیکٹ اور ثمرہ کا کوٹ بھی نکال کر عقبی نشست پر رکھ دیا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈی وی ڈی پلیئر آن کردیا۔ گاڑی میں گانے کی آواز گونجنے لگی۔ ''ہوش والوں کو خبر کیا، بےخودی کیا چیز ہے؟''

ثمرہ نے ناک چڑھا کر کہا۔ ''تم ایسے ''ریں ریں'' کرنے والے گانے کیسے سن لیتے ہو؟ تمہارے جسم میں تو لگتا ہے کہ کسی پچاس سالہ آدمی کی روح ہے۔''

''اچھا، تم پہلے مجھے کافی پلاؤ۔ گزشتہ ایک گھنٹے سے ڈرائیونگ کررہا ہوں۔ کافی پی کر تمہاری پسند کا کوئی چیختا چنگھاڑتا گانا لگادوں گا۔''

ثمرہ نے عقبی نشست پر رکھی ہوئی باسکٹ سے کافی کا تھرماس نکالا اور مگ میں کافی نکال کر آصف کو دیتے ہوئے بولی۔ ''تم اگر تھک گئے ہو تو کچھ دیر میں ڈرائیونگ کرلیتی ہوں۔ تم سکون سے کافی پی لو۔''

''ارے یار! اب میں اتنا بھی نہیں تھکا ہوں۔'' آصف مسکرا کر بولا اور سپر ہائی وے پر مناسب رفتار سے چلتا رہا۔ اس نے گھونٹ گھونٹ کرکے بہت اطمینان سے کافی پی۔ اس دوران میں غزل ختم ہوچکی تھی۔

اس نے کافی کا مگ ثمرہ کو دیتے ہوئے پلیئر میں دوسری ڈی وی ڈی لگادی۔ گاڑی میں تیز موسیقی گونجنے لگی۔ ''لے لے لے لے مزہ لے، پیار کا جم کے مزہ لے۔''

ثمرہ وہ گانا سن کر نہ صرف دائیں بائیں جھومنے لگی بلکہ اس نے اسپیکر کی آواز بھی خاصی بلند کردی۔ موسیقی کی دھمک آصف کو گراں گزر رہی تھی لیکن وہ ثمرہ کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے دل پر اور کانوں پر جبر کرکے وہ دھمک سنتا رہا۔

اچانک انہیں اپنی گاڑی کے عقب میں کسی گاڑی کا تیز ہارن سنائی دیا۔

آصف نے عقبی آئینے میں دیکھا۔ وہ کوئی پجارو تھی اور اس کے ڈرائیور کو کچھ زیادہ ہی عجلت تھی۔ اس وقت آصف ایک ٹرک کو اوورٹیک کررہا تھا اس لیے فوری طور پر پجارو کو راستہ نہیں دے سکتا تھا۔

پجارو نے ایک مرتبہ پھر ہارن دیا اور ڈرائیور نے ساتھ ہی ڈیپر دے کر اس پر واضح کیا کہ فوراً راستہ دو۔

''جنگلی!'' آصف نے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' ثمرہ اس وقت گانا سننے میں محو تھی۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے جھنجلا کر کہا اور رفتار مزید بڑھا کر ٹرک کو اوورٹیک کرلیا۔ پجارو اسے اوورٹیک کرکے آگے نکل گئی۔ آصف پھر اپنی مخصوص رفتار سے چلنے لگا۔

کچھ دور چلنے کے بعد اسے پجارو پھر نظر آئی۔ اس مرتبہ اس کی رفتار سست تھی لیکن آصف جب اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے رفتار مزید سست کرکے اسے آگے نکلنے دیا۔

پھر اچانک آصف کی لینڈ کروزر کو اوورٹیک کیا اور اپنی گاڑی اس کے سامنے کچھ اس انداز میں روکی کہ ان کا راستہ مسدود ہوگیا۔

ثمرہ نے گھبرا کر کہا۔ ''آصف! کون ہیں یہ لوگ؟''

آصف نے جھٹکے سے گاڑی روکی تھی تو ثمرہ کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا۔

پجارو میں سے گھیردار شلوار قمیص میں ملبوس خطرناک حلیوں والے دو آدمی اترے۔ ان کے شانوں سے کلاشنکوف جھول رہی تھی۔ آصف کی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے انہوں نے کلاشنکوف کندھے سے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لیں اور ان کا رخ آصف کی طرف کردیا۔

آصف نے پھرتی سے ڈیش بورڈ کھول کر اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک وہ دونوں اس کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے ایک آصف کی طرف بڑھا اور دوسری پسنجر سیٹ کی طرف سے ثمرہ کی طرف گیا۔

آصف نے شیشہ تھوڑا سا نیچے کرکے کرخت لہجے میں کہا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے.... تم لوگوں کو سڑک پر چلنے کی بھی تمیز نہیں ہے؟''

''نیچے اتر، تمیز کا بچہ۔'' ان میں سے وہ آدمی غرا کر بولا جو آصف کی طرف کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی داڑھی مونچھیں تھیں۔ مونچھیں اتنی گھنی تھیں کہ اس کے ہونٹ تک ان میں چھپ کر رہ گئے تھے۔ دوسرے آدمی کا حلیہ بھی لگ بھگ ایسا ہی تھا۔ دونوں درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسموں کے مالک تھے۔

''اپنا ہاتھ باہر نکال۔'' آصف کی طرف والے آدمی نے چیخ کر کہا۔

آصف ڈیش بورڈ سے پستول نکال رہا تھا۔ اس کا ہاتھ واپس باہر آگیا۔ ''چل باہر نکل۔'' اس نے دوسرا حکم دیا۔ پھر اپنے ساتھی سے بولا۔ ''چل! اسے بھی نیچے اتار۔ یہ کیا یہیں بیٹھی رہے گی؟''

''تم لوگ ہو کون اور کیا چاہتے ہو؟'' آصف نے جھنجلا کر پوچھا۔

"جانو! اسے نیچے گھسیٹ کر بتا کہ ہم کون ہیں؟" بچل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

جانو نے دروازہ کھول کر آصف کو باہر گھسیٹ لیا۔

اسی وقت ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ باہر نکلتے ہی آصف کو سردی کا شدید احساس ہوا۔

بچل نے ثمرہ کو بھی بیدردی سے باہر کھینچ لیا۔ ثمرہ کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی۔ پھر وہ مسلسل چیخنے لگی۔

"اسے خاموش کرا بچل۔" جانو نے چیخ کر کہا اور اپنی آنکھوں سے بارش کا پانی صاف کرنے لگا۔ بارش اب تیز ہو گئی تھی۔

بچل اور جانو انہیں دھکیلتے ہوئے پجارو کی طرف لے چلے۔

"دیکھو، تم لوگ جو کوئی بھی ہو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں .... یہ بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو؟" آصف نے کہا۔

جواب میں جانو نے اسے دھکا دیا اور بولا۔ "خاموشی سے چل۔"

"اچھا، گاڑی کی پچھلی سیٹ سے ہمارے کوٹ اور جیکٹ تو اٹھا لو ورنہ میری بیوی کو سردی سے لگ جائے گی۔"

"تیری بیوی اتنی نازک نہیں ہے چھوکرے۔" جانو نے کہا۔ پھر وہ بچل سے بولا۔ "بچل! ان لوگوں کا سامان بھی اٹھا لا۔ دیکھ گاڑی میں سگریٹ اور شراب ہو تو وہ بھی لیتا آنا۔"

وہ دونوں آپس میں مقامی زبان میں بات چیت کر رہے تھے۔ اسے آصف تو نہیں لیکن ثمرہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کیونکہ وہ خود بھی مقامی تھی۔ ان لوگوں کو شاید اس بات کا علم نہیں تھا۔ وہ ثمرہ کے بارے میں انتہائی گھٹیا جملے کہہ رہے تھے۔

بارش اب مزید تیز ہو گئی تھی۔ ان لوگوں نے ثمرہ اور آصف کو پجارو کی عقبی سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔ گاڑی میں ایک شخص پہلے سے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا۔ جانو، ثمرہ اور آصف کا سامان لے کر واپس آیا اور وہ سامان بھی عقبی سیٹ کے پائدان میں ڈھیر کر دیا۔

پھر جانو درشت لہجے میں بولا۔ "او چھورا! اپنا کوٹ پہن لے اور اپنی عورت کو بھی پہنا دے ورنہ تم دونوں ہی سردی سے مر جاؤ گے۔ تم لوگ تو ٹھنڈے کمروں میں پیدا ہوتے ہو۔ سردیوں میں گھر بھی گرم ہوتے ہیں اور گاڑیاں بھی۔ تم لوگوں کو کیا پتا کہ سردی اور گرمی کیا ہوتی ہے۔"

"اگر یہ مر گئے جانو تو ہمیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔"

"اڑے، یہ بھی کوئی مرغی کے چوزے ہیں کہ ذرا سی ٹھنڈ لگتے ہی مر جائیں گے؟" جانو نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر بچل سے بولا۔ "چھوکرے کی آنکھوں پر پٹی باندھ دے۔"

"کیوں ..... تم ہم لوگوں کو کہاں لے جا رہے ہو؟" آصف نے بوکھلا کر کہا لیکن جانو نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اب اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

پھر جانو بولا۔ "چل مولا بخش!" گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ آصف کو اب صرف بارش کی آواز، گاڑی کے انجن کا ہلکا ہلکا شور اور ثمرہ کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

☆☆☆

ایک بجے کے قریب شیرازی کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے چونک کر ٹیلی فون سیٹ کی طرف دیکھا پھر ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو!"

"کون بول رہا ہے؟" دوسری طرف سے کوئی کرخت لہجے میں بولا۔

"میں شیرازی بول رہا ہوں۔" شیرازی نے جواب دیا۔

"بابا! میری بات غور سے سن۔ تیرا بیٹا اور بہو دونوں ہمارے قبضے میں ہیں۔ پولیس کے پاس جائے گا تو تجھے دونوں کی لاشیں ملیں گی۔"

"تم ہو کون اور کیا چاہتے ہو؟" شیرازی نے گھبرا کر پوچھا۔

"اس کے لیے ہمارے دوسرے فون کا انتظار کر۔" اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ "ہم ایک گھنٹے بعد پھر ٹیلی فون کریں گے۔"

پھر شیرازی "ہیلو، ہیلو" ہی کرتا رہ گیا اور ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"کس کا فون تھا؟" بیگم شیرازی نے پوچھا۔

"کیا کہہ رہا تھا..... کون تھا؟" سردار جہانگیر نے بے تابی سے پوچھا۔

"آصف اور ..... ثمرہ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔" شیرازی نے رک رک کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اغوا کر لیا گیا ہے؟" احسن بپھر کر کھڑا ہو گیا۔ "کس کی اتنی جرأت ہے کہ....."

"بولنے والا تھا کون؟" سردار جہانگیر نے احسن کی بات کاٹ دی۔

"اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔ بس اتنا بتایا کہ آصف

اور ثمرہ ہمارے قبضے میں ہیں۔ پولیس کے پاس مت جانا ورنہ ہم ان دونوں کو مار دیں گے۔"

"کیا چاہتے ہیں وہ؟" احسن نے بھنا کر پوچھا۔

"اس کے لیے اس نے کہا ہے کہ میرے دوسرے ٹیلی فون کا انتظار کرو۔ وہ ایک گھنٹے بعد دوبارہ کال کرے گا۔"

"شیرازی سائیں! بولنے والا لہجے سے کیسا لگ رہا تھا؟ میرا مطلب ہے کہ پڑھا لکھا یا....."

"وہ لہجے سے انتہائی جاہل لگ رہا تھا اور شاید سندھی تھا۔"

"سندھی تھا؟" سردار جہانگیر نے چونک کر کہا۔ "بابا! اب ٹیلی فون آئے تو مجھ سے بات کرانا۔"

وہ سب پھر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ اچانک احسن نے اپنا سیل فون نکالا اور بولا۔ "میں اپنے دوست ایس ایس پی مظہر کو کال کرتا ہوں۔ وہ کرائمز برانچ میں ہوتا ہے اور....."

"احسن صاحب! میں پہلے ہی آئی جی کو کال کر چکا ہوں۔ وہ ابھی....."

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

سردار جہانگیر نے اپنا سیل فون نکالا اور اسکرین پر نظر ڈال کر بولا۔ "ہاں نثار..... کوئی اطلاع؟..... اچھا..... کہاں..... گاڑی کا نمبر....." پھر وہ شیرازی سے بولا۔ "سائیں آصف کی لینڈ کروزر کا نمبر کیا ہے؟"

شیرازی نے اسے سوچ سوچ کر نمبر بتایا۔

سردار جہانگیر نے وہی نمبر سیل فون پر دہرا دیا۔ "اچھا..... ہاں، لینڈ کروزر ہے..... ہم لوگ آئیں کیا؟..... اچھا....." اس نے سیل فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر وہ شیرازی سے بولا۔ "سائیں! آصف کی گاڑی پولیس کو سپر ہائی وے پر تھانہ بولا خان کے نزدیک ملی ہے۔ اغوا کرنے والے انہیں وہیں سے اغوا کر کے لے گئے ہیں۔"

"کون لے گئے ہیں؟" بیگم شیرازی نے سوال کیا۔

"بھابی! اگر یہ معلوم ہوتا تو پولیس اب تک ان کی گردن پکڑ چکی ہوتی۔ لیکن آپ فکر مت کرو۔ آئی جی نے پورے علاقے کی پولیس کو الرٹ کر دیا ہے۔ اس نے جگہ جگہ سڑک کی ناکا بندی کر دی ہے۔ اغوا کرنے والے زیادہ دور نہیں جا سکیں گے۔"

"ہمیں یہ بھی تو معلوم نہیں کہ ان لوگوں کو کس وقت اغوا کیا گیا ہے۔" احسن نے کہا۔ "اگر انہیں دو تین گھنٹے پہلے بھی اغوا کیا گیا ہے تو اغوا کرنے والے اب تک سندھ کی حدود سے باہر نکل چکے ہوں گے۔"

"وہ پاکستان سے باہر تو نہیں جا سکتے۔" سردار جہانگیر نے کہا۔ "میں ابھی پنجاب پولیس کے آئی جی سے بھی رابطہ کرتا ہوں۔ وہ پنجاب میں بھی جگہ جگہ ناکا بندی کرا دے گا۔ اغوا کرنے والے انہیں کہاں تک لے کر بھاگیں گے۔"

"لیکن جہانگیر بھائی!" بیگم شیرازی نے کہا۔ "اس نے کہا تھا کہ پولیس کو اطلاع مت دینا ورنہ....."

"آپ پریشان نہ ہوں بھابی!" جہانگیر نے کہا۔ "اغوا کرنے والے ایسی دھمکیاں تو دیتے ہی ہیں۔ اب دیکھتے ہیں کہ وہ چاہتے کیا ہیں؟"

وہ سب پھر خاموشی سے انتظار کرنے لگے۔

اچانک کسی کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ احسن نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا۔ اسکرین پر نظر ڈالی پھر سرد لہجے میں بولا۔ "ہیلو ..... یار! اس وقت میں بہت ٹینشن میں ہوں ..... صبح بات کرنا ..... یار میرے بھتیجے اور اس کی بیوی کو اغوا کر لیا گیا ہے..... پولیس..... ہاں، پولیس انہیں تلاش کر رہی ہے..... چلو، صبح بات ہو گی۔" اس نے سلسلہ منقطع کر کے ٹیلی فون جیب میں رکھ لیا۔ وہ لوگ مسلسل اغوا کرنے والے کے ٹیلی فون کا انتظار کر رہے تھے۔ وقت بھی گویا چیونٹی کی رفتار سے گزر رہا تھا۔

اس دوران میں غلام رسول دو دفعہ ان لوگوں کے لیے کافی لا چکا تھا۔

سردار جہانگیر نے کافی پیتے ہوئے بیگم شیرازی سے کہا۔ "بھابی! آپ کی طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں۔ اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں بھابی!" احسن نے کہا۔ "آپ کو ویسے بھی ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہے۔ آپ اپنے کمرے میں جا کر ..... آرام ....." یہ کہتے ہوئے وہ صوفے پر ایک طرف لڑھک گیا۔

"احسن!" شیرازی بے تاب ہو کر اس کی طرف لپکا اور اس کے چہرے پر ہلکے ہلکے تھپڑ مارنے لگا۔ "آنکھیں کھولو۔" پھر وہ بلند آواز میں بولا۔ "غلام رسول! ڈاکٹر کو ٹیلی فون کرو۔"

احسن مسلسل گہرے گہرے سانس لے رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

''یہ اپنے بھتیجے کو اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہے۔'' شیرازی نے سردار جہانگیر سے کہا۔ ''شاید اسی صدمے سے۔۔۔''

فوراً ہی ڈاکٹر بھی آ گیا۔ وہ نزدیک ہی بنگلے میں رہتا تھا۔ اس نے احسن کا معائنہ کیا اور بولا۔ ''انہیں کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے۔ میں انہیں انجکشن دے دیتا ہوں۔ انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔''

''صدمہ تو ہوگا ڈاکٹر صاحب!'' شیرازی نے جواب دیا۔ ''کسی نے میری بہو اور بیٹے کو اغوا کر لیا ہے۔''

''ارے، یہ کب ہوا؟''

''آج ہی۔'' شیرازی نے مختصر جواب دیا۔ ''آپ تو برسوں سے ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں۔ جانتے ہی ہوں گے کہ احسن، آصف کو کتنا چاہتا ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ویسے مجھے بھی اس خبر سے بہت صدمہ پہنچا ہے۔ اللہ اپنا رحم کرے شیرازی صاحب۔'' ڈاکٹر کچھ دیر رسمی باتیں کرنے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔

احسن کو ملازمین کی مدد سے اس کے بیڈ روم میں شفٹ کر دیا گیا۔ شیرازی اور سردار جہانگیر کے اصرار پر بیگم شیرازی بھی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

اغوا کرنے والے کے وقت کے مطابق ایک گھنٹا ہو چکا تھا لیکن ابھی تک ٹیلی فون خاموش تھا۔ پھر پچیس منٹ مزید گزر گئے۔

اچانک شیرازی کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شیرازی نے چونک کر سینٹرل ٹیبل پر پڑا ہوا سیل فون اٹھایا اور نمبر دیکھ کر کچھ الجھ گیا اور بڑبڑایا۔ ''نہ جانے کس کا نمبر ہے؟''

''مجھے دیں سائیں۔'' سردار جہانگیر نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ انہی لوگوں کی کال ہوگی۔'' اس نے سیل فون شیرازی سے لے لیا اور اسے کان سے لگا کر بولا۔ ''ہیلو، کون بول رہا ہے؟''

''شیرازی؟'' دوسری طرف سے کسی نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، میں شیرازی بول رہا ہوں۔'' سردار جہانگیر نے کہا۔

''تم نے آخر میری بات نہیں مانی اور پولیس کو اطلاع دے دی۔'' دوسری طرف سے بولنے والے نے سندھی لہجے میں کہا۔

''پولیس کو اطلاع تمہاری کال آنے سے پہلے دی گئی تھی۔'' سردار جہانگیر نے سندھی میں کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو، پولیس کی بات چھوڑو۔ پولیس تو ویسے بھی ناکارہ ہے۔''

''ٹیلی فون شیرازی کو دو۔'' دوسری طرف سے کرخت لہجے میں کہا گیا۔ ''تم شیرازی نہیں ہو۔''

''شیرازی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ تم مجھ سے بھی بات کر سکتے ہو۔''

''اچھا؟'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''تو پھر سنو۔ ہمیں پندرہ کروڑ روپے ادا کرو اور اپنے بچوں کو لے جاؤ۔''

''پندرہ کروڑ؟'' سردار جہانگیر نے حیرت سے کہا۔

''اس لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تم ٹیلی فون شیرازی کو دو۔''

شیرازی نے سیل فون اس سے لے لیا اور بولا۔ ''ہاں، بولو۔''

''ہمیں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پندرہ کروڑ روپے چاہئیں۔''

''اتنی جلدی میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست کیسے کر سکتا ہوں؟'' شیرازی نے کہا۔

''یہ بات تم کہہ رہے ہو؟'' دوسری طرف سے طنزیہ لہجے میں کہا گیا۔ ''شکر کرو، میں نے تم سے تیس کروڑ نہیں مانگے ورنہ تم وہ بھی دے سکتے ہو۔''

''میں پندرہ کروڑ روپے دے سکتا ہوں لیکن یہ چوبیس گھنٹے میں ممکن نہیں ہے۔''

''بابا! کچھ بھی کرو، ہمیں چوبیس گھنٹوں کے اندر رقم چاہیے ورنہ اپنے بچوں کو بھول جاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسی وقت پھر شیرازی کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے چونک کر اسکرین کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ''ہیلو.... جی آئی جی صاحب! ہاں ان لوگوں کی کال آئی تھی۔ میرے سیل فون پر کال کی تھی ان لوگوں نے۔ ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں۔''

''کیا کہہ رہا تھا آئی جی؟'' سردار جہانگیر نے پوچھا۔

''وہ کہہ رہا تھا کہ میں نے آپ کے تینوں لینڈ لائن نمبر آبزرویشن پر لگا دیے ہیں۔ اب مجھے آپ کے گھر کے تمام سیل فون بھی آبزرویشن پر لگانا پڑیں گے۔ وہ ابھی کچھ دیر میں یہاں پہنچ رہا ہے۔''

اسی وقت بیگم شیرازی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں اور بولیں۔ ''بچوں کا کچھ پتا چلا؟''

''ہاں ان لوگوں کا ٹیلی فون آیا تھا۔ آصف اور ثمرہ خیریت سے ہیں۔'' سردار جہانگیر جلدی سے بولا۔ ''ان

لوگوں کو تاوان چاہیے بھابی! ایسے لوگ صرف تاوان لیتے ہیں، کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔'' یہ بات کہتے ہوئے سردار جہانگیر کا لہجہ کھوکھلا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بعض اوقات اغوا کنندگان تاوان لینے کے بعد بھی مغویوں کو زندہ نہیں چھوڑتے لیکن سب معاملات میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس نے تمام منفی خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ داماد کے ساتھ ساتھ اس کی بیٹی کی زندگی بھی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

''ان لوگوں نے کتنا تاوان مانگا ہے؟'' بیگم شیرازی نے پوچھا۔ ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر بھی سوئی نہیں ہیں بلکہ جاگتی رہی ہیں۔

''وہ لوگ پندرہ کروڑ مانگ رہے ہیں۔'' شیرازی نے کہا۔

''تو دے دیں۔'' بیگم شیرازی نے کہا۔ ''پندرہ کروڑ بچوں کی جان سے زیادہ تو نہیں۔''

''بھئی وہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر رقم مانگ رہے ہیں۔ اتنی جلدی میں رقم کیسے دے سکتا ہوں۔ میں نے کل ہی تو ایک پارٹی کو بیس کروڑ کی پے منٹ کی ہے۔ کچھ پارٹیز کی طرف سے پیسا آتا ہے لیکن اتنی جلدی تو نہیں آئے گا۔ میرے ذاتی اکاؤنٹ میں مشکل سے پانچ چھ کروڑ ہوں گے۔''

''بات پیسے کی نہیں ہے سائیں۔'' سردار جہانگیر نے کہا۔ ''پندرہ کروڑ تو میں بھی دے سکتا ہوں۔ پہلے یہ تو معلوم ہو کہ وہ پیسے کہاں لیں گے اور بچوں کو کہاں پہنچائیں گے۔''

اسی وقت احسن اوپر سے نیچے کی طرف آیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس نے بھی شاید ان لوگوں کی باتیں سن لی تھیں۔ اس نے کہا۔ ''بھائی جان! پیسوں کی فکر نہ کریں۔ دس بارہ کروڑ تو میرے اکاؤنٹ میں بھی ہیں۔''

اسی وقت غلام رسول نے آ کر بتایا کہ آئی جی صاحب آئے ہیں۔

''تو انہیں اندر لے آؤ۔'' شیرازی نے ناگواری سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد آئی جی اندر داخل ہوا اور بولا۔ ''شیرازی صاحب! آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن مجھے آپ کا ایک کمرا چاہیے۔''

''کمرا چاہیے؟'' احسن نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، میں اس کمرے میں اپنا مانیٹرنگ سیل لگاؤں گا۔ مانیٹرنگ اور آئی ٹی کی ٹیم میرے ساتھ ہے۔ ہماری گاڑی میں تمام ضروری سامان موجود ہے۔''

''آئیے، میں آپ کو کمرا دکھا دوں۔'' شیرازی نے اٹھتے ہوئے کہا اور آئی جی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

''جہانگیر بھائی! پولیس کی وجہ سے کہیں وہ لوگ آصف اور ثمرہ کو نقصان نہ پہنچا دیں۔'' بیگم شیرازی نے کہا۔

''انہیں کیسے معلوم ہوگا کہ پولیس کیا کر رہی ہے۔ اور یہ کراچی ہے۔'' جہانگیر نے کہا۔

''ان لوگوں کو سب معلوم ہو جاتا ہے سردار صاحب۔'' احسن نے کہا۔ ''کسی بھی اغوا کی واردات سے پہلے اچھی طرح معلومات کرتے ہیں۔ مغویوں کے معمولات معلوم کرتے ہیں، پورا ہوم ورک کرنے کے بعد ہی واردات کرتے ہیں۔ مجھے تو شبہ ہے کہ ہمارے اردگرد بھی ان لوگوں کا کوئی مخبر موجود ہے۔''

''پولیس سب کچھ معلوم کر لے گی۔'' سردار جہانگیر نے کہا۔ ''رات تو آئی جی صاحب اپنے دوسرے انتظامات میں مصروف تھے، ابھی وہ گھر کے دوسرے ملازمین کے بیانات بھی لیں گے۔''

تھوڑی دیر بعد آئی جی اور شیرازی واپس ڈرائنگ روم میں آئے۔ شیرازی نے آئی جی سے کہا۔ ''آپ فکر مت کریں۔ میں دس منٹ کے اندر اندر اس کمرے سے تمام سامان ہٹوا دوں گا۔'' پھر وہ بیگم شیرازی سے بولے۔ ''میں نے اس مقصد کے لیے انہیں گیسٹ روم دے دیا ہے۔ وہ کمرا خاصا کشادہ ہے۔ میں نے غلام رسول سے کہہ دیا ہے کہ اسے ابھی خالی کرا دو۔ آئی جی صاحب وہاں اپنا مانیٹرنگ سیل بنائیں گے۔ ٹریکر لگائیں گے اور ریکارڈنگ کا بندوبست کریں گے۔''

''انسپکٹر اکرام یہاں رہے گا۔'' آئی جی نے کہا۔ ''وہ آئی ٹی اور ٹریکنگ کا ماہر ہے۔ آپ کے استعمال میں جتنے بھی سیل فونز ہیں، ان سب کے نمبر مجھے لکھوا دیں۔ میں وہ سارے نمبر آبزرویشن پر لگوا دوں گا اور ٹریکنگ کے ذریعے اغوا کرنے والوں کے ٹھکانے کی نشاندہی بھی ہو جائے گی۔''

غلام رسول، آئی جی کے لیے کافی بنا لایا تھا۔ آئی جی نے کافی ختم کی ہی تھی کہ ایک انسپکٹر نے آ کر اسے سیلوٹ کیا اور بولا۔ ''سر! مجھے وہ تمام ٹیلی فون نمبرز دے دیں جو آبزرویشن پر لگانا ہیں۔ میں ابھی دس منٹ میں کام شروع کر دوں گا۔''

شیرازی نے اپنا، اپنی بیگم، غلام رسول کا سیل نمبر ایک پیڈ پر لکھا، پھر اسے کچھ خیال آیا اور بولا۔ ''سردار صاحب! آپ بھی اپنا نمبر دے دیں۔ ممکن ہے وہ لوگ آپ سے بھی

رابطہ کریں۔ اور احسن تم بھی اپنا نمبر بتا دو۔" پھر وہ سر جھٹک کر بولے۔ "اوہو، میرا دماغ بھی ماؤف ہو رہا ہے۔ آپ لوگوں کے نمبرز میرے پاس بھی تو ہیں۔"

"ہوتا ہے سائیں، ہوتا ہے۔" سردار جہانگیر نے کہا اور اپنا نمبر بتا دیا۔ احسن نے بھی اپنا نمبر دہرا دیا۔

نمبروں کی وہ لسٹ آئی جی نے انسپکٹر کے حوالے کی پھر سردار جہانگیر سے بولا۔ "سر! میں کرائمز برانچ کے ایک ایس ایس پی کو یہ کیس دے چکا ہوں۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائے گا۔ بہت ہی ذہین اور اصول پسند آفیسر ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت سے کیس حل کر چکا ہے۔"

☆☆☆

وہ لوگ ایک ایسے کمرے میں قید تھے جس کی دیواریں پختہ اینٹوں کی تھیں لیکن چھت شہتیروں کے ذریعے مٹی اور گارے سے بنائی گئی تھی۔ کمرے میں صرف ایک ہی دروازہ تھا جسے ان لوگوں نے بند کر دیا تھا۔ کمرے کا فرش بھی کچا تھا۔ اس پر پال بچھا ہوا تھا۔ پال کے اس ڈھیر پر ان لوگوں نے میلی سی ایک دری ڈال دی تھی۔ ان لوگوں نے اب تک وہی سینڈوچز اور برگر وغیرہ کھائے تھے جو کراچی سے اپنے ساتھ لے کر چلے تھے۔ تھرمس میں تھوڑی سی کافی بھی تھی۔ آصف کو اب بھوک لگ رہی تھی۔ ثمرہ کا حال تو اس سے بھی برا تھا۔ اس نے تو اس وقت بھی ایک سینڈوچ ہی کھایا تھا۔

"آصف!" ثمرہ نے کہا۔ "کیا یہ لوگ ہمیں مار دیں گے؟"

"ان کی ہم سے کیا دشمنی ہے جو یہ ہمیں مار دیں گے؟"

"تو پھر ہمیں یہاں اس طرح کیوں لائے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ ان لوگوں نے ہمیں تاوان کے لیے اغوا کیا ہے۔ یہ ڈیڈ سے رقم کا مطالبہ کریں گے، پھر پیسے لے کر ہمیں چھوڑ دیں گے۔"

"ٹائم کیا ہوا ہے؟" ثمرہ نے پوچھا۔

"میرے ہاتھ تو پشت کی طرف بندھے ہیں۔ میں ٹائم کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت رات کے دو تو بج ہی چکے ہوں گے۔"

"اگر ایسی بات ہوتی تو یہ اب تک ان سے کیش کی ڈیمانڈ کر چکے ہوتے۔" ثمرہ نے کہا۔ "ابھی تک تو انہوں نے کوئی ڈیمانڈ کی نہیں ہے۔"

"ہمیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ڈیمانڈ کی ہے یا نہیں۔" آصف نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "یہ پتا نہیں کون سی جگہ ہے..... ان کی گاڑی میں ہم نے پانچ چھ گھنٹے کا سفر تو کیا ہوگا۔"

"مجھے تو یہ کوئی جنگل لگتا ہے۔" ثمرہ نے کہا۔ "دیکھا نہیں تھا کہ گاڑی کیسے اونچے نیچے اور ناہموار راستوں پر چل رہی تھی؟"

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور سفید شلوار قمیص میں ملبوس ایک شخص اندر داخل ہوا۔ وہ اپنے چہرے اور چال ڈھال سے... پڑھا لکھا اور معقول آدمی لگ رہا تھا۔ اس کا رنگ گورا تھا اور بالوں کی رنگت براؤن تھی۔ اس کے پیروں میں چمڑے کی... قیمتی چپل تھی جس میں سے اس کے صاف ستھرے پاؤں جھانک رہے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شخص خاصا نفیس ہے۔

اس نے کمرے میں داخل ہو کر اپنی جیب سے کسی غیر ملکی برانڈ کا سگریٹ نکالا اور اسے قیمتی لائٹر سے سلگا کر منہ سے دھواں خارج کرتے ہوئے بولا۔ "آپ لوگوں کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

اسی وقت کمرے میں جانو داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں حسبِ معمول کلاشنکوف تھی۔

"ہاں، ہم تو یہاں بہت عیش و آرام سے ہیں۔ فائیو اسٹار ہوٹل کے مزے لوٹ رہے ہیں۔"

"کیا میرے آدمیوں نے آپ لوگوں کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے؟" وہ معصومیت سے بولا۔

"کوئی زیادتی نہیں کی..... بس میری کمر پر دس بارہ لاتیں ماری ہیں، منہ پر کئی زوردار تھپڑ مارے ہیں، گالیاں دی ہیں اور مجھے باندھ کر یہاں ڈال دیا ہے۔ میری بیوی کے ساتھ بھی ان لوگوں نے بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ اس کے بال پکڑ کے گھسیٹا ہے، اسے دھکے دیے ہیں، اسے نازیبا الفاظ سے نوازا ہے اور اس کے منہ پر بھی دو چار تھپڑ مارے ہیں..... بس اس کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔"

"زیادہ طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ معقول نظر آنے والا شخص اچانک درشت لہجے میں بولا اور اس کا نرم چہرہ کرخت ہو گیا۔ "تم لوگ تو شکر کرو کہ میرے آدمیوں نے تم پر تشدد نہیں کیا۔ تمہیں گاڑی میں یہاں تک لائے ورنہ ہم مغویوں کو میلوں اونچے نیچے راستوں پر پیدل چلاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ذرا بھی سستی دکھائے تو اس کی کمر پر رائفل کا بٹ پڑتا ہے۔ تمہارے ساتھ تو کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ ہاں، اگر تم اسی طرح بکواس کرتے رہے تو تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا جو دوسروں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔"

"تم نے میرے ڈیڈ سے کتنا تاوان مانگا ہے؟"

"میں نے ان سے صرف پندرہ کروڑ مانگے ہیں۔ اگر انہوں نے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہماری ڈیمانڈ پوری نہ کی تو پھر تمہاری زندگیوں کی بھی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔"

اس نے کلائی پر بندھی ہوئی قیمتی گھڑی میں وقت دیکھا پھر جیب سے... سیل فون نکال کر اس میں دوسری سم ڈالی اور کوئی نمبر ڈائل کر دیا۔ دوسری طرف سے شاید فوراً ہی ریسیور اٹھا لیا گیا تھا۔ "ہیلو شیرازی! پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟ رقم کب تک دے رہے ہو؟" کیا..... بکواس کرتے ہو تم..... اس رقم کی تمہارے لیے کیا حقیقت ہے؟ یہ بہت پرانے بہانے ہیں سیٹھ صاحب..... اچھا..... چلو، میں تمہیں ایک دن کی مہلت اور دیتا ہوں..... اچھا، کل ہفتہ ہے..... پھر تو بات پیر پر گئی..... اتنا وقت کیسے دے دوں..... اچھا..... اس کی ایک شرط ہے..... لیٹ فیس..... ایک کروڑ روپیا..... لیکن اس پر زیادہ مہلت نہیں ملے گی..... اس وقت تک بندوبست نہ ہو تو اپنے بچوں کی لاشیں اٹھا لینا..... انہیں قومی شاہراہ پر کہیں بھی پھینک دوں گا..... میں تمہیں اتوار کی رات کو کال کروں گا۔ اسی وقت بتاؤں گا کہ تمہیں رقم کہاں پہنچانا ہے اور تمہارا بیٹا اور بہو تمہیں کہاں سے ملیں گے..... ہاں، دونوں خیریت سے ہیں..... لو بات کرو۔" اس نے سیل فون آصف کے کان سے لگا دیا۔

"ہیلو ڈیڈ!" آصف نے کہا۔

"ہیلو بیٹا! تم خیریت سے تو ہو نا؟"

"جی ڈیڈ! میں خیریت سے ہوں۔" آصف نے کہا۔

"ان لوگوں نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں دی نا؟"

"نہیں..... ڈیڈ ہم لوگ..... بہت آرام سے ہیں۔" آصف نے کہا۔

"ثمرہ کہاں ہے؟" شیرازی نے پوچھا۔

"وہ بھی یہیں میرے ساتھ ہے۔"

"ذرا ثمرہ سے بات کرا دو..... سردار صاحب اس سے بات کریں گے۔"

"میں ان لوگوں سے....."

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ سفید کپڑوں والے نے اسی وقت سیل فون اس کے کان سے ہٹا دیا تھا۔

"میری بیوی کی بات بھی کرا دو..... اس کے بابا بھی وہاں موجود ہیں۔"

"یہ کوئی پی سی او نہیں ہے۔" جانو غرا کر بولا۔

"جانو! اس لڑکی کی بات بھی کرا دے۔" اس شخص نے کہا۔ "اس کا باپ بھی بہت بے چین ہے۔"

جانو نے سیل فون ثمرہ کے کان سے لگایا اور اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے گن اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔

"ہیلو بابا!" ثمرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا پھر وہ بری طرح رونے لگی۔

"رومت بیٹا!" سردار جہانگیر نے کہا۔ "ابھی تیرا باپ زندہ ہے۔ مجھے ایک دفعہ معلوم ہو جائے کہ یہ کس علاقے کے ڈاکو ہیں تو میں انہیں زمین کی تہ میں سے بھی کھود کر نکال لوں گا۔"

"بابا سائیں....."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی جانو نے سیل فون اس کے کان سے ہٹا دیا اور دوبارہ سفید پوش کو دے دیا۔

"ہاں شیرازی! اچھا، تم جہانگیر بول رہے ہو؟ بس اب میں لائن کاٹ رہا ہوں، کل کسی وقت کال کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور سیل فون میں سے وہ سم نکال کر دوسری سم لگالی۔ پھر وہ جانو سے بولا۔ "اڑے بابا! ان لوگوں کو کھانے کو کچھ دے دو۔ صبح سے بھوکے ہیں۔ چائے بھی بنا لینا۔ میں اب صبح آؤں گا۔"

"جی سائیں۔" جان محمد نے مؤدب لہجے میں کہا۔

سفید پوش وہاں سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر اکرم بہت پُرجوش انداز میں اندر داخل ہوا اور بولا۔ "سر! ابھی جو ٹیلی فون کال آئی تھی، وہ اس حد تک ٹریس ہو گئی ہے کہ اغوا کرنے والے سندھ ہی میں ہیں۔ وہ دوبارہ کال کریں گے تو لوکیشن مزید واضح ہو جائے گی۔"

"سندھ تو بہت بڑا ہے۔" سردار جہانگیر نے سرد لہجے میں کہا۔ "یہ تو ہم بغیر ٹریکنگ کے بھی بتا سکتے ہیں کہ وہ لوگ سندھ میں کہیں ہیں۔"

"سر! ابھی کچھ واضح نہیں ہے۔ موسم بھی خراب ہے۔ کبھی سگنل آ رہے تھے، کبھی نہیں آ رہے تھے۔ وہ لوگ کسی ایسے علاقے میں ہی ہو سکتے ہیں جو سندھ کے نزدیک ہو جیسے رحیم یار خان، صادق آباد۔"

"ٹھیک ہے۔" سردار جہانگیر نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم جا کر اپنے آلات کو سیٹ کرو اور کال ریکارڈ ضرور کرنا۔"

"ریکارڈنگ تو میں نے کر لی ہے۔" انسپکٹر نے کہا اور سردار جہانگیر کو سلام کر کے وہاں سے چلا گیا۔

"سردار صاحب!" شیرازی نے کہا۔ "آپ کئی گھنٹے

سے ایک جگہ بیٹھے ہیں۔ اب تھوڑی دیر آرام کرلیں۔'' پھر شیرازی نے غلام رسول کو آواز دی۔ ''غلام رسول! سردار صاحب کے لیے وہ کونے والا بیڈروم سیٹ کردو۔''

''وہ تو میں نے پہلے ہی تیار کردیا ہے سر۔'' غلام رسول نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے کمرے میں ہیٹر بھی چلا دیا ہے اور اسپرے بھی کردیا ہے۔''

''آیئے سردار صاحب!'' شیرازی نے کہا۔

''آپ بھی آرام کرلیں۔'' سردار جہانگیر نے کہا۔ ''کیا آپ یہیں بیٹھے رہیں گے؟''

''نہیں، اب میں بھی آرام کروں گا۔'' شیرازی نے کہا۔ ''جو ہوگا، اللہ مالک ہے۔ بیگم کو تو میں نے خواب آور دوا دے کر سلا دیا ہے۔ احسن کو بھی سونے کے لیے زبردستی بھیج دیا ہے۔ میرے تینوں ٹیلی فونز کا ایکسٹینشن میرے بیڈروم میں بھی ہے۔ اگر اب ان لوگوں میں سے کسی کی کال آئی تو میں اسے بیڈروم ہی میں ریسیو کرلوں گا۔ میرا سیل فون بھی میرے پاس ہے۔''

شیرازی نے سردار جہانگیر کو رخصت کیا اور خود بھی اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ پولیس کو پہلے سے اطلاع کیوں نہیں دی۔ پھر اسے اس ایس ایس پی کا خیال آیا جسے آئی جی صاحب یہاں بھیجنے والے تھے۔ اب تک وہ یہاں نہیں پہنچا تھا۔

اسے خود بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے خواب آور دوا کی ایک گولی پانی سے نگلی اور کمرے کی لائٹ آف کرکے نائٹ بلب آن کردیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے خراٹے گونجنے لگے۔

☆☆☆

خواب آور دوا کھانے کے باوجود ان سب کی آنکھ صبح سات بجے ہی کھل گئی تھی۔ شیرازی کے اصرار پر سردار جہانگیر نے الٹا سیدھا ناشتا کیا اور کافی کا کپ لے کر شیرازی کے ساتھ لاؤنج میں آگیا۔

اسی وقت دروازے پر ایک جیپ آکر رکی لیکن گارڈ نے اسے اندر نہیں آنے دیا۔ آنے والا جیپ سے اتر کر اندر آیا اور سردار جہانگیر سے لپٹ گیا پھر وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ ''یہ کیا ہوگیا چاچا سائیں؟ آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں۔''

''تمہیں بتاتا تو تم کون سا تیر مار لیتے؟'' سردار جہانگیر نے سرد لہجے میں کہا۔ پھر وہ شیرازی سے مخاطب ہوا۔ ''یہ میرا بھتیجا مکرم ہے۔''

اس نے شیرازی کو سلام کیا۔ شیرازی نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''تم سے تو ایک دو دفعہ پہلے بھی ملاقات ہوچکی ہے۔''

''چاچا سائیں! کچھ معلوم ہوا کہ ثمرہ اور ادا آصف کہاں ہیں؟'' مکرم نے پوچھا۔

''بابا، معلوم ہوتا تو ہم یہاں ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہ بیٹھے ہوتے۔'' سردار جہانگیر نے بیزاری سے کہا۔ اس کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مکرم کو پسند نہیں کرتا۔

''چاچا سائیں! میرے ساتھ میرا ایک دوست بھی ہے۔ میں اسے چھوڑ کر ابھی آتا ہوں۔''

''ہاں بابا جاؤ۔'' سردار جہانگیر نے یوں کہا جیسے کہہ رہا ہوں ''دفع ہو جاؤ۔''

مکرم ہاں سے چلا گیا۔

گاؤں میں رہنے کے باوجود وہ اس وقت جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے بہت نفیس جیکٹ پہن رکھی تھی اور جیکٹ کے نیچے کا ابھار بتا رہا تھا کہ اس نے بغلی ہولسٹر لگا رکھا ہے۔

اس کے جانے کے بعد شیرازی نے کہا۔ ''سردار صاحب! اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک بات پوچھوں؟''

''سائیں! آپ کی بات کا میں برا کیوں مانوں گا؟'' سردار جہانگیر نے کہا۔

''یہ مکرم آپ کے سگے بھائی کا بیٹا ہے؟''

''ہاں، یہ نکما میرے سگے بھائی کا بیٹا ہے۔'' سردار جہانگیر نے کہا۔ ''اور بھائی کے انتقال کے بعد اس نے اپنے حصے کی پوری جائداد ریس کے گھوڑوں اور جوئے میں اڑا دی۔ اب دو ڈھائی سو ایکڑ زمین رہ گئی ہے جو بھاجائی کے نام ہے ورنہ یہ تو اسے بھی ٹھکانے لگا دیتا۔ کام کاج کا نہیں اور خود کو بہت بڑا جاگیردار سمجھتا ہے۔''

''سردار صاحب! اس کے حصے کی زمین بھی اتنی ہی ہو گی جتنی آپ کے پاس ہے؟'' شیرازی نے پوچھا۔

''اس کے پاس تو اس سے بھی زیادہ زمین تھی۔ ادا سائیں کا انتقال دس سال پہلے ہوا تھا۔ اس وقت یہ مشکل سے سترہ، اٹھارہ سال کا ہوگا۔ اس نے صرف دس سال میں اپنی جائداد ٹھکانے لگا دی۔ وہ تو غنیمت ہے کہ اس کے حصے کی بہت سی زمین میں نے خرید لی تھی۔ اب میں ہی اس کے تمام اخراجات پورے کرتا ہوں لیکن عیاشی کے لیے ایک پیسا بھی نہیں دیتا۔ میں نے بھاجائی کو بھی سختی سے منع کردیا ہے کہ وہ اسے فضول خرچی کے لیے ایک پیسا بھی نہ دیں۔''

☆☆☆

مکرم اپنے دوست مراد کے ساتھ وہاں سے سیدھا سردار جہانگیر کے بنگلے پر پہنچا۔ مراد بھی اسی کی طرح ایک زمیندار کا بیٹا تھا لیکن اس کا باپ ابھی زندہ تھا اور اتنا بڑا زمیندار بھی نہیں تھا۔ مکرم اسی کے ساتھ رہ کر بری صحبت میں پڑا تھا۔ مراد کے تعلقات اچھے لوگوں سے نہیں تھے۔ بعض اوقات تو اسے علاقے کے بدنام ترین لوگوں کے ساتھ بھی دیکھا گیا تھا۔

مکرم نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یار مراد! عیش کر، اپنا ہی گھر ہے۔''

''یہاں پینے کو تو کچھ ملے گا نہیں۔''

''میں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔ جا گاڑی میں سے بوتل لے آ۔''

''ویسے یار! تو اب بے فکر ہو جا۔ چاچا سائیں کی جائداد بھی اب تیری ہے اور یہ گھر بھی تیرا ہوگا۔'' مراد نے ہنس کر کہا۔

''تو کہنا کیا چاہتا ہے مراد! صاف صاف بات کر۔'' مکرم نے کہا۔

''دیکھ، اب ثمرہ تو رہی نہیں۔ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ تیرے چاچا سائیں کا کوئی بیٹا بھی نہیں ہے تو پھر یہ جائداد، یہ دولت، یہ گھر کس کا ہوا؟''

مکرم چند لمحے تک اسے گھورتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔ ''مراد! سچ سچ بتا، کہیں اس واردات میں تیرا ہاتھ تو نہیں ہے؟''

''یار مکرم! تو کسے بے وقوف بنا رہا ہے؟ مجھے یا اپنے آپ کو۔''

''اچھا، آہستہ بول۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' مکرم نے جلدی سے کہا اور بولا۔ ''جا، جیپ سے بوتل نکال لا۔''

''اپنی باری آئی تو دیواروں کے بھی ناک کان ہونے لگے۔'' مراد نے ہنس کر کہا۔ ''ویسے ایک بات بتا دوں، میں بھی تیرے ساتھ پھر کوئی کاروبار کروں گا۔''

''یار! دادا مریں گے تو پھل بٹیں گے نا۔'' مکرم ہنس کر بولا۔ ''ابھی تو ثمرہ بھی زندہ ہے اور چاچا سائیں بھی۔'' پھر وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''لیکن ثمرہ بچے گی نہیں۔''

مراد جیپ سے بوتل لینے چلا گیا۔

ان دونوں کو یہ خوف تو تھا نہیں کہ سردار جہانگیر یہاں آئے گا۔ وہ تو شیرازی کے گھر میں ڈیرا جمائے بیٹھا تھا اس لیے دونوں دوست خوب کھل کر پی رہے تھے اور ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ گھر کے تمام ملازمین بھی سردار جہانگیر کے گاؤں کے تھے اور مکرم کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر انہوں نے مکرم کی شراب نوشی کے بارے میں بڑے سائیں کو بتایا تو مکرم بعد میں کسی نہ کسی بہانے سے ان کی چمڑی ادھیڑ دے گا اس لیے بھی سہمے سہمے رہتے تھے اور اس کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ اس وقت بھی وہ لوگ مکرم اور مراد کے لیے خشک میوے، اور تلے ہوئے کاجو اور بادام لا رہے تھے۔ ایک ملازم ان کے لیے چکن بروسٹ کر رہا تھا۔

☆☆☆

ایس ایس پی خرم کرائمز برانچ کا بہت ذہین اور سخت گیر آفیسر تھا۔ جرائم پیشہ افراد تو اس کے نام ہی سے کانپتے تھے۔ وہ سیدھا شیرازی کے بنگلے پر اس لیے نہیں پہنچا تھا کہ پہلے وہ اس جگہ کا جائزہ لینے گیا تھا جہاں آصف کی گاڑی پائی گئی تھی۔ بارش کی وجہ سے وہاں پجارو کے ٹائروں کے نشانات بھی تھے۔ جو کچے سے مڑ کر سیدھی سڑک پر گئی تھی۔

''سر!'' اس کے ایک ماتحت انسپکٹر اقبال نے کہا۔ ''لگتا ہے اغوا کنندگان ان لوگوں کو لے کر سیدھے نکل گئے ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ لوگ اب تک سندھ کی حدود سے باہر جاچکے ہوں گے۔''

''تم فکر مت کرو۔'' خرم نے کہا۔ ''میرے پاس وفاقی سیکریٹری داخلہ کا خصوصی اجازت نامہ بھی ہے۔ میں پاکستان کے کسی بھی حصے میں ملزمان کے خلاف کارروائی کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنا یہ اختیار دو مرتبہ پہلے بھی استعمال کیا ہے اور اب ....'' وہ بولتے بولتے رک گیا۔

اس کی نظریں سڑک کی مخالف سمت تھیں۔ وہ بہت غور سے اس طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ سڑک پار کرکے دوسری طرف چلا گیا اور وہاں ٹائروں کے نشانات کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ نشانات بھی بالکل ویسے ہی تھے جیسے اس پجارو کے تھے جس میں مبینہ طور پر آصف اور ثمرہ کو اغوا کیا گیا تھا۔

وہ نشانات کچے میں ایک نیم دائرے کی شکل میں جاکر دوبارہ پختہ سڑک کی طرف مڑ گئے تھے۔

''کوئی خاص بات سر!'' انسپکٹر اقبال نے پوچھا۔

''ہاں، وہ پجارو یہاں سے سیدھی نہیں گئی ہے بلکہ یو ٹرن لے کر واپس گئی ہے۔ پجارو کا ڈرائیور یا تو نشے میں تھا یا بہت زیادہ ترنگ میں تھا اس لیے اس نے یو ٹرن لیتے وقت کچھ زیادہ ٹرن لے لیا ورنہ عموماً پجارو کا یو ٹرن اتنا لمبا نہیں

ہوتا پھر اس سے اچانک واپس مڑنے کو کہا گیا ہوگا۔"

"سر! لگتا تو ایسا ہی ہے۔ نشانات بالکل ویسے ہی ہیں جیسے سڑک کے دوسری طرف ہیں۔"

"تو پھر واپس چلو، ہم دیکھیں گے کہ پجارو کس طرف گئی ہے۔ کل کی بارش نے ہماری مشکل بہت آسان کر دی ہے۔ گاڑی بہت سست رفتاری سے چلانا تاکہ میں نشانات پر نظر رکھ سکوں۔"

"لیکن سر! آپ اس پختہ سڑک پر نشانات کیسے تلاش کریں گے؟"

"اقبال! تمہیں پولیس میں ملازمت کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟" خرم نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"سترہ سال ہوگئے ہیں سر!" اقبال نے جواب دیا۔

"اور میرے ساتھ کب سے کام کر رہے ہو؟" خرم نے پوچھا۔ اس کی نظریں سڑک کے ساتھ ساتھ کچی زمین پر تھیں جہاں اِکا دُکا ٹائروں کے نشانات تھے۔

"سر! میں گزشتہ تین سال سے آپ کے ساتھ ہوں۔"

"پھر بھی ایسی احمقانہ بات کر رہے ہو؟" خرم نے سرد لہجے میں کہا۔ "وہ گاڑی واپس کراچی کی طرف تو گئی نہیں ہو گی، دائیں بائیں کسی طرف مڑی ہوگی۔ وہ گاڑی جہاں سے کچے کی طرف گئی ہوگی، ادھر بھی اسی قسم کے نشانات ہوں گے۔ اگر بارش نہ ہوئی ہوتی تو ٹائروں کے نشانات ملنا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور تھا۔ پرانے وقتوں میں کھوجی ہوا کرتے تھے جو چور کا کھرا دیکھتے ہوئے اس کے ٹھکانے پر پہنچ جاتے تھے۔"

"سر! وہ تو اپنے فن میں ماہر ہوتے تھے۔ دس افراد کے قدموں کے درمیان بھی اپنے مطلوبہ شخص کا کھرا پہچان لیتے تھے۔" اقبال نے کہا اور سست رفتاری سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

وہ خرم کی ہدایت کے مطابق اپنی طرف کی کچی زمین کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے ایک جگہ گاڑی روک دی۔ خرم نے چونک کر اسے دیکھا۔

"سر! مجھے اس طرف کسی گاڑی کے ٹائروں کے نشانات نظر آرہے ہیں۔"

خرم اس کے ساتھ اتر کر سڑک کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی سوچ میں اتنا گم تھا کہ اگر اس سے ایک لمحے کی بھی غلطی ہو جاتی تو وہ مخالف سمت سے آنے والی تیز رفتار کار سے ٹکرا جاتا۔ گاڑی ... زناٹے سے اس کے سامنے سے گزر گئی۔

وہ دونوں چند لمحے ساکت کھڑے رہے پھر خرم ان نشانات کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے غور سے نشانات کا جائزہ لیا اور بولا۔ "یہ پجارو کے ٹائروں کے نشانات نہیں ہیں۔ یہ غالباً ٹویوٹا کرولا یا ہنڈا سوک کے ٹائروں کے نشانات ہیں۔"

اقبال کچھ مایوس سا ہوگیا۔

وہ دونوں پھر گاڑی میں سوار ہو گئے اور اقبال سست رفتاری سے گاڑی چلانے لگا۔

اس مرتبہ خرم اور اقبال دونوں ہی کی نظر ٹائروں کے نشانات پر پڑی۔ اقبال نے فوراً گاڑی روک دی اور وہ دونوں اس مرتبہ بہت احتیاط سے سڑک کی دونوں طرف دیکھ کر آگے بڑھے۔

نشانات دیکھتے ہی خرم نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "یہ اسی پجارو کے نشانات ہیں۔ یہ دیکھو ..... پجارو کے بائیں طرف کے اگلے ٹائر میں ہلکا سا ٹک لگا ہوا ہے۔ ایسا نشان وہاں بھی تھا جہاں ان لوگوں نے گاڑی ترچھی کر کے روکی تھی اور ایسا نشان سڑک کی دوسری طرف بھی تھا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "یہاں سے ایک راستہ اندر کی طرف بھی جا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ پجارو اسی کچے راستے سے اندر کی طرف گئی ہے۔"

"جی سر! لگتا تو یہی ہے۔" اقبال نے کہا۔

وہ دونوں مزید آگے بڑھے تو ان کے چہرے مایوسی سے لٹک گئے۔ آگے زمین خاصی نشیبی تھی اور دور تک پانی بھرا ہوا تھا۔ اس پانی میں ٹائروں کے نشانات تلاش کرنا ناممکن تھا لیکن خرم ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔

وہ دونوں گھٹنے گھٹنے پانی میں کافی دور تک چلتے رہے پھر جب وہ آدھ گھنٹے بعد پانی سے باہر نکلے تو وہاں دور تک بجری پھیلی ہوئی تھی۔ بجری پر ٹائروں کے نشانات معدوم ہو گئے تھے لیکن خرم کسی سراغ کی امید میں آگے بڑھتا رہا۔

مزید آدھ گھنٹے چلنے کے بعد وہ بھی مایوس ہوگیا کیونکہ اس بجری کے بعد پھر نشیبی زمین تھی جہاں خاصا پانی کھڑا تھا۔

وہ کچھ سوچ کر اقبال سے بولا۔ "چلو، واپس چلو۔ میں اس کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکال لوں گا۔ بہرحال، ہمیں یہ تو یقین ہوگیا کہ اغوا کنندگان اسی طرف گئے ہیں اور وہ ابھی سندھ کی حدود سے باہر نہیں نکلے۔"

وہ دونوں وہاں سے کپڑے تبدیل کرنے اپنے اپنے گھر گئے تھے اور اب وہ شیرازی اور سردار جہانگیر کے سامنے بیٹھے تھے۔

"تم نے کیا تفتیش کی ایس ایس پی صاحب؟" سردار جہانگیر نے پوچھا۔

"سر! جب تک میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں آتا، اس وقت تک میں کسی کو بھی کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔" خرم نے مؤدب لیکن سرد لہجے میں کہا۔

وہ ابھی یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ اس نے اغوا کرنے والوں کے ممکنہ ٹھکانے کا کسی حد تک سراغ لگا لیا ہے۔ اس نے اقبال کو بھی سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ کسی بھی کیس کے سلسلے میں جب تک کوئی ٹھوس ثبوت ہاتھ نہ آئے، کوئی قیاس آرائی نہ کی جائے۔ اس سے ایک طرف تو وہ مزید سوالات سے بچ جاتا تھا، دوسری طرف ملزم بھی اس بات سے بے خبر رہتے تھے کہ پولیس کی تحقیقات کس مرحلے میں ہے۔

پھر اس نے شیرازی سے کہا۔ "سر! آپ کے گھر میں جتنے ملازمین ہیں، انہیں یہاں بلالیں۔ میں ان سے فرداً فرداً بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"غلام رسول!" شیرازی نے بلند آواز میں کہا۔ غلام رسول بوتل کے جن کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ "گھر میں جتنے بھی ملازم ہیں، انہیں لان میں اکٹھا کر لو۔ ڈرائیور، مالی، خانساماں سب کو بلالو۔"

تھوڑی دیر بعد لان میں شیرازی صاحب کے بنگلے کے تمام ملازمین ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔

"تم یہاں کیا کرتے ہو؟" ایس ایس پی خرم نے غلام رسول سے پوچھا۔

"میں بھی صاحب کا خدمت گار ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر تم بھی وہاں جا کر کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے درشت لہجے میں کہا۔

"میں؟" غلام رسول نے حیرت سے پوچھا۔ "میں بھی ....."

"ہاں، تم بھی۔" خرم کا لہجہ مزید درشت ہوگیا۔

غلام رسول نے ایک نظر شیرازی کی طرف دیکھا پھر پیر پٹختا ہوا وہ بھی ان ملازموں کی صف میں شامل ہوگیا۔

"ایس ایس پی صاحب!" شیرازی نے کہا۔ "غلام رسول ہمارا بہت پرانا ملازم ہے۔ یہ سمجھئے کہ یہ گھر کے ایک فرد کی طرح ہے۔"

"بیان تو سر سبھی کا لینا پڑے گا۔ آپ پلیز، مجھے اپنے طور پر تفتیش کرنے دیں۔" اس نے کہا۔

شیرازی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سردار جہانگیر نے اسے اشارے سے روک دیا۔

"آپ صبح سے مسلسل کام کر رہے ہیں۔" شیرازی نے کہا۔ "پہلے ایک کپ کافی یا چائے پی لیں تاکہ آپ کی تھکن بھی اترے اور جھنجلاہٹ بھی ختم ہو۔"

"میں کام کر کے کبھی نہیں تھکتا۔" خرم نے کہا۔ "ورنہ اب تک اپنے کسی دشمن کی گولی کا نشانہ بن گیا ہوتا یا پھر پولیس لائن میں بیٹھا غیر اہم کام کر رہا ہوتا۔ رہی بات کافی کی تو سر..... کافی ضرور پیوں گا لیکن اپنا کام ختم کرنے کے بعد۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور لان میں پہنچ کر ان تمام ملازمین کا جائزہ لینے لگا جن کے چہروں پر برہمی اور بیزاری کے ملے جلے تاثرات تھے۔ ایک دو ملازمین کے چہرے بالکل سپاٹ تھے۔

ایک ملازم بار بار اپنے کان کی لو مسل رہا تھا اور خاصا مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔

"تم میں سے کس کو معلوم تھا کہ آصف صاحب ہنی مون پر جا رہے ہیں؟"

"یہ بات تو ہم سبھی کو معلوم تھی۔" غلام رسول نے کہا۔

"جب تم سے کچھ پوچھا جائے تو بولا کرو۔" خرم نے اسے جھڑک دیا۔

غلام رسول کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ قطار کے ایک سرے پر ڈرائیور گل باز کھڑا تھا۔

خرم نے اس سے کہا۔ "تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔" پھر وہ بقیہ ملازمین سے بولا۔ "تم لوگ یہیں ٹھہرو گے۔"

خرم، گل باز کو لے کر اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جسے انسپکٹر اکرام نے اس وقت مانیٹرنگ سیل بنا رکھا تھا۔ وہ اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ مختلف مانیٹرز اور گرافک مشینوں پر مصروف تھا۔

خرم کو دیکھ کر وہ کھڑا ہوگیا۔

"بیٹھیے، انسپکٹر صاحب! میں یہاں شیرازی صاحب کے ملازمین سے تفتیش کروں گا۔" پھر اس نے اقبال سے کہا۔ "تم اس دوران میں کسی کو اندر مت آنے دینا۔ چاہے وہ شیرازی ہی کیوں نہ ہو۔"

"او کے سر۔" اقبال نے جواب دیا اور دروازے پر جم گیا۔

خرم، ڈرائیور کو لے کر کمرے کے ایک گوشے میں چلا گیا۔ کمرے کا وہ سرا انسپکٹر اکرام سے بھی بہت دور تھا۔

"تم یہاں کب سے ملازم ہو؟" خرم نے پوچھا۔

"مجھے یہاں چھ ماہ ہوگیا ہے صاحب۔"

''اس سے پہلے کہاں ملازمت کرتے تھے؟''
''اس سے پہلے میں ایک بڑے افسر بخاری صاحب کا ڈرائیور تھا۔'' اس نے جواب دیا۔
''اکمل بخاری؟'' خرم نے تصدیق چاہی۔ ''وہ ڈپٹی سیکریٹری؟''
''جی سر!'' گل باز نے جواب دیا۔ ''پھر بیگم صاحبہ نے ایک دن غصے میں ہمیں ملازمت سے نکال دیا۔ ہم ان کو لینے گیا تھا۔ راستے میں ٹائر پنکچر ہو گیا۔ بس دیر ہونے پر بیگم صاحبہ کو غصہ آگیا اور اس نے نکال دیا۔''
''ٹھیک ہے تم جاؤ لیکن کسی سے کوئی بات نہیں کرنا۔''
گل باز کے جانے کے بعد انسپکٹر اکرام نے کہا۔ ''سر! آپ بھی کس چکر میں پڑ گئے۔ یہ تفتیش آپ کا کام تو نہیں ہے۔''
''یار! سردار جہانگیر صاحب سینیٹر ہیں، پھر آئی جی صاحب نے بہ ذات خود یہ کیس میرے ہاتھ میں دیا ہے۔ ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہے۔'' پھر وہ اقبال سے بولا۔ ''دوسرے ملازم کو بھیج دو۔''
اس نے یکے بعد دیگرے پانچ ملازمین سے تفتیش کی۔ اب صرف مالی، گھر کا سودا سلف لانے والا اور غلام رسول باقی تھے۔
خرم نے مالی کو بھی رسمی پوچھ گچھ کر کے چھوڑ دیا۔ پھر اس ملازم کا نمبر آیا جو باہر کے کام کرتا تھا۔ شیرازی نے اسے گھریلو کاموں کے لیے ایک ہنڈا ففٹی دے رکھی تھی۔
وہ شکل ہی سے کائیاں لگ رہا تھا۔ خرم نے درشت لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''
''مجید لاشاری۔'' اس نے جواب دیا۔
''یہاں کب سے ملازم ہو؟''
''ایک سال ہو گیا ہے۔'' اس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔
اسے شاید یہ سوال جواب پسند نہیں آرہے تھے۔
''اس سے پہلے کہاں کام کرتے تھے؟'' خرم نے پوچھا۔
''کہیں بھی نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔
''یہاں کس کی سفارش پر آئے تھے؟''
''کسی کی سفارش پر نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔
''تو کیا شیرازی صاحب نے تمہیں بغیر کسی کی سفارش کے ملازم رکھ لیا؟''
''میں ملازمت کی تلاش میں ادھر آیا، ادھر غلام رسول سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ہمارے چاچا کو جانتا ہے۔ اس نے صاحب سے سفارش کی تو صاحب نے ہمیں ملازمت پر رکھ لیا۔''
خرم نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ ''ابھی تو تو کہہ رہا تھا کہ تو کسی کی سفارش پر نہیں آیا۔ غلام رسول نے تیری سفارش کی تھی نا؟''
''جی صاحب!'' اس نے اپنا گال سہلاتے ہوئے کہا۔ خرم کی انگلیوں کے نشان اس کے بائیں گال پر ثبت ہو گئے تھے۔
''تیرا شناختی کارڈ کہاں ہے؟'' خرم نے پوچھا۔
''میرے پاس ہے۔'' اس نے جواب دیا اور جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر خرم کو دے دیا۔ خرم نے ایک نظر اس کے کارڈ پر ڈالی، اس کا مستقل پتا بہت غور سے دیکھا پھر کارڈ اسے واپس کر دیا اور بولا۔ ''اب جا کر غلام رسول کو بھیج دو۔''
اس کے جانے کے بعد اس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے پیڈ پر کچھ اندراج کیا اور غلام رسول کے انتظار میں بیٹھ گیا۔
غلام رسول یوں آکر کھڑا ہوا جیسے وہ اس گھر کا ملازم نہیں بلکہ مالک ہو۔
''تم یہاں کب سے ملازم ہو غلام رسول؟''
''یہ تو مجھے یاد بھی نہیں ہے صاحب۔'' غلام رسول نے کہا۔ ''پچیس، چھبیس سال تو ہو گئے ہوں گے۔''
''تم یہاں کس کی سفارش پر آئے تھے؟'' خرم نے پوچھا۔
''میں پہلے شیرازی صاحب میرا مطلب ہے کہ سعید شیرازی صاحب کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ سعید شیرازی صاحب، عارف شیرازی کے والد تھے۔ میں ان کا چپراسی تھا۔ پھر وہ مجھے گھر کے کاموں کے لیے لے آئے۔ اس وقت عارف شیرازی صاحب ملک سے باہر پڑھنے گئے ہوئے تھے اور ان کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر سعید صاحب کے انتقال کے بعد شیرازی صاحب نے مجھے اپنے ساتھ ہی رکھا۔ میں نے تو آصف صاحب کو گودوں میں کھلایا ہے۔''
''اس مجید لاشاری کو کیسے جانتے ہو؟'' خرم نے اچانک پوچھا۔
''مجید لاشاری کا چچا حاکم لاشاری میرے ساتھ سعید شیرازی صاحب کی فیکٹری میں کام کرتا تھا، بہت بھلا مانس تھا۔ اس نے تقریباً دس سال کام کیا ہو گا پھر اس کا انتقال ہو

گیا۔''
''تم اس کی تدفین میں گئے تھے؟''
''ہاں صاحب، میں اس کے گاؤں گیا تھا۔ میں کیا، سعید شیرازی صاحب بھی اس کے جنازے میں شریک ہوئے تھے۔''
''اس کا گاؤں کہاں ہے؟'' خرم نے پوچھا۔
''وہ روہڑی کے نزدیک کسی گاؤں میں رہتا تھا۔ مجھے اس وقت اس کے گاؤں کا نام یاد نہیں آرہا ہے، عجیب سا نام تھا۔''
''کرڑو گوٹھ تو نہیں؟''
''نہیں صاحب۔'' غلام رسول نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس کے گاؤں کا نام تو کچھ ٹوپی ..... پگڑی سے ملتا جلتا تھا۔''
''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔''
غلام رسول چلا گیا۔ خرم کے نرم رویے سے اس کا موڈ بحال ہو گیا تھا۔
''اقبال!'' خرم نے کہا۔ ''ذرا ادھر آؤ۔'' اقبال اس کے پاس آگیا۔ ''ان تمام ملازمین میں یہ ملازم مجید لاشاری مشکوک ہے۔ اس پر نگاہ رکھو بلکہ اپنے کسی آدمی کو سادہ لباس میں اس کی نگرانی پر لگا دو۔'' پھر اسے کچھ خیال آیا اور وہ بولا۔ ''ذرا مجید لاشاری کو ایک مرتبہ پھر بلانا۔''
مجید لاشاری آیا تو خرم نے کہا۔ ''تمہارے پاس موبائل کون سا ہے؟''
''میرے پاس تو بہت سستا سا موبائل ہے صاحب۔'' اس نے جواب دیا۔
''ذرا اپنا موبائل فون مجھے دو۔'' خرم نے کہا۔
مجید لاشاری کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نظر آئے۔ پھر اس نے اپنا موبائل فون نکال کر خرم کو دے دیا۔
خرم نے موبائل فون کا جائزہ لیا پھر اس سے کہا۔ ''تم جاؤ، تمہارا موبائل ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں مل جائے گا۔''
اس نے کچھ کہنا چاہا پھر خرم کے تیور دیکھ کر خاموشی سے چلا گیا۔
خرم اپنی جگہ سے اٹھ کر انسپکٹر اکرام کے پاس پہنچا اور بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! مجھے اس سیل فون اور سم کا تمام ڈیٹا نکال کر دے دیں۔''
''اوکے سر۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''میں ابھی آدھے گھنٹے کے اندر اندر آپ کو رپورٹ دیتا ہوں۔''
خرم کمرے سے باہر آگیا۔
شیرازی اور سردار جہانگیر اس وقت بھی لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔
''کہیے ایس ایس پی صاحب! کچھ بات بنی؟''
''سر! بات تو انشاء اللہ ضرور بنے گی۔'' خرم نے جواب دیا۔
اسی وقت احسن وہاں آگیا۔
خرم نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''آپ کی تعریف؟''
''مجھے احسن کہتے ہیں، احسن شیرازی!'' اس نے جواب دیا۔ ''میں عارف شیرازی صاحب کا چھوٹا بھائی ہوں۔''
''آپ یہیں رہتے ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اب تک آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔''
''میری طبیعت رات خاصی بگڑ گئی تھی۔'' احسن نے جواب دیا۔
''احسن، آصف کو بہت چاہتا ہے ایس ایس پی صاحب! اس سے آصف کے اغوا کا صدمہ برداشت نہیں ہوا اور طبیعت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر نے آکر اسے انجکشن دیا، کچھ دوائیں دیں تو اس کی حالت سنبھلی۔''
''آپ نے کچھ معلوم کیا آصف اور ثمرہ کو اغوا کر کے کہاں لے جایا گیا ہے؟'' احسن نے پوچھا۔
''میں پوری کوشش کر رہا ہوں احسن صاحب!'' ایس ایس پی نے کہا۔ ''ابھی تک تو یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے۔''
''کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔'' احسن بھرائی ہوئی آواز میں بولا پھر اس کے آنسو بہنے لگے۔ ''میرا بیٹا نہ جانے کس حال میں ہو گا۔'' وہ روتے ہوئے بولا۔ ''اور وہ پھول سی ثمرہ۔ اس نے تو کبھی کسی بھی قسم کی سختی برداشت ہی نہیں کی ہے۔''
''حوصلہ رکھیں احسن صاحب۔'' خرم نے کہا۔ ''میں مجرموں تک پہنچنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو انہیں پکڑ کر ہی دم لوں گا۔''
''مجھے مجرموں سے کوئی غرض نہیں ایس ایس پی صاحب۔'' احسن نے کہا۔ ''مجھے صرف آصف اور ثمرہ صحیح سلامت اور بہ خیریت چاہئیں۔'' یہ کہہ کر پھر وہ آنسو بہانے لگا۔
شیرازی اور سردار جہانگیر دونوں مل کر اسے تسلی دینے لگے۔
''اب تو آپ کا کام پورا ہو گیا۔'' شیرازی نے ہنس کر کہا۔ ''اب کم سے کم ایک کپ کافی تو آپ پی ہی سکتے ہیں۔''

”چلیے، آپ کا اصرار ہے تو میں اب انکار نہیں کروں گا۔“

شیرازی نے غلام رسول کو کافی لانے کو کہا۔

کافی پینے کے دوران میں خرم نے سردار جہانگیر سے کہا۔ ”سر! میں تھوڑی سی زحمت آپ کو بھی دوں گا۔“

”جی کہیے۔“ سردار جہانگیر نے کہا۔

”مجھے آپ کے ملازمین کے بیانات بھی لینا پڑیں گے۔“

”وہ سب میرے جدی پشتی ملازم ہیں۔ ان کے باپ دادا بھی ہمارے ملازم تھے۔ وہ سب میرے گوٹھ کے ہیں ایس ایس پی صاحب۔“

”لیکن سر! ان کے بیانات لینا تو ضروری ہیں۔ ہوسکتا ہے، مجھے ان میں سے کسی کے بیان سے کوئی سراغ مل جائے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ سردار جہانگیر نے کہا۔

اسی وقت انسپکٹر اقبال نے اس کے ہاتھ میں ایک پرنٹڈ شیٹ دے دی اور بولا۔ ”سر! انسپکٹر اکرام صاحب نے یہ ڈیٹا آپ کے لیے بھیجا ہے۔“

خرم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”سردار صاحب! چلیں؟“

”بالکل چلیں۔“ سردار جہانگیر نے کہا۔

اقبال نے خرم کو مجید کا موبائل فون بھی دے دیا تھا مجید لاشاری سامنے ہی لان میں کھڑا اگل باز سے باتیں کررہا تھا۔ خرم نے اشارے سے اسے بلایا اور اس کا موبائل اس کے حوالے کردیا۔

☆☆☆

آصف اور ثمرہ کی حالت خراب تھی۔ ان لوگوں نے انہیں صرف ایک وقت کھانے کو دیا تھا اور ابھی تک ان کی رہائی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ ثمرہ نے آصف کو بتایا کہ رات کو جانو اور بچل ہمارے کمرے کے باہر ہی تھے۔ جانو، بچل سے کہہ رہا تھا کہ ان دونوں کو اب پیر تک رکھنا ہے۔ پھر پیسے وصول ہوتے ہی انہیں ختم کردینا ہے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ آصف نے گھبرا کر پوچھا۔

”میں نے جو کچھ سنا تھا، وہی بتارہی ہوں۔“ ثمرہ کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ”یہ لوگ پیسے لے کر بھی ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ ثمرہ سسکنے لگی۔ ”شاید ہماری موت اس ویرانے میں لکھی ہے۔“

”لیکن کیوں؟“ آصف نے کہا۔ ”جب انہیں پیسے مل جائیں گے تو پھر یہ ہماری جان کیوں لیں گے؟“

”کیونکہ جس نے ہمیں اغوا کرایا ہے، وہ ہمیں زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔“

”اس کی ہم سے کیا دشمنی ہے؟“

”میں کیا بتاسکتی ہوں۔“ ثمرہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”ہم بھی کتنی مختصر عمر لے کر آئے تھے۔ ابھی ہماری شادی کو ایک ہی ہفتہ ہوا ہے اور۔۔۔۔“

”روؤ مت ثمرہ!“ آصف نے کہا۔ ”مجھے کچھ سوچنے دو۔ ہم یہاں سے فرار کیسے ہوسکتے ہیں، تم نے اس امکان پر بھی غور کیا ہے؟“

”میرا تو ذہن ہی ماؤف ہوکر رہ گیا ہے۔ سردی کی وجہ سے پورا جسم اکڑ کر رہ گیا ہے اور ان کم بختوں نے میرے ہاتھ پشت پر اتنی سختی سے باندھے ہیں کہ لگتا ہے دونوں بازو کندھوں سے اکھڑ جائیں گے۔“

”تم تو اسکول کے زمانے میں ایتھلیٹ تھیں۔“ آصف نے انگریزی میں کہا۔

”اب اس کا کیا ذکر؟“ ثمرہ نے مایوسی سے کہا۔

”ثمرہ! انگلش میں بات کرو۔“ آصف نے انگلش میں کہا۔ ”ہوسکتا ہے، کوئی ہماری باتیں سن لے۔ تم کوشش کر کے کسی طرح اپنا جسم رسی کے اس پھندے سے نہیں گزار سکتیں؟ اس طرح تمہارے ہاتھ پشت کے بجائے سامنے آجائیں گے اور تمہارے لیے کھولنے میں آسانی رہے گی۔“

”میں تو اس وقت اپنے ہاتھ چلا ہی نہیں سکتی۔“ ثمرہ نے کہا۔ ”میرے ہاتھ بالکل سن ہوکر رہ گئے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ میرے دونوں ہاتھ ہل بھی نہیں سکتے۔“

”ثمرہ! پلیز کوشش کرو۔ اگر تم نے اپنے ہاتھ کھول لیے تو میرے ہاتھ بھی کھول سکو گی۔“

”میں ایسا نہیں کرسکتی آصف۔“

”ثمرہ پلیز! ہمیں ایک آخری کوشش تو کرنا چاہیے۔ کوشش کرو۔۔۔۔ پلیز کوشش کرو۔“

”میرے ہاتھ پیر بالکل سُن ہورہے ہیں۔“ ثمرہ نے کہا۔

”کسی طرح کوشش کرو ثمرہ۔۔۔۔ میں نے تو بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ تمہارے جسم میں زیادہ لچک ہے۔ تم ضرور کامیاب ہوجاؤ گی۔ شاباش کوشش کرو۔“

”ابھی کوشش کرنا بیکار ہے۔“ ثمرہ نے کہا۔ ”رات ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

آصف نے بھی سوچا کہ ثمرہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ بھی خاموشی سے اپنی جگہ پر پڑ گیا۔ ان لوگوں نے اتنا ضرور کیا تھا کہ ان کے جسموں پر کمبل ڈال دیے تھے ورنہ وہ دونوں واقعی اکڑ کر مر جاتے۔

پھر شاید آصف کی آنکھ لگ گئی تھی یا کمزوری کی وجہ سے اس پر نقاہت طاری ہوگئی تھی کہ اسے اردگرد کا ہوش نہ رہا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو کمرے میں پرانی سی وہی لالٹین جل رہی تھی جو وہ لوگ رات کو جلادیا کرتے تھے۔

پھر دروازہ کھلا اور جانو اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں گرم گرم بھاپ اڑاتے چاولوں کی ایک پرات تھی۔

چاولوں کی اشتہا انگیز خوشبو سے آصف اور ثمرہ دونوں بے چین ہوگئے۔

”بچل!“ جانو نے بچل کو آواز دی۔ ”ان بے چاروں کو کھانا تو کھلادے۔“ اس نے سندھی میں کہا۔ ”ذبح کرنے سے پہلے تو جانور کو دانہ پانی دے دیتے ہیں۔ انہیں بھی پیٹ بھر کر کھلادے۔ کھانے کے بعد ذرا اچھی سی چائے بھی پلا دینا۔ بے چارے آج رات ہی کے تو مہمان ہیں۔ کل کے بعد تو ان کی زندگی میں کوئی رات نہیں آئے گی۔“

ثمرہ ان کی باتیں سمجھ رہی تھی اور خوف سے کانپ رہی تھی۔

جانو اور بچل ہاتھوں سے چاولوں کے لقمے بنا بنا کر ان کے منہ میں ڈالنے لگے۔

عام حالات میں ثمرہ اور آصف ان کے نزدیک بیٹھنا بھی گوارا نہ کرتے لیکن اس وقت وہ مریضوں کی طرح انہی غلیظ لوگوں کے ہاتھوں سے کھانا کھارہے تھے۔

ان دونوں نے خوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا، پھر جانو سے پانی مانگا۔ جانو سلور کے ایک غلیظ گلاس اور جگ میں پانی لے آیا۔ ان لوگوں نے وہ پانی بھی پی لیا۔ کھانے کے بعد ان کو ایسا لگا جیسے ان کے جسم میں نئی توانائی آگئی ہو۔

کھانے کے بعد جانو اور بچل نے انہیں دودھ پتی چائے بھی پلائی اور جاتے جاتے جانو، بچل سے بولا۔ ”ان دونوں کو اب سونے دو کیونکہ آئندہ کبھی انہیں سونے کا موقع نہیں ملے گا۔“

ان کے جانے کے بعد ثمرہ نے انگلش میں آصف کو بتایا کہ وہ دونوں کیا باتیں کررہے تھے۔

”کھانا کھانے اور چائے پینے کے بعد ایسا لگ رہا ہے جیسے جسم میں جان آگئی ہو۔ اب میں کوشش کرتی ہوں کہ کسی طرح ہاتھوں کے اس حلقے سے اپنا جسم نکال سکوں۔“

ثمرہ نے لات مار کے اپنے جسم سے کمبل اتار دیا۔ اس کے پیر بندھے نہ ہوتے تو وہ اب تک کسی نہ کسی طرح دانتوں ہی سے آصف کے ہاتھ کھول چکی ہوتی۔ زندگی سے مایوس ہوکر اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ مرنے سے پہلے ایک کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ انہوں نے ابھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ہاتھ پیر کھلنے کے بعد وہ یہاں سے فرار کیسے ہوں گے؟

اس نے پوری کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح اپنے بندھے ہوئے ہاتھ اپنے کولہوں کی طرف سے نکال کر سامنے لے آئے۔ اس کوشش میں وہ پسینا پسینا ہوگئی۔ یہ اس کے حق میں اچھا ثابت ہوا۔ جسم میں گرمی آئی تو اس کے ہاتھ پیر بھی کام کرنے لگے۔

آصف مسلسل اس کی حوصلہ افزائی کررہا تھا۔ ”شاباش ثمرہ۔۔۔۔ گڈ۔۔۔۔ اسی طرح ایک کوشش اور کرو۔ تم کامیاب ہوجاؤ گی۔“

ثمرہ نے جسم کا پورا زور لگا کر کوشش کی اور اپنے ہاتھ اپنے گھٹنے کے جوڑوں تک پہنچا کر ہانپنے لگی۔

آصف نے پھر اس سے کہا۔ ”ویری گڈ ثمرہ۔۔۔۔ اب تم آسانی سے اپنے ہاتھ نکال سکتی ہو۔“

ثمرہ اس وقت چکرا کر رہ گئی تھی۔ اس کا سر اس کی ٹانگوں کے پاس تھا اور ہاتھ، گھٹنوں کے جوڑوں کے پاس پھنسے ہوئے تھے۔ اس نے ذرا دم لے کر پھر کوشش کی اور اپنے دونوں ہاتھ پیروں کی طرف سے نکال لیے۔ اب اس کے ہاتھ سامنے کے رخ پر تھے۔ اگلا مرحلہ رسی کھولنے کا تھا۔ ثمرہ کے ہاتھ شاید ان لوگوں نے رعایتاً زیادہ مضبوطی سے نہیں باندھے تھے۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر رسی کو دانتوں کی مدد سے کھولنے کی کوشش کی اور تقریباً پندرہ منٹ میں اس میں بھی کامیاب ہوگئی۔

اسے ہاتھ کھلنے کی اتنی خوشی ہوئی کہ وہ مارے خوشی کے رونے لگی۔

پھر اس نے اپنے ہاتھوں کو سہلایا اور آگے بڑھی اور آسانی سے آصف کے ہاتھ اور پاؤں کی رسی کھول دی۔

آصف کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور گویا سردی سے جم کر رہ گیا تھا۔ وہ ثمرہ کا سہارا لے کر اٹھا اور آہستہ آہستہ اپنے ہاتھوں، پیروں کو دائیں بائیں گردش دی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا دورانِ خون بھی بحال ہونے لگا۔ وہ اپنے جسم کو تیزی سے حرکت دینے لگا۔

جب اس کا جسم بالکل معمول پر آگیا تو اس نے اچھل کود کر کے ایک مرتبہ پھر خود کو آزمایا۔ اب وہ بالکل نارمل تھا۔

اس نے اپنے کوٹ کو الٹا کر کے پہن لیا۔ اب کوٹ کے بٹن پشت کی طرف تھے اور پچھلا حصہ آگے کی طرف۔ اس سے اس کا جسم سردی سے محفوظ ہو جاتا لیکن اس صورت میں وہ ہاتھ پیروں کو اچھی طرح حرکت نہیں دے سکتا تھا اس لیے اس نے کوٹ اتار کر ثمرہ کو دے دیا۔ ثمرہ پہلے ہی اپنی جیکٹ کی زپ بند کر چکی تھی اور اپنے دوپٹے کو کانوں پر لپیٹ چکی تھی۔

آصف نے اردگرد نظر دوڑائی تاکہ اسے اپنی حفاظت کے لیے کوئی چیز مل جائے لیکن وہاں سوائے اس لالٹین کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

اچانک آصف کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ اس نے ثمرہ سے کہا۔ ''میں لالٹین بجھا کر دروازے کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ تم اپنے بستر پر لیٹ کر زور زور سے چیخیں مارنا۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی تمہاری چیخیں سن کر ضرور اندر آئے گا۔ میں آنے والے کو پیچھے سے قابو کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ ایک جوا ہے۔ یا تو ہم اس پر قابو پالیں گے یا وہ ہمیں مار دے گا یا دوبارہ باندھ دے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے لالٹین بجھا دی اور وہی ہتھیار کے طور پر ہاتھوں میں لے کر کھڑا ہو گیا۔ اور ثمرہ سے بولا۔ ''چلو، لیٹو اور شروع ہو جاؤ۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔''

ثمرہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی اور بہت بری طرح چیخیں مارنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ کہتی جا رہی تھی۔ ''ہائے مر گئی ..... پتا نہیں کس چیز نے کاٹا ہے۔''

اس کی چیخیں سن کر فوراً ہی دروازے پر آہٹ ہوئی اور کوئی اندر داخل ہوا اور بولا۔ ''بابا، کیوں چیخ .....'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ آصف نے لالٹین سے اس کے سر پر وار کیا تھا۔ لالٹین کی چوٹ تو اتنی شدید نہیں تھی لیکن چوٹ لگنے سے وہ کچھ بوکھلا گیا تھا۔ آصف نے اس کی گردن پر پوری قوت سے گھونسا مارا تو وہ زمین پر گر گیا۔ اس نے جھپٹ کر اس کے شانے سے لٹکی ہوئی کلاشنکوف گھسیٹ لی اور اس کے دستے سے اس کے سر پر ایک زوردار ضرب لگائی۔ اس کے حلق سے کرب ناک چیخ بلند ہوئی اور وہ ساکت ہو گیا۔ لگتا تھا کہ جانو کسی اور جگہ سو رہا تھا۔ بچل ان کے کمرے کے نزدیک تھا۔ آصف نے کلاشنکوف کندھے پر لٹکائی اور ثمرہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف لپکا۔

باہر گھپ اندھیرا تھا۔ وہ دونوں اندازے سے ایک طرف دوڑنے لگے۔ راستہ ناہموار تھا، کئی جگہ ثمرہ گرتے گرتے بچی۔ اس کے ہیل والے جوتے بھاگنے میں اس کے لیے رکاوٹ بن رہے تھے۔ اس نے جوتے اتار کر پھینک دیے۔

اب اسے بھاگنے میں مزید تکلیف ہو رہی تھی کیونکہ راستے میں کانٹے بھی تھے اور کنکر پتھر بھی۔

☆☆☆

خرم، سردار جہانگیر کے سب ملازموں کے بیانات لے چکا تھا۔ اسے ان سے کوئی بھی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ اچانک اس کی نظر اوپر سے اترتے ہوئے مکرم اور مراد پر پڑی۔

خرم انہیں دیکھ کر چونک اٹھا۔ مکرم اور مراد بھی اسے دیکھ کر ساکت ہو گئے۔ وہ چند لمحے خرم کو دیکھتے رہے پھر اچانک ہی غیر متوقع طور پر پلٹ کر بھاگے۔

انہیں بھاگتے دیکھ کر سردار جہانگیر کو حیرانی ہوئی، خرم کو بھی حیرانی تھی۔ وہ بھی بجلی کی طرح ان کے پیچھے لپکا۔ مکرم اور مراد اوپری منزل پر جا کر بنگلے کی عقبی سمت میں موجود ایک سیوریج پائپ کے ذریعے نیچے اترے اور باؤنڈری وال کو کر دیوانہ وار بھاگے۔

خرم ان کے پیچھے تھا۔ اس نے بھی باؤنڈری وال پھلاندی اور چند منٹوں بعد انہیں جا لیا۔ ان کے نزدیک پہنچ کر وہ چیخ کر بولا۔ ''رک جاؤ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔''

بھاگتے بھاگتے مکرم نے بھی ریوالور نکال لیا تھا۔ اس نے پلٹ کر خرم پر فائر کر دیا۔ گولی خرم کے شانے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

خرم زمین پر لیٹ گیا اور مکرم کے پیروں کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ مکرم لڑکھڑا کر گرا۔ خرم نے دوسرا فائر مراد پر کیا۔ وہ عین وقت پر ایک گلی میں مڑ گیا اور خرم کی گولی سے بچ گیا۔ وہاں سے اس نے ایک رکشا پکڑا اور اس سے سیدھا چلنے کو کہا۔

رکشا والا اس کے چہرے سے زیادہ اس کے لہجے سے خوف زدہ ہو گیا اور رکشا آگے بڑھا دیا۔ ''اسپیڈ بڑھاؤ۔ میرے دشمن میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ اگر وہ مجھ تک پہنچ گئے تو میں پہلے تمہیں گولی مار دوں گا۔''

رکشا ڈرائیور نے گھبرا کر اسپیڈ بڑھا دی۔

خرم جب اس گلی میں داخل ہوا جس میں مراد غائب ہوا تھا تو اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ اس کے شانے سے مسلسل خون بہہ رہا تھا اور اس کی وردی کی ایک آستین خون میں تر ہو گئی تھی۔ ان علاقوں میں رکشا، ٹیکسی مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ مراد کی قسمت اچھی تھی کہ اسے رکشا مل گیا۔

خرم ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا رہا۔

آخر سامنے والے بنگلے سے ایک لڑکا نکلا۔ وہ اپنی چھت پر کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے خرم سے کہا۔ ''آفیسر! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں اپنی گاڑی میں آپ کو اسپتال ڈراپ کر دوں؟''

''تھینکس!'' خرم نے کہا اور واپس اس طرف چل دیا جہاں مکرم گرا تھا۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر دور جا گرا تھا لیکن وہاں موجود کچھ افراد نے اسے پکڑ لیا تھا۔ دو لڑکے شاید ہاکی کھیل کر آ رہے تھے اور مکرم اور خرم کا مقابلہ دیکھ چکے تھے۔

''شکریہ بچو!'' خرم نے ان کے نزدیک پہنچ کر کہا۔ ''بس تھوڑی دیر اور رکو، میں ذرا پولیس موبائل بلا لوں۔'' اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور کال کر کے پولیس موبائل بلا لی۔

موبائل اس علاقے میں چند بلاک دور تھی۔ وہ دس منٹ سے بھی کم وقت میں وہاں پہنچ گئی۔

خرم خود سردار جہانگیر کے بنگلے پر اتر گیا اور مکرم کو پولیس کی حراست میں اسپتال بھجوا دیا۔

سردار جہانگیر، خرم کو زخمی دیکھ کر حیران رہ گیا اور بولا۔ ''ایس ایس پی صاحب! آپ تو اچھے خاصے زخمی ہو گئے۔''

''معمولی زخم ہے، صرف خون زیادہ بہہ گیا ہے۔ آپ اپنے ڈرائیور سے کہیں کہ وہ مجھے اسپتال چھوڑ دے۔''

''ڈرائیور کیوں خرم صاحب! میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

سردار جہانگیر نے فوراً گاڑی نکلوائی اور خرم کو ایک نزدیکی پرائیویٹ اسپتال لے گیا۔ وہاں کا عملہ ایک بڑے پولیس افسر کو دیکھ کر ایک دم الرٹ ہو گیا۔ گولی خرم کے دائیں بازو کا گوشت ادھیڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔

ڈاکٹر نے اس کا زخم صاف کر کے اس پر ٹانکے لگائے اور اس پر پٹی کر دی۔

وہاں سے فارغ ہو کر خرم، شیرازی کے بنگلے پر پہنچا۔ سردار جہانگیر اس کے ساتھ تھا اور خرم کو بتا چکا تھا کہ زخمی ہونے والا اس کا سگا بھتیجا ہے اور فرار ہونے والا اس کا ایک دوست ہے۔

''اب میں کچھ کچھ صورتِ حال سمجھ رہا ہوں۔'' شیرازی نے کہا۔ ''بقول سردار صاحب کے مکرم پہلے تو ثمرہ سے شادی کا خواہش مند تھا، پھر ان کے انکار پر اس نے ثمرہ کو اغوا کر کے مجھ سے پندرہ کروڑ روپے ہتھیانے کی کوشش کی۔ اگر وہ اس رقم کا مطالبہ سردار جہانگیر سے کرتا تو اس سے پہلے اس پر شبہ ہوتا کیونکہ آج کل مکرم کو عیاشی اور فضول خرچی کے لیے پیسے نہیں مل رہے ہیں۔''

''اگر یہ حرکت اس کمینے کی ہے تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' سردار جہانگیر نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

''آپ کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' خرم نے کہا۔ ''قانون اس سے خود نمٹ لے گا۔''

''پہلے اس سے یہ تو معلوم کریں کہ آصف اور ثمرہ ہیں کہاں؟''

''وہ ابھی زخمی ہے۔'' خرم نے کہا۔ ''ہم اس پر تشدد نہیں کر سکتے۔ ہاں، آپ پیار محبت سے اگلوا سکتے ہیں۔'' خرم نے سردار جہانگیر سے کہا۔ ''لیکن ابھی آپ اس سے مت ملیے گا۔ پہلے میں اس سے ملوں گا۔ آپ اپنے غصے پر قابو نہیں پا سکیں گے۔''

خرم وہاں سے اٹھ کر انسپکٹر اکرام کی طرف گیا اور اس سے پوچھا۔ ''انسپکٹر! آپ نے جو ڈیٹا مجھے دیا ہے، اس میں دو نمبر ایسے ہیں جن کے سامنے کوئی نام نہیں ہے بلکہ ایکس اور وائی لکھا ہے۔ میں ان دونوں نمبروں پر کال کر چکا ہوں۔ دونوں نمبرز بند ہیں۔ آپ نے بتایا ہے کہ ان نمبروں پر دن میں کئی مرتبہ کال کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ نمبر کس کے ہیں؟''

''یہ تو آپ کو مجید لاشاری ہی بتائے گا۔'' انسپکٹر اکرام نے جواب دیا۔

''اب اس سے واقعی تفتیش کرنا پڑے گی۔'' خرم نے کہا پھر انسپکٹر اقبال کو پکارا۔ ''اقبال!''

''یس سر!'' اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''مجید لاشاری کو حراست میں لو اور اسے اپنے مخصوص سیل میں لے چلو۔ میں بھی وہاں پہنچ رہا ہوں۔''

''اوکے سر!'' انسپکٹر اقبال نے مستعدی سے کہا اور باہر نکل گیا۔

خرم تھوڑی دیر انسپکٹر اکرام کے پاس بیٹھا رہا کہ ممکن ہے اغوا کنندگان کی طرف سے کوئی کال موصول ہو لیکن کوئی کال نہیں آئی۔

وہ کمرے سے باہر نکلا تو لان میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ انسپکٹر اقبال نے مجید لاشاری کو ہتھکڑی نہیں لگائی تھی لیکن شیرازی اور احسن مزاحمت کر رہے تھے۔

''شیرازی صاحب!'' خرم نے کہا۔ ''پلیز آپ لوگ پولیس سے تعاون کریں۔ میں یہ آپ کے بھلے ہی کے لیے

کررہا ہوں۔''

''آپ ہمارے ایک وفادار اور دیانت دار ملازم کو گرفتار کر رہے ہیں۔ یہ ہمارا بھلا کر رہے ہیں آپ؟'' شیرازی نے درشت لہجے میں کہا۔ ''اور اس کے خلاف ثبوت کیا ہے آپ کے پاس؟''

''میں ثبوت آپ کو دینے کا پابند نہیں ہوں۔ ثبوت میں عدالت میں پیش کروں گا۔''

''ثبوت تو آپ کو دینا پڑے گا۔'' احسن نے بھی درشت لہجے میں کہا۔ ''ورنہ آپ ہمارے ملازم کو یوں گرفتار نہیں کر سکتے۔''

خرم اب تک خود پر جبر کررہا تھا ورنہ وہ اس قسم کا لہجہ سننے کا عادی نہیں تھا۔

اس نے درشت لہجے میں احسن سے کہا۔ ''آپ نے یا شیرازی صاحب نے سرکاری کام میں مداخلت کی کوشش کی تو مجبوراً مجھے آپ کو بھی حراست میں لینا پڑے گا۔''

''تم...... مجھے...... عارف شیرازی کو حراست میں لو گے؟'' شیرازی غصے سے کانپنے لگا۔

''میں تو سردار جہانگیر کو بھی حراست میں لے سکتا ہوں۔'' اس نے انتہائی درشت لہجے میں کہا پھر اقبال سے بولا۔ ''لے چلو اسے۔''

''میں پورے پولیس ڈپارٹمنٹ کو الٹ پلٹ کر رکھ دوں گا۔'' شیرازی نے کہا۔

''میں ابھی اپنے وکیل سے بات کرتا ہوں۔'' احسن نے کہا۔ ''میں تمہارے خلاف اور پورے پولیس کے محکمے کے خلاف سپریم کورٹ میں پٹیشن داخل کرتا ہوں۔''

''یہ آپ کا قانونی حق ہے۔'' خرم نے کہا۔ ''آپ ایسا ضرور کریں لیکن میرے کام میں مداخلت مت کریں۔''

وہ اپنی سرکاری گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اقبال پہلے ہی مجید لاشاری کو گاڑی میں بٹھا چکا تھا۔ ڈرائیور نے جلدی سے خرم کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھنے کے بعد فوراً ہی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''تمہیں یہ جسارت بہت مہنگی پڑے گی ایس ایس پی خرم!'' احسن نے چیخ کر کہا۔

خرم نے کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

خرم نے اقبال سے کہا۔ ''تم اسے اپنے سیل میں لے جا کر پوچھ گچھ کرو۔ میں اس کے بارے میں تمہیں سب کچھ بتا چکا ہوں۔''

☆☆☆

ثمرہ اور آصف گرتے پڑتے بھاگ رہے تھے۔ اسی وقت جانو کی آنکھ کھل گئی۔ اسے پڑی کی طلب محسوس ہورہی تھی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن پڑی نہیں تھی۔ وہ یہ سوچ کر بچل کی طرف بڑھا کہ اس کے پاس پڑی ہوگی لیکن بچل اپنے بستر پر نہیں تھا۔ اس نے آواز دی۔ ''بچل...... او بچل۔'' اس کی آواز کا کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا تو اسے ثمرہ اور آصف کے کمرے کا دروازہ کھلا نظر آیا۔

وہ جھپٹ کر آگے بڑھا اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ بچل کے جسم سے ٹکرا گیا۔ وہ پلٹ کر پھر اپنے بستر کی طرف آیا۔ وہاں سے ٹارچ اٹھائی اور بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ ٹارچ کی تیز روشنی میں جو منظر اس نے دیکھا، اسے یقین نہ آیا۔ بچل اپنے ہی خون میں لت پت پڑا تھا۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ جانو نے آگے بڑھ کر بچل کی نبض محسوس کی پھر دل پر کان لگا کر دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی لیکن وہاں بالکل سناٹا تھا۔

اپنے ساتھی کی موت پر جانو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ بچل جیسے آدمی کو جو دس پر اکیلا بھاری تھا، شہر کے اس لڑکے نے ماردیا۔ سوال یہ تھا کہ وہ کھلا کیسے؟ لیکن یہ سب کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ بچل کا جسم ابھی گرم تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے ابھی کچھ دیر پہلے ہی مارا گیا تھا۔ وہ ٹارچ لے کر دیوانہ وار باہر نکلا اور زمین پر جھک کر آصف اور ثمرہ کے قدموں کے نشان دیکھنے لگا۔ جلد ہی اسے ثمرہ کے جوتے کا نشان نظر آگیا۔ سمت کا تعین کرتے ہی وہ دیوانہ وار اس طرف دوڑ پڑا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر ڈائل کردیا۔

دوسری طرف سے کوئی غرا کر بولا۔ ''کیا بات ہے جانو! نشہ زیادہ کرلیا ہے کیا؟''

''سائیں! وہ چھوکرا اور چھوکری دونوں بچل کو قتل کر کے بھاگ گئے۔ میں ان کے پیچھے جارہا ہوں۔''

''کیا بکواس کرتا ہے؟'' بولنے والے کی آواز سے غنودگی غائب ہوگئی۔ ''اس لڑکے نے بچل جیسے بشہ زور کو ہلاک کردیا۔''

''سائیں! میں خود حیران ہوں۔''

''انہیں تو تلاش کر جانو...... اگر وہ نکل گئے تو تجھے حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں بھی مولا بخش اور محمد خان کو لے کر اسی طرف آرہا ہوں۔ وہ لوگ گئے کس طرف ہیں؟''

''سائیں، وہ مین روڈ کی طرف بھاگے ہیں۔ ان کے قدموں کے نشان تو اسی طرف جارہے ہیں۔''

''مین روڈ وہاں سے پندرہ کلومیٹر ہے۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ تو ان کا پیچھا کر جانو ورنہ ......'' یہ کہہ کر بولنے والے نے سلسلہ منقطع کردیا۔

جانو کے لیے وہ راستہ نیا نہیں تھا۔ وہ بہت تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ اس کے پاس ٹارچ کی سہولت بھی تھی لیکن آگے جا کر اچانک ثمرہ کے جوتے کا نشان غائب ہوگیا۔ جانو چکرا کر رہ گیا کہ یہاں سے وہ لوگ کس طرف گئے ہیں۔ دائیں طرف ایک گوٹھ تھا۔ وہ اگر گوٹھ تک پہنچ جاتے تب بھی بچ نہیں سکتے تھے۔ سائیں کی دہشت گوٹھ والوں پر بھی تھی۔

☆☆☆

ثمرہ دوڑتے دوڑتے گر پڑی۔ ننگے پیر ہونے کی وجہ سے اس کے پیروں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے پیروں میں کانٹے چبھے ہوئے تھے۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''آصف! تم نکل جاؤ۔ میں اب نہیں دوڑ سکتی۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو ثمرہ۔'' آصف نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نہیں جاؤ گی تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔''

اس نے جھک کر ثمرہ کے پیر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھوں پر ثمرہ کا خون لگا تو وہ چونک اٹھا۔ اس نے ثمرہ کے تلووں سے کانٹے نکالے۔ اس کا دوپٹا پھاڑ کر اس کے دونوں پیروں پر باندھا اور ان لوگوں نے ایک مرتبہ پھر گرتے پڑتے بھاگنا شروع کردیا۔

اس دوران میں جانو وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں آصف کو دیکھ لیا اور چیخ کر بولا۔ ''رک جاؤ چھوکرے، ورنہ گولی ماردوں گا۔'' اس نے آصف کی طرف ایک فائر بھی کیا۔ وہ آصف کو زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ فائر تو اس نے محض آصف کو دھمکانے کے لیے کیا تھا۔

خطرہ سر پر دیکھ کر آصف نے ثمرہ کو ایک درخت کے پیچھے چھپایا اور خود بھی ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ جانو کو یہ علم نہیں تھا کہ آصف کے پاس بچل سے چھینی ہوئی کلاشنکوف بھی ہے۔ وہ ٹارچ کی تیز روشنی میں آگے بڑھا۔ جونہی وہ آصف کی رینج میں آیا، آصف نے آنکھیں بند کر کے اس پر فائر کھول دیا۔ کلاشنکوف کے ایک ہی برسٹ نے جانو کو بھون کر رکھ دیا۔ اس نے دوڑ کر جانو کی ٹارچ اٹھائی اور اس کا مفلر بھی لے لیا۔ پھر اس کا مفلر دو حصوں میں تقسیم کر کے ثمرہ کے پیروں کے نیچے باندھ دیا تاکہ اسے چلنے میں زیادہ

تکلیف نہ ہو۔ اب آصف کو خطرہ نہیں تھا۔ اس کے دونوں دشمن ختم ہوچکے تھے۔ اس لیے وہ اور ثمرہ اب بہت اطمینان سے آگے بڑھ رہے تھے۔ آصف نے منزل کا تعین تو نہیں کیا تھا، بس اندازے سے چل رہا تھا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ خطرہ سامنے سے بھی اس کی طرف آرہا ہے۔ سائیں اپنے دو خونخوار آدمیوں کو لے کر ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

خرم نے مکرم سے اسپتال میں ملاقات کی۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی محفوظ تھی۔ گولی اس کی پنڈلی کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ خرم کو دیکھ کر مکرم ایک دفعہ پھر خوف زدہ ہوگیا۔

''اب بتاؤ، تم نے ثمرہ اور آصف کو کہاں چھپایا ہے اور تمہارے ساتھ کون کون شامل ہے؟'' خرم نے پوچھا۔

''سائیں! قسم اللہ کی، مجھے بالکل پتا نہیں کہ ادی ثمرہ اور آصف کہاں ہیں؟''

''پھر تم مجھے دیکھ کر بھاگے کیوں تھے؟''

''سائیں، میں آپ کو دیکھ کر ڈر گیا تھا۔'' مکرم نے کہا۔

''کیوں ڈر گئے تھے؟'' خرم نے کہا۔ ''میری شکل اتنی خوف ناک تو نہیں ہے۔''

''سائیں ..... میں ..... آپ کو ..... دیکھ کر..... واقعی ڈر گیا تھا۔'' مکرم نے پھر کہا۔

''لیکن کیوں؟'' خرم نے الجھ کر پوچھا۔ ''دیکھو مکرم! اگر سچ بولو گے تو کم سے کم سزا ملے گی۔''

''سائیں ..... وہ ..... بات ..... اصل میں یہ ہے کہ..... میں نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ مل کر..... ایک ہندو ساہوکار کو لوٹا تھا۔'' مکرم نے کہا۔

''اور بعد میں اسے زخمی کردیا تھا؟'' خرم نے کہا۔

''اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔'' مکرم نے آہستہ سے کہا۔

''اس بندے سے چھینی ہوئی تین لاکھ روپے کی رقم کہاں ہے؟'' خرم نے پوچھا۔

''سائیں! اس میں سے ایک لاکھ کے قریب تو میں نے خرچ کردیے، باقی پیسے میرے پاس موجود ہیں۔''

''تمہارا ساتھی کون تھا؟'' خرم نے پوچھا۔

''وہ دونوں میرے گوٹھ ہی میں رہتے ہیں۔ اشرف اور رئیس۔'' مکرم نے کہا۔

''اور مراد؟ وہ تمہارے ساتھ نہیں تھا؟''

''نہیں سائیں! مراد ہمارے ساتھ نہیں تھا۔'' مکرم نے جواب دیا۔

''پھر وہ مجھے دیکھ کر کیوں بھاگا تھا؟''

''سائیں ..... میں نہیں جانتا۔'' مکرم نے کہا۔ ''ویسے میرا خیال ہے کہ وہ ادی ثمرہ کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔''

خرم نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کیا..... اس نے تمہیں کچھ بتایا تھا؟''

''نہیں سائیں، اس نے بتایا تو نہیں تھا لیکن اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ادی ثمرہ کے اغوا میں اگر اس کا ہاتھ نہیں ہے تو اسے معلوم ضرور ہے۔''

''مراد کا پتا بتاؤ۔''

''سائیں! وہ اس وقت گوٹھ میں نہیں ہوگا بلکہ جان محمد کے اڈے پر ملے گا۔''

''جان محمد کا اڈا؟'' خرم نے پوچھا۔ ''یہ جو کراچی میں ہے؟''

''جی سائیں! وہ وہاں سے ہیروئن اور چرس لے کر ان کا دھندا بھی کرتا ہے۔''

اسی وقت اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف انسپکٹر اکرام تھا۔ وہ پُرجوش لہجے میں بتا رہا تھا کہ اغوا کنندگان کا سراغ مل گیا ہے۔ وہ اس وقت سپر ہائی وے کے نزدیک موجود ہیں۔ انہوں نے ابھی ابھی شیرازی صاحب کو کال کی تھی۔

''تمہیں یقین ہے کہ وہ سپر ہائی وے کے نزدیک ہیں؟''

''سر! میرا تو خیال ہے کہ وہ سپر ہائی وے پر ہیں۔'' انسپکٹر اکرام نے کہا۔

خرم تیزی سے باہر نکلا۔ اس نے اقبال کو کال کی اور اس سے کہا۔ ''فوری طور پر پولیس پارٹی تیار کرو اور اسپتال پہنچو۔ ہمیں ابھی اور اسی وقت نکلنا ہے..... ہری اپ۔''

''اوکے سر!'' انسپکٹر نے جواب دیا۔

☆☆☆

آصف اور ثمرہ جیسے جیسے آگے بڑھے، انہیں گاڑیوں کے انجن کی دھیمی دھیمی آوازیں سنائی دیں۔

آصف پُرجوش لہجے میں بولا۔ ''ثمرہ! ہم صحیح سمت میں جا رہے ہیں۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' ثمرہ نے کہا۔

''ذرا غور سے سنو، تمہیں گاڑیوں کی آوازیں نہیں سنائی دے رہیں؟''

ثمرہ نے غور سے سنا پھر خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ہاں آصف! کوئی سڑک نزدیک ہے۔ یہاں سے ہمیں ضرور لفٹ مل جائے گی۔''

☆☆☆

اقبال دس منٹ کے اندر اندر پولیس پارٹی لے کر اسپتال پہنچ گیا۔ گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے خرم نے انسپکٹر اکرام کو ٹیلی فون کیا۔ ''انسپکٹر! کیا اب بھی ٹریکر اس سیل فون کی نشاندہی کر رہا ہے؟''

''جی سر! اس سیل فون کا مالک اس وقت بھی ہائی وے پر ہے۔''

''انسپکٹر! کیا ہمارے پاس ایسی کوئی گاڑی نہیں ہے جو اس سیل فون کے ساتھ ساتھ ٹریکنگ کر سکے؟''

''گاڑی تو موجود ہے سر!'' انسپکٹر نے کہا۔ ''لیکن ٹریکنگ اس وقت ممکن ہے جب سیل فون آن ہو۔''

''کیا تم وہ گاڑی لے کر ہائی وے پر آ سکتے ہو؟''

''میں ابھی پہنچ رہا ہوں سر۔'' انسپکٹر اکرام نے کہا۔

خرم جیپ میں سوار ہو کر تیز رفتاری سے ہائی وے کی طرف بڑھ رہا تھا اور مسلسل اکرام سے رابطے میں تھا۔

وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے انہیں پجارو کے ٹائروں کے نشانات اندر کی طرف مڑتے دکھائی دیے تھے۔

اسی وقت اکرام کی کال آئی۔ ''سر! وہ اب اس جگہ ہیں جو تھانہ بولا خان کے ریڈیائی بوسٹر سے نزدیک ہے۔''

خرم سمجھ گیا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں سے پجارو ہائی وے سے کچے کی طرف گئی تھی۔

اس نے اقبال سے کہا۔ ''فوراً اس طرف چلو جہاں ہم نے اس پجارو کے نشانات اندر کی طرف جاتے دیکھے تھے۔''

''وہ جگہ تو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے سر..... مشکل سے پانچ منٹ کا فاصلہ ہوگا۔''

''پانچ نہیں، تین منٹ۔'' خرم نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''اوکے سر! تین منٹ۔'' اقبال نے کہا اور گاڑی کی اسپیڈ خوفناک حد تک بڑھا دی۔

☆☆☆

ثمرہ اور آصف بے فکری سے روڈ کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک انہیں سامنے سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی دکھائی دی۔ آصف نے جلدی سے ٹارچ بند کر دی اور خود ثمرہ کو لے کر ایک ٹیلے کی آڑ میں چھپ گیا۔

سامنے سے آنے والا سائیں تھا۔ وہ ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی میں ثمرہ کو دیکھ چکا تھا کیونکہ اس نے چھپنے میں سستی سے کام لیا تھا۔ وہ پلک جھپکتے میں آصف کے نزدیک پہنچ گیا اور چیخ کر بولا۔ ''چھوکرے! گن پھینک دے اور خود کو ہمارے حوالے کر دے۔ ہم تجھے اتنی آسانی سے نہیں جانے دیں گے۔ تُو تو پندرہ کروڑ روپے کا چیک ہے۔''

آصف خاموش رہا۔

سائیں نے اپنے دونوں آدمیوں کو گاڑی سے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں بہت آہستگی سے اترے اور لمبا چکر کاٹ کر آصف کی طرف پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔

مولا بخش پہلے آصف کے نزدیک پہنچ گیا۔ آصف نے بھڑک کر اس پر فائر کھول دیا۔ مولا بخش اذیت ناک چیخ مار کے زمین پر گر گیا۔

☆☆☆

خرم نے کلاشنکوف کی آواز سنی تو اپنی گاڑی اندھادھند اس راستے پر ڈال دی جس پر انہوں نے پجارو کے نشانات دیکھے تھے۔ اقبال نے گاڑی کے ہیڈ لیمپس آف کر دیے تھے۔ وہ پلک جھپکتے میں اس پجارو کے نزدیک پہنچ گئے جو وہاں پہلے سے موجود تھی۔ خرم نے گاڑی سے نیچے چھلانگ لگاتے ہوئے للکارا۔ ''گاڑی کے آس پاس جو کوئی بھی ہے خود کو قانون کے حوالے کر دے۔ تم لوگ چاروں طرف سے گھر چکے ہو۔''

خرم کی آواز سن کر سائیں کا دوسرا ساتھی بوکھلا کر واپس بھاگا اور اقبال کے ہتھے چڑھ گیا۔ سائیں کو خرم نے پہلے ہی گرفتار کر لیا تھا۔

اس وقت آصف بھی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور بولا۔ ''سر! میں آصف ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے اغوا کیا تھا۔ میری بیوی ثمرہ ان جھاڑیوں کے پیچھے ہے۔''

☆☆☆

سائیں کو گرفتار کر کے لایا گیا۔ جب اس سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے عجیب انکشاف کیا۔ اس نے بتایا۔ ''مجھے آصف کے چچا نے آصف اور ثمرہ کو اغوا کرنے کو کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ پندرہ کروڑ روپے تاوان کے وصول کر کے تم انعام کے طور پر رکھ لینا اور آصف اور ثمرہ کو قتل کر دینا۔''

اسی وقت شیرازی اور سردار جہانگیر بھی پولیس اسٹیشن پہنچ گئے اور شیرازی نے خرم کو بتایا کہ میرے بھائی احسن نے خودکشی کر لی ہے۔ اس کی جیب سے یہ پرچہ نکلا ہے۔ اس نے وہ پرچہ خرم کی طرف بڑھا دیا۔

اس میں لکھا تھا۔ ''بھائی جان! میں لالچ میں اندھا ہو گیا تھا۔ میں پوری جائداد اور اس کاروبار پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ آصف نہ رہتا تو آپ کی تمام دولت اور جائداد میرے ہی حصے میں آتی۔ اس لیے میں نے آصف کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ ثمرہ کو میں اس لیے ٹھکانے لگانا چاہتا تھا کہ کہیں بعد میں وہ آصف کی جائداد کی دعویدار نہ بن جائے۔ اس کا باپ سردار جہانگیر بہت اثر رسوخ والا آدمی ہے۔ میں قانونی طور پر اس سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ بھائی جان! آپ مجھے معاف کر دیجیے گا اور آصف سے بھی میری طرف سے معافی مانگ لیجیے گا۔ میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے آصف کو ٹوٹ کر چاہا تھا لیکن دولت کی ہوس نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ ثمرہ بیٹی سے بھی میری طرف سے معافی مانگ لیجیے گا۔ وہ بے چاری تو فضول میں میرے لالچ کی بھینٹ چڑھ رہی تھی۔ میں شاید پاگل ہو گیا تھا جو اپنے ہی خون کو اپنے ہاتھوں سے بہانا چاہا۔ میں نے جس جس کو بھی تکلیف پہنچائی ہو، اس سے معافی کا خواستگار ہوں۔

فقط بدنصیب احسن''

خط پڑھ کر شیرازی بلک بلک کر رونے لگا اور بولا۔ ''احسن! تجھے اگر دولت کی ضرورت تھی تو مجھ سے کہتا۔ میں اپنی ساری دولت اور جائداد تیرے نام کر دیتا۔ میں تو تجھے بیٹوں کی طرح چاہتا تھا۔ میرا سب کچھ تیرا تھا۔'' وہ بلکنے لگا۔ سردار جہانگیر نے اسے تسلی دی۔

مجید لاشاری بھی اصل میں احسن ہی کا آدمی تھا۔ وہ ایک جرائم پیشہ شخص تھا اور اس کا کوئی چچا، غلام رسول کے ساتھ کام نہیں کرتا تھا۔ اسے یہ پٹی احسن ہی نے پڑھائی تھی۔ وہ خود سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔

مجید لاشاری، غلام رسول سے ملا اور اسے بتایا کہ اس کا ایک چچا اس کے ساتھ کام کرتا تھا۔ وہ غلام رسول کے توسط سے اس گھر تک پہنچا۔

سیل نمبرز دیکھ کر خرم سمجھ تو گیا تھا لیکن اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا اس لیے وہ فوری طور پر احسن کو گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے خفیہ طور پر اپنے آدمی احسن کے پیچھے لگا دیے تھے۔ یوں لاشاری پر بھی اس کیس میں معاونت کا مقدمہ بنا۔

مکرم اس معاملے میں بے قصور تھا لیکن اس نے لوٹ مار کی تھی اور ایک شخص کو زخمی کیا تھا، اس لیے اسے بھی سزا ہو گئی۔

خرم نے یہ کیس بھی بالآخر حل کر لیا تھا۔

صیادِ شب

ساحر جمیل سید

ایک مقام آتا ہے کہ محبت کی واردات مسلسل ریاضت بن جاتی ہے... نہ جیت ہے نہ ہار... سفر در سفر کی صورتِ حال ہے... وصال سے زیادہ فراق کی کیفیت ہے... ایسی کیفیت میں ہارے بھی تو بازی مات نہیں... اسیرانِ جنوں پرستوں کا کوئی ایک حال نہیں ہوتا... ایک ایسے ہی جنوں پرست کا ماجرا جو جنونِ محبت میں ڈوب کے... نفرتوں... عداوتوں کے جنوں میں مبتلا ہوتا چلا گیا... اس بے خودی کی کیفیت نے اسے ہر دم... ہر پل ایک طلسماتی دنیا کا قیدی بنا دیا... جہاں سب اس کے اپنے تھے... مگر درحقیقت کوئی اپنا نہ تھا...

''اے ظلمت و نور کے الوہی دیوتا! میں تیرے حضور قسم کھاتا ہوں... قسم کھاتا ہوں۔'' وہ سجدے سے سر اٹھاتے ہوئے اس ہال نما کمرے کی بند و بالا چھت کی جانب دیکھ کے چلّایا۔ اس کی پکار اس ہال نما کمرے اور پُرسکوت سرنگ نما راہداریوں میں چکراتے ہوئے دم توڑ گئی۔

قدیم وضع کی اس نحوست زدہ عمارت کے باہر رات سکوت کی چادر اوڑھے ساکت کھڑی تھی۔ عمارت کے مشرقی کنارے سنبل کے درخت کی ایک شاخ پر تنہا بیٹھا ایک الو بیمار چاند کو یک ٹک گھور رہا تھا۔ عمارت کے اندر اس ہال نما کمرے میں چھت کی جانب منہ اٹھائے وہ بدستور چیخ رہا تھا۔

''اے فہم و ادراک کی تمام صلاحیتوں کو پتھرا دینے والے پُراسرار دیوتا! میں قسم کھاتا ہوں... قسم کھاتا ہوں... قسم کھاتا ہوں اس رات کے اندھیرے کی بے ربط سانسوں کی۔ اپنی زندگی کے ان ضعیف لمحوں کی جو تیری ذات کے تجلک کا رزق ہوئے۔ اپنے ان مقتول خوابوں کی قسم کھاتا ہوں جو تیری ذات کے فریب میں فنا ہوئے۔ میں اپنی زندگی کے ہر اپاہج پل کی قسم کھا کر آج یہ عہد کرتا ہوں کہ میں تجھے سکون سے بیٹھنے، جینے نہیں دوں گا۔

''تُو نے میری ذات سے مذاق کیا، میری زندگی کو تماشا بنا دیا۔ میری ایک ایک سانس کا بہت بھاری خراج وصول کیا ہے تُو نے۔ آج تک میرے دامن میں تو اپنی من مانیوں کے خار ہی ڈالتا آیا اور میں اپنی تمام محرومیوں اور اذیتوں کو تیری طرف سے اپنے شکرانوں کا انعام سمجھ کر بخوشی قبول کرتا رہا۔ لیکن تجھے کبھی احساس نہیں ہوا... میرا کلیجا پاش پاش ہوتا رہا لیکن تیرا دل کبھی موم نہ ہوا مگر آج جو تو نے میرے ساتھ کیا ہے، یہ اچھا نہیں کیا...

''سن... اے فضائے بسیط میں خاموشی سے بسنے والی قوتوں کے مالک دیوتا! سن... میں آج تجھ سے اعلانِ بغاوت کرتا ہوں۔ تو نے آج تک مجھے بے سکون رکھا۔ آج میں تیری تمام عنایتیں تجھے واپس لوٹانے کا عہد کرتا ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں... قسم کھاتا ہوں۔''

اطراف کے کمروں اور راہداریوں میں اس کی آواز کی بازگشت سر پٹختی پھر رہی تھی۔

☆☆☆

گہری نیند سوئے ہوئے شخص کی اگر رات کے کسی پہر آنکھ کھل بھی جائے تو اس کا ذہن غنودگی کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔ مگر بیگم رخشندہ کی کیفیت اس کے برعکس تھی۔ آنکھ کھلتے ہی اس کے ذہن نے اسے دھڑکنوں کی بے ربطگی کا احساس دلا دیا تھا اور ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ اپنے شوہر کی غیر موجودگی کو بھی اچھی طرح جان گئی تھی۔ مگر لاشعوری طور پر

محبت کے دیوتا کی

سحر آفریں دنیا کے

کرداروں کا خونی

ملاپ... ایک سنگتراش

کی تخلیقی فنکاریاں

اس نے ٹٹول کر دیکھا۔ پھر اس نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر دھرے لیمپ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''چٹ'' کی آواز ابھری لیکن روشنی نہیں ہوئی۔ یقیناً بجلی نہیں تھی۔ کمرے کے کسی گوشے میں ایک نامانوس سی آہٹ ہوئی تو وہ اپنے اندر کی بے چینی کو پوری طرح سمجھ نہیں پائی۔

''خورشید...'' اس نے اپنے شوہر کو پکارا مگر جواب میں خاموشی رہی۔

''کدھر ہیں آپ... کیا کر رہے ہیں؟'' اسے ہلکی سی حیرت ہوئی کہ آخری جملے پر اس کی آواز کیوں لرزی تھی۔

کوئی آہٹ دوبارہ سرسرائی۔

''خورشید! آپ جواب کیوں نہیں دے رہے؟'' جملہ مکمل ہوتے ہی اسے اندازہ ہوا کہ کسی وجود کی سرسراہٹ اس کے بالکل قریب آگئی ہے۔ یکایک اسے اپنے کلیجے پر شدید بوجھ کا احساس ہوا۔ ٹھیک اسی وقت اس کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ اس کے قریب جو کوئی بھی تھا، شاید اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پاور فل ٹارچ روشن کی تھی لیکن ایسا محض ایک لحظے کے لیے ہوا تھا۔ اس ایک لحظے میں اس نے اس ہیولے کو دیکھا تھا جو ہاتھ میں ٹارچ پکڑے اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اچانک کمرا دوبارہ اندھیرے میں ڈوب گیا... رخشندہ کو محسوس ہوا جیسے اس کا دل اچھل کر کسی گولے کی صورت اس کے حلق میں پھنس گیا ہو۔ ابھی اس کا دماغ صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک مضبوط اور چوڑا ہاتھ اس کے منہ پر آجما۔ اس نے اس گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی انسانی گرفت نہیں ہے۔

پھر اچانک اس نے اپنے حلقوم پر کسی دھاگے کی حرکت سے ہونے والی سرسراہٹ محسوس کی اور ساتھ ہی اسے اپنے سینے کی طرف اترتی حرارت آگیں نمی کا ادراک بھی ہو گیا۔ یک دم... حلقوم میں ایک تیز چبھن ہوئی اور ایک روح فرسا، انہونا سا خیال اس کو تڑپا گیا۔ اس طرح، اچانک موت آوارد ہوگی یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا... پھر اچانک اس کی شہ رگ میں جیسے انگارے دہک اٹھے۔ اس نے چیخنا چاہا... اس گرفت سے نکلنا چاہا، اس اذیت سے بچنا چاہا لیکن وہ جان گئی کہ اب کوئی حاجت پوری نہیں ہوگی۔ ہر سانس اپنی تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ اندھیرے کے گہرے سمندر میں اترتے ہوئے اسے صرف حیرت و بے یقینی سے آشنائی تھی۔

☆☆☆

پُرسکوت اور اداس راتیں ہویدا کو بہت پسند تھیں۔ وہ تھی بھی کچھ کلاسیکی طبع کی مالک اسی لیے اس کے خواب بھی عموماً ایک ہی طرز کے ہوا کرتے تھے۔

فضا میں نمی تھی۔ سامنے چاندنی کا سفید اور مہین سا

آنچل تنا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں خلا کی بیکراں وسعتوں کی جانب متوجہ تھیں کہ اچانک چاندنی کا آنچل بڑی شدت سے لرزا۔ روشنی کی تیز دھار کرنوں نے اس آنچل کو تار تار کر ڈالا۔ ہویدا کو اپنی آنکھوں میں شدید چبھن محسوس ہوئی۔ چند لمحے وہ اس چبھن کو برداشت کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن روشنی کی شدت زیادہ تھی۔ سو مجبوراً اسے اپنے ہاتھ کو حرکت دینا پڑی اور ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ اپنے کمرے میں، اپنے بستر پر موجود تھی۔ بایاں بازو اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے کر رکھا تھا اور محض دو قدم پر کوئی ٹارچ روشن کیے ساکت کھڑا تھا۔ ہویدا کو جاگتا دیکھ کر بھی اس کے وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ ہویدا بازو کی اوٹ سے حیرت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ ایسا بے ہودہ مذاق کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ شاید اختر... پھر وہ اس کی چھٹی حس ہی تھی جس نے اسے کسی شدید خطرے کا احساس دلایا۔ اس نے تڑپ کر اٹھنا چاہا مگر اس کے حرکت میں آتے ہی کمرے میں اندھیرے کا سیلاب اتر آیا۔ اس نے بولنا چاہا مگر ایک مضبوط ہاتھ اس کے منہ پر جم چکا تھا۔

اگلے ہی پل اسے اپنی گردن پر کسی چیز کا لمس محسوس ہوا... شہ رگ میں کوئی تیز دھار چیز اترتی چلی گئی۔ اس نے دہشت کے مارے اپنی آنکھیں پھٹتی محسوس کیں۔ تڑپنے کی کوشش کی مگر کچھ ہی دیر میں اس کے حواس ساتھ چھوڑ گئے۔

☆☆☆

جلیل حیدر رات دو بجے اپنے گھر کے لان میں اکیلا بیٹھا تھا تو یہ کوئی اس کا مشغلہ نہیں تھا۔ نہ ہی اس کا محرک موسم کی سحر آفرینی تھی بلکہ وہ بہت زیادہ دل گرفتگی کا شکار تھا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بہت بے چینی اور گھٹن محسوس کر رہا تھا اور اس کی اس کیفیت کی وجہ تھا راحیل حیدر...

اس کے دو ہی بچے تھے تنزیلہ حیدر اور راحیل حیدر۔ تنزیلہ تو اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ البتہ راحیل چھ ماہ پہلے اپنے حقیقی گھر جا سویا تھا۔ وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا اور جاتے جاتے باپ کی آنکھوں سے نیند بھی لے گیا۔ یہ اور بات کہ جلیل حیدر بیوی، بچی پر اپنے غم کی شدت ظاہر نہیں ہونے دیا کرتا تھا لیکن راتوں کی خاموشیاں اس کے اس غم کی شدتوں سے آگاہ تھیں۔

وہ لان سے اس وقت اٹھا جب برآمدے کی مدھم روشنیوں نے اچانک آنکھیں بند کر لیں۔ یقیناً فیوز اڑا تھا کیونکہ ساتھ والی کوٹھی کے اوپری کمرے کی کھڑکیوں سے روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے بیگم کی آنکھ نہ کھل جائے، اسی اندیشے کے پیش نظر وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے ہینڈل کی طرف ابھی ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک دروازہ از خود کھلتا چلا گیا۔

''بیگم جاگ...'' اس کا قیاس یہیں دم توڑ گیا کیونکہ اندھیرے کے باوجود وہ اپنے سامنے کھڑے ہیولے کو پہچان گیا کہ وہ کوئی مردانہ وجود ہے اور اس نے اپنے کندھے پر کوئی انسانی وجود لاد رکھا ہے۔ ابھی اس کا ذہن اس صورت حال اور اس منظر کو پوری طرح قبول بھی نہیں کر پایا تھا کہ اس ہیولے میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے کوئی نوک دار چیز اپنے سینے میں اترتی ہوئی محسوس کی۔ چیخنے کی کوشش کی تو جیسے آواز نیزہ بن کر کلیجے میں ہی چبھ کر رہ گئی اور وہ تیورا کر وہیں ٹھنڈے فرش پر گر پڑا۔

☆☆☆

صبح کا وقت تھا۔ پیراڈائز بیچ کے مشرقی کنارے پر پولیس کی تین گاڑیاں موجود تھیں۔ ان کے علاوہ دو کاریں بھی وہاں کھڑی تھیں اور تین موٹر بائکس بھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ موسم خاصا خوشگوار تھا مگر وہاں موجود بھی افراد کے چہروں پر تناؤ اور پریشانی کی کیفیت نمایاں تھی۔ باوردی پولیس والوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی وہاں موجود تھے جن میں سے ایک اے ایس پی ملک ظفر اقبال تھے جو ابھی ابھی اپنی کار میں وہاں پہنچے تھے۔ دوسری کار میں ایک اخبار کا کرائم رپورٹر توحید علی وہاں پہنچا تھا۔ ایک دو مزید اخباری نمائندوں اور درجن بھر سپاہیوں کے علاوہ متعلقہ تھانے کا عملہ موقع پر موجود تھے۔ صبح ہی صبح ساحل کنارے جوگنگ کی غرض سے آئے ہوئے کسی شخص نے فون کر کے تھانے اطلاع کی تھی کہ یہاں ایک خون آلود بوری موجود ہے جس میں یقینی طور پر انسانی لاش ہے۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی تھانے میں جیسے ایک ہلچل مچ گئی اور پولیس والے فوری طور پر یہاں پہنچ گئے۔ بھی کے چہروں پر پریشانی طاری تھی کیونکہ اس سے پہلے بھی یہاں مختلف مقامات سے دو بوری بند لاشیں مل چکی تھیں۔

گزشتہ دو واقعات کے بعد چار کانسٹیبل بھی رات کی ڈیوٹی پر یہاں تعینات کیے گئے تھے۔ اس کے باوجود رات پھر کسی وقت مجرم اپنا کام کر گزرا تھا اور کانسٹیبلز کو اس کی بھنک بھی نہیں ملی۔

چند سپاہیوں نے آگے بڑھ کر بوری کو خشکی پر گھسیٹ

لیا اور پھر اس کا منہ کھولنے لگے جو نائیلون کی رسی سے کس کر باندھا گیا تھا۔

اے ایس پی ملک ظفر اقبال اپنی جگہ خاموش کھڑے اپنا نچلا ہونٹ چبا رہے تھے۔ ان کے قریب ہی توحید علی موجود تھا۔ ایس ایچ او قاسم شاہ اپنی جگہ تناؤ کا شکار تھا کہ ابھی ملک صاحب اس کی جھاڑ پھٹک شروع کر دیں گے۔ ابھی دو ہفتے پہلے ایسی ہی ایک بوری میں بیگم رخشندہ کی لاش ملی تھی جن کا نرخرہ کٹا ہوا تھا۔ وہ ایک بہت بڑے صنعت کار کی بیوی اور ایک سابقہ وزیر کی بھابی تھیں اور خود ایک پوسٹ گریجویٹ کالج میں پروفیسر تھیں۔ ان کے ایسے بہیمانہ قتل سے پوری انتظامیہ میں ایک ترتھلی مچ اٹھی تھی۔ ان کے بعد ای ڈی او کمیونٹی ریاض حسین بھٹی کی بیٹی ہویدا ریاض کی لاش بھی یونہی ایک بوری میں بند یہاں سے کچھ فاصلے پر پائی گئی تھی۔

پولیس کو یہ جاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ ہویدا ریاض چند سال پہلے تک بیگم رخشندہ خورشید کی اسٹوڈنٹ رہی تھی لیکن اس ایک بات کے علاوہ کوئی بھی ایسی خاص بات یا کوئی کلیو نہیں ملا تھا جس سے تفتیشی کارروائی آگے بڑھتی یا قاتل کے متعلق کسی قسم کا کوئی سراغ ملتا۔ ابھی یہی دو قتل پولیس والوں کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے کہ اب یہ تیسری بوری... تیسرا قتل...

بوری کا منہ کھلا تو توقع کے عین مطابق اندر سے نسوانی لاش ہی برآمد ہوئی۔ یہ ایک قبول صورت ادھیڑ عمر عورت تھی لیکن موت کی اذیت نے کافی حد تک اس کے چہرے کو مسخ کر رکھا تھا۔ قاتل نے اس کو بھی نرخرہ کاٹ کر ہلاک کیا تھا۔ اس کی زبان دائیں طرف کے دانتوں تلے دبی ہوئی تھی۔ گردن اور چہرے کے ساتھ ساتھ اس کے کپڑے بھی خون میں لت پت تھے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں میں جیسے دہشت اور بے یقینی جم کر رہ گئی تھی۔ ملک صاحب چند لمحے خاموشی سے اس کی بے جان صورت کو تکتے رہے پھر قاسم شاہ کی طرف متوجہ ہوئے تو جیسے وہ اپنی عزت افزائی کے لیے تیار ہو گیا۔

''زنجیر کی تیسری کڑی... کالج رابطہ کرو اور پھر آ کر مجھے رپورٹ کرو۔''

بالکل خلاف توقع ملک ظفر نے نرم لہجے میں کہا۔ ایک نظر توحید علی کی طرف دیکھا اور اپنی کار کی طرف بڑھ گئے۔

قاسم شاہ نے یوں گہری سانس لی جیسے جان شکنجے سے نکل آئی ہو۔

''رات یہاں ڈیوٹی پر کون کون تھا؟''

ملک ظفر کی کار کے روانہ ہوتے ہی قاسم... نے کھردرے لہجے میں فرید سے سوال کیا۔

''وہ جی، مبشر، صیغم، فیاض اور... اوئے ادھر آؤ۔''

فرید نے آخری جملہ ایک سپاہی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو اس کے ساتھ ساتھ رات کی ڈیوٹی والے باقی تینوں سپاہی بھی آگے بڑھ آئے۔

توحید علی جواب تک خاموش اور لاتعلق سا کھڑا تھا، وہ آگے بڑھ کر لاش کے قریب بیٹھ گیا۔

''یہاں ڈیوٹی کے لیے بھی بڈ حرام بچے تھے؟'' قاسم نے فرید کو گھورتے ہوئے ناگواری سے کہا پھر ان چاروں کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیوں اوئے، یہ بوری یہاں کیسے پہنچی؟''

''سر جی! رات تین بجے تک تو یہ یہاں نہیں...''

''میں نے اس کے یہاں پہنچنے کا ٹائم نہیں پوچھا کھوتے کے کھر... یہ پوچھا ہے کہ یہ یہاں پہنچی کیسے؟ تم لوگ کہاں مرے ہوئے تھے؟''

''سر جی! ہم یہاں پورے ایریے میں ہی گشت کرتے رہے ہیں۔ تین بجے ہم ادھر سے گیٹ کی طرف چلے گئے تھے۔ اس...''

''اگر یہ اس کے بعد بھی یہاں پہنچی ہے تو خود سے تو نہیں پہنچی نا؟'' قاسم نے ایک بار پھر بولنے والے کی بات کاٹی۔

''ہم ساری رات چوکس رہے ہیں جی۔ کوئی گاڑی تو کیا موٹر بائک بھی اس طرف نہیں آئی۔''

''تمہاری چوکسی کا ثبوت تو یہ سامنے پڑا ہے...'' قاسم نے زبان پر آئی ہوئی گالی کو بمشکل روکا اور سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ توحید علی پنجوں کے بل بیٹھا بغور لاش کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ قاسم اس سے مخاطب ہوا۔

''جی! آپ جناب کیا غور فرما رہے ہیں؟ کیا ان محترمہ نے کوئی کہانی سنائی ہے آپ کو؟'' انداز طنزیہ تھا۔

''کہانی سے تو یقیناً آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ ہاں البتہ اگر آپ پسند فرمائیں تو میں آپ کو قاتل کی تصویر حاصل کرنے کا طریقہ بتا سکتا ہوں۔'' توحید علی نے اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو اس کی بات پر بھی چونک اٹھے۔

''کیا مطلب... کیسے؟'' قاسم اور مصطفیٰ شہزاد بہ یک زبان بولے۔

''ان محترمہ نے قاتل کو دیکھا ہے۔ اس کا عکس اب بھی ان کی آنکھوں میں موجود ہے۔ اگر آپ کسی طرح وہ حاصل کر سکیں تو یقینی طور پر قاتل تک پہنچنا آپ لوگوں کے

لیے بہت آسان ہو جائے گا۔‘‘

توحید کی بات پر قاسم کی تیوریاں چڑھ گئیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ایک سپاہی تیزی سے ان کے قریب چلا آیا۔

’’سر! ہیڈ کوارٹر سے وائرلیس میسج ہے۔ ڈیفنس فیز فائیو اسٹریٹ ون میں نقوی لاج میں قتل ہوا ہے اور مقتول کی اہلیہ لاپتا ہے۔‘‘

’’لعنت ہے۔‘‘ قاسم نے بیزاری سے کہا پھر ایک نظر سامنے پڑی لاش پر ڈالتا ہوا مصطفیٰ سے مخاطب ہوا۔

’’ایسا کرو کہ تم چار سپاہیوں کو لے کر ڈیفنس چلے جاؤ۔ میں یہاں کی کارروائی بھگتا کر کالج جاتا ہوں۔‘‘ پھر جیسے اچانک اسے یاد آیا اور وہ پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے خودکلامی والے انداز میں بولا۔

’’کالج سے ہو کر ملک صاحب کے دربار پر بھی تو حاضری دینی ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے سر جی! ادھر کا معاملہ میں سنبھال لوں گا۔ آپ ٹینشن مت لیں۔‘‘ مصطفیٰ نے کہا پھر وہ قریب کھڑے سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ ’’سراج، نوازش! تم لوگ آؤ میرے ساتھ۔ بشارت! تم بھی آجاؤ۔‘‘ پھر وہ توحید کو اشارہ کرتے ہوئے موبائل کی طرف بڑھ گیا اور توحید بھی خاموشی سے اپنی کار کی طرف چل پڑا۔

دونوں میں اچھی دوستی تھی۔ سو وہ مصطفیٰ کے اشارے کو بخوبی سمجھ گیا تھا۔ پھر جس وقت وہ اپنی کار میں بیٹھا، اسی وقت ایک ایمبولینس اس طرف آتی دکھائی دی۔

توحید نے ایک نظر قاسم کی بیزار صورت اور نیچے پڑی لاش پر ڈالی اور کار اسٹارٹ کر کے واپسی کے لیے موڑ دی۔

☆☆☆

اس کے ہاتھ میں دبی ٹارچ کی روشنی نیچے کہیں اندھیرے میں گم ہوتی ان سیڑھیوں کے وجود کو ٹٹول رہی تھی جو اس کے بھاری قدموں تلے چرچرا رہی تھیں۔ لکڑی کی وہ سال خوردہ سیڑھیاں اپنی وضع قطع سے یہ تاثر دیتی تھیں کہ انہیں یہاں کسی کاریگر نے نہیں سجایا بلکہ کسی اناڑی نے اپنے کسی خفیہ مقصد کی تکمیل کے لیے از خود نصب کیا ہے۔

سیڑھیاں اترنے کے بعد اس نے ٹارچ کا رخ دائیں ہاتھ کی دیوار کی طرف کیا۔ تقریباً چھ فٹ کی بلندی پر اس کچی دیوار میں ایک کیل کی مدد سے چھوٹا سا الیکٹرک بورڈ لٹکایا گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بورڈ سے ایک بٹن دبایا تو وہ تہ خانہ نما جگہ روشن ہو گئی۔ اس نے ٹارچ بجھا کر ایک طرف کونے میں بچھی مسہری پر اچھالی اور خود انتہائی مضمحل سے انداز میں سیڑھی کے آخری زینے پر بیٹھ کر اپنی اس دنیا کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک درمیانے سائز کا کمرا تھا۔ فرش اور دیواروں کا وجود کچا تھا۔ یہ تہ خانہ اس کے اپنے ہی زورِ بازو کا نتیجہ تھا۔ ایک طرف تقریباً چار ضرب چار کا لکڑی کا صندوق رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک فل سائز آہنی ٹب اور ایک زنگ آلود بالٹی رکھی تھی۔ قریب ہی لکڑی کے کچھ عجیب و غریب سے اوزار بکھرے پڑے تھے۔ دو قدم کے فاصلے پر دائرے کی صورت میں مٹی کا ایک ڈھیر سا جما ہوا تھا۔ اس سب کے علاوہ کمرے کے اثاثہ جات میں... غیر معمولی اور دلچسپ چیز خاکی مجسمے تھے۔

مختلف سائز کے وہ انسانی مجسمے اس کے تخلیق کردہ تھے جو دیکھنے والے کسی بھی قدر شناس کے نزدیک نادر و نایاب شاہکاروں کی حیثیت سے کم ثابت نہ ہوتے۔ مگر اس کے نزدیک وہ مجسمے محض مجسمے نہ تھے بلکہ اس کے ماضی کی جمود زدہ زندگی کا حصہ تھے۔

ان مجسموں کی فنکارانہ تراش اور آفاقی نکھار کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل تھا۔ اگر کوئی ماہر مجسمہ ساز بھی ان مجسموں کا حسن تراش، پرکاری اور تاثراتی نقوش کی حقیقت دیکھ لیتا تو کچھ دیر کے لیے تو مبہوت ہو کر رہ جاتا۔

ایک دیوار کے بالکل پہلو کی طرف دو مجسموں کو بالکل آمنے سامنے اس انداز میں بٹھایا گیا تھا کہ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے ہوں۔ ایک مجسمہ کسی پُروقار مرد کا تھا جو ٹانگ پر ٹانگ دھرے، ہاتھ میں کوئی کتاب اٹھائے مطالعے میں مگن تھا۔ اس کے مقابل والا مجسمہ ایک پختہ عمر مگر خوب صورت عورت کا تھا جس کے وجود پر ساڑی کو ابھارا گیا تھا۔ خاک سے کھینچی گئی زلفوں میں کوئی خاص ترتیب نہ تھی۔ وہ خاتون بھی کسی کتاب کے مطالعے میں منہمک تھی۔ قریب ہی ایک اور مجسمہ تھا۔ یہ مجسمہ ایک بچے کا تھا... ایک آٹھ نو سالہ بچے کا۔ وہ گویا فلور کشن پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ گود میں ایک موٹی سی کتاب مگر چہرے پر انتہائی بیزاری اور کوفت۔ جبکہ مرد، عورت دونوں کے چہروں پر ایک جمود، ایک سکوت چھایا ہوا تھا۔

ان مجسموں سے ہٹ کر ایک اور مجسمہ ایستادہ تھا۔ ایک اٹھائیس تیس سالہ جوان آدمی کا مجسمہ جو ہو بہو اس کی اپنی کاپی تھی۔ جیسے وہ خود پر مٹی کا خول چڑھا کر وہاں جا کھڑا ہوا ہو۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے وہ بڑی تیکھی نظروں سے ان مرد، عورت کی طرف گھور رہا تھا جو مطالعے میں مصروف تھے۔ اس

مجسمے کے عقب میں دیوار کے ساتھ قطار در قطار تیرہ مجسمے ایستادہ تھے جو اسی کے تھے۔ ہر مجسمے کے نقوش اور جسامت میں بہت غیر محسوس سا فرق تھا اور یہ فرق تیرھویں مجسمے پر آ کر بالکل واضح دکھائی دیتا تھا جہاں وہ بمشکل پندرہ سولہ سالہ نوجوان کے روپ میں نظر آتا تھا۔

یہ مجسمے اس کے عہد بہ عہد گزرے جمود زدہ ماضی کا ایک قیمتی اثاثہ اور اس کی تنہائیوں کے خاموش ساتھی تھے۔ ان مجسموں کی قطار سے چند قدم ہٹ کر ایک اور مجسمہ تھا جس پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ یہ مجسمہ اسی آٹھ نو سالہ بچے کا تھا جس کے ہاتھ میں بھاری سی کتاب تراش کر دوسرے کونے میں بٹھایا گیا تھا۔ دونوں مجسموں میں فرق اتنا تھا کہ یہ بچہ دونوں گھٹنوں کو بازوؤں کے حصار میں لیے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا خالی خالی نظروں سے دور... خلا کی وسعتوں میں کہیں گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا ہی بکھرا ان خالی پن تھا۔

وہ کافی دیر اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھا اس بچے کے اداسیوں اور محرومیوں میں گندھے چہرے کو تکتا رہا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اس مجسمے کے سامنے آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں بدستور اس بچے کی خاکی آنکھوں میں اترنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ نہ جانے وہ ان خاموش آنکھوں میں کیا تلاشنے کی سعی میں مگن تھا۔

بہت دیر تک وہ اسی طرح ساکت و جامد بیٹھا یک ٹک اس بچے کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ بچے کا چہرہ مدھم پڑ گیا۔ اس کے بے جان نقوش گڈمڈ سے ہو گئے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا وجود اس تہ خانے کی پُرسکوت فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے اور پھر کچھ ہی دیر میں اس کے شعور پر تہ در تہ جمی بیس برس کی گرد تحلیل ہو کر رہ گئی۔ محض چند لمحوں میں اس کا احساس ماضی کے بیس سالوں کے تغیراتی مراحل کا سفر کرتے ہوئے زندگی کے آٹھویں سال پر آ رکا۔

سب کچھ بدل چکا تھا... وہ اس کچے تہ خانے کے بجائے ایک سجے سجائے خوب صورت بیڈ روم میں ایک دیوار گیر آئینے کے سامنے کھڑا اپنے ہی عکس سے ہم کلام تھا۔

’’مجھے تمہارا یہ پتھریلا چہرہ اور خاموش ہونٹ دیکھ کر خوف محسوس ہوتا ہے۔‘‘ وہ خود سے مخاطب تھا مگر آئینے میں دکھائی دینے والا اپنا عکس اسے بالکل اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی دوسرا لڑکا۔ وہ بول رہا تھا مگر اس کا عکس خاموش تھا... لاتعلق، ساکت... مُردے کی طرح۔

’’میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ تمہیں جواب دینا چاہیے۔ اس طرح سنجیدہ اور خاموش مت رہو... دیکھو، اگر تم مجھ سے بات نہیں کرو گے تو میں رو دوں گا۔‘‘ اس کی آواز بھرا گئی۔

اس بار عکس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ اپنی ہی آواز اسے نامانوس لگی۔ سپاٹ... اس معصومیت سے قطعی عاری جو اس کی عمر کی متقاضی تھی۔

’’کیا چاہتے ہو؟‘‘

’’میں تمہارے ساتھ کھیلنا چاہتا ہوں۔ ہنسنا بولنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’تم اچھی طرح جانتے ہو میرے پاس فضول وقت نہیں ہوتا جو میں کھیل کود میں ضائع کروں۔‘‘

’’کیوں نہیں ہوتا؟‘‘ اس نے بیزاری سے پاؤں پٹخا۔ ’’آخر تم بھی میری ہی عمر کے بچے ہو اور اس عمر میں دنیا کا ہر بچہ کھیلتا کودتا ہے۔ شرارتیں کرتا ہے۔ تمہیں بھی اسی طرح جینا چاہیے۔‘‘

’’ہاں، ہم دونوں ہم عمر ہیں سو تم بھی کھیل کود کے خیالات سے اپنا ذہن مت تھکایا کرو۔ اس طرح کے بیکار مشاغل میں انرجی ضائع کرنے سے بہتر ہوگا کہ میری طرح تکمیلِ ذات کے حصول کے لیے کوشش کرو۔ وقت کو مثبت اور تعمیری مقاصد کے لیے استعمال کرنا سیکھو۔‘‘

وہی سپاٹ انداز۔

’’تم مجھ سے ایسی مشکل مشکل باتیں مت کیا کرو۔ مجھے الجھن ہونے لگتی ہے۔‘‘

’’تم بھی تو چوبیس گھنٹے مجھے اپنی ان بے مقصد سوچوں اور باتوں میں الجھانے کی کوشش کرتے رہتے ہو۔‘‘

’’میں تو صرف تمہیں ہنستا مسکراتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’اور میں تمہیں مکمل جینئس، غیر معمولی انسان دیکھنا چاہتا ہوں۔ وقت سے دس قدم آگے چلنا جس کی عادت شمار کی جائے۔‘‘

’’مگر میں ایسا نہیں بن سکتا۔‘‘ اس کے انداز میں بے بسی، بے چارگی تھی۔

’’اور میں تم جیسا بننا پسند نہیں کرتا۔‘‘

’’میرا دم گھٹتا ہے۔‘‘

’’تم اپنی زندگی جینا چاہتے ہو اور میں اپنی۔ ہمارے درمیان کمپرومائز ہونا ناممکن ہے۔‘‘

’’تو... تو پھر اس الجھن، اس اذیت کا حل کیا ہوگا؟‘‘

"اس کا حل میرے پاس نہیں ہے اور اگر کوئی حل ہے تو اتنا کہ ہمیں اپنی اپنی زندگی جینا ہوگی۔"

"مگر ہماری زندگی الگ الگ تو نہیں ہے۔"

"نہیں ہے تو کرنا ہوگی۔ ایک زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا، تبھی بات بنے گی۔"

"بنے گی یا بگڑے گی؟"

"دیکھو، تم مسلسل بے معنی باتیں کررہے ہو۔ یہ ایک لاحاصل بحث ہے اور تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ مجھے اس طرح کی گفتگو قطعی پسند نہیں۔ لہٰذا اب میں تم سے کوئی بات نہیں کروں گا... سوری۔" اتنا کہہ کر اس کا عکس بالکل خاموش ہوگیا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا بہت دیر تک اپنے عکس کو مخاطب کرتا رہا مگر وہ اس کی طرف سے مکمل طور پر لاتعلق رہا۔ آخر وہ مایوس ہوکر وہیں قالین پر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ اس کی کنپٹیوں میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں جن میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہورہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ زمین پر نہیں بلکہ کمہار کے اس چاک پر بیٹھا ہو جس پر بے شکل مٹی کا ڈھیلا رکھ کر کمہار اس مٹی کو اپنی مرضی کی شکل میں ڈھال لیتا ہے۔ اسے بھی اپنا وجود ایسے ہی کسی چاک پر مٹی کے ایک بے صورت ڈھیر کی طرح پڑا محسوس ہورہا تھا اور کوئی ناقابلِ فہم قوت اس چاک کو گھما رہی تھی... اسے گردش میں رکھے ہوئے تھی اور اس کا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔ اس نے جبڑے بھینچ لیے۔ سر گھٹنوں میں دبائے رکھا۔ آنکھیں زور سے بند کرلیں اور پھر آہستہ آہستہ اس کا دماغ پُرسکون ہونے لگا۔ وہ گردش، وہ چکر تھمنے لگے۔ سماعت میں گونجتی سائیں سائیں کی آوازوں کی جگہ ایک گمبھیر خاموشی نے لے لی۔

اس نے آنکھیں کھول کر سر اٹھایا۔ سب کچھ بدل چکا تھا۔ وہ کسی سجے سجائے بیڈروم میں نہیں تھا۔ نہ ہی وہ آٹھ سالہ بچے کے قالب میں تھا بلکہ وہ اٹھائیس سالہ جوان آدمی کے روپ میں اسی صنم کدے، اسی تہ خانے میں موجود تھا جہاں گزشتہ چودہ برس سے وہ روزانہ کئی گھنٹے گزارتا تھا۔

☆☆☆

گو کہ حبیب الرحمٰن قصوری کی کوٹھی میں بیسیوں افراد موجود تھے مگر اس کمرے میں وہ چھ ہی تھے۔ ملک ظفر اقبال، مصطفیٰ شہزاد اور توحید علی جبکہ باقی تینوں افراد فارنسک ڈپارٹمنٹ سے تعلق رکھتے تھے۔

ان کے علاوہ ایک اور انسانی وجود بھی وہاں موجود تھا اور وہ تھا حبیب الرحمٰن قصوری کا مگر وہ محض وجود ہی تھا۔ قصوری صاحب اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

یہ ان کا اسٹڈی روم تھا۔ دو طرف دیوار گیر الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک طرف رائٹنگ ٹیبل، کرسی، بغلی دیوار کے ساتھ کاؤچ اور کاؤچ کے پہلو میں واش روم تھا۔ ملک ظفر اور مصطفیٰ دونوں کرسی پر موجود قصوری صاحب کی لاش کے قریب کھڑے تھے۔ لاش کی حالت کچھ ایسی کریہہ اور دہشت ناک تھی کہ ان سب کے دل لرز اٹھے تھے۔

لاش مادر زاد برہنہ حالت میں تھی۔ دائیں ٹانگ گویا شاہانہ انداز میں ٹیبل کے اوپر دھری تھی۔ گردن بائیں طرف قدرے ڈھلکی ہوئی تھی اور شہادت کی انگلی کنپٹی کا سہارا لیے ہاتھ کو نیچے گرنے سے روکے ہوئے تھی۔ کٹا ہوا نرخرہ اور گردن کے اطراف کھال کے اندر تک اتری ہوئی لکیر سی ثابت کرتی تھی کہ یہ قتل بھی اسی قاتل کا کام ہے جس نے گزشتہ ڈیڑھ ماہ میں پولیس والوں کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ اب سے پہلے جو قتل ہوئے تھے، ان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق قتل کا طریقہ کار ایک ہی رہا تھا۔ قاتل کوئی باریک دھاتی تار استعمال کرتا تھا مگر یہاں اس نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا۔

قصوری صاحب کے دونوں جبڑے کانوں تک چرے ہوئے تھے اور سارے وجود پر اتنے چرکے لگے ہوئے تھے کہ ان کی گنتی محال تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ قتل کرنے کے بعد لاش کو اس حالت میں یہاں ڈالا گیا ہے۔ ان کی کرسی سے لے کر کاؤچ تک کارپٹ پر خون کی واضح اور موٹی لکیر بنی ہوئی تھی اور کاؤچ کے قریب سے کارپٹ کا اچھا خاصا حصہ خون کے ملغوبے اور گوشت کے لوتھڑوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

یقیناً قاتل نے قصوری صاحب کو اس جگہ ذبح کرنے کے بعد اپنی جنوں کی نفرت کا اظہار کیا تھا۔

گزرے ہوئے ڈیڑھ ماہ میں ہونے والا یہ ساتواں قتل تھا۔ پہلا قتل بیگم رخشندہ خورشید کا تھا۔ دوسرا ہویدا ریاض نامی لڑکی کا۔ اس کے بعد دو قتل ایک ساتھ، ایک ہی رات میں ہوئے۔ ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں جلیل حیدر.... مردہ پائے گئے۔ قاتل نے ان کے سینے میں لمبے پھل کا چھرا یا خنجر گھونپ کر انہیں قتل کیا تھا اور ان کی اہلیہ کو قتل کرنے کے بعد ایک بوری میں بند کرکے وہ بوری ساحل سمندر پر جا پھینکی تھی۔ پانچواں قتل مقتولہ بیگم رخشندہ خورشید کے بڑے بیٹے منظر خورشید کا ہوا تھا۔ اس کی بوری بند لاش بھی ہاکس بے کے علاقے میں پائی گئی تھی۔ چھٹا قتل حمیرا ضیا کا تھا اور اب

ساتواں قتل قصوری صاحب کا ہوا تھا۔ اب تک کا سب سے زیادہ بے رحمانہ اور پُرتشدد قتل... ان سبھی وارداتوں میں ایک بات اہم اور قابلِ غور تھی اور وہ یہ کہ قتل ہونے والے ان سات افراد میں سے پانچ کا تعلق ایک ہی کالج سے تھا۔ بیگم رخشندہ خورشید اور نزہت جلیل.... دونوں کالج کی قابل ترین پروفیسرز تھیں جبکہ ہویدا ریاض، منظر خورشید اور حمیرا ضیا کالج کے ایکس اسٹوڈنٹس تھے۔ تینوں کالج فیلوز تھے اور چھ سال پہلے اپنا ماسٹرز مکمل کرکے جا چکے تھے۔

"خدا کی پناہ! یہ قاتل کوئی پاگل درندہ ہے۔ ایسی بے رحمی اور سنگ دلی..." ملک ظفر نے کراہت آمیز انداز میں رخ پھیرا تو ان کی نظر توحید علی پر پڑی جو کچھ فاصلے پر دیوار کی طرف رخ کیے کھڑا تھا۔ دیوار پر غالباً خون کی مدد سے کچھ تحریر کیا گیا تھا۔

"کیا ہے یہ؟" ملک ظفر نے متجسس انداز میں کہا اور اس کی طرف بڑھ گئے۔ مصطفیٰ بھی اس طرف متوجہ ہوگیا۔

توحید نے پلٹے بغیر جواب دیا۔

"قاتل کی ذات کا پہلا سراغ... یہاں وہ اپنی ذات کے ایک گوشے کو بے نقاب کررہا ہے۔"

ملک ظفر اور مصطفیٰ بھی اس کے برابر جا کھڑے ہوئے۔ دیوار پر خون کی مدد سے لکھی گئی تحریر ایک نظم کی صورت میں تھی۔

میرا ایمان ہے تم بھی ہو جانتے
مارتا ہے وہی جس نے پیدا کیا زندگی کو یہاں
موت کے ضابطوں کا مرتب وہی
جس نے بخشی تو ازندگی کو یہاں
اس کے اس حال کا بھی ہے لیکھت وہی
سو مرے مہرباں!
نام لب پہ کبھی میرا لانا نہیں
کوئی الزام مجھ پر اٹھانا نہیں
میں نے اتنا کیا
اس کی اس چاہ میں
اپنے ہر سانس کو، اپنے ہر خواب کو
اپنے اس آج سے
آنے والے کسی آخری آج تک
اپنی اس ذات کو وقف ہے کردیا
...خیر اندیش
رام جہانگیر

"رام جہانگیر!" ملک ظفر بڑبڑائے۔ "بھلا اس کا کیا مطلب ہوا... اور کیا کہنا چاہتا ہے یہ؟"

"وہ کیا کہنا چاہتا ہے یا کیا کہہ گزرا ہے، یہ تو آپ بھی اچھی طرح سمجھ رہے ہیں ملک صاحب۔" توحید علی نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ایک گہرا سانس لیتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔

"آپ کے لوگ اب تک اس کا کوئی بھی سراغ حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ شاید اسی لیے وہ اب اس نظم کے ذریعے اپنے متعلق کچھ بتا رہا ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ آپ لوگوں کے ساتھ کچھ مزید کھل کر کھیلنا چاہ رہا ہے۔"

"تم کیا اس سب کو ایک کھیل سمجھ رہے ہو؟" مصطفیٰ کا لہجہ قدرے تیز تھا۔

"میں تو نہیں، ہاں البتہ قاتل کے نزدیک یقیناً یہ سب ایک کھیل ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔" توحید نے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ "ذرا اس پر تو غور فرمایئے... وہ آپ لوگوں ہی سے مخاطب ہے اور اس سارے خونی کھیل کے ساتھ ساتھ وہ آپ لوگوں کی بے بسی کو بھی انجوائے کررہا ہے۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہ کم بخت واقعی انجوائے کررہا ہے۔" ملک ظفر نے ایک نظر قصوری کی لاش پر ڈالتے ہوئے کہا پھر دیوار کی طرف دیکھا۔

"مجھے یہ معاملہ سلجھتا نہیں، مزید الجھتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔" ملک ظفر کے لہجے میں شدید فکر و پریشانی تھی اور پیشانی پر لکیروں کا جال۔

ٹھیک اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور ایس ایچ او قاسم اندر داخل ہوا۔ اس نے ایک نظر قصوری کی لاش کی طرف دیکھا اور پھر ملک ظفر سے مخاطب ہوا۔

"سر! سب کے بیان محفوظ کرلیے ہیں۔ قصوری صاحب کی فیملی رات یہاں موجود نہیں تھی۔ وہ لوگ صبح واپس آئے ہیں۔ لاش سب سے پہلے مسز قصوری نے دیکھی تھی۔ سیکیورٹی گارڈز ساری رات گیٹ پر موجود رہے ہیں۔ انہوں نے کسی قسم کی کوئی غیر معمولی بات نوٹ نہیں کی۔ فون پر اس واردات کی اطلاع قصوری صاحب کی بیٹی شمائلہ نے دی تھی۔ ابھی اس سے بات چیت کے دوران معلوم ہوا ہے کہ چھ سال پہلے تک وہ بھی میڈم رخشندہ اور میڈم نزہت کی اسٹوڈنٹ رہی ہے۔ یعنی قاتل کا اصل شکار یہی تھی مگر خوش قسمتی سے وہ رات یہاں موجود نہیں تھی اور جلیل حیدر کی طرح قصوری صاحب بھی اپنی بدقسمتی سے قاتل کے جنون کا نشانہ بن کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔" قاسم نے جیسے خبرنامہ پڑھنا شروع کردیا تھا۔

''قصوری صاحب کی بدقسمتی کے ساتھ ساتھ یہ محکمے کی نااہلی بھی ہے کہ ابھی تک قاتل کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا۔'' ملک ظفر نے خشک لہجے میں کہا۔ ''کالج کی طرف سے کوئی نئی بات سامنے آئی؟''

''ہم نے پورے اسٹاف اور ملازمین کو چیک کیا ہے سر! مقتولین کے عزیز و اقارب اور حلقۂ احباب سے بھی پوچھ گچھ کی ہے، چند گرفتاریاں بھی ڈالی ہیں۔ قتل ہونے والوں میں سے صرف منظر خورشید اور ہویدا ریاض کے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ ان کے درمیان بے تکلفانہ دوستی تھی۔ باقی تقریباً ایک دوسرے کو ٹھیک سے جانتے بھی نہیں تھے۔''

''پھر کس نتیجے پر پہنچے تم؟''

''کچھ مشکوک افراد کی مسلسل نگرانی بھی کی جارہی ہے مگر مجھے افسوس اور شرمندگی ہے کہ فی الحال ہم کوئی بھی تسلی بخش نتیجہ قائم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ بس ایک کمزور سا اندازہ ہے کہ قاتل بھی کوئی ایکس اسٹوڈنٹ ہو سکتا ہے لیکن ایسے اسٹوڈنٹس کی تعداد سیکڑوں، ہزاروں میں ہے۔ لہٰذا سب کے متعلق جاننا یا انہیں چیک کرنا بھی ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ مقتولین کے چند کالج فیلوز کو ٹریس کرلیا گیا ہے لیکن ان سے بھی کوئی قابلِ ذکر بات معلوم نہیں ہو سکی۔''

''اور یقینی طور پر شائلہ سے بھی اس سلسلے میں کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی ہوگی؟'' ملک ظفر کی چبھتی نظروں کے سامنے قاسم نے گردن جھکالی۔

''جی سر!''

ملک ظفر نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے اور آہستہ قدموں سے وہیں ٹہلنے لگے۔ فارنسک ڈپارٹمنٹ والے کمرے کے کونے کھدرے ٹٹول چکنے کے بعد اب قصوری کی لاش کا معائنہ کررہے تھے۔

اچانک ملک ظفر کے موبائل پر بیل ہوئی۔ انہوں نے سیل نکال کر کالر کا نام دیکھا۔ پھر کال ریسیو کرتے ہوئے موبائل کان سے لگالیا۔

''جی سر! حکم کیجیے؟''

''جی... مجھے معلوم ہے اور میں خود بھی موقع پر موجود ہوں۔''

''جی سر... جی ہاں... بالکل... یس سر! کچھ امید بنی تو ہے۔'' اس نے تیکھی نظروں سے قاسم اور مصطفیٰ کو گھورا۔ ''یس سر! میں سمجھتا ہوں۔ عام طور پر تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ قاتل، مقتول کا اپنا کوئی جاننے والا ہی ہوتا ہے اور اڑتالیس گھنٹوں میں ہی قاتل کے متعلق ٹھوس ثبوت بھی مل جایا کرتا ہے۔ لیکن سر! آپ کو بھی معلوم ہی ہے کہ یہ سیریل کلنگ کا معاملہ ذرا مختلف ہوتا ہے... یس سر! انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ یس سر! جی... جی بہت بہتر۔''

انہوں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے موبائل کان سے ہٹالیا۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جاچکا تھا۔

''جی تو مصطفیٰ شہزاد اور قاسم شاہ صاحب! آپ لوگوں کی اپنے متعلق کیا رائے ہے؟'' ملک ظفر کے سوال کا مطلب وہ دونوں ہی ٹھیک سے سمجھ نہیں پائے تھے۔ البتہ ملک ظفر کے لب و لہجے اور چہرے کے تاثرات سے دونوں ہی کو بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ فون پر کسی افسرِ اعلیٰ نے ملک ظفر کی قابلیت کو سراہا ہے۔

''رائے... کیسی سر!'' قاسم نے جاننا چاہا۔

''آپ کے ابا حضور پوچھ رہے تھے۔'' ملک ظفر نے موبائل ان دونوں کو دکھایا۔ ''کہ قاتل گرفتار ہوتا ہے یا تم لوگوں کو نااہل تسلیم کرتے ہوئے تمہاری جگہ کسی اور کو دے دی جائے... اب تم لوگ خود بتادو کہ اپنے متعلق کیا رائے رکھتے ہو؟''

''سر! آپ کے سامنے ہی ہے سب کچھ... ہم تو کوئی کوتاہی، کوئی ڈھیل نہیں دکھا رہے... باقی جیسے اور جو حکم آپ فرمادیں، ہم تو ہر لمحہ حاضر و تیار کھڑے ہیں۔''

ملک ظفر، قاسم کے لب و لہجے اور چہرے کی بے چارگی پر بس خاموشی سے اسے گھورتے رہ گئے۔

''ایک ہفتہ...'' چند لمحے بعد ملک ظفر گمبھیر لہجے میں بولے۔ ''جسٹ ون ویک... تم لوگوں کے پاس مزید ایک ہفتے کا وقت... صرف ایک ہفتہ۔''

''جی سر!'' دونوں ہی بہ یک زبان بولے۔

ملک ظفر چند لمحے کھڑے کچھ سوچتے رہے۔ پھر قاسم سے مخاطب ہوئے۔

''بیگم رخشندہ قتل ہوئیں تو منظر اس دن شہر ہی سے باہر تھا۔ جس دن وہ واپس آیا، اس سے اگلی رات وہ بھی مارا گیا۔ اب رات قصوری صاحب کی بیٹی... شائلہ یہاں موجود نہیں تھی تو قصوری صاحب مارے گئے... اگر قاتل کا اصل شکار شائلہ ہی تھی جیسا کہ اس سیریل سے ثابت ہوتا ہے تو پھر یقیناً قاتل آئندہ کسی وقت شائلہ پر لازمی ہاتھ ڈالے گا۔ اس لحاظ سے فی الوقت شائلہ کی ذات بہت ہی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔''

''ویل۔'' توحید نے نوٹ بک بند کرکے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک طرح سے دیکھا

جائے تو شائلہ اس وقت وہ واحد ذریعہ ہے جس کے بہتر استعمال سے آپ لوگ آج نہیں تو کل ضرور قاتل تک پہنچ سکتے ہیں۔''

''مصطفیٰ!'' ملک ظفر اس سے مخاطب ہوئے۔ ''شائلہ والا معاملہ مکمل طور پر تمہارے حوالے۔''

''یس سر!'' وہ جیسے پوری طرح مستعد تھا۔

''ایک دو مستعد جوانوں کے ساتھ تم خود بھی یہیں ڈیرے ڈال لو۔ بہتر ہوگا کہ ملازمین کی جگہ لے لو اور یاد رہے کہ غلطی اور کوتاہی کی ہمارے پاس قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

''کوئی کوتاہی نہیں ہوگی سر!''

''گڈ... اور قاسم! تم ابھی اور اسی وقت دوبارہ کالج پہنچ جاؤ۔ پتا کرو گزشتہ چند ماہ میں کالج انتظامیہ اور اسٹاف میں سے کون گیا، یا کون نیا آیا۔ پیونز اور کینٹین ملازمین سے لے کر پرنسپل تک۔ مجھے سب کے نام اور حدود اربعہ ڈٹن شیپ میں چاہیے... جلد از جلد۔''

''جی، بہتر سر!'' قاسم پلٹنے لگا تو ملک ظفر تیزی سے بولے۔

''اور سنو! ایک نام، رام جہانگیر... اس کے متعلق خصوصی طور پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو اور گزشتہ چند سالوں میں جہانگیر نام کے جتنے اسٹوڈنٹس بھی کالج سے متعلق رہے ہیں، ان کا بایو ڈیٹا بھی حاصل کرو اور یہ سب تحریری صورت میں میرے آفس پہنچاؤ۔''

''ابھی چند گھنٹوں میں پہنچ جائے گا سر۔''

''اوکے تو پھر نکلو تم۔ میں یہاں کا معاملہ خود دیکھ رہا ہوں۔ ادھر سے فارغ ہوکر آفس میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

''جی سر جی!'' قاسم نے ملک ظفر کو سیلیوٹ جھاڑا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد ملک ظفر، مصطفیٰ شہزاد اور توحید علی کے درمیان کچھ دیر تک کیس اور قاتل کے متعلق تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ فارنسک والوں نے اپنی ناکامی کا اظہار کردیا۔ ضابطے کی کارروائی مکمل ہوگئی تو قصوری کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا گیا۔ گھر کے دیگر افراد کو اپنے آئندہ پروگرام کے مطابق اعتماد میں لینے کے بعد ملک ظفر آفس کے لیے روانہ ہوگئے تو توحید نے بھی مصطفیٰ سے رخصت لی۔ توحید کو..... اخبار کے دفتر سے ہوتے ہوئے اپنے دفتر پہنچنا تھا۔

اخبار کی یہ ملازمت محض اس کا شوق تھی، ذریعہ معاش نہیں۔ ایک چھوٹی سی پلاسٹک انڈسٹری کے نام پر اس کا

☆ اللہ کے سوا کبھی بھی کسی سے کوئی سوال نہیں کرنا چاہیے۔

☆ جب زمانہ تجھے تکلیف دے تو مخلوق کی طرف مائل نہ ہو بلکہ اپنے خالق سے رجوع کر۔

☆ ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود ایک ظلم ہے۔

☆ خدا دنیا اپنے دوست دشمن دونوں کو دیتا ہے مگر دین صرف دوستوں کو ہی دیتا ہے۔

☆ برے لوگ سخت پتھر ہیں جن سے پانی نہیں نکلتا۔ وہ درخت ہیں جن کے پتے سبز نہیں ہوتے اور وہ زمین ہیں جس سے نباتات نہیں اگتیں۔

☆ آدمی کی نیک بختی اس میں بھی ہے کہ اس کا دشمن عقل مند ہو۔

☆ شہوتوں کے گھوڑے پر سوار شخص کی ٹھوکریں قابلِ علاج نہیں ہوا کرتیں۔

مرسلہ: تانی چوہدری، یوکے

لاکھوں کا ذاتی بزنس تھا۔ صحافت میں چونکہ اسے ویسے ہی دلچسپی تھی، اس لیے چند سال پہلے اس نے ایک معروف اخبار کے لیے باقاعدہ رپورٹنگ شروع کردی تھی اور تھوڑے ہی عرصے میں اپنی ایک شفاف شناخت بھی بنالی تھی۔ تھانہ، کچہری، پولیس، مجرم اس سب سے اس کا مسلسل واسطہ چلا آرہا تھا۔ کئی پولیس افسران کے اگر اس نے انٹرویوز لیے تھے تو کئی ایک مجرموں کی آپ بیتیاں اور جرائم کی کہانیاں بھی لکھی تھیں۔

☆☆☆

''سر جی! رام جہانگیر نام کا کوئی شخص کبھی بھی کالج سے متعلق نہیں رہا۔ البتہ جہانگیر حسن، جہانگیر علی، جہانگیر اختر اور ایسے ہی ناموں کے بتیس اسٹوڈنٹس گزشتہ سات سالوں میں کالج میں رہے ہیں۔ ان سب کی تفصیل اس فائل میں موجود ہے۔'' قاسم نے مؤدبانہ انداز میں ایک فائل ملک ظفر کو پکڑائی۔ وہ اس وقت انہی کے آفس میں موجود تھا۔

''ان بتیس کے علاوہ ایک جہانگیر اور ہے جو مجھے ذاتی

طور پر ان سب سے کچھ مختلف اور مشکوک معلوم ہوا ہے۔"

قاسم نے سامنے کی جیب سے ایک تصویر نکال کر ملک ظفر کی طرف بڑھائی تو انہوں نے فائل کھولتے کھولتے رک کر ہاتھ بڑھایا اور قاسم کے ہاتھ سے تصویر لے لی۔ یہ ایک اٹھائیس تیس سالہ لڑکے کی تصویر تھی۔ عام سے نقوش تھے البتہ آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور چہرے پر پھیلی ایک عصیلی سی سنجیدگی دیکھنے والے کو پہلی ہی نظر میں اپنے ہونے کا احساس دلاتی تھی۔

"اس کا پورا نام احمد جہانگیر معلوم ہوا ہے۔" قاسم اس کے متعلق تفصیل سے بتانے لگا۔ "اپنے تعلیمی دور میں یہ کبھی بھی سیکنڈ پوزیشن پر نہیں آیا۔ شاعری سے بھی شغف رکھتا ہے۔ چھ سال پہلے اسی کالج سے اس نے ایم ایس سی فزکس میں ٹاپ کیا تو اسے کالج میں آنریری لیکچررشپ دے دی گئی۔

"ضرورت سے زیادہ کم آمیز اور سنجیدہ تو اسے شروع سے شمار کیا جاتا تھا۔ لیکچررشپ کے بعد جلد ہی بھی اسٹوڈنٹس اور اسٹاف پر اس کے مزاج کی تیزی اور تلخی بھی آشکار ہو گئی۔ گزشتہ چند سالوں میں کئی بار اسٹوڈنٹس کے ساتھ بھی اس کی گرمی سردی ہوئی اور چند ایک بار اپنے سینئرز کے ساتھ بھی منہ ماری ہوئی۔ میڈم نزہت کے ساتھ بھی ایک بار کسی معمولی سے اختلاف پر اس کی اچھی خاصی تلخ کلامی ہوئی تھی۔

"چند ایک بار اسے اس کے رویے کی بنا پر پرنسپل صاحب کی طرف سے متنبہ بھی کیا گیا مگر شاید اسے اپنے مزاج پر اختیار ہی نہیں تھا۔ آخرکار چار ماہ پہلے اسے جاب سے فارغ کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ کالج کے اسٹاف یا دیگر ملازمین میں سے نہ تو کسی کو ملازمت سے نکالا گیا اور نہ ہی کسی کو رکھا گیا ہے۔"

ملک ظفر جیسے جیسے احمد جہانگیر کے متعلق تفصیل سنتے گئے، ان کے خون کی گردش میں ایک غیر محسوس سی تیزی آتی گئی۔

رام جہانگیر، احمد جہانگیر... رام جہانگیر، احمد جہانگیر۔ یہ دو نام تیزی سے ان کے ذہن میں غتربود ہونے لگے۔ ان کی چھٹی حس یا وجدان جیسے ان سے کہہ اٹھا تھا کہ بس اب ان کی تلاش کو ست مل گئی ہے۔ وہ اب مجرم سے اور مجرم ان سے زیادہ دور نہیں ہے۔

احمد جہانگیر جیسے ان کے ذہن میں موجود مجرم کے اسکیچ میں پوری طرح فٹ بیٹھ رہا تھا۔

"اس کے متعلق حالیہ رپورٹ کیا ہے؟"

"سر! شروع دنوں کی تفتیش میں، میں نے اسے مشکوک فرد کی حیثیت سے چیک کرنے کی کوشش کی تھی۔ سوسائٹی میں ایک پرانی سی کوٹھی میں تنہا رہتا تھا۔ والدین گزر چکے ہیں۔ آگے پیچھے اور کوئی ہے نہیں۔ کوٹھی پر تالا تھا۔ اردگرد سے بھی کوئی زیادہ جانکاری نہیں مل سکی کیونکہ پڑوسیوں کے ساتھ اس نے کبھی دعا سلام رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ کوٹھی پر تقریباً پندرہ بیس دن سے تالا ہے اور آس پڑوس والوں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔ شاید شہر ہی سے کہیں باہر گیا ہو ہے۔ اب بھی ایک کانسٹیبل وہاں ڈیوٹی دے رہا ہے مگر یہ شخص تاحال وہاں واپس نہیں آیا۔"

ملک ظفر کی طبیعت میں اضطراب پیدا ہونے لگا۔ ان کا شبہ کچھ مزید پختہ ہو رہا تھا۔

"اس کو تلاش کرو قاسم! معلوم کرو یہ اس وقت کہاں ہے۔ اگر شہر سے کہیں باہر ہے تو یہ معلوم کرو کہ باہر کہاں ہے۔ کس شہر میں ہے۔ اور بھی جو کچھ معلوم ہو سکے، معلوم کرو۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ ہمارا مطلوبہ شخص ہو سکتا ہے... اس لحاظ سے یہ پوائنٹ بھی ذہن میں رکھنا کہ عین ممکن ہے یہ یہیں اسی شہر میں کہیں موجود ہو۔"

"جی، بہتر سر!"

☆☆☆

شاید کسی طرح وجود کو ایک زور کا جھٹکا لگا تھا۔

بے ہوشی کے بعد یہ پہلا احساس تھا جس نے شگفتہ جمال کے حواسوں کو اپنے ہونے کا احساس دلایا تھا۔ بے ہوشی کی حالت میں اترتے وقت کا منظر اور دہشت ابھی تک اس کے دماغ میں جوں کی توں کھڑی تھی۔ سینے میں ایک ٹیس سی ٹوٹی اور اپنی پسلیاں اسے کسی شکنجے میں جکڑی ہوئی محسوس ہوئیں۔ دماغ جیسے ایک جھماکے سے روشن ہو گیا۔ حواس پوری طرح لوٹ آئے تو اس نے خود کو کسی گاڑی کی دو سیٹوں کے درمیان ٹھنسا ہوا پایا۔ دونوں ہاتھ پشت پر کس کر باندھے گئے تھے اور پیر غالباً اسی کے دوپٹے سے جکڑ دیے گئے تھے۔ ایک دوپٹا نما کپڑا اس کے منہ پر بھی باندھ دیا گیا تھا اور گاڑی تیز رفتاری سے کسی انجانی سمت رواں تھی۔ شگفتہ نے بے اختیار چیختے ہوئے تڑپ کر اٹھنا چاہا، مگر کراہ کر رہ گئی۔ پسلیوں میں شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ تبھی ایک سخت ہاتھ نے مضبوطی کے ساتھ عقب سے اس کی گردن دبوچ لی اور خوف و دہشت کی ایک یخ لہر اس کے پیروں تک سرسرا گئی۔

"ریلیکس... شگفتہ جی! اگر آپ زندہ رہنا چاہتی ہیں تو صبر و تحمل سے کچھ دیر مزید یونہی گزار لیں... پلیز۔" ساتھ

ہی گردن پر موجود گرفت کچھ اور سخت ہو گئی۔ شگفتہ کے وجود سے جیسے جان ہی نکل گئی۔ وہ وحشی جانور ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا اور اب اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے شگفتہ کی گردن بھی دبوچ رکھی تھی۔

اس کے ذہن میں بے ہوش ہونے سے پہلے کی یاد ابھری۔

وہ معمول کے مطابق اپنی بڑی بہن شائستہ جمال کے ساتھ سو رہی تھی کہ کچھ عجیب سی آوازوں پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ فوراً ہی اسے کسی شدید قسم کی گڑبڑ کا احساس ہوا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر بیڈ سائڈ لیمپ روشن کر دیا۔ تبھی اس نے وہ بھیانک منظر دیکھا...

اس کی بڑی بہن اپنی جگہ بُری طرح تڑپ رہی تھی۔ ایک انتہائی وحشی صورت انسان اس کے سرہانے موجود تھا جس نے کوئی باریک ڈوری یا تار شائستہ کی گردن کے گرد لپیٹ کر پوری طاقت سے کس رکھا تھا۔ شائستہ کی گردن سے ہلکا ہلکا خون بھی رس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور وہ پھڑپھڑا رہی تھی۔ شگفتہ کے اندر سے ایک چیخ اٹھی لیکن اسے باہر آنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اچانک وہ بھوکے عقاب کی طرح اس کی طرف جھپٹا اور ایک چوڑا ہاتھ اس کے منہ پر آ جما۔ شگفتہ کی تو جیسے روح ہی فنا ہو چکی تھی۔ اس درندے نے ایک جھٹکا دیا تو وہ کسی بے جان بوری کی طرح شائستہ کے برابر ہی میں ڈھیر ہو گئی اور وہ جیسے پلک جھپکتے میں ان دونوں بہنوں کے اوپر سوار ہو گیا۔ دونوں بہنوں کی گردنیں اس نے اپنے ہاتھوں کے شکنجوں میں بُری طرح جکڑ لی تھیں۔ شگفتہ کے اعصاب خوف کی زیادتی سے یوں شل ہوئے کہ وہ بے چاری ٹھیک سے مزاحمت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

یک بہ یک اس کے ذہن میں گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ سے سنی اور پڑھی گئی وہ تمام خبریں آ گئیں جو سیریل کلر کے حوالے سے متواتر سامنے آ رہی تھیں۔ وہ اس سارے سلسلے سے خصوصاً کچھ اس لیے بھی آگاہ تھی کیونکہ یہ سب ان دونوں بہنوں کے درمیان مسلسل موضوع گفتگو رہا تھا۔ کیونکہ ایک طرح سے اس کی بہن شائستہ بھی مقتولین ہی کی کیٹیگری میں آتی تھی۔ اس نے بھی اسی کالج سے ماسٹرز کیا تھا اور ماسٹرز کیے ہوئے اسے بھی چھ سال ہی گزرے تھے۔ یعنی سات میں سے تین اس کے کالج فیلوز تھے اور دو اس کی پروفیسرز... مسز نزہت جلیل تو اس کی فیورٹ ہوا کرتی تھیں اور آج... آج اس کی اپنی باری آ گئی تھی۔

شگفتہ کا دم گھٹ رہا تھا۔ اپنی کنپٹیوں میں ٹھنڈک کے ساتھ ساتھ دماغ میں گاڑھا دھواں سا بھرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج آپی کے ساتھ ساتھ میری سانس بھی پوری ہوئی۔ یقیناً صبح ہم دونوں کی بوری بند لاشیں پولیس والوں کو ساحل کنارے ملیں گی پھر شاید دم گھٹنے کے باعث یا مارے خوف کے وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور اب دوبارہ ہوش آنے پر وہ یہاں گاڑی میں یوں بے بس پڑی اس پاگل مجنوں قاتل کے ساتھ سفر کرنے پر مجبور تھی جس نے انتہائی بیدردی سے سات قتل پہلے کیے تھے اور آٹھواں شاید اب سے کچھ دیر پہلے اس کی بڑی بہن کا کر چکا تھا۔

گاڑی اچانک رک گئی۔ قاتل گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو شگفتہ نے ایک بار پھر ان سیٹوں کے شکنجے میں سے نکلنے کی کوشش کی۔ پسلیوں میں تکلیف کی شدت سے وہ تڑپ اٹھی۔ اس نے خود کو بے بس پایا۔ چند لمحوں بعد ہی قاتل دوبارہ اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس دوران میں کچھ ایسی آوازیں سنائی دی تھیں جیسے کوئی گیٹ وغیرہ کھولا گیا ہو۔ شگفتہ کے دل نے گواہی دی کہ قاتل اسے اغوا کرنے کے بعد کامیابی سے اپنے ٹھکانے تک لا چکا ہے اور اس کے دل کی یہ گواہی بالکل سچ ثابت ہوئی۔ گاڑی آگے بڑھ کر ایک گیٹ سے گزری اور اس عمارت کے کسی تاریک گوشے میں جا رکی۔ قاتل، انجن بند کر کے باہر نکلا پھر عقبی دروازے سے اندر آ کر اس نے شگفتہ کو کندھوں سے پکڑ کر ایک ہی جھٹکے میں سیٹوں کے درمیان میں سے باہر کھینچ لیا۔

قاتل نے اسے گاڑی سے باہر نکالا تو اسے معلوم ہوا کہ عمارت کا صرف یہ گوشہ ہی تاریک نہیں بلکہ پوری عمارت ہی تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ قاتل نے اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر لادا اور کوٹھی کی اندرونی جانب چل پڑا۔

عمارت کے اندرونی حصے میں داخل ہوتے ہی قاتل نے کوئی بٹن دبایا تو چاروں طرف ایک بیمار سی روشنی پھیل گئی۔ یہ ایک لاؤنج نما کمرا تھا۔ قاتل اسے کندھے پر لادے لادے آگے بڑھ گیا پھر ایک دو کمروں اور راہداریوں سے گزرنے کے بعد قاتل نے ایک بیڈ روم میں آ کر اسے آہستہ سے بیڈ پر ڈالا اور خود الٹے قدموں بیڈ روم سے باہر نکل گیا۔ دروازہ بند کرنا وہ نہیں بھولا تھا۔

اب تک جو کچھ گزرا تھا، وہ انتہائی ہولناک اور اعصاب شکن تھا۔ اب آگے کیا ہونے والا تھا....؟ یہ سوالیہ نشان پوری شدت سے اس کے دماغ میں جلنے بجھنے لگا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے ذہن میں اس حوالے سے کوئی بات نہیں آئی کہ قاتل نے قتل سے پہلے

کسی عورت یا لڑکی کو جنسی تشدد کا نشانہ بھی بنایا تھا۔ اب تک وہ صرف اپنے شکاروں کو ایک مخصوص اور سفاک طریقۂ کار سے قتل کرتا آیا تھا۔ پھر بھی... وہ ایک جنونی، بے رحم قاتل تھا... ایسے شخص سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی تھی۔

وہ ابھی حال ہی میں ایف ایس سی کلیئر کرنے کے بعد تھرڈ ایئر میں آئی تھی۔ مقتولین والے کالج سے تو اس کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا... وہ تو کبھی اس کے پاس سے بھی نہیں گزری تھی۔ اس کے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ اب جو ہونے والا ہے، وہ پہلے سے بھی زیادہ ہولناک اور زیادہ اعصاب شکن ہوگا۔ یکایک اس کی آنکھوں میں باقی گھر والوں کے چہرے گھوم گئے۔ ممی، پاپا، بھائی باسط، ابوبکر اور... اور آپی شائستہ... جو پتا نہیں زندہ بچی تھیں یا نہیں۔

بے اختیار اس کے دل میں دعا مچلی کہ کاش اسے اغوا کیے جانے کے بجائے قتل کیا جاچکا ہوتا۔ یکایک ہی اسے اپنے اردگرد اب تک قتل ہونے والوں کی خون میں لت پت، مسخ صورت لاشیں پڑی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ بیڈروم کی محدود فضا میں خون کی ثقیل سی بو بھر آئی اور شگفتہ کو متلی سی ہونے لگی۔

اچانک اس کے کانوں میں ایک عجیب سی آواز پڑی تو اس نے اپنی گھٹتی گھٹتی سسکیوں کو پوری طرح اپنے حلق میں گھونٹ لیا۔ آواز ہلکی مگر واضح تھی۔ بیڈروم سے باہر، کوئی گرائنڈر ٹائپ کی مشین چلا رہا تھا۔ یعنی وہ اس عمارت میں کہیں زیادہ دور نہیں گیا تھا... بیڈروم کے باہر کہیں قریب ہی موجود تھا۔ شگفتہ نے پہلی بار اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ ایک درمیانے سائز کا بیڈروم تھا۔ ہر چیز کی صورت اور ترتیب سے ایک نفاست اور عمدگی جھلکتی تھی۔ دائیں طرف دیوار پر جھولتے ہوئے پردوں کے عقب میں یقیناً کوئی کھڑکی تھی لیکن اس وقت کھڑکی، دروازے اس کے لیے بے معنی تھے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اس طرح جکڑے گئے تھے کہ وہ ہر طرح سے بے بسی اور لاچاری کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔

بیڈروم کے باہر سے سنائی دینے والی آواز بند ہوچکی تھی۔ چند لمحوں بعد بیڈروم کے دروازے پر آہٹ ہوئی تو وہ اپنی جگہ سہم کر رہ گئی۔ دروازہ کھلا اور وہ اندر آگیا۔ شگفتہ جمال کی دہشت زدہ آنکھیں اس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ٹرے سے چپک کر رہ گئیں جس میں شیشے کا ایک جگ دھرا تھا جو غالباً ملک شیک سے لبالب تھا۔ ساتھ میں ایک گلاس اور وائن کی بوتل...

وہ سیدھا چلتا ہوا اسی کی طرف آیا۔ ٹرے اس نے شگفتہ کے قریب بیڈ پر رکھی اور خود بھی بیٹھ گیا۔ شگفتہ نے سرک کر دور ہٹنا چاہا لیکن اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر شگفتہ کے منہ پر موجود کپڑے کو کھینچ کر نیچے کیا اور خود ٹرے میں جگ گلاس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''مم... مجھے... مجھے یہاں سے جانے دیجیے۔ پپ، پلیز... خدا کے لیے۔'' منہ آزاد ہوتے ہی اس کے لب بے اختیار حرکت میں آئے اور وہ جیسے سسک اٹھی۔

قاتل نے خاموشی کے ساتھ ملک شیک سے بھرا ہوا گلاس اٹھایا اور اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھا دیا۔ شگفتہ نے سر قدرے پیچھے ہٹا لیا۔

''خدا کے لیے... مجھ سے جو بھی غغ... غلطی ہوئی ہے، مم... مجھے اس کے لیے معاف کردیں اور گگ... گھر جانے دیں۔'' وہ ایک بار پھر گڑگڑائی۔

''پی لو۔'' اس کی سنجیدہ اور بھاری آواز شگفتہ کی سماعت میں جیسے گونجی۔

''نن... نہیں۔ آپ بس مجھے گھر جانے دیں۔ پلیز... پلیز!''

''باقی جو بھی ہوگا وہ اس کے بعد۔ پہلے تم یہ پی لو... لو شاباش۔'' اس کا لہجہ سنجیدہ اور حتمی تھا۔ شگفتہ کو اس کی آنکھوں میں سرخی سی ابھرتی محسوس ہوئی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ پوری طرح اس قاتل کے رحم و کرم پر ہے۔ وہ اس کے ساتھ کوئی بھی سلوک کرسکتا تھا مگر فی الحال تو وہ اسے ملک شیک پیش کررہا تھا۔ شگفتہ کو یہی بہتر لگا کہ فی الوقت وہ اس کی بات مان لے۔

''لو، پی لو۔'' اس نے گلاس شگفتہ کے ہونٹوں کے ساتھ لگایا تو وہ متذبذب انداز میں پینے لگی۔

آدھے سے زیادہ پی لینے کے بعد اس نے منہ ہٹا لیا۔

''بس... پلیز اور نہ مجھے قے ہوجائے گی۔''

وہ گلاس رکھ کر خاموشی سے شگفتہ جمال کی صورت تکنے لگا۔ شگفتہ کی حالت وہ تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ وہ اپنے اندر ہی اندر سمٹتی ہوئی عجیب ڈری سہمی وحشت ناک آنکھوں سے اس قاتل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ عام سے نقوش کا ایک اونچا لمبا آدمی تھا۔ چہرے پر گہری سنجیدگی اور دماغ کو اندر تک چھیدتی ہوئی خاموش آنکھیں۔ شگفتہ کو وہ چند گھنٹے پہلے سے کچھ مختلف دکھائی دیا۔ تبھی اسے احساس ہوا کہ وہ نہا دھو کر اپنے کپڑے وغیرہ تبدیل کرچکا ہے۔ بکھرے ہوئے بال اب سر پر سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ چند گھنٹے پہلے جو چہرہ فرطِ وحشت و غضب سے بری طرح بگڑا ہوا تھا، اب اس چہرے پر صرف سکون اور سنجیدگی دکھائی دے رہی تھی جس کے باعث ظاہری طور پر وہ ایک خاصا معقول شخص نظر آرہا تھا۔ البتہ اس کے اندر کی وہ وحشت ایک عکس کی صورت اب بھی اس کی آنکھوں میں موجود تھی۔

شگفتہ کے لیے یہ تبدیلی ناقابلِ یقین تھی۔ وہ متوقع طور پر ایک قتل اور ایک لڑکی کو اغوا کرنے کے فوری بعد نہا دھو کر چینج وغیرہ کرکے بالکل فریش اور مطمئن بیٹھا تھا۔

''مجھے گھر جانے دیں۔'' شگفتہ کی سوئی جیسے ایک ہی جگہ اٹک کر رہ گئی تھی۔ ''میرے ممی پاپا بہت پریشان ہوں گے۔ دیکھیں... میں نے آپ کا کچھ نہیں بگاڑا۔ میں تو... میں تو آپ کو جانتی تک نہیں۔ پھر... پھر بھلا آپ مجھے کیوں پکڑ لائے ہیں۔ آپ کو خدا کا واسطہ... مجھے چھوڑ دیں... جانے دیں۔'' شگفتہ کی آنکھیں پھر سے چھلک اٹھیں مگر اس کی فریاد شاید اس قاتل کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں سکی تھی۔ وہ لاتعلقی سے بیٹھا بوتل کے ساتھ مصروف رہا۔ اس نے کچھ توقف کیا پھر بولی۔

''میری ممی میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں۔ آپ کچھ رحم کریں۔ اگر... اگر مجھ سے کبھی کوئی غلطی ہوئی ہے یا... یا میری وجہ سے آپ کو کبھی کوئی تک... تکلیف یا نقصان پہنچا ہے تو... تو خدا گواہ ہے کہ اس کا مجھے معلوم نہیں۔ میں نے تو کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کا سوچا تک نہیں... پھر بھی... پھر بھی مجھے معاف کردیں... میں معافی مانگتی ہوں۔ مجھے چھوڑ دیں۔ پہلے ہی آپ ہم لوگوں کے ساتھ بہت کرچکے ہیں۔ پپ... پتا نہیں میری آپی کس حال میں ہوں گی، آپ...''

''سوری!'' اس کی گمبھیر آواز ابھری۔ ''اسے تو ہر صورت مرنا ہی تھا۔'' اس کا مختصر سا یہ جملہ شگفتہ کے سینے میں کسی بھالے کی طرح لگا۔

''آپ... آپ... آپی...'' وہ فرطِ جذبات سے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ آواز بالکل ہی رندھ گئی۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا چند لمحے تو سرد آنکھوں سے شگفتہ کی طرف دیکھتا رہا پھر دوبارہ بوتل کی طرف متوجہ ہوگیا۔

شگفتہ کو خون میں لت پت اپنی آپی کی لاش دکھائی دے رہی تھی اور روتے چیختے ہوئے گھر کے دیگر افراد۔

''آپ کو خدا کا واسطہ ہے، مم... مجھے چھوڑ دیں۔ مجھے گھر جانے دیں۔ میری ممی کو کک... کچھ ہوجائے گا۔ وہ... وہ جی نہیں پائیں گی۔'' وہ بلک رہی تھی۔

''تمہیں کہیں کوئی تکلیف ہے؟''

''آں، ہاں، نن... نہیں تو۔'' وہ اس کے اچانک تخاطب پر گڑبڑائی۔

''تو پھر کیوں فضول میں شور مچا رہی ہو؟ ایک پُرسکون فضا ہے۔ آرام دہ ماحول ہے۔ ذرا سکون کی سانس لے کر تھوڑا سوچو سمجھو... صورتِ حال کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے اسے قبول کرنے کی کوشش کرو۔'' اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ایک ٹیچر ہو اور شگفتہ ایک پرلے درجے کی نالائق اسٹوڈنٹ۔

''آپ مجھ پر کچھ رحم کریں... پلیز۔'' وہ دوبارہ سے گھگیائی۔

''دل میں کوئی اندیشہ اور کوئی پریشانی مت رکھو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ تم اس چار دیواری کے اندر پوری طرح محفوظ ہو... یوں سمجھ لو کہ اس چار دیواری کے اندر موت بھی تم تک نہیں پہنچ سکتی۔''

پتا نہیں شگفتہ کو ایسا کیوں لگا کہ اس شخص کی آواز کچھ زیادہ ہی بھاری اور گونجیلی ہوکر سنائی دے رہی ہے۔

''آ... آپ خدا کے لیے... مجھے... چھوڑ دیں۔''

اسے خود اپنی آواز بھی اجنبی سی محسوس ہوئی تو وہ چونک پڑی۔ کچھ گڑبڑ تھی۔ اسے اپنے سر کا وزن بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ گردن کے لیے سر کو اٹھائے اور سنبھالے رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ یقیناً ملک شیک میں اسے کوئی نشہ آور دوا ملا کردی جاچکی تھی جس نے اب اپنا رنگ دکھانا شروع کردیا تھا۔ شگفتہ نے بوجھل ہوتی آنکھیں پٹ پٹا کر دیکھا۔ وہ بوتل منہ سے لگائے اپنی جگہ مطمئن سا بیٹھا تھا۔

''رحم... رح... خدا کے لیے...'' شگفتہ کو محسوس ہوا کہ اس کی زبان سن ہوچکی ہے۔

''تمہیں سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔'' ایک گمبھیر آواز اس کی کھوپڑی میں گونجی۔ ''لہٰذا فی الحال تم آرام سے سوجاؤ۔ اور یہ اچھی طرح جان لو کہ ابھی چند ایک روز تو تمہیں ہر صورت یہیں گزارنے ہوں گے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی... ابھی تم سوجاؤ... میں تمہارے ہاتھ پیر بھی کھول دیتا ہوں... بالکل بے فکر ہوکر سوجاؤ۔'' وہ گونج لحہ بہ لحہ دور ہوتی گئی اور اس کا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

ابھی ایک روز پہلے قصوری صاحب کا قتل ہوا تھا کہ آج پھر قاتل انتہائی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرگیا۔ یہ بھی ایک دہری واردات تھی۔ قاتل رات کسی وقت گلشن اقبال ٹاؤن میں جمال احمد غوری کے گھر داخل ہوا اور غوری صاحب کی

بڑی بیٹی شائستہ جمال (جو کہ سابقہ مقتولین کی کالج فیلو تھی) کو بیدردی سے قتل کرنے کے بعد ان کی چھوٹی بیٹی شگفتہ جمال کو اغوا کر کے کسی نامعلوم مقام پر لے گیا تھا۔

ساتھ ہی پورے شہر کی پولیس احمد جہانگیر کی بوسونگھتی پھر رہی تھی۔ اس کے متعلق جب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ ہویدا ریاض کا کلاس فیلو تھا، تب سے سارا محکمہ جیسے اس کی کھوج میں لگا ہوا تھا۔

جگہ جگہ چھاپے مارے جارہے تھے۔ شہر بھر کے سبھی مشکوک افراد سے پوچھ گچھ جاری تھی۔

سہ پہر قریباً تین بجے کا وقت تھا۔ ملک ظفر آفس میں اپنے سامنے بیٹھے توحید کو احمد جہانگیر کی تصویر دے رہے تھے انہوں نے خود ہی اسے فون کر کے بلایا تھا۔

''مضمون تمہارے پاس ہے۔ یہ رہی اس کی تصویر۔ نمایاں طور پر شائع ہونی چاہیے۔''

توحید نے ہاتھ بڑھا کر وہ تصویر لے لی۔ وہ عام سی شکل وصورت کا شخص تھا۔ البتہ اس کے خدوخال میں گندھی ہوئی کرخت سنجیدگی، اس کے مزاج کی شدت اور انتہا پسندی کی غمازی کرتی تھی۔

ٹھیک اسی وقت فون کی بیل ہوئی تو ملک ظفر نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے قاسم کی جوشیلی سی آواز سنائی دی۔ ''سر جی! قاسم عرض کر رہا ہوں۔ آپ کا اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا ہے جی... وہ احمد جہانگیر نامی بندہ یہیں، شہر ہی میں موجود ہے۔''

''کب... کیسے پتا چلا؟'' ملک ظفر ملنے والی اطلاع پر چونک اٹھے۔

''اب سے تقریباً ایک گھنٹا پہلے اسے کیماڑی میں دیکھا گیا ہے جناب۔''

''قاسم! کہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟'' ملک ظفر کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

''نہیں سر جی! سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ موٹر بائک پر تھا۔ ہمارے روکنے پر الٹا بھاگ کھڑا ہوا۔ ہم نے کوشش تو بہت کی کہ چھاپ لیں مگر وہ گلیوں میں کہیں غائب ہو گیا۔''

''کیا... یعنی وہ دکھائی دینے کے بعد فرار ہونے میں بھی کامیاب ہو گیا اور... اور تم کچھ بھی نہیں کر سکے؟''

توحید کو گفتگو سے اندازہ ہو گیا تھا کہ قاسم اور ملک ظفر کے درمیان کس کے متعلق بات ہو رہی ہے۔

''سر جی! ہم نے فوری طور پر پورے علاقے کو کور کر لیا ہے۔ ہماری آنکھ سے بچ کر کوئی پرندہ بھی اب اس علاقے سے باہر نہیں جا سکتا۔ آپ بالکل بھی فکر مت کریں۔ انشاء اللہ بہت جلد وہ خبیث اب ہمارے شکنجے میں ہوگا۔'' قاسم کا لہجہ اعتماد سے بھرا ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ پوری طرح سے ہوشیار اور چوکس رہو اور ہر آدھ گھنٹے بعد مجھے رپورٹ دیتے رہو۔'' ملک ظفر نے ریسیور کریڈل پر ڈالا اور پیشانی مسلنے لگے۔

''یہ احمد جہانگیر کے متعلق بات ہو رہی تھی نا؟''

توحید کے مخاطب کرنے پر ملک ظفر نے یوں چونک کر اس کی طرف دیکھا جیسے اس کی موجودگی کو بھول ہی گئے ہوں۔

''ہاں، اسے کیماڑی میں دیکھا گیا ہے۔ قاسم بتا رہا تھا کہ پورے علاقے کا گھیراؤ کر لیا گیا ہے۔''

''یہ بڑی اچھی خبر ہے ہم سب کے لیے۔ مگر آپ مجھے الٹا پریشان دکھائی دے رہے ہیں... خیریت؟''

توحید کے لہجے میں سوال سے زیادہ تعجب تھا۔ وہ بغور ملک ظفر کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ملک ظفر پر اس خبر نے کچھ اچھا اثر نہیں ڈالا۔

''بس یونہی، سر میں کچھ درد ہے۔'' انہوں نے ایک بار پھر اپنی پیشانی مسلی اور توحید کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

''اسے سنبھال کے رکھ لو لیکن اب پریس میں بھیجتے وقت ایک بار رابطہ ضرور کر لینا۔ ہو سکتا ہے اب اس کی ضرورت پیش نہ آئے۔''

''جی بہتر... تو پھر مجھے اجازت ہے؟''

''ہاں بالکل تم جا سکتے ہو۔'' ملک ظفر نے اسی انداز میں کہا اور توحید ان سے مصافحہ کر کے آفس سے نکل آیا۔

ملک ظفر کے رویے کی اچانک تبدیلی اسے الجھا رہی تھی لیکن فی الوقت وہ کیماڑی پہنچ کر وہاں کی صورتِ حال کا جائزہ لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ سو اس نے سر جھٹکا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

شگفتہ کو اس بیڈ روم کی قید کاٹتے ہوئے تین روز گزر چکے تھے اور اس دوران میں اسے قاتل کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ اس کا نام ''رام جہانگیر'' ہے۔ اس کی طرف سے ابھی تک اس کی جان و عزت محفوظ تھی۔

وہ ہر وقت ڈری سہمی رہتی تھی۔ رام جہانگیر روزانہ تین ٹائم کھانے کے ساتھ اس کے سامنے ہوتا تھا اور اپنے ساتھ

ساتھ اسے بھی کھانے پر مجبور کیے رکھتا تھا یا شاید وہ صرف اسی کو کھلانے کی غرض سے ایسا کرتا تھا۔

اس دوران میں شگفتہ نے کافی حد تک اپنے حواس پر قابو پا لیا تھا اور یہ بات بھی وہ بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ اس کی داد و فریاد، چیخ و پکار بالکل بے معنی اور لاحاصل ہے۔ اسے ہر صورت فی الحال یہیں رہنا ہے اور بس... اس کے بعد تو وہ اس پر بھی شکر گزار تھی کہ چلو اس کے ساتھ کوئی سختی تو نہیں کی جارہی تھی... اور اس کی عزت و آبرو محفوظ تھی۔

اس نے ایک اور بھی بہت ہی خاص اور عجیب بات محسوس کی تھی۔ جتنی خاص اور عجیب اتنی ہی خوف ناک... پہلی رات ٹرنکولائزر کے زیرِ اثر سونے کے بعد صبح جب وہ اٹھی تو اس نے خود کو بندشوں سے آزاد پایا تھا۔ دن میں رام جہانگیر وقتاً فوقتاً کئی بار بیڈ روم میں آیا۔ اس کی گفتگو، اس کے برتاؤ اور اس کے دیکھنے کے انداز سے پتا نہیں کیوں اسے یہ شبہ سا ہوا تھا کہ وہ سفاک انسان اسے پسند کرتا ہے۔ بعد میں شگفتہ نے اس طرف خصوصی توجہ دی تو آئندہ دو تین روز میں اسے یقین ہو گیا کہ اس کا اندازہ بالکل درست ہے۔ وہ بالکل خشک مزاج... ایک سرد مزاج سا شخص تھا۔ پھر بھی اس کے لہجے اور اس کی آنکھوں میں اس کے اندر کا حال واضح دکھائی دیتا تھا۔ وہ شگفتہ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا تھا۔

شگفتہ کے لیے یہ انکشاف ہولناک بھی تھا اور امید افزا بھی۔ اور اسی امید کی بنا پر اس نے کچھ حوصلے اور دانش مندی سے کام لینے کا ارادہ کیا۔ آج صبح سے وہ خود ہی اپنی ہمت بندھا رہی تھی اور مناسب موقع کے انتظار میں تھی لیکن آج صبح ہی سے اس کا موڈ کچھ بدلا بدلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ گزشتہ تین روز میں شگفتہ نے اسے صرف رات کے وقت ایک مخصوص مقدار تک پیتے دیکھا تھا لیکن آج وہ صبح ہی سے پی رہا تھا۔ مغرب سے کچھ پہلے ایک بار پھر بیڈ روم کے دروازے کا لاک کھلنے کی آواز ابھری اور وہ اندر آ گیا۔ توقع کے عین مطابق شگفتہ کو بوتل اس کے ہاتھ ہی میں دکھائی دی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور نپے تلے انداز میں قدم اٹھاتا ہوا صوفے پر اپنی مخصوص جگہ جا بیٹھا۔

''کوئی ضرورت ہے تو کہو؟'' وہی مخصوص سوال۔

''جی، نہیں۔''

وہی گھبراہٹ زدہ انکار پر ایک گمبھیر خاموشی۔ وہ صوفے پر نیم دراز سا بیٹھا اسی کو تک رہا تھا۔ وہ یوں گڑبڑا سی گئی جیسے اس کی آنکھیں اندر تک جھانک رہی ہوں۔

''آ... آپ آج زیادہ ہی... ڈرنک کر رہے ہیں۔''

اس ایک جملے کے پیچھے جیسے اس نے اپنی تمام ہمت صرف کر دی تھی۔ بات کر کے وہ یونہی اپنا دوپٹا درست کرنے لگی۔ اسی دوپٹے سے اس کے پاؤں باندھے گئے تھے۔

''ہاں... آج صبح سے پاپا کی بہت یاد آرہی ہے۔''

آج یہ پہلا ذاتی نوعیت کا سوال تھا اور ذاتی نوعیت کا جواب۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر شگفتہ نے ایک بار دوبارہ ہمت کی اور ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''وہ... شاید آپ کے ساتھ نہیں رہتے؟''

''نہیں، رہتے تو وہ یہیں... میرے ساتھ ہی ہیں... ممی پاپا دونوں ہی۔ بس... ہم لوگوں کے بیچ بات چیت نہیں ہوتی۔'' اس نے ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور کچھ مزید ڈھیلا سا ہو کر بیٹھ گیا۔

''کیا ان دونوں کو میری یہاں موجودگی کا علم ہے؟''

رام جہانگیر کا انداز، اس کا نرم لہجہ شگفتہ کے لیے حوصلہ افزا تھا۔

''شاید ہاں... شاید نہیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔''

چند لمحے کے لیے فضا میں ایک بوجھل خاموشی پھیلی رہی پھر شگفتہ نے سوال کیا۔

''مجھے مزید کب تک یہاں رہنا ہوگا؟'' ان چند دنوں میں یہ ایک ہی سوال اس نے مختلف الفاظ میں لاتعداد دفعہ پوچھا تھا مگر جواب میں دوسری طرف مکمل خاموشی اور بے نیازی طاری رہتی تھی۔ جواب کی توقع نہ ہونے کے باوجود اس نے پھر سے سوال دہرایا مگر اس بار خاموشی ٹوٹی اور وہ اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اگر میں کہوں کہ باقی کی ساری زندگی تو؟''

''تو... یقیناً میری باقی زندگی بہت ہی تھوڑی بچی ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''ظاہر ہے اس قید خانے میں کتنا عرصہ جی پاؤں گی میں۔ دم گھٹ کے مر جاؤں گی۔'' شگفتہ کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں کے سامنے اپنے پیاروں کے چہرے گھوم گئے جن کے متعلق اس کے ذہن میں آیا کہ شاید اب وہ کبھی ان سے مل نہیں پائے گی اور وہ سب بھی اسے نہیں دیکھ پائیں گے۔

اس بار خاموشی کا وقفہ زیادہ بوجھل، زیادہ طویل ثابت ہوا۔ پھر اس خاموشی کو رام جہانگیر کی بھاری آواز ہی نے توڑا۔

''تمہیں یہاں یوں قید کر کے رکھنا میری خواہش نہیں

مجبوری ہے۔" اس کا لہجہ پہلے کی نسبت خاصا نرم تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اس بحث سے قطع نظر کہ میں نے تمہیں اغوا کر کے صحیح کیا یا غلط... میرے لیے یہ حقیقت زیادہ حیران کن ہے کہ میں خود کو ایسا کرنے سے روک ہی نہیں پایا... کیا تم یقین کرو گی کہ میں بالکل بلا ارادہ ایسا کر گزرا ہوں۔"

"اگر... اگر ایسی ہی بات ہے تو... تو پھر اب مجھے جانے دیجیے نا، پلیز۔"

رام جہانگیر نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی۔ مضمحل سے انداز میں مسکرایا۔

"میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی آپ کے بارے میں... آ... آپ جیسی مرضی مجھ سے قسم لے لیں۔" شگفتہ کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ رہ رہ کر یہ ایک خیال اسے ہولانے لگتا کہ ابھی اس جنونی کو دورہ پڑے گا اور یہ جھپٹ کر گردن دبوچ لے گا۔

"مس شگفتہ! بے شک تمہارا اغوا میں نے بلا ارادہ کیا ہے مگر ایسا بلا وجہ تو نہیں ہوا۔"

"کیا... وجہ ہو سکتی ہے بھلا؟" شگفتہ نے پریشانی کا اظہار کیا۔

رام جہانگیر بس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر نظریں جھکا کر سینٹر ٹیبل کے ٹاپ کو گھورنے لگا۔ اس کے چہرے پر گہری سوچ کے تاثرات تھے۔

"وجہ کیا تھی؟" چند لمحے کی خاموشی کے بعد شگفتہ نے پھر گھبرائی گھبرائی سی آواز میں پوچھا مگر وہ اپنی جگہ اسی طرح خاموش اور ساکت بیٹھا رہا۔ شگفتہ نے کچھ مزید حوصلے کی ٹھانی۔

"دیکھیں! اگر آپ کے بہن بھائی ہیں تو آپ کو ان کا واسطہ ہے۔ آپ... آپ کو آپ کے ممی پاپا کا واسطہ، مجھے گھر جانے دیں۔ میرے ممی پاپا بہت زیادہ پریشانی اور اذیت میں ہوں گے... پلیز۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"میرے ممی پاپا سے ملنا پسند کرو گی؟"

وہ جیسے کافی سوچ بچار کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ گیا۔ شگفتہ نے دیکھا۔ وہ اپنی سرخ سرخ آنکھوں میں سوال لیے اسے تک رہا تھا۔

"جج... جی۔" شگفتہ کے لہجے میں رضامندی سے زیادہ تعجب اور بے یقینی تھی۔

"اٹھو... تمہیں اپنی فیملی سے ملواتا ہوں۔"

شگفتہ اپنی جگہ متذبذب سی بیٹھی رہی تو اس نے قریب آ کر شگفتہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"اٹھو۔" اس نے جیسے کھینچ کر اسے کھڑا کیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"کک... کہاں؟" آواز کے ساتھ ساتھ شگفتہ کے وجود پر بھی خفیف سی کپکپی طاری تھی۔ اغوا کر کے لائی ہوئی لڑکی کو وہ اپنی فیملی سے ملوائے گا، اس کی تو شگفتہ کو بالکل بھی توقع نہیں تھی۔ بس ایک ہی بات سمجھ آتی تھی کہ وہ ضرورت سے زیادہ نشے میں ہے اور اس خیال کے ساتھ ہی لاتعداد جاں گسل خدشات نے شگفتہ کے دل و دماغ کو دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔

رام جہانگیر نے آگے بڑھتے ہوئے بیڈ روم کا دروازہ کھولا اور شگفتہ کا ہاتھ تھامے راہداری میں ایک طرف بڑھ گیا۔ شگفتہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ گھسٹتی جا رہی تھی۔

وہ اسے ساتھ لے کر ایک بڑے سے کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں صرف دو لکڑی کی سال خوردہ الماریاں، دو ٹیبلز اور چند کرسیاں رکھی تھیں۔ وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر کمرے کے دوسرے کونے میں لے گیا پھر اس نے کونے میں سے کارپٹ پکڑ کر، کارپٹ کا کافی سارا حصہ الٹا دیا۔

شگفتہ اپنی جگہ کھڑی کپکپاتی رہی۔ وہ کیا کر رہا تھا؟ کیا کرنے والا تھا؟ شگفتہ کو اس کا کچھ بھی اندازہ نہیں تھا۔

کارپٹ الٹنے کے بعد اس نے نیچے سے برآمد ہونے والا تین ضرب پانچ فٹ سائز لکڑی کا ایک تختہ اٹھایا تو وہ بالکل کسی دروازے کے پٹ کی طرح اوپر کو کھل گیا۔ اس کی چٹخنی دیوار میں موجود ایک سوراخ میں پھنسا کر اس نے کمرے میں موجود لکڑی کی ایک الماری سے ٹارچ نکالی اور شگفتہ کے برابر آ کھڑا ہوا۔

"چلو، اترو۔" اس نے تختے کے نیچے سے نمودار ہونے والے اس تاریک خلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو یقیناً کسی تہ خانے کا راستہ تھا۔ ساتھ ہی اس نے ٹارچ آن کرتے ہوئے اس کا رخ اس خلا کی طرف کر دیا۔

"کیوں؟" شگفتہ نے خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ہاتھ کا لمس پاتے ہی شگفتہ کے اندر دور تک کراہت کا احساس دوڑ گیا۔ خون کی بو تیز ہو گئی۔

"آؤ۔" اس نے خود آگے قدم بڑھایا۔

"کک... کہاں؟" وہ خوف زدہ تھی۔

"ڈرو مت، میں تمہارے ساتھ ہوں۔" وہ عجیب بات کر رہا تھا۔

شگفتہ نہ چاہتے ہوئے کھنچی اور وہ اس کا ہاتھ پکڑے خلا میں اتر گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں شگفتہ نے دیکھا، وہ لکڑی کی ایک بے ڈھنگی مگر مضبوط سیڑھی تھی۔ شگفتہ کو بے انتہا ڈر بھی لگ رہا تھا مگر وہ قدم آگے بڑھانے پر مجبور تھی۔ گویا اس کا ہاتھ موت کے فرشتے نے کس کر پکڑ رکھا ہو۔

اس نے انتہائی محتاط انداز میں زینے پر قدم رکھا اور سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی نیچے تہ خانے کے فرش پر اتر آئی تو رام جہانگیر نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے ایک طرف دیوار پر ٹارچ کی روشنی پھینکی اور وہاں موجود الیکٹرک بورڈ سے ایک بٹن دبا دیا۔ یکا یک ہی کمرے میں روشنی ہو گئی۔ روشنی ہوئی تو کمرے کا منظر ظاہر ہوا اور اس منظر کے ظاہر ہوتے ہی شگفتہ کے منہ سے بے ساختہ ایک بے معنی سی آواز خارج ہو گئی۔

پہلی نظر میں اسے یہی محسوس ہوا تھا کہ وہاں بہت سے لوگ موجود ہیں۔ وہ تمام مجسمے تھے ہی اتنے جاندار اور حقیقی کہ سرسری نظر پر کوئی بھی دھوکا کھا سکتا تھا۔

شگفتہ نے متحیر نظروں سے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔

ایک طرف دو مجسمے یوں بیٹھے دکھائی دے رہے تھے جیسے آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے ہوں۔ ان کے قریب ہی ایک بچے کا مجسمہ تھا جسے مجسمہ ساز فنکار نے فلور کشن پر بٹھایا تھا۔ ان سے تھوڑا ہٹ کر ایک اور مجسمہ ایستادہ تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی شگفتہ کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے جیسے چونک کر رام جہانگیر کی طرف دیکھا۔ وہی... وہی تو تھا وہ... وہ مجسمہ رام جہانگیر کا اپنا تھا اور اس کے ساتھ قطار اندر قطار دو... چار... چھ... آٹھ... دس... بارہ اور تیرہ... تیرہ مجسمے کھڑے تھے اور وہ... سبھی... ہاں، سبھی کے سبھی اسی کے تھے۔ رام جہانگیر کے اپنے!

شگفتہ نے ذرا غور سے دیکھا۔ ہر مجسمے کی جسامت اور نقوش میں انتہائی غیر محسوس سا فرق تھا اور یہ فرق تیرھویں مجسمے پر آ کر بالکل واضح دکھائی دے رہا تھا اور اس مجسمے میں پندرہ، سولہ سالہ نوجوان رام جہانگیر دکھائی دے رہا تھا۔ اس قطار سے تین قدم ہٹا کر پھر اسی آٹھ نو سالہ بچے کا مجسمہ دھرا تھا جو دوسرے کونے میں کشن پر بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔ یعنی... یعنی وہ رام جہانگیر کا آٹھ نو سالہ وجود تھا۔ اس لحاظ سے سامنے موجود مرد و عورت کے مجسمے دراصل اس کے ممی پاپا کے مجسمے تھے۔ شگفتہ نے ایک بار پھر سے ان مجسموں کی طرف دیکھا۔ یقیناً رام جہانگیر کے پاپا ایک پُروقار شخص ہوں گے اور ممی بھی خوب صورت خاتون ہوں گی۔ مجسموں کی حقیقت آفرینی تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی رہی تھی۔

غموں کا اظہار

اکثر و بیشتر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں کہ ایک معتمد، ہمدرد اور مخلص دوست سے دل کھول کر بات چیت کرنا طبیعت اور دل و دماغ کو کس قدر ہلکا کر دیتا ہے۔ بہت کم لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ اگر وہ اپنے تفکرات اور آلام کو کشادہ دلی کے ساتھ دوسروں کے سامنے بیان کرتے رہیں تو یہ بات ان کے اعصاب اور عمومی صحت کے لیے کتنی فائدہ مند ہے۔ یہاں ہم اس بات کا مشورہ ہرگز نہیں دے رہے کہ آپ اپنی افسردگی اور رنج و غم کو دوسروں تک منتقل کرتے رہیں یا اپنا وزن دوسروں کے کندھوں پر ڈال دیا کریں۔ لیکن یہ ہمیشہ مفید ہوتا ہے کہ ہم اپنے دل کا غم گاہے بگاہے دوسروں کے سامنے پیش کیا کریں اور اس طرح دماغی و جذباتی دباؤ سے چھٹکارا حاصل کر لیا کریں۔ اگر ہمیں ایک بھی ایسا عزیز، دوست یا ساتھی مل جائے جس کے سامنے ہم آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ دل کی بات بلاجھجک کہہ سکیں تو ہم یقیناً خوش نصیب ہیں۔ آزادی سے باتیں کرنا درازیٔ عمر کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس سے ہمیں خود آگاہی اور دوسروں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے سے ہمارے دل کو تسکین اور عصبی ہیجان کو قرار آتا ہے۔ جس وقت ہم اپنے مسائل کو آزادی اور بے باکی سے بیان کرتے ہیں تو ہم خود اپنی ہی مدد نہیں کرتے بلکہ دوسروں میں بھی اپنے تفکرات کے اظہار کی جرأت پیدا کر کے اُن کے لیے بھی اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ باہمی تبادلۂ خیال اور پُرمسرت گفتگو سے ہمارے فہم و ادراک میں اضافہ ہوتا۔ اپنا دکھ درد بیان کرنے سے ہمیں خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور زندگی کے متعلق ہمارے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

مرسلہ
سعیدہ احسن
کراچی

ان دونوں مجسموں کے ہاتھوں میں ایک ایک کتاب تراشی گئی تھی۔ چہروں پر کچھ ویسا ہی جمود، ویسا ہی سکوت تھا جو گزشتہ چند دنوں سے وہ رام جہانگیر کے چہرے پر دیکھتی آرہی تھی۔ یعنی یہ تاثرات اسے والدین کی طرف سے وراثت میں ملے تھے۔ فلور کشن پر آلتی پالتی مارے بیٹھے بچے کے ہاتھ میں بھی ایک موٹی سی کتاب تھی مگر چہرے پر انتہا سے زیادہ بیزاری اور کوفت کے تاثرات ابھارے گئے تھے۔

شگفتہ نے الجھن اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس کی طرف دیکھا تو وہ ایک طرف موجود مسہری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ مسہری پر ٹک گئی۔ رام جہانگیر نے فیملی سے ملنے ملانے کی بات کی تھی اور اس کے بعد اسے سیدھا یہاں لے آیا تھا۔ شگفتہ کے رگ وپے میں ایک عجیب سی سنسناہٹ جاگ اٹھی۔ اس کا اندر کہہ رہا تھا کہ وہ سفاک قاتل... رام جہانگیر اس پر منکشف ہونے جارہا ہے۔ ایک خطرناک جنونی شخص اپنی زندگی کے کچھ خاص اور اب تک دوسروں سے پوشیدہ گوشے، آشکار کرنے والا ہے۔ وہ منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ، وہیں سیڑھی کے آخری زینے پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے سر جھکائے خاموش اور بے حس وحرکت بیٹھا رہا پھر ایک طرف موجود مرد وعورت کے مجسموں کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

''یہ میرے ممی پاپا ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر ریاست علی جسکانی اور پروفیسر ڈاکٹر مادھوی کوشل... حیدرآباد کے ایک ہندو گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں وہ...''

''رام جہانگیر'' نام شگفتہ کو عجیب تو معلوم ہوا تھا لیکن اس نے کچھ سوچنے سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور اب اسے اس نام کا بیک گراؤنڈ معلوم ہونے جارہا تھا۔

''وہ دونوں کولیگز تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دونوں کو کیسے اور کس طرح ایک دوسرے سے محبت ہوئی اور معاملہ شادی تک آپہنچا۔ پاپا کا تو کوئی اپنا پرایا تھا نہیں۔ تنہا منش تھے البتہ ممی کی فیملی کو یہ رشتہ کسی طور گوارا نہیں تھا لیکن یہ بات کوئی ایسا مسئلہ ثابت نہ ہوئی اور دونوں نے کورٹ میرج کرلی۔ ممی کی فیملی نے ان سے ہمیشہ کے لیے تعلق ختم کرلیا اور انہوں نے اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ ایک تو وہ کسی کی محتاج نہیں تھیں اور دوسرا ان کا مزاج بھی کچھ ایسا تھا کہ وہ کم ہی کسی کو خاطر میں لاتی تھیں۔ دونوں ہی ہائی کوالیفائڈ اور ماڈرن لائف جینے والے انسان تھے لہٰذا مذہب ان کے درمیان مسئلہ نہیں بنا۔ نام کی باری آئی تو ممی نے اپنی پسند کے مطابق مجھے رام کہہ کر پکارنا شروع کردیا جبکہ پاپا کو جہانگیر اچھا لگتا تھا۔ یوں میں رام جہانگیر ہوگیا۔ اگلا مسئلہ میرے مستقبل کا تھا۔ دونوں ہی کی شدید خواہش تھی کہ وہ مجھے ایک ذہین فطین، ایک غیر معمولی انسان کے طور پر پروان چڑھائیں۔ لہٰذا کھلونوں کی جگہ مجھے کتابیں دی گئیں۔ اوڑھنے بچھونے کے لیے بھی کتابیں۔ بھوک لگی تو دس منٹ اسٹڈی۔ سر درد ہے تو کتاب۔ میرے ہر مسئلے اور ضرورت کا ان کی نظر میں جیسے ایک ہی حل تھا۔ کتاب، مطالعہ۔ ممی پاپا اور خصوصاً ممی کا بس چلتا تو وہ مجھے اسکول جانے سے پہلے گھر ہی میں ماسٹرز کروادیتیں لیکن مجبور تھیں۔ میرا ایڈمیشن پاپا ہی نے کروایا تھا اور میری ذات کے ساتھ انہوں نے یہ بھلائی بھی کردی کہ ممی سے مشورہ کیے بغیر انہوں نے اپنی مرضی سے اسکول میں میرے نام کے دونوں لفظ اسلام کے مطابق درج کروائے۔'' رام جہانگیر نے ایک نظر شگفتہ کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر مزید کہنے لگا۔

''وہ نام میں ابھی نہیں بتاؤں گا... گھر کی فضا کو میں نے ہمیشہ مُردہ ہی پایا۔ ممی پاپا تو مسکراتے بھی کہیں عید، دیوالی کے موقع پر ہی تھے۔ ہنسی مذاق کا پھر بھلا کیا سوال... میری ہنسی پر شروع دن ہی سے قدغن لگائی جانے لگی تھی۔

''مہذب لوگ یوں منہ پھاڑ کر نہیں ہنستے... یوں نہیں مسکراتے۔ میرے لیے کھیل کود کو بھی انتہائی غیر ضروری اور فضول سرگرمی خیال کیا گیا اور یہ خیال ممی نے کیا تھا۔ جب ممی نے کیا تھا تو پھر پاپا کو بھی اِیگری کرنا ہی تھا۔ تم اسے محبت کہو یا کچھ اور... پاپا، ممی سے اختلاف نہیں کیا کرتے تھے۔ ممی اپنی ہر بات ان سے منوالیا کرتی تھیں۔

''مجھے نہیں بھولتا کہ کھیلنے کی خواہش پر مجھے ممی کا انتہائی سخت رویّہ سہنا پڑتا تھا اور آنکھ بچا کر کھیلنے کودنے کی کوشش پر باقاعدہ تشدد برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اور اس کے لیے ممی نے خاص طور پر ایک بجلی کی تار کو بل چڑھا کر اسے ہنٹر کے طور پر سنبھال رکھا تھا جو اکثر اوقات میرے وجود پر سرخ سرخ لکیریں ابھارا کرتا تھا۔'' رام جہانگیر کے ہونٹوں پر ایک مضمحل سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ شگفتہ اپنی جگہ خاموش بیٹھی اس قاتل کو سن رہی تھی اور اس کے پردۂ تصور پر جیسے خود بخود ایک فلم چلے جارہی تھی۔

''وہ قابل اور ذہین عورت اس حقیقت کو فراموش کیے ہوئے تھی کہ ذہانت کا کتاب یا مطالعے سے تعلق نہیں ہوتا۔ یہ ایک آفاقی صفت ہوتی ہے اور مجھے تو الٹا اس برتاؤ کے باعث کتاب کے نام ہی سے چڑ ہوگئی تھی۔ لیکن مجبوری تھی۔ میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ فرسٹ آنا بھی لازم تھا۔ دوسری صورت میں وہ تار والا ہنٹر تھا۔ اس دوران ہم میں سے کوئی اندازہ ہی نہیں کرپایا... میرے اندر ایک بے نام اور بے صورت نفرت نے پرورش پانا شروع کردیا۔ اس نفرت کا نشانہ اسکول میں میرے کلاس فیلوز بنتے اور گھر واپسی پر وہ سود سمیت مجھے ممی سے تشدد کی صورت پھر واپس مل جاتی۔ دوسرے لڑکے مجھ سے کترانے لگے اور میں بھی ایک خول میں بند ہوتا چلا گیا۔ زندگی کے ابتدائی دور میں... بالکل شروع میں ہی انسانوں کے اس سمندر میں... میں ایک جزیرے کی صورت جینے پر مجبور ہوگیا۔ گزرتے دنوں کے ساتھ ممی کا رویّہ مزید بے لچک، سخت ہوتا چلا گیا اور بقول ان کے اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اب بچہ نہیں رہا تھا۔ بڑا ہوچکا تھا۔

''پاپا ان دنوں کسی سائڈ بزنس کے سلسلے میں مصروف تھے۔ اکثر رات کو دیر سے آتے اور بعض اوقات تو وہ ساری ساری رات نہ لوٹتے۔ انہی دنوں گھر میں ایک اجنبی شخص آنے جانے لگا۔ ممی اس کے ساتھ کئی کئی گھنٹے بیڈ روم کا دروازہ بند کرکے اندر بیٹھی رہتیں۔ مجھے کمرے سے نہ نکلنے کا حکم مل جاتا۔ میں چھوٹا تھا مگر اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ یہ بات نہ سمجھ پاتا کہ ممی پاپا کے اعتماد کی کیسے دھجیاں اڑا رہی ہیں۔'' رام جہانگیر کی آواز میں زمانوں کی تلخی آگھلی۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر شگفتہ کا دل کانپنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے اس جنونی کو پھر سے دورہ پڑنے لگا۔

وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر اس کے چہرے کا تناؤ کم پڑ گیا اور وہ دوبارہ کہنے لگا۔

''مجھے ممی سے نفرت ہوگئی... شدید نفرت اور میں نے اس نفرت کو اپنا خون پلانا شروع کردیا۔ میٹرک میں نے حیدرآباد ہی سے کیا اور اس کے بعد ہم لوگ یہاں کراچی شفٹ ہوگئے۔ بزنس پاپا پہلے ہی یہاں سیٹ کرچکے تھے اس لیے کوئی فکر یا پریشانی نہیں تھی۔ مجھے کالج میں ایڈمیشن دلادیا گیا اور یوں زندگی کا نیا دور شروع ہوگیا۔ چند کالج فیلوز، کلاس فیلوز نے مجھ سے راہ و رسم بڑھانا چاہی لیکن انہیں فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ ایک نامناسب تعلق ثابت ہوگا۔

''میرے لیے تو خیر یہ شروع ہی سے ایک مشکل اور دقت طلب معاملہ رہا تھا۔ دوسروں نے بھی میرے ساتھ تعلق بنانے کو نامناسب خیال کرنا شروع کردیا۔ یہاں اپنے اردگرد مجھے ممی کی سی فطرت رکھنے والی بہت ساری لڑکیاں نظر آئیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ممی شادی کے بعد جو کررہی تھیں، یہ لڑکیاں ابھی سے وہ کچھ کررہی تھیں۔ ممکن ہے کہ خود ممی نے بھی اپنی کالج لائف یونہی گزاری ہو مگر ان کے اس دور کے متعلق میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

''مجھے ممی کی نسبت سے اپنے اردگرد موجود ایسی تمام لڑکیوں سے بھی گھن آیا کرتی تھی۔ میں شدید نفرت محسوس کیا کرتا تھا۔ پھر تھرڈ ایئر میں ہویدا نامی لڑکی میری کلاس فیلو بنی۔''

اس نام پر شگفتہ کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ دوسرا قتل ہویدا ریاض نامی لڑکی کا ہوا تھا اور ابھی ابھی شگفتہ نے اس کا نام، اس کے قاتل کی اپنی زبان سے سنا تھا۔ خود بخود رام جہانگیر کی آپ بیتی میں اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''معلوم نہیں کیوں مگر پہلی ہی نظر میں وہ مجھے دوسری سبھی لڑکیوں سے مختلف نظر آئی اور دوسری ہی نظر میں مجھے اس سے محبت ہوگئی۔ بڑی بڑی چمک دار سیاہ آنکھیں اور روشن چہرہ۔ اس کے چہرے کی وہ روشنی مجھے ایک پاکیزگی اور تقدس کی حامل محسوس ہوئی تھی اور آنے والے دنوں میں میرے اس احساس کی تصدیق ہوتی چلی گئی۔ کئی ایک لڑکوں نے اس کی طرف پیش قدمی کی مگر کسی کو پذیرائی نہیں ملی۔

''وہ بہت محتاط اور اقدار کا پاس رکھنے والی لڑکی ثابت ہوتی رہی اور میں جی جان سے اس پر فدا ہو کر رہ گیا۔ چار سال ہم نے ایک ساتھ گزارے۔ اس دوران میں نے اسے ٹوٹ کر چاہا مگر باوجود خواہش کے میں کبھی پیش قدمی نہیں کرسکا۔ میرے جذبات اَن کہے ہی رہے۔

''سلام دعا سے ہٹ کر ہمارے درمیان کبھی اس سے زیادہ بات چیت نہ ہوسکی۔ فائنل ایئر میں وہ ایک اور کالج فیلو منظر خورشید میں دلچسپی لینے لگی تو سبھی کلاس فیلوز کی متفقہ رائے ٹھہری کہ وہ منظر خورشید کی محبت میں مبتلا ہوچکی ہے۔ اس نے بھی تردید ضروری خیال نہیں کی...''

رام جہانگیر نے ایک گہری سانس لی اور سر جھٹکتے ہوئے گویا ہوا۔

''اس دوران میں ایک اور اہم واقعہ ہوگیا۔ جب سے ہم یہاں شفٹ ہوئے تھے تب سے ممی نے بہت زیادہ ڈرنک کرنا شروع کردی تھی۔ پیتی تو خیر وہ پہلے بھی تھیں مگر یہاں آکر تو انہوں نے بے اعتدالی کی حدیں پھلانگنا شروع کردی تھیں اور تو اور اب کچھ مرد حضرات بے دھڑک آنے جانے لگے تھے۔ کچھ خواتین بھی تھیں اور ظاہر ہے وہ بھی ممی

ہی کی قبیل میں سے تھیں۔ ان دنوں پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ ممی اور پاپا کے درمیان ہلکی ہلکی تلخ کلامی شروع ہو گئی۔ اس تلخ کلامی کے ردِعمل میں ممی کچھ اور بھی خودسری کا مظاہرہ کرنے لگیں اور تلخ کلامی معمول بننے لگی۔

''پھر ایک دن پاپا پر انکشاف ہوا کہ انہیں ایڈز ہے۔ وہ بہت مضبوط کردار اور محتاط طبیعت کے مالک تھے۔ اس کا اندازہ مجھے بھی ہے۔ ممی پر شک تو انہیں پہلے ہی تھا۔ جب انہوں نے باقاعدہ یقین کے لیے کوشش کی تو یہ ثابت بھی ہو گیا کہ ان کی محبوب بیوی ان کی پیٹھ پیچھے کیا غلاظت گھول رہی ہے۔ اس رات... اس رات پاپا نے ممی کو قتل کرنے کے بعد خودکشی کر لی تھی۔''

رام جہانگیر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ شگفتہ اس کے گزرے ہوئے ماضی سے واقف ہو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس طور پروان چڑھا انسان واقعی ذہنی طور پر نارمل تو ہو نہیں سکتا۔

''پاپا کے اس طرح مرنے پر مجھے کچھ تھوڑا سا دکھ تو محسوس ہوا تھا۔'' وہ دوبارہ سلسلۂ کلام شروع کر چکا تھا۔ ''لیکن اس دکھ سے زیادہ مجھے ممی کے مر جانے کی خوشی تھی۔ اس عورت کو مر ہی جانا چاہیے تھا۔ ویسے تو خیالوں ہی خیالوں میں، میں کئی بار اسے قتل کر چکا تھا لیکن حقیقت میں میرے لیے ایسا ممکن نہیں تھا۔ پاپا نے بہت اچھا کیا تھا جو پہلے اس کا گلا گھونٹ ڈالا تھا۔

''زیادہ جاننے والے تو تھے نہیں۔ جو چند تھے ان میں سے کچھ ممی یعنی مادھوی کوشل کو مدیحہ کے نام سے جانتے تھے اور کچھ ان کی مذہبی شناخت کے حوالے سے ویسے ہی متذبذب تھے۔ میری تصدیق پر انہیں مسلمان تصور کرتے ہوئے دفنا دیا گیا۔ چند ایک روز تھانہ کچہری کا چکر پڑا رہا پھر سب کچھ نارمل ہو گیا۔ پاپا کے جمے جمائے کاروبار کے مالکانہ حقوق خود بخود مجھے مل گئے تھے۔ سو کالج کے بعد میرا وقت کاروبار کی دیکھ بھال میں گزرنے لگا۔

''شب و روز بے انتہا اذیت میں گزر رہے تھے۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ ممی بھی نہ رہی تھیں پھر بھی... ہر ہر لمحہ میرے لیے ایک سزا، ایک عذاب کی صورت اختیار کر گیا تھا اور ایسا تھا ہویدا اور منظر کی پروان چڑھتی ہوئی محبت کے باعث۔ اگر ہویدا دوسری لڑکیوں جیسی ہوتی تو شاید مجھے اس سے کبھی بھی اور کسی بھی صورت محبت ہی نہ ہوتی... اور اگر ہو بھی جاتی تو پھر میں کسی بھی انتہا تک چلا جاتا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہویدا کوئی عام لڑکی نہیں تھی... وہ منظر سے محبت کرتی تھی... ان دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ تھا اور سبھی کو معلوم تھا کہ کالج لائف کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کا لائف پارٹنر بننے کا فیصلہ بھی کر چکے ہیں۔ مجھے تہذیب اور اخلاقیات کا بھی پاس رکھنا تھا سو میں خاموش رہا اور اندر ہی اندر ٹوٹتا بکھرتا رہا۔ ہمیشہ خاموش اور لاتعلق رہنے کا فیصلہ ہی میرے لیے اتنا مشکل اور کرب ناک تھا۔

''پھر کالج کا آخری دن آ گیا۔ فیئرویل پارٹی میں ہی پروگرام بنا کہ ہم سب کل پیراڈائز پوائنٹ پر اپنے طور پر فیئرویل پارٹی منائیں گے اور پھر وہیں ساحل کنارے سے اپنی اپنی راہ لیں گے۔ میرے لیے اگلے روز کی اہمیت صرف اس وجہ سے تھی کہ چند ایک گھنٹے ہویدا کے آس پاس گزرنا تھے۔ یہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہم کس حد تک آس پاس ہوں گے۔ کلاس فیلو ہونے کے ناتے مجھے بس رسماً ہی انوائٹ کیا گیا تھا پھر بھی میں سب سے پہلے مقررہ جگہ پر موجود تھا۔ پھر جب وقت آیا تو معلوم ہوا کہ آدھے سے زیادہ کلاس فیلوز غیر حاضر ہیں۔ بہرحال جو موجود تھے انہوں نے خود کو ہی کافی خیال کیا۔ کھانے کے لیے جب سب بیٹھے تو مجھے ہویدا کے پہلو میں جگہ ملی۔ اس کے بائیں ہاتھ... بالکل اس کے پاس۔ کھانا کھایا گیا۔ اس کے بعد فروٹ کی باری آئی۔ گپ شپ ہوتی رہی۔ آدھ گھنٹے بعد چائے منگوائی گئی۔ ہم تقریباً دو گھنٹے یونہی پہلو بہ پہلو بیٹھے رہے اور میں وہاں ہونے کے باوجود وہاں سے غائب رہا۔ ہویدا کے قرب کے وہ لمحات تھے ہی ایسے سحرانگیز... ایسے کیف آگیں کہ بیان ممکن نہیں۔ مجھ پر ایک عجیب بے خودی کی کیفیت طاری تھی کہ سبھی نے واپسی کا پروگرام بنا لیا۔ یہ تو ظاہر ہے ہونا ہی تھا مگر میں ابھی وہاں سے اٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ سب اپنے اپنے راستے پر روانہ ہو گئے اور میں تنہا وہاں بیٹھا گزرے ہوئے لمحات کو جیتے رہنے کی سعی کرتا رہا۔ میری اب تک کی زندگی میں وہ دو گھنٹے انمول ہیں۔ جیسے... جیسے کہ میں نے زندگی کو جیا ہی صرف دو گھنٹے ہو۔

''میرے لیے وہاں سے اٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں بیٹھا رہا... بہت دیر تک۔ رات گئے میں اٹھ کر واپس آیا مگر یوں کہ میں خود کو نہ تو زندوں میں شمار کر پا رہا تھا اور نہ مردوں میں۔ میں نے سوچا تھا کہ کالج ختم ہوا۔ اب آمنا سامنا ہو گا نہیں تو خود بخود آہستہ آہستہ میں اسے بھولنے میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ میری بے چینی بڑھتی گئی۔ نیندیں حرام ہو گئیں اور مجھ پر ایک عجیب وحشت سوار ہونے لگی۔ انہی دنوں مجھے خیال آیا کہ میں نے جھوٹ بول

کر مادھوی کوشل کو دفن کیوں کروایا تھا۔ بس پھر ایک رات جب اضطراب حد سے بڑھا اور میری وحشتوں کو کسی پل قرار آتا دکھائی نہ دیا تو میں قبرستان جا پہنچا۔ دونوں قبریں کھود کر میں نے ممی پاپا دونوں کے خستہ حال اجسام نکالے اور انہیں گھر لا کر سنبھال لیا۔ اس کے بعد میری وحشتوں نے یہ تہ خانہ کھودا مگر پھر بھی یہ قرار پانے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ ممی پاپا کے وہ خستہ حال اجسام میں نے یہیں دفن کیے ہیں۔'' رام جہانگیر نے اپنے ممی پاپا کے مجسموں کی طرف اشارہ کیا۔ ''ٹھیک وہاں... ان مجسموں کے نیچے۔''

شگفتہ بے اختیار جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ اس کے لیے یہ خیال ہی بہت خوفناک تھا کہ اس سے محض چند فٹ کے فاصلے پر دو لاشیں دفن ہیں۔ دو ایسے افراد کی لاشیں جن میں سے ایک قاتل ہے اور دوسرا مقتول۔

''سکون اور قرار کسی صورت نہ مل رہا تھا۔ میرے اسی اضطراب اور وحشت نے ان مجسموں کو تراشا شروع کر...''

بات کرتے کرتے وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی نظریں شگفتہ کے ہراساں چہرے پر تھیں جو یک ٹک اس کے ممی پاپا کے مجسموں کی سمت دیکھے جا رہی تھی۔

''چلو اٹھو... باقی بات اوپر چل کر کرتے ہیں۔'' وہ اچانک اٹھتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر شگفتہ کا ہاتھ تھام کر... اسے کھڑا کیا۔ تہ خانے سے نکل کر اس نے تختہ برابر کیا، کارپٹ سیدھا کیا اور اس کا ہاتھ تھام کر واپس اسی بیڈ روم میں لے آیا جہاں گزشتہ تین روز سے وہ قید تھی۔ شگفتہ بیڈ پر سکڑ کر بیٹھ گئی اور وہ خود صوفے پر جا بیٹھا۔ وہاں بیٹھتے ہی اس نے سینٹر ٹیبل پر پڑی ہوئی شراب کی بوتل اٹھائی اور منہ سے لگا لی۔ شگفتہ نے دیوارگیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ وہ انتظار کرنے لگی کہ رام جہانگیر بات شروع کرے گا مگر وہ تو جیسے بھول ہی گیا تھا۔ بس اپنی جگہ تھکا تھکا سا بیٹھا گھونٹ گھونٹ شراب پیتا رہا۔ یقیناً دن بھر کی شراب نوشی نے اس کے اعصاب کو انتہائی مضمحل کر رکھا تھا۔

کافی دیر بعد شگفتہ نے ہی ہمت کی۔

''آپ... نے اپنی بات... مکمل نہیں کی۔''

رام جہانگیر نے اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر جیسے اچانک اس کی یادداشت لوٹ آئی۔

''ہاں، وہ... اضطراب اور وحشت والا پروگرام۔'' لہجے میں پھر سے نشے کا بوجھل پن تازہ ہو گیا۔

''وہ رہا... مسلسل رہا... چھ سال گزر گئے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان دونوں کی اس پریم کہانی کی خیر خبر رکھتا رہا۔ درمیان میں تین سال منظر نے ایجوکیشن ہی کے سلسلے میں ملک سے باہر گزارے۔ پھر چھ سال مکمل ہو گئے۔ اب سے دو ماہ دس دن پہلے مجھ پر ایک انکشاف ہوا... ایک جانکاہ انکشاف۔ اور وہ یہ کہ منظر اور ہویدا کے آپس میں جسمانی تعلقات تھے۔ انتہا درجے کے... اور ہویدا کسی یو کے ریٹرن سے شادی کرنے جا رہی تھی اور وہ دونوں، یعنی منظر اور ہویدا پوری طرح مطمئن اور خوش بھی تھے۔ اس سارے معاملے کے متعلق میرے سامنے ناقابلِ تردید شواہد تھے...''

اس نے رک کر ایک بڑا سا گھونٹ لیا۔

''اس روز میرے اندر سناٹا اتر آیا۔ ایک عجیب پُرہول اور گاڑھا سناٹا۔ بالکل موت جیسا گہرا سکوت۔ مجھے لگا کہ میں مر چکا ہوں۔ زندہ نہیں ہوں میں۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا... ہویدا تو ہویدا تھی۔ وہ کوئی عام لڑکی تھوڑا ہی تھی۔ وہ سیاہ چمک دار، زندہ اور جان دار آنکھیں۔ وہ پاکیزگی اور تقدس کی روشنیوں سے دھلا ہوا چہرہ... اس رات میں چیخ چیخ کر کسی سے کہتا رہا کہ یہ تو نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ۔ یاد نہیں کہ اس وقت میں خدا سے مخاطب تھا یا بھگوان سے۔ میں نے خودکشی کا فیصلہ کیا تھا۔ فیصلہ کیا تو پاپا کی خودکشی اور ممی کا قتل یاد آ گیا۔ اس کے یاد آنے سے خیال آیا کہ پاپا نے یہ کام ادھورا کیا تھا... میں پورا کروں گا۔ سب سے پہلے بدبخت رقیب کی گردن کیوں نہ مروڑی جائے۔ جب مرنا ہی ٹھہرا تو پھر دو چار کو لے کر کیوں نہ مرا جائے... دو چار اور چہرے نگاہوں کے سامنے ابھر آئے۔ یہ بالکل ٹھیک تھا۔ جس بات پر اپنی جان گنوانی ہے، اس پر چار چھ کو عبرت کا نشان تو بنایا جائے۔ کوئی تو سمجھے گا... کسی کا اندر تو سنبھلے گا... کوئی تو سوچے گا۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ اتر آئی۔

''اس رات گویا میں نے اپنی موت کے حوالے سے پلان کیا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں نے آج تک صرف دو گھنٹے زندگی جی ہے۔ پیراڈائز پر۔ اس جگہ کی اہمیت میرے نزدیک کچھ ایسی تھی کہ میں نے اسی کو منتخب کر لیا۔ میری موت کا کھیل یہیں سے شروع ہونے والا تھا۔ میں نے اپنے پہلے شکار کے طور پر منظر کو چنا اور تیاری کر کے رات کو اس کے گھر جا پہنچا۔ اس کی چند روزہ خوش قسمتی تھی کہ وہ لاہور گیا ہوا تھا مگر اس کی ممی گھر ہی میں تھیں۔ بالکل میری ممی جیسی... پروفیسر ڈاکٹر رخشندہ خورشید۔ دوسری صبح میرے پروگرام کے مطابق پروفیسر

صاحب کی بوری بند لاش پولیس کو پیراڈائز ساحل پر ملی۔"

اس نے ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے دونوں ٹانگیں سینٹر ٹیبل پر پھیلا دیں اور دوبارہ گویا ہوا۔

"ہویدا کو قتل کرتے ہوئے مجھے کچھ زیادہ تو نہیں... ہاں کچھ تھوڑا سا دکھ ضرور ہوا تھا۔ پھر مسز جلیل کی باری آئی۔ اسے بھی کالج میں دیکھ دیکھ کر مجھے ممی کی یاد آتی رہتی تھی۔ ممی کو تو میں خواہش کے باوجود قتل نہیں کر سکا تھا لیکن اب مرنے سے پہلے مما جیسی اور دو چار چڑیلوں کو تو قتل کر سکتا تھا نا۔ ہاں البتہ اس کا شوہر بے وجہ میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ لہٰذا اس کی موت میری فوری ضرورت بن گئی تھی۔ پولیس والے اپنی کارروائیاں شروع کر چکے تھے۔ آنکھ مچولی شروع ہو چکی تھی اور مجھے یہ صورتِ حال انتہائی ایڈونچرز اور رومانٹک محسوس ہونے لگی تھی۔

"پھر موت منظر کو واپس لے آئی اور میں نے اسے بھی پارسل کر دیا۔ اس کے بعد حمیرا کی باری آئی۔ پھر شمائلہ کا نمبر تھا مگر مجھے انتہائی مایوسی اور کوفت ہوئی کیونکہ یہ لوگ کہیں گئے ہوئے تھے۔ گھر میں صرف شمائلہ کا باپ تھا۔ سیٹھ حبیب الرحمٰن قصوری۔ وہ مجھے اپنے اسٹڈی روم میں ملا۔ ڈھیر ساری کتابوں کے بیچ کتاب لیے بیٹھا... ایک تو پہلے ہی میں کوفت کا شکار تھا۔ دوسرا کتاب، عذاب جو مجھ پر مسلط رہا تھا... شروع دن سے۔ کیونکہ مادھوی کوشل صاحبہ مجھے غیر معمولی انسان بنانا چاہتی تھیں۔ بس... پھر کیا... قصوری میں بھی میری ممی ہی کی قبیل سے تعلق رکھنے والی روح رہی ہوگی۔ میں نے بھی چھید مارا اس خبیث روح کو۔"

رام جہانگیر کے لہجے میں حقارت اور نفرت کے الاؤ بھڑکنے لگے تھے۔ وہ اپنا گال کھجاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اس کے فوری بعد تو شمائلہ پر ہاتھ ڈالنا اس کھیل کو ختم شد کروانے والی بات ہوتی جبکہ میرا ابھی کچھ اور کھیلنے کا موڈ تھا۔ اس لیے میں نے شائستہ کا سوچا۔"

رام جہانگیر نے رک کر اپنی بوجھل آنکھوں کے ساتھ شگفتہ کی طرف دیکھا اور گمبھیر لہجے میں بولا۔

"یقیناً تمہیں اچھا تو نہیں لگے گا... لیکن سچ تو یہی ہے کہ کالج لائف میں وہ بھی ایسی ہی تھی۔ میں یہ معلوم کر چکا تھا کہ تم اس کے ساتھ ہی ہوتی ہو۔ مگر اس بات کی مجھے ذرا بھی پریشانی نہ تھی مگر جب وہاں میں نے تمہیں دیکھا تو ایک بار تو یقین جانو کہ میرے ہاتھوں پیروں سے جان ہی جاتی رہی تھی۔

"میں مبہوت رہ گیا تھا کہ بھلا ہویدا یہاں کہاں سے اور... اور کیسے آ گئی؟ وہ اس وجہ تک آ پہنچا تھا جس کی بنا پر اس نے شگفتہ کو اغوا کیا تھا اور شگفتہ اپنی جگہ خاموش بیٹھی دل ہی دل میں اپنی قسمت اور صورت دونوں کو کوسنے لگی۔

"تم ابھی کم عمر ہو۔" اس کی بھاری اور نشے کی زیادتی سے بوجھل آواز شگفتہ کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

"یقیناً تمہیں ابھی زمانے کی میلی اور ناپاک ہواؤں نے نہیں چھوا۔ چھ سال سے میں ایک جہنم بھگت رہا تھا۔ تمہیں دیکھ کر محسوس ہوا کہ میرے اندر کا وہ جہنم یکا یک کچھ سرد پڑ گیا ہے۔ سینے میں ایک ٹھنڈک اور سکون کا احساس جاگا تھا۔ بس پھر میں خود کو روک نہیں پایا اور تمہیں اپنے ساتھ ہی لے آیا۔"

یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ رام جہانگیر، وہ ظالم اور سفاک قاتل جس نے گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ کے اندر اندر آٹھ افراد کو انتہائی بیدردی سے قتل کر ڈالا تھا اور جو تا حال پولیس کے لیے دردِ سر بنا ہوا تھا۔ وہ اس وقت شگفتہ کے سامنے، محض چند فٹ کے فاصلے پر ایک کھلی کتاب کی صورت موجود تھا۔

وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کی گزری ہوئی زندگی کے متعلق بھی بہت کچھ جان چکی تھی۔ وہ کیا تھا... کیا ہے... کیوں ہے؟ سب کچھ اس پر کھل گیا تھا۔ ممکن ہے اس نے صرف شگفتہ کی کچھ ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اپنی گزری ہوئی اذیت ناک اور جمود زدہ سی زندگی کا تذکرہ کیا ہو یا پھر جواز فراہم کرنے کے لیے۔ لیکن شگفتہ کے ذہن و دل کی حالت پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ہمدردی تو دور کی بات ہے، اس کے نزدیک کسی بھی صورت ایک انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اپنے ہی جیسے کسی دوسرے انسان کی جان لے۔ اس کا قتل کرے...

"دیکھیں۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد شگفتہ نے اسے مخاطب کیا۔ "آپ کے فیملی میٹرز پر تو میرا کچھ کہنا بنتا ہی نہیں اور... یہ جو آپ نے قتل... قتل کیے ہیں۔ ان کے متعلق بھی میں کچھ نہیں کہوں گی کہ یہ آپ نے ٹھیک کیا یا غلط۔ لیکن... لیکن آپ مجھے کیوں قید کر کے رکھنا چاہتے ہیں؟ میں نے آپ کو کیا تکلیف پہنچائی ہے؟ میرا اس سب میں کیا قصور؟"

"کمال ہے۔" وہ متعجب لہجے میں بولا۔ "وجہ میں تمہیں بتا تو چکا ہوں۔"

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں... سوائے اس کے کہ تم یہیں رہو۔ ہمیشہ... اور اگر تم پاکستان میں نہ رہنا چاہو تو بھی کوئی

پریشانی نہیں۔ ملائیشیا، دبئی، بحرین، سعودیہ۔ ان میں سے جس ملک کا تم کہو گی، میں انتظام کر لوں گا۔ ہم یہ ملک ہی چھوڑ دیں گے۔"

"مم... مگر میں کیوں؟ میں شگفتہ ہوں، ہویدا نہیں۔"

"تم اس کا گزرا ہوا کل ہو... اسی کی تصویر ہو، ہوبہو۔"

"مگر میں وہ نہیں ہوں۔ ہو بھی نہیں سکتی۔ اس لیے خدارا مجھے یہاں سے جانے دیجیے۔ پولیس آپ کو ہر طرف ڈھونڈ رہی ہے۔ کسی دن... کسی دن آپ باہر جاؤ گے اور لوٹ کر واپس نہیں آ سکو گے۔ ایسے میں... میں تو یہیں زندہ دفن ہو کر رہ جاؤں گی۔ آپ خدا کے لیے مجھے جانے دیں۔" شگفتہ کی آواز ایک بار پھر سے بھیگ گئی۔

"ایسا نہیں ہوگا۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "پولیس والے کبھی بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔"

"آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"میں پولیس کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں اور تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ گزشتہ تین چار روز سے پولیس نے اس سارے علاقے کو اپنے محاصرے میں لے رکھا ہے۔ باہر ہر گلی کے نکڑ پر چیک پوسٹ بنی ہوئی ہے۔ وہ پاگل کتوں کی طرح مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ احمد جہانگیر کے نام سے لیکن مجھ تک پہنچنے کے لیے ان کے پاس کوئی سراغ، کوئی ذریعہ نہیں۔ کبھی بھی کوئی میرا دوست نہیں رہا۔ میں بھی کسی کے لیے خاص نہیں رہا۔ میرے کلاس فیلوز بھی صرف نام کی حد تک مجھ سے واقف رہے اس دنیا میں۔ اگر کوئی مجھے جانتا پہچانتا ہے تو وہ صرف میں خود ہوں... صرف اور صرف میں خود... سمجھی تم؟"

"پھر بھی... کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے اور کچھ نہیں تو میں یہاں گھٹن ہی سے مر جاؤں گی۔" وہ اپنی موت کا ذکر کر کے ایک بے رحم قاتل سے رحم کی توقع کر رہی تھی۔ وہ بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھا اسے گھورتا رہا۔ اپنی بوجھل اور سرخ آنکھوں سے۔

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں، پلیز... آپ... آپ تو اخلاق و اقدار کا پاس رکھنے والے انسان ہو نا۔"

"فضول بکواس ہے... اخلاق و اقدار... ایک بار کالج لائف میں پاس رکھا تھا چھ سال ہو گزرے، ایک ایک سانس عذاب گزری... لہو کے قطروں میں دہکتے ہوئے انگاروں کی تپش جیتا رہا ہوں... پل پل مرا ہوں۔ اب... اب پھر سے نہیں۔ میں... میں پھر سے تمہیں کھونا نہیں چاہتا... کسی صورت بھی نہیں۔" نشے کی زیادتی کے باعث اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"مجھے یوں عذاب و اذیت میں رکھ کر آپ کو کیا ملے گا... مجھے میرے گھر جانے دیں... مجھے میرے ممی پاپا کے پاس جانے دیں۔ یہ دیکھیں۔" شگفتہ نے دونوں ہاتھ معافی کے انداز میں جوڑے۔ "میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں... کہیں تو آپ کے پاؤں بھی پکڑ لیتی ہوں مگر... مگر خدا کے لیے مجھے چھوڑ دیں... مجھے جانے دیں۔" شگفتہ کی آواز بھرا گئی اور وہ ایک بار پھر سے سسکنے لگی، رونے لگی۔

"رو لو... جی بھر کے رو لو۔ اس سے من ہلکا ہوتا ہے۔" وہ اسے اور رونے کا مشورہ دے رہا تھا۔ شگفتہ نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ سسکیاں کچھ اور تیز اور بلند ہو گئیں۔

"یہ بھی ایک طرح سے تمہاری... خوش بختی ہے۔" چند لمحے بعد اس کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز شگفتہ کے کانوں میں پڑی۔ "تم رو سکتی ہو... آنسو بہا سکتی ہو۔ میں تو اس معاملے میں خود کو قلاش... پوری طرح مفلس پاتا ہوں۔" چند لمحے کی خاموشی رہی۔

"تم بھی سارے آنسو بہا ڈالو... تم نہیں جانتی تمہاری آئندہ زندگی میں کتنی... کتنی زیادہ خوشیاں آنے والی ہیں۔ بس ایک بار... ایک بار تم میرے ساتھ رہنے کا ارادہ تو کرو۔"

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ پھر بولا۔

"مجھے تمہاری صورت سے کس قدر پیار ہے... تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ دیکھنا تم... میں تمہیں اتنی... اتنی محبت دوں گا کہ تمہارا دامن چھوٹا پڑ جائے گا... تب تم خود پر رشک کرو گی... یہ دن... آج کا وقت یاد کر کے... تم افسوس کیا کرو گی کہ میں بے وجہ کتنی پریشان... خوف زدہ اور گھبرائی ہوئی تھی۔"

وہ پھر کچھ دیر کے لیے چپ ہوا اور تھوڑی دیر بعد دوبارہ بولنے لگا۔ انداز خود کلامی کا سا تھا مگر شگفتہ اس کی بات نہیں سن رہی تھی۔ وہ تو بس روئے جا رہی تھی۔ اپنی مصیبت اور موجودہ صورتِ حال پر... اپنی قسمت اور نصیبوں پر۔

بہن قتل ہو چکی تھی۔ خود وہ یہاں اس بے رحم، پاگل انسان کی قید میں تھی۔ پتا نہیں اس سانحے، اس صدمے سے اس کے گھر والوں پر کیا گزری ہوگی۔ وہ سب کس حال میں ہوں گے؟

وقفے وقفے سے رام جہانگیر اپنے جذبات کا اظہار کرتا رہا پھر شاید اسے مسلسل سسکیاں بھرتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا تھا مگر شگفتہ پھر بھی کافی دیر تک سسکتی رہی۔ پھر خود ہی اس کے آنسو خشک ہو گئے اور سسکیاں تھم گئیں۔

اس نے دوپٹے سے چہرہ اور آنکھیں پونچھتے ہوئے ایک سرسری سی نظر سے رام جہانگیر کی طرف دیکھا تو اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ وہ اسی طرح سینٹر ٹیبل پر ٹانگیں پھیلائے صوفے پر نیم دراز پڑا تھا۔ شراب کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھی مگر اس طرح کہ وہ صوفے پر پڑی تھی اور اس میں سے کچھ شراب صوفے پر بہہ نکلی تھی جو اب صوفے کو بھگوتے ہوئے قطرہ قطرہ نیچے کارپٹ پر گر رہی تھی۔ اس کا چہرہ بجھا بجھا اور آنکھیں بند تھیں۔ یکایک شگفتہ کا دل اچھل کر اس کے حلق میں آدھڑکا۔ رام جہانگیر نشے کی زیادتی کے باعث بے سدھ پڑا تھا۔ شگفتہ کو یاد آیا کہ تہ خانے سے واپس بیڈروم میں آنے کے بعد اس نے دروازہ بھی اندر سے لاک نہیں کیا تھا۔ شگفتہ کے رگ و پے میں ایک عجیب سا اضطراب بیدار ہو گیا۔ خون کی گردش یک دم ہی بہت تیز ہو گئی ... اس نے ایک نظر بیڈروم کے دروازے کی سمت دیکھا اور پھر خوف زدہ نظروں سے رام جہانگیر کی طرف دیکھتی ہوئی آہستہ سے بیڈ پر سرکتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اندرونی خوف سے اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں مگر وہ ننگے پاؤں دبے قدموں بیڈروم کے دروازے کی طرف بڑھ گئی کہ یہی وقت تھا... ایسا موقع شاید پھر کبھی نہ ملتا۔

وہ لرزتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھی۔ نظریں بدستور رام جہانگیر پر تھیں۔ وہ کسی بھی پل بیدار ہو سکتا تھا اور بیدار ہوتے ہی اپنے سارے جنون کے ساتھ اس پر جھپٹ سکتا تھا۔ لہٰذا وہ حتی المقدور احتیاط سے چلتی ہوئی دروازے تک پہنچی۔ بے آواز انداز میں دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر آتے ہی وہ راہداری میں ایک طرف کو دوڑ پڑی۔ اسے واضح طور پر محسوس ہوا تھا کہ اس کے کمرے سے نکلتے وقت رام جہانگیر بیدار ہو گیا تھا۔ اس کے دماغ میں جیسے آندھیاں چلنے لگیں اور دل سینے سے باہر نکل آنے پر آمادہ ہو گیا۔

چند قدم دوڑنے کے بعد وہ ایک دوسری راہداری میں آ گئی۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ باہر جانے کا راستہ کدھر ہے۔ بس ایک شدید خواہش تھی کہ کسی بھی طرح اس عمارت سے باہر نکل جاؤں۔ اس نے ایک دو دروازے چیک کیے مگر وہ لاک تھے۔ اس کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر رونا شروع کر دے۔ سارے علاقے کو اکٹھا کر لے مگر وہ ایسا کر نہیں سکتی تھی کیونکہ ایسا کرنے پر کسی اور کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ سفاک صیاد اس تک پہنچ جاتا اور پھر... اس سے آگے سوچنے کا بھی حوصلہ نہیں تھا اس میں۔ اس خیال ہی سے اس کی ٹانگوں سے جان نکلی جا رہی تھی کہ کسی بھی لمحے رام جہانگیر اس کی گردن آدبوچے گا۔

وہ لرزتی کانپتی آنسو بہاتی راہداری میں آگے بڑھتی گئی۔ آگے سے راہداری دائیں طرف مڑتی تھی مگر وہاں پہنچ کر شگفتہ کو شدید مایوسی ہوئی۔ وہاں سیڑھیاں تھیں جو یقینی طور پر دوسری منزل پر جاتی تھیں جبکہ اسے اس عمارت سے نکلنا تھا... باہر جانا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، راہداری کے وسط میں صرف ایک انرجی سیور تھا جو پوری راہداری کو روشن کرنے کے لیے ناکافی تھا پھر بھی اتنا تو واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا کہ راہداری خالی ہے۔ وہ اس بری طرح گھبرائی ہوئی تھی کہ اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کدھر جائے؟

اچانک ہی کسی چیز کے گرنے کی مدھم سی آواز بلند ہوئی تو اس کے وجود میں دہشت کی ایک تیز لہر دوڑ گئی اور پھر وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے اندھا دھند دوسری منزل پر جانے والی تاریکی میں ڈوبی سیڑھیوں پر چڑھتی چلی گئی۔

☆☆☆

قاسم مسلسل تین روز سے یہیں موجود تھا اور اس دوران میں وہ ڈھنگ سے سویا تک نہیں تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اب یہ کہانی دنوں کی نہیں بلکہ گھنٹوں کی ہے۔ اوپر سے اتنا دباؤ تھا کہ وہ ایک لمحہ بھی غفلت کی نذر کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ ایک گلی کے کونے پر کھڑی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ تین روز پہلے جب وہ خبیث ان کے روکنے پر الٹا فرار ہوا تھا تو یہیں کہیں آ کر اچانک کسی چھلاوے کی طرح گم ہو گیا تھا۔ قاسم نے اسی وقت وائرلیس کی مدد سے ہنگامی بنیادوں پر پورے علاقے کو گھیر لیا تھا۔ تمام راستوں پر چوکس سپاہی تعینات کر دیے گئے تھے۔ ہر آنے جانے والی گاڑی کی تلاشی لی جانے لگی اور ایک ایک فرد کو چیک کیا جانے لگا۔ کل اور آج چند ایک مشتبہ افراد کے گھروں کی تلاشیاں بھی لی گئیں مگر تا حال کوئی امید افزا بات سامنے نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود قاسم کو پورا یقین تھا کہ قاتل یہیں کہیں موجود ہے۔ اس کی پیشہ ورانہ حسیات جیسے اسے قائل کیے ہوئے تھیں کہ وہ اور قاتل بس اب پاس پاس ہی موجود ہیں۔

پھر گاڑی میں بیٹھے بیٹھے وہ چونک پڑا۔ فرید ایک کانسٹیبل اور ایک عام بندے کو ساتھ لیے تیز قدموں سے چلتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ ان کی چال اور چہروں سے پتا چل رہا تھا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے... خاص اور سنسنی خیز۔ قاسم کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور وہ گاڑی سے باہر نکل آیا۔

”سر جی! مبارک ہو... قاتل کا پتا چل گیا ہے۔“ فرید نے قریب پہنچتے ہی جوشیلے انداز میں کہا تو قاسم کے خون کی گردش تیز ہو گئی۔

”تفصیل؟“ قاسم نے تیز لہجے میں کہا۔

”وہ یہیں موجود ہے سر جی! اسی لائن کی آخری کوٹھی میں۔ یہ رشید احمد اس کے برابر والی کوٹھی میں چوکیدار ہے۔ اس نے چند ایک بار اسے دیکھا ہے اور تصویر سے بھی شناخت کر لیا ہے۔“ فرید نے قریب کھڑے شخص کو بازو سے پکڑ کر سامنے کر دیا۔

”کیوں جوان! تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ وہی بندہ ہے جس کی ہمیں تلاش ہے... تصویر تو ٹھیک سے دیکھی ہو گی تم نے؟“ قاسم نے بغور رشید احمد کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”بالکل صاب جی! سو فیصد وہی ہے۔ میں نے کئی بار دیکھا ہے اسے اور مشکوک تو مجھے وہ پہلے ہی سے لگتا تھا۔“ رشید کے پُر یقین لہجے سے قاسم کا دل دھڑک اٹھا۔

”تمہیں وہ کیوں مشکوک لگتا تھا؟“

”بس جی! ایک تو اس کی شکل ہی کچھ ایسی ہے اور دوسرا اتنی بڑی کوٹھی میں اکیلا ہی رہتا ہے... جیسے انسان نہ ہو کوئی بھوت ہو۔“

”ایک بار پھر سوچ لو، کہیں تمہیں غلط فہمی تو نہیں ہو رہی؟“ اس بار قاسم نے پولیس والوں کے مخصوص انداز میں پوچھا۔

”نہیں جی، مجھے کوئی غلط فہمی نہیں۔ میری بات غلط ثابت ہو جائے تو بے شک اس بندے کی جگہ مجھے اپنے ساتھ لے چلیے گا۔“

”فرید!“ قاسم فوراً ہی فرید سے مخاطب ہوا۔ ”وائرلیس پر سب کو الرٹ کر دو اور متعلقہ کوٹھی کو پوری طرح گھیرے میں لے لو۔ جوانوں سے کہو کہ بالکل خاموشی اور سکون سے ارد گرد کی کوٹھیوں پر بھی پوزیشنیں سنبھال لیں اور کم از کم پندرہ بیس جوانوں کو اندر گھسنے کے لیے تیار کرو۔“

”او کے سر!“ فرید برق رفتاری سے پلٹا تو قاسم نے پکارا۔

”فرید!“

دودھ والا

خریدار (دودھ والے سے)۔ ”تم روزانہ دیر سے آتے ہو، اب دیر سے آئے تو ہم دودھ نہیں لیں گے۔“

دودھ والا۔ ”صاحب جی، اس میں میرا کیا قصور ہے۔ نل میں پانی ہی دیر سے آتا ہے۔“

(مرسلہ: طیب اسد، ڈی آئی خان)

تین بچے تین باتیں

تین بچے اپنی اپنی امی کے بالوں کی تعریف کر رہے تھے۔

پہلا۔ ”میری امی کے بال اتنے بڑے ہیں کہ زمین کو چھوتے ہیں۔“

دوسرا۔ ”میری امی کے بال اتنے سنہری ہیں جیسے سونے کے ہوں۔“

تیسرا۔ ”میری امی کے بال جادو کے ہیں۔ کبھی میز پر تو کبھی سر پر۔“

(شہناز شہرت، حیدرآباد)

منا کہاں ہے؟

ایک کینگرو اپنی بیگم سے۔ ”بیگم منا کہاں ہے؟“

بیگم۔ ”ہائے میں لٹ گئی۔ کسی نے میری جیب کاٹ لی۔“

(بنوں سے فہیم اللہ خان کی عنایت)

سکھ شاعر

ایک سکھ شاعر جو بی اے پاس تھا، غالب کے اشعار کی تشریح لکھنے بیٹھ گیا۔ جب یہ شعر سامنے آیا۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

تو اس نے اس کی تشریح یوں لکھی کہ موت جب بھی آئے گی دن کے وقت آئے گی پھر رات کو نیند کیوں نہیں آتی۔

(مرسلہ: تسلیم اختر، کوٹ ادو)

"جی سر!" وہ واپس پلٹا۔

"میں نے کہا ہے خاموشی اور سکون سے... خود بھی تحمل سے کام لو۔ اگر کسی کی عجلت یا بے پروائی سے کوئی گڑبڑ پیدا ہوئی تو میں اسے موقع پر ہی گولی مار دوں گا۔" قاسم نے کرخت لہجے میں کہا تو فرید "جی بہتر" کہہ کر واپس پلٹ گیا۔

قاسم نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ رات کے پونے دس بج رہے تھے۔ اس نے حساب لگایا۔ یقینی طور پر رات بارہ سے پہلے پہلے اس خبیث قاتل کو اب ہر صورت ان کی گرفت میں ہونا تھا۔ قاسم نے گاڑی اسٹارٹ کروائی اور متذکرہ کوٹھی سے تھوڑے فاصلے پر رکوا دی۔ اس کوٹھی کی پشت کے ساتھ بھی ایک کوٹھی موجود تھی۔ اس کے باوجود دوسری گلی میں بھی آٹھ دس سپاہی کھڑے تھے۔ اس کے بعد قاسم، فرید اور دو کانسٹیبلو کو لے کر خود بھی رشید احمد والی کوٹھی کی چھت پر پہنچ گیا تو گلی میں موجود سپاہیوں کو کوٹھی کے اندر گھسنے کا سگنل دے دیا گیا۔

بھی کے اعصاب یکا یک ایک تناؤ کا شکار ہو گئے۔ فضا میں ایک عجیب سی سنسنی اتر آئی۔ قاسم چھت سے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ پولیس کے مسلح جوان انتہائی احتیاط اور ہوشیاری سے کوٹھی کے اندر اتر چکے تھے۔ قاسم کے اپنے اعصاب کشیدہ تھے۔ اس کا ہاتھ ہولسٹر میں موجود پسٹل کے دستے پر تھا اور کان گولی چلنے کی آواز کے منتظر تھے۔

قاسم نے اطراف کا جائزہ لیا۔ ساری کوٹھیوں کی چھتیں یا تو ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں یا پھر اس قدر قریب قریب تھیں کہ بہ آسانی ایک سے دوسری چھت پر پہنچا جا سکتا تھا۔ وہ خود بھی اس چھت سے قاتل والی کوٹھی کی چھت پر پہنچ گیا۔ فرید اور ساتھ آنے والے باقی دونوں کانسٹیبلو نے اس کی تقلید کی جبکہ باقی چاروں اپنی اپنی پوزیشنز پر جمے بیٹھے رہے۔

کوٹھی کی چھت کے ایک کونے سے سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ سیڑھیوں کے سامنے ہی پرندوں کا ایک لکڑی کا سال خوردہ سا پنجرہ پڑا تھا جس کی ایک طرف سے جالی مکمل طور پر اکھڑی ہوئی تھی۔ اس پنجرے کے اوپر ہی پلاسٹک کا ایک درمیانے سائز کا واٹر ٹینک رکھا تھا اور پنجرے کے برابر میں دو تین تارکول والے خالی ڈرم بھی پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ان چیزوں کو دیکھ رہے تھے کہ یکا یک چاروں ہی بری طرح چونک پڑے۔ یقیناً وہ آواز سیڑھیوں کی طرف سے سنائی دی تھی۔ کوئی تھا... کوئی تھا جو سیڑھیوں پر اوپر کی طرف دوڑا چلا آ رہا تھا۔

"ہوشیار..." قاسم نے دھیمے مگر تیز لہجے میں کہا اور خود بھی برق رفتاری سے آڑ میں ہو گیا۔ پسٹل ہولسٹر سے نکل کر اس کے ہاتھ میں آ چکا تھا۔

یقینی طور پر قاتل کو کسی طرح پولیس کے کوٹھی میں داخل ہونے کی خبر ہو گئی تھی اور اب وہ بذریعہ چھت فرار ہونے کی نیت سے اوپر کی جانب دوڑا آ رہا تھا۔ قاسم کے اعصاب بری طرح تن چکے تھے۔ سیڑھیوں پر دوڑتے قدموں کی آواز اب بالکل اوپر آ چکی تھی۔ پھر جیسے ہی آہٹ کی آواز آخری زینے سے بلند ہوئی، قاسم نے برق رفتاری سے بھاگ کے آتے شخص کے راستے میں اپنی ٹانگ اڑا دی۔ اوپر آنے والا اونچا لمبا جوان خاصی بوکھلاہٹ اور عجلت کا شکار تھا۔ قاسم کی ٹانگ سے ٹھوکر کھا کر وہ لڑکھڑاتا ہوا لکڑی کے پنجرے سے ٹکرایا اور پنجرے پر دھرے واٹر ٹینک کو اپنے ساتھ لیتا ہوا دھڑام سے منہ کے بل سامنے جا گرا۔ اس کے منہ سے ایک بے معنی دہشت زدہ سی آواز خارج ہوئی۔ واٹر ٹینک ایک زور کی آواز سے تارکول والے ڈرموں سے ٹکرایا اور چھت پر ایک طرف کو لڑھکتا چلا گیا۔ قاتل نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی لیکن وہ اٹھتے ہوئے جیسے ہی چھت کی عقبی طرف دوڑا، ایک ڈرم کی اوٹ میں دبکے ہوئے فرید نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر چھلانگ لگائی اور وہ دونوں آپس میں الجھتے ہوئے عقبی سمت کو لڑھک گئے۔

"بس، خبردار۔"

"شاباش فرید! چھوڑنا نہیں اب اس کو۔"

قاسم دہاڑتا ہوا ان دونوں کی طرف لپکا۔ دونوں کانسٹیبل بھی دوڑے۔ وہ دونوں دو تین قدم لڑھکے اور قاتل اچانک کسی مچھلی کی طرح تڑپ کر فرید کی گرفت سے نکل گیا۔ ٹھیک اسی وقت ساتھ والی چھت سے تین چار طاقتور ٹارچز کی روشنی نے ان سب کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور ساتھ ہی کئی ایک آوازیں بلند ہوئیں۔

"اوئے پکڑ... قابو کر۔"

"ہلنا مت ورنہ مارے جاؤ گے۔"

"خبردار۔" وہ فرید کی گرفت سے نکلتے ہی اٹھ کر دوبارہ دوڑا مگر اتنے میں ایک سپاہی اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ یہ بات بھی حوصلہ افزا تھی کہ قاتل خالی ہاتھ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اٹھ کر ابھی دو قدم ہی دوڑا تھا کہ اس کے پیچھے دوڑتے سپاہی نے اس کا کالر دبوچ لیا۔ اگلے ہی پل وہ دونوں آپس میں ٹکراتے ہوئے ایک بار پھر گر پڑے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ چھلاوا ایک بار پھر گرفت سے چھوٹ کر بھاگتا، دوسرا

کانسٹیبل بھی جا کر اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔

"سر جی! اس نے شراب چڑھا رکھی ہے۔"

"فرید! پیچھے ہٹ جاؤ تم۔" قاسم نے پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "اس کا نشا اتارو ذرا۔"

ان سب کے لیے "صاحب" کا اتنا اشارہ ہی کافی تھا۔ وہ سب ایک ساتھ اس پر پل پڑے۔ تھپڑ، گھونسے، ٹھوکریں۔ ایک دائیں طرف سے تو دوسرا بائیں طرف سے۔ انہوں نے اسے اس بری طرح دھنکا کہ کچھ ہی دیر میں اس کا سارا نشہ اڑنچھو ہو گیا اور وہ باقاعدہ روتے چیختے ہوئے منت سماجت پر اتر آیا۔ قاسم نے سپاہیوں کو رکنے کا کہا تو انہوں نے قاتل کو بغلوں میں ہاتھ دے کر قاسم کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس کے ہاتھ پہلے ہی پشت پر لے جا کر ہتھکڑیوں میں جکڑے جا چکے تھے۔

قاسم نے انتہائی قہر بار نظروں سے اسے گھورا۔ اتنی سی دیر میں اس کا حلیہ بُری طرح خراب ہو چکا تھا اور حالت بھی۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا اور چہرے پر شدید گھبراہٹ اور خوف کے تاثرات تھے۔ تصویر میں اور اس میں صرف مونچھوں کا فرق تھا۔ باقی بلاشبہ وہ تھا احمد جہانگیر ہی۔

"کمال ہے بھئی! تمہاری تو ابھی سے ہوا خشک ہو گئی ہے اور... ابھی تو کچھ ہوا ابھی نہیں۔" قاسم کے لہجے میں تمسخر تھا، طنز تھا۔

"سر! مم... میرا کوئی قصور نہیں... پہل۔"

وہ ہکلایا تو قاسم نے اتنے زور کا تھپڑ رسید کیا کہ اس کا رخ پھر گیا۔

"تیرا قصور نہیں..."

"آپ یقین کریں سر! خ... خالد مسلسل زیادتی..."

چٹاخ کی آواز کے ساتھ اس کا رخ ایک بار پھر سے گھوم گیا۔

"اب یہ خالد کون ہے؟" قاسم نے دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھتے ہوئے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔

"خ... خالد... خالد نیازی، نیازی کمپلیکس والوں کا..."

قاسم نے ایک اور بھرپور تھپڑ رسید کیا۔

اتنے میں کوٹھی کے اندر اترنے والے مسلح جوان بھی ایک ایک کر کے اوپر پہنچ آئے۔ شاید یہاں کے ہنگامے یا پھر گرنے والے واٹر ٹینک نے انہیں چھت کی طرف متوجہ کیا تھا۔

"سیدھی طرح بتا کہ اس سارے معاملے سے اس کا کیا تعلق ہے؟"

اسی وقت اس کے عقب میں کھڑے ایک سپاہی نے اس کے کندھوں کے بیچ ایک زور کی دھپ جمائی۔

"صرف کام کی بات بول۔" اسے عقب سے ایک غراہٹ سنائی دی۔

"سر! اسی کو گولی لگی تھی۔ لل... لیکن میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ... وہ پستول بھی اسی کا تھا۔" وہ قدرے حیرت و الجھن کا شکار ہوتے ہوئے بولا۔

"یعنی... یعنی کہ ایک اور قتل۔" قاسم اس کی بات پر بری طرح چونکا۔ ساتھ ہی اس نے دو تین تھپڑ اسے اور جڑ دیے۔

"قتل... قتل نہیں سر! گولی اس کی ران کا گوشت ادھیڑ کر نکل گئی تھی۔ ابھی تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی میں نے اسے صدر میں شاپنگ کرتے دیکھا ہے۔ وہ... وہ زندہ ہے سر... قق... قتل کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اسے بھی اس روز ایک طرح سے اتفاقاً ہی گولی لگ گئی تھی۔" قتل کا سن کر ہی جیسے اس کی روح فنا ہو گئی تھی۔ اس کے لہجے کا بے ساختہ پن ایک لمحے کے لیے تو بھی کو

محبت اور نفرت

محبت اور نفرت دو بہنیں ہیں۔ انسانی زندگی میں یہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ان میں فاصلہ تو ہے لیکن صرف چند قدم کا۔ اور — اور شاید یہ انسان کا اپنا ہی انداز فکر ہے کہ وہ کسی کو پسند کرتا ہے تو اپنے تخیل، اپنے تصور اور اپنی رُوح کے سارے حسین خیالات و جذبات کے رنگ اس کی شخصیت سے منسُوب کر کے اُسے ایک مکمل اور آئیڈیل شخصیت بنا ڈالتا ہے۔ اپنے خلوص، اپنے پیار۔ اور اپنی ساری عقیدت کے رنگین پھول اُس کے قدموں پر نچھاور کر دیتا ہے۔ جاگتے میں حسین سپنے دیکھتا ہے۔

اور جب ایک دن حقائق کی سنگین چٹانوں سے ٹکرا کر سپنے ٹوٹ جاتے ہیں۔ رنگ بکھر جاتے ہیں، سُہانے خواب چکنا چُور ہو جاتے ہیں۔ تو نفرت و حقارت کا آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے اور اس محبُوب اور آئیڈیل شخصیت کا بُت اس آتش فشاں کی نذر ہو کر راکھ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

از "منزہ" — نسیمہ مظہر

متذبذب کر گیا تھا۔
"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم نے کوئی قتل نہیں کیا؟"
"نہیں سر! خدا گواہ ہے۔ میں نے تو آج تک کوئی چڑیا بھی نن... نہیں ماری۔ قق... قتل کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ تو خالد نیازی کے ساتھ بہت دنوں سے کچھ پرابلم چل رہا تھا... وہ... وہ مجھے مسلسل پریشان کر رہا تھا۔ اس... اس دن بھی اس نے سڑک پر تھوکنے کے بعد مجھ پر پستول تان لی تھی کہ یہ تھوک چاٹو نہیں تو گولی مار دوں گا۔ بس مم... میں پھر غصے میں اس سے بھڑ گیا تھا۔"
وہ بول رہا تھا اور قاسم یک ٹک اسے گھورے جا رہا تھا۔ اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہو چکی ہے... ہم غلطی پر ہیں... یہ ہمارا مطلوبہ شخص نہیں ہو سکتا... یہ مریل سا شخص سچ میں کسی کو قتل کرنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا اور کہاں وہ سفاک قاتل... رام جہانگیر۔
"ہویدا ریاض کے متعلق کچھ جانتے ہو؟" قاسم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔
"جی، ایک ہویدا ریاض تو میری کلاس فیلو تھی... قریباً ڈیڑھ دو ماہ پہلے اس کا قتل..." اچانک جیسے سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ سامنے کھڑے پولیس افسر نے خالد کو گولی لگنے کی بات پر چونک کر کہا تھا "یعنی کہ ایک اور قتل" اور پھر یہ تو خالد نیازی کو شاید جانتے ہی نہیں۔ یعنی... یعنی کہ... اس کا رنگ فق ہو گیا۔ سیریل کلر کے متعلق وہ بھی اخبارات میں پڑھتا رہا تھا۔
"نن... نہیں سر! مم... میں نے کسی کو قتل نہیں کیا... میں قاتل نہیں۔ بس ایک دن پہلے میرا خالد سے جھگڑا ہوا تھا۔ وہ... وہ زخمی ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے میں چھپتا پھر رہا تھا۔ جو غلطی مجھ سے ہوئی ہے وہ میں خود تسلیم کر رہا ہوں... مم... مگر قتل... قتل کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" احمد جہانگیر بُری طرح گڑگڑانے لگا۔ قاسم سمجھ چکا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔
اب تک کی ساری کوشش، ساری بھاگ دوڑ یوں اکارت چلی جائے گی، اس کا اسے کوئی اندازہ نہیں تھا مگر ایسا ہو چکا تھا... وہ غلط رخ پر چلتے رہے تھے اور آج بھی... اس وقت بھی وہ وہیں کے وہیں کھڑے تھے جہاں پہلے روز تھے... مکمل اندھیرے میں۔ قاسم نے فرید کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی تھوڑی سی الجھن اور مایوسی تھی۔
"ہیلپ... ہیلپ... پلیز میری مدد کیجیے۔ خدا کے لیے۔"
وہاں موجود بھی افراد اچانک سنائی دینے والی اس نسوانی آواز پر بُری طرح چونک پڑے۔ آواز عقبی طرف موجود کوٹھی کی چھت والی سائڈ سے بلند ہوئی تھی۔ ٹارچ برداروں نے فوراً ٹارچز کا رخ عقبی طرف کر دیا۔ وہ ایک لڑکی تھی۔ بری طرح گھبرائی، بوکھلائی ہوئی سی۔ وہ عقبی چھت سے اسی چھت کی طرف آ رہی تھی۔ ضرور ابھی مزید کوئی گڑبڑ باقی تھی۔
قاسم جلدی سے اس طرف کو بڑھا تو آٹھ دس سپاہی بھی اس کے پیچھے ہی لپکے۔
"سر... سر! پلیز مجھے بچا لیجیے۔ وہ... وہ مجھے مار ڈالنا چاہتا ہے... وہ مم... مجھے مار ڈالے گا سر..." وہ لڑکی ہانپتی کانپتی ہوئی قاسم کے سامنے آ پہنچی۔ اس کا پورا وجود کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔
"کون؟ کس کی بات کر رہی ہو؟" قاسم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "گھبراؤ مت۔ کچھ نہیں ہو گا تمہیں۔ تم اب پولیس کی حفاظت میں ہو۔ بتاؤ کیا بات ہے؟"
"سر! وہ... وہ نیچے کوٹھی میں ہے۔"
"کون؟ کس کی بات کر رہی ہو؟"
"سر! وہ قاتل... رام جہانگیر... سیریل کلر!"
الفاظ نہیں، بم تھا جو ان سب کی سماعتوں میں جا کر پھٹا تھا۔ قاسم محاورتاً نہیں حقیقتاً اچھل پڑا۔
"کیا... کیا کہہ رہی ہو؟ تمہیں کیسے پتا چلا؟" قاسم کے لہجے میں انتہا کا اضطراب تھا۔ اس نے لڑکی کو دونوں کندھوں سے پکڑ لیا۔
"مم... مجھے پتا ہے۔ تین روز پہلے اس نے مجھے گگ... گلشن اقبال ٹاؤن سے اغوا کیا تھا اور شش... شائستہ آپی کا مرڈر۔ میں... میں شگفتہ ہوں... شگفتہ جمال۔" لڑکی، یعنی شگفتہ بُری طرح ہکلا رہی تھی۔ خوف و دہشت سے اس کی حالت خراب تھی۔
قاسم جیسے پھر سے جی اٹھا۔
"فرید!"
"جی سر جی!" فرید پہلے ہی مستعد کھڑا تھا۔
"فوراً سب کو نئے ٹارگٹ کا بتاؤ، جلدی۔" قاسم نے تیز لہجے میں فرید کو ہدایت دی اور اس کا ردِ عمل جانے بغیر دوبارہ شگفتہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔
"اس کے علاوہ نیچے کتنے لوگ ہیں؟"
"کک... کوئی نہیں، وہ اکیلا ہے۔"
"کوئی ہتھیار وغیرہ؟"

"پپ... پتا نہیں، میں نے نہیں دیکھا۔"
"اچھا... یہ بتاؤ کہ وہ اس وقت عمارت کے کس حصے میں ہے؟"
"نیچے گراؤنڈ فلور پر ہے۔ ایک... ایک راہداری کے کونے میں بیڈ روم ہے۔ وہاں سو رہا تھا... جس وقت میں وہاں سے نکلی... اس نے بہت زیادہ ڈرنک کر رکھی ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ بس تم اب فکر نہیں کرو۔ تم بالکل محفوظ ہو۔" قاسم نے شگفتہ کو تسلی دی پھر پلٹ کر دیکھا۔ چند قدم کے فاصلے پر فرید کھڑا وائرلیس کے ذریعے ارد گرد کی گلیوں میں موجود سپاہیوں کو نئی ہدایات دے رہا تھا۔
"ہاں جوانو! تم سب تیار ہو نا؟" قاسم اپنے اطراف میں موجود مسلح سپاہیوں سے مخاطب تھا۔
"یس سر!" وہ سب ایک ساتھ مگر دھیمی آواز میں بولے۔
"گڈ!" قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اندرونی جوش کی تمتماہٹ اس کے چہرے پر دکھائی دے رہی تھی۔ پھر فرید ان کے پاس پلٹ آیا تو قاسم اس سے مخاطب ہوا۔
"فرید! تم چار سپاہیوں کو ساتھ لو اور ان دونوں کو نیچے لے جاؤ۔ باقی سب میرے ساتھ دوسری کوٹھی میں اتریں گے۔"
"ٹھیک ہے سر جی! جو آپ کا حکم۔" فرید نے فوراً سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔ پھر جب وہ چار سپاہیوں کے ساتھ احمد جہانگیر اور شگفتہ کو لے کر وہاں سے چلا گیا تو باقی سب عقبی طرف والی چھت پر چلے آئے۔ سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر قاسم رک گیا۔
"خیال رہے بلا ضرورت کوئی گولی نہیں چلائے گا۔ ہاں اگر خطرے کی صورت بن آئے تو بنا سوچے فائر کھول دینا، ٹھیک ہے؟"
"جی سر۔"
"ٹھیک ہے سر جی۔"
ان سب کے اثباتی جواب پر قاسم نے اشارہ کیا اور وہ باری باری محتاط انداز میں سیڑھیاں اترنے لگے۔ قاسم بھی ساتھ ہی تھا۔ پانچ رائفل بردار سپاہی اس کے آگے تھے اور دس اس کے پیچھے۔ گاڑھے اندھیرے کے باعث ایک سپاہی نے ٹارچ روشن کر لی تھی۔
آخری زینے پر رکتے ہوئے قاسم اپنے عقب میں آنے والے سپاہیوں سے سرگوشی کے انداز میں مخاطب ہوا۔
"تم میں سے دو یہیں رک جائیں۔ وہ ہم سے آنکھ بچا کر اس طرف آ سکتا ہے۔" وہ سب دو قطاروں کی صورت راہداری

عورت

ایمان کے بعد سب سے بڑی نعمت عورت ہے۔
(حضرت عمرؓ)

عورت کی آنکھ سُرمہ سے زیادہ شرم و حیا کی جھلک ہوتی ہے۔
(حضرت علیؓ)

عورت مرد کی نسبت زیادہ وسیع القلب ہوتی ہے۔
(لارڈ مارٹن)

عورت مبارک ہے کیونکہ برکتیں اس کے دم قدم سے پھیلتی ہیں۔
(کیمپ بل)

عورت وقار، ایثار، مروّت اور محبت کا درس دیتی ہے۔
(والٹیئر)

عورت گردشِ لیل و نہار کا کیف آور نغمہ ہے۔
(کننگھم)

میں برابر برابر دوسرے کونے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔
یہ حصہ مکمل طور پر گہری خاموشی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ انتہائی احتیاط کے باوجود ان کے بھاری جوتوں سے راہداری میں ایک مدھم سی گونج جاگ اٹھی تھی۔ دوسرے کونے میں واقعی سیڑھیاں موجود تھیں جو گراؤنڈ فلور پر موجود ایک راہداری میں اترتی تھیں۔ راہداری میں ملگجی سی روشنی بھی موجود تھی۔ قاسم کے اشارے پر سپاہی نے ٹارچ آف کر لی۔
"نیچے کا ایک ایک کمرا چیک کرنا ہے۔ انتہائی ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ۔ پہلی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ ہم اسے زندہ قابو کر لیں۔" قاسم نے دھیمے لہجے میں ہدایت دی۔ بھی پوری طرح چوکنا دکھائی دے رہے تھے۔ قاسم نے اشارہ کیا تو وہ پہلے ہی کے سے انداز میں سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔
آخری زینے پر رک کر قاسم نے جھانکا۔ راہداری کے وسط میں صرف ایک انرجی سیور روشن تھا۔ پوری راہداری خالی اور خاموش پڑی تھی۔ قاسم کے اشارے پر دو سپاہی اپنی رائفلیں سیدھی کرتے ہوئے راہداری میں داخل ہو گئے۔ وہ دو تین قدم آگے بڑھ گئے تو قاسم کے اشارے پر مزید دو سپاہی ان کے پیچھے چل پڑے۔ چند لمحوں بعد دو اور

پھر قاسم خود بھی راہداری میں آگیا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔

دو دو کر کے تمام سپاہی راہداری میں آگئے۔ قاسم سب سے آگے والے سپاہیوں کے ساتھ راہداری کے سرے تک جا پہنچا تھا۔ وہ لوگ راہداری میں نظر آنے والے دروازوں کو بھی چیک کرتے جا رہے تھے لیکن تقریباً سبھی دروازے لاک تھے۔ ایک دروازہ کھلا ملا تو تین چار سپاہی باری باری اندر داخل ہو گئے۔ قاسم راہداری کے سرے پر موجود ایک دروازے کو چیک کر رہا تھا مگر وہ بھی لاک ہی تھا۔ اس نے نکڑ پر رک کر دوسری طرف جھانکا۔ یہ بھی ایک راہداری تھی جو دائیں طرف سے تو کافی فاصلے تک پھیلی ہوئی تھی جبکہ بائیں ہاتھ وہ بمشکل بارہ پندرہ قدم طویل تھی اور اس کونے پر موجود دروازے سے روشنی باہر راہداری کے فرش پر پڑ رہی تھی۔

قاسم کی دھڑکنیں کچھ اور تیز ہو گئیں۔ یقیناً یہی وہ بیڈ روم تھا جس میں رام جہانگیر شراب کے نشے میں دھت پڑا سو رہا تھا۔ قاسم نے فوراً سپاہیوں کو مزید ہوشیار ہونے کا اشارہ کیا اور قریب والے سپاہیوں کو اشاروں میں ہدایت دینے کے بعد دوسری راہداری میں آگیا۔ یہاں وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا اس کھلے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ سپاہی اس کی تقلید کر رہے تھے۔ سبھی نے رائفلیں یوں سنبھال رکھی تھیں جیسے موقع آنے پر ایک لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر فائر کھول دیں گے۔

دروازے کے بالکل برابر پہنچ کر قاسم دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہاں سے درمیانی راہداری تک تقریباً آٹھ دس سپاہی .... دونوں دیواروں کے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ایک دوسرے سے دو دو فٹ کے فاصلے پر اور دو سپاہی بالکل اس کے برابر میں کھڑے تھے۔ قاسم کی نظر ان پر پڑی تو وہ دونوں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے، گویا کہ حکم کے منتظر ہوں۔ سبھی کے اعصاب بری طرح کشیدہ تھے اور وہ ہر طرح کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے پوری طرح تیار دکھائی دے رہے تھے۔ قاسم نے اپنے برابر موجود سپاہیوں سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ طے کیا اور پھر لمبے لمبے سانس لے کر خود کو آئندہ لمحے کے لیے تیار کرنے لگا۔ پستول کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ پھر اچانک وہ دیوار سے ہٹا اور بیڈ روم کے کھلے دروازے سے اندر جا پہنچا۔ دونوں سپاہی بھی فوراً ہی اس کے پیچھے لپکے تھے۔

قاسم نے ایک ہی طائرانہ نظر میں بھانپ لیا کہ کمرا خالی ہے... وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے چوکنا انداز میں چاروں طرف کا اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ یہ ایک درمیانے سائز کا بیڈ روم تھا۔ وکٹورین طرز کا خوب صورت فرنیچر۔ ہر چیز کی صورت اور ترتیب سے ایک نفاست اور عمدگی جھلکتی تھی۔

قاسم کے تنے ہوئے اعصاب قدرے ڈھیلے... پڑ گئے۔ اسے محسوس ہوا کہ کمرے کی فضا میں شراب کی بو بھی شامل ہے۔ ضرور وہ اسی کمرے میں شگفتہ کو بٹھائے شراب نوشی کرتا رہا تھا اور ابھی شاید ان کے وہاں پہنچنے سے کچھ ہی دیر پہلے وہ یہاں سے نکل کر کسی اور کمرے میں گیا تھا۔ اگر وہ جاگ چکا تھا تو پھر یہ عین ممکن تھا کہ وہ پولیس کے اندر داخل ہونے سے بھی باخبر ہو چکا ہو۔ اس خیال کے ساتھ ہی قاسم کے پورے وجود میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ ٹھیک اسی وقت باہر راہداری سے یکے بعد دیگرے ایک ساتھ دو گولیاں چلنے کی آواز بلند ہوئی پھر ایک ساتھ کئی ایک فائر ہوئے۔ قاسم بری طرح اچھل پڑا۔ گولیوں کی آواز نے سارے ماحول کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ قاسم فوراً باہر کو لپکا۔ ان چند دھماکوں کے بعد باہر پھر خاموشی چھا چکی تھی۔ البتہ کچھ کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ قاسم نے دیکھا، دو سپاہی راہداری میں ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ ایک کی ٹانگ میں گولی لگی تھی جبکہ ایک کی پسلیوں میں گھس گئی تھی۔ تین چار سپاہی ان کے قریب بیٹھے تھے۔ جبکہ دو تین رائفلیں اٹھائے ہونقوں کی طرح اپنے زخمی ہونے والے ساتھیوں کو دیکھ رہے تھے۔

”کک... کیا ہوا؟ کیسے ہوا یہ سب؟“ قاسم نے بوکھلائے ہوئے انداز میں چیخ کر پوچھا۔

”وس... سر! وہ قاتل ادھر... ادھر بائیں ہاتھ والے کمرے سے نکل کر ادھر دائیں طرف والے دروازے میں داخل ہو رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے وقت اس پر ہماری نظر پڑی۔ فائر پہلے اس نے کیے جن سے یہ دونوں زخمی ہو گئے مگر وہ... وہ ہماری فائرنگ سے بچ گیا۔“ سپاہی نے راہداری کے دوسرے کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ... لعنت ہے، تو اب یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ اس کے پیچھے جاؤ اور چھلنی کر کے رکھ دو...“ قاسم نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا اور خود بھی سامنے دکھائی دینے والی راہداری کے دوسرے کونے کی طرف دوڑ پڑا۔

”انہیں اسپتال پہنچاؤ۔“ اس نے دوڑتے دوڑتے ہی پکار کر کہا۔

اسے لگ رہا تھا کہ قاتل ایک بار پھر ہاتھ سے نکلتا جا رہا

ہے۔ پتا نہیں کیوں مگر یہ خیال اسے شدت سے تنگ کر رہا تھا کہ اگر وہ کوٹھی سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر وہ باہر موجود پولیس والوں سے بھی بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس پر عجیب جھنجلاہٹ طاری ہو گئی تھی۔ وہ دوڑ رہا تھا اور پانچ مسلح سپاہی بھی اس کے ساتھ ہی بھاگے جا رہے تھے۔

راہداری کے آخری کونے پر موجود دروازے کے سامنے پہنچ کر قاسم نے محض ایک لمحے کو سوچا پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ پوری طرح تیار تھا کہ یا ایک گولی کھا لے یا ایک کھلا دے۔ پانچوں سپاہی بھی جیسے بھرّا مار کر اندر داخل ہو گئے۔ ایک بیمار سے بلب کی روشنی میں انہوں نے دیکھا، یہ لاؤنج تھا مگر پوری طرح خالی۔ بس ایک آہٹ کی بازگشت سی وہاں موجود تھی اور اس بازگشت کو محسوس کرتے ہوئے قاسم کو لگا کہ صرف ایک لمحہ پہلے وہ بدبخت دائیں طرف والی دیوار میں موجود دروازے سے اس طرف گیا ہے۔

قاسم بھاری وجود کے باوجود اس لمحے چیتے کی سی پھرتی سے اس دروازے کی طرف لپکا اور دروازے کے قریب پہنچتے ہی اس نے بنا کسی تاخیر کے دروازہ کھولا اور دوسری طرف پہنچ گیا۔ پھر سے ناکامی کے خیال نے جیسے اسے ایک جنون میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ اپنی زندگی کی قیمت پر بھی قاتل کو گرفتار یا ہلاک کر دینے پر پوری طرح تیار تھا۔

دروازے سے دوسری طرف آتے ہی قاسم نے خود کو اندرونی حصے سے باہر پایا۔ چاند کی روشنی میں اس نے دیکھا، وہ بغلی دیوار کی سمت دوڑ رہا تھا۔ یقیناً وہ قاتل ہی تھا اور ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس نے اندر راہداری میں اس کے دو ماتحتوں کو بھی گولیوں سے زخمی کیا تھا جن میں سے ایک کا زخم تشویش ناک تھا۔

”رک جاؤ، رام جہانگیر... ورنہ گولی مار دوں گا۔“ قاسم نے دبنگ لہجے میں للکارا۔ ردِعمل میں رکنے کے بجائے رام جہانگیر نے بھاگتے بھاگتے ہی پیچھے مڑ کر فائر کیا۔ گولی قاسم کے کان میں سرگوشی کرتی ہوئی گزری تھی۔ جواب میں قاسم نے بھی یکے بعد دیگرے دو فائر کیے مگر اتنے میں وہ دیوار کی طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ لہٰذا دونوں نشانے خطا گئے۔ پانچوں سپاہی بھی قاسم کے عقب میں آن پہنچے تھے۔ رام جہانگیر دیوار پر چڑھ چکا تھا۔ ٹھیک اسی لمحے قاسم نے تیسرا فائر کیا۔ ادھر سے رام جہانگیر نے بھی گولی چلا دی۔ قاسم کے عقب میں موجود سپاہیوں نے بھی فائر کھولا تھا مگر رام جہانگیر واضح طور پر اس سے پہلے ہی قاسم کی گولی کا نشانہ بنتے ہوئے دیوار پر سے لڑکھڑا کر دوسری جانب گر پڑا تھا۔

گولی غالباً اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ اس بار اس کا نشانہ بھی خطا نہیں گیا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی قاسم کے بائیں بازو کا گوشت ادھیڑتی ہوئی عقب میں موجود ایک کانسٹیبل کے کندھے میں لگی اور وہ پلٹ کر ڈھیر ہو گیا۔ قاسم کو یوں لگا جیسے کسی نے دہکتی ہوئی لوہے کی کوئی سلاخ اس کے بازو میں اتار دی ہو۔ اس نے فوراً پستول والے ہاتھ سے بازو دبوچ لیا۔ ایک نظر عقب میں دیکھا اور بولا۔

”تم میں سے دو اسے سنبھالو۔“ خود وہ کوٹھی کے بیرونی دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔ دو سپاہی بھی اس کے پیچھے تھے جبکہ باقی دونوں سپاہی اپنے زخمی ساتھی کو سنبھالنے میں لگ گئے۔

فائرنگ کی آواز سن کر یقیناً اردگرد موجود بھی پولیس اہلکار اپنی اپنی جگہ پوری طرح چوکس ہو چکے ہوں گے۔ رام جہانگیر ابھی زندہ تھا۔ گولی نے صرف اس کی ایک ٹانگ زخمی کی تھی۔ وہ مزید نقصان کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ گیٹ کی طرف بھاگتے ہوئے قاسم کے ذہن میں یہی سب گردش کر رہا تھا اور اس کے کان بیرونی طرف سے بلند ہونے والے کسی بھی ہنگامے کے منتظر تھے۔ گیٹ پر پہنچتے ہی اس نے بہ عجلت گیٹ کا بغلی دروازہ کھولا اور باہر نکلتے ہی کوٹھی کی بغلی طرف والی کشادہ گلی کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ نکڑ سے صرف چند قدم پیچھے تھے، جب اس کے کانوں سے پولیس والوں کی للکار ٹکرائی اور ساتھ ہی گولی چلنے کی آواز بلند ہوئی۔ پسٹل کا یہ فائر یقیناً رام جہانگیر ہی کی طرف سے کیا گیا تھا۔ قاسم متعلقہ گلی میں پہنچ گیا۔ ٹھیک اسی وقت ایک ساتھ کئی رائفلوں کے دہانے غرائے اور قاسم نے تیس چالیس قدم آگے ایک کھمبے کے پاس رام جہانگیر کو ان گولیوں کی تال پر لڑکھڑا کر ایک طرف ڈھیر ہوتے دیکھا۔ اس سے آگے تھوڑے ہی فاصلے پر پولیس کی ایک موبائل کھڑی تھی جس کے قریب ہی فرید ظاہر ہوا تھا۔ اس کے عقب میں دو رائفل بردار سپاہی بھی تھے۔ گلی کی دوسری طرف سے بھی ایک رائفل بردار سامنے آیا تھا۔

قاسم کے اعصاب یکا یک ہی ڈھیلے پڑ گئے۔ ”اندر“ جیسے کسی اَن دیکھی گرفت سے اچانک ہی آزاد ہو گیا اور وہ ایک طویل سانس چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ آیا۔ رام جہانگیر سڑک کنارے چاروں خانے چت پڑا تھا۔ اس کا پستول بھی ایک طرف گرا پڑا تھا۔ قاسم اس کے قریب پہنچا تو دوسری طرف سے فرید اور تین چار کانسٹیبلز بھی وہیں پہنچ گئے۔

آج ان سب نے اس درندے کو مار گرایا تھا جس نے

گزشتہ دو ماہ میں آٹھ انسانوں کو سفاکی سے موت کے گھاٹ اتار اتھا جو مسلسل ناقابلِ دسترس معلوم ہوتا آرہا تھا۔ آج ان کے سامنے گرا پڑا تھا کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ انہوں نے قریب پہنچ کر اسے دیکھا۔ وہ ابھی زندہ تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر اس قاتل کی طرف دیکھا اور دوبارہ سے ایک دوسرے کی صورت تکنے لگے۔ حیرت، الجھن اور بے یقینی کے تین رنگ اس لمحے اکٹھے اور ایک رنگ بن کر ان کے چہروں پر پھیل گئے تھے۔

انہوں نے تو سیریل کلر رام جہانگیر کو نشانہ بنایا تھا جبکہ یہاں ان کے قدموں میں خون میں لت پت کرائم رپورٹر توحید علی پڑا تھا...

''اوئے فرید!'' قاسم نے بغور توحید کی صورت دیکھتے ہوئے فرید کو مخاطب کیا۔

''جی سرجی!'' وہ بھی آنکھیں پٹپٹا کر توحید علی ہی کو تک رہا تھا۔

''او یار دیکھ تو ذرا... یہ بندہ تو مجھے اپنے توحید باؤ جیسا لگ رہا ہے۔''

''جی سرجی! وہی ہے۔'' قاسم کے کندھے میں ایک تیز ٹیس اٹھی۔

''وہ لڑکی... شگفتہ کدھر ہے؟''

''ان دونوں کو ادھر ہی گاڑی میں بٹھار کھا ہے جی۔''

''ذرا لاؤ ادھر اسے۔ تسلی تو کراؤ۔'' قاسم کی بات اور فرید کے اشارے پر دو سپاہی فوراً ہی کچھ فاصلے پر کھڑی موبائل کی طرف دوڑ گئے۔

قاسم گہری سنجیدہ نظروں سے توحید کی صورت دیکھنے لگا۔ اسے کئی گولیاں لگی تھیں مگر ابھی وہ زندہ تھا... اس میں آخری چند سانس باقی تھے۔ تکلیف کی شدت ضبط کرنے کی کوشش میں توحید علی نے اپنے جبڑے مضبوطی سے بھینچ رکھے تھے۔ پیشانی اور کنپٹیوں کی رگیں ابھری ہوئی تھیں اور اس کا چہرہ یوں دہک رہا تھا جیسے اندر کا خون سلگ رہا ہو۔ اس کی آنکھیں قاسم ہی کو دیکھ رہی تھیں۔

قاسم اپنا پستول ہولسٹر میں ڈال چکا تھا اور اب وہ توحید کی گولی سے بازو پر آنے والے زخم کو دبوچے کھڑا تھا۔ اس کا ذہن اب بھی اچھل کود میں مصروف تھا۔ ''ہم کس طرح قاتل کو پورے شہر میں ڈھونڈتے رہے اور وہ... یعنی قاتل کتنے اطمینان سے ہمارے ساتھ ساتھ پھرتا رہا۔ ہماری پل پل کی خبر گیری کرتے ہوئے... ہمیں انجوائے کرتا رہا۔''

کچھ ہی دیر میں سپاہی شگفتہ کو لے کر موقع پر پہنچ گئے۔

وہ ابھی تک ڈری سہی ہوئی تھی۔

''شگفتہ بی بی! دیکھو تو سہی یہی ہے وہ بندہ... رام جہانگیر!'' قاسم نے سوال کیا۔

''جج... جی! یہی ہے۔'' شگفتہ نے ایک نظر لہولہو رام جہانگیر پر ڈالتے ہی گھبرا کر رخ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ذرا غور سے دیکھو بی بی... غور سے دیکھ کر بتاؤ۔'' یہ فرید تھا۔

اس بار شگفتہ نے رام جہانگیر کے چہرے پر نظر لگائی اور ڈھیر ساری دہشت اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔

''یہی... یہی ہے۔ اسی نے مجھے کڈنیپ کیا تھا اور... اور آپی شائستہ کا مرڈر۔''

رام جہانگیر کی دھندلاتی ہوئی آنکھوں میں ایک روشنی سی تڑپی۔ ایک نظر اس نے شگفتہ کی طرف دیکھا۔ پھر قاسم کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ یقیناً آخری چند سانسوں کے ساتھ اسے بے پناہ وقت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا پھر بھی اس نے ہاتھ اٹھا کر شگفتہ کی طرف ایک لرزتا سا اشارہ کیا۔ ہاتھ موڑ کر انگلی سے اپنی کنپٹی پر ضرب لگائی اور اس کے کانپتے لرزتے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ ابھر آئی اور ہونٹوں پر ہی پتھرا کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں مکمل طور پر دھندلا چکی تھیں۔ وہ مر چکا تھا۔

قاسم ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

رام جہانگیر یا توحید علی... وہ سفاک قاتل... خطرناک مجرم اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکا تھا۔ گزشتہ دو ماہ سے اس نے پولیس والوں کو نچا کر رکھا ہوا تھا اور کمال کامیابی سے یکے بعد دیگرے اس نے آٹھ افراد کو قتل کر ڈالا تھا۔ ایک طرح سے اس خونی کھیل میں وہ مسلسل جیتتا آیا تھا، فاتح رہا تھا۔ اب وہ سامنے مرا پڑا تھا تو بھی قاسم محسوس کر رہا تھا کہ شاید آج زندگی ہار کر بھی در اصل جیتا وہی ہے۔

شگفتہ بھی آنکھوں میں خوف سمیٹے اسی کی بے جان صورت کو تک رہی تھی۔ اس کے ذہن میں رام جہانگیر کے ماضی... اس کے بچپن کے متعلق وہ تمام باتیں پوری شدت سے گردش کرنے لگی تھیں جو ابھی چند گھنٹے پہلے ہی رام جہانگیر نے خود اپنی زبانی اسے بتائی تھیں۔

وہ اس کی بے جان صورت تکتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ والدین کی طرف سے بچے کی پرورش میں عدم توازن اور غیر اخلاقی رویہ بھلا کس حد تک خوفناک اور سنگین نتائج کا باعث بن سکتا ہے۔